زیرو پوائنٹ 5

جاوید چوہدری

Atif

زیرو پوائنٹ 5

جاوید چودھری

عبداللہ اکیڈمی
الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور
7230350

ترتیب

کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے

(میری داستان تھوڑی)

"لیکن نعش تازہ ہونی چاہیے" میں نے اپنے دوست کی طرف دیکھا اور وہ بھی ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا" ہم دونوں کی دھڑکنیں تیز تھیں' دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا' سانسیں نتھنوں سے الجھ رہی تھیں اور پسینے کے قطرے سر کی چوٹی سے گردن کی طرف دوڑ رہے تھے' کمرے میں سانسوں کی آواز کے سوا مکمل خاموشی تھی اور وہ ہماری حالت کو انجوائے کر رہا تھا' اس کی لمبی لمبی لٹیں برگد کے درخت کی رسیوں کی طرح اس کے شانوں پر گری تھیں' اس کے چوڑے ماتھے پر سلوٹوں کا جال بچھا تھا اور اس جال میں پسینے کے قطرے دائیں سے بائیں اور کبھی بائیں سے دائیں دوڑ رہے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کے پسینے کو دھڑکتے ہوئے دیکھا تھا' اس کی سرخ آنکھوں کی سرخی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اس کے بدن کی بدبو بھی آہستہ آہستہ تعفن بن رہی تھی' میرے اندر خوف ہلکورے لے رہا تھا لیکن میں اپنے خوف کو چہرے تک پہنچنے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دنیا کا ہر انسان خوفزدہ ضرور ہوتا ہے' خواہ وہ بہادر ہو یا بزدل' خوفزدہ اور بہادر لوگوں میں بس اظہار کا فرق ہوتا ہے' بہادر لوگ اپنے خوف کو نسوں تک محدود رکھنا جانتے ہیں' یہ خوف کو چہرے تک نہیں آنے دیتے جبکہ جو شخص اپنے خوف کو دبا نہیں سکتا اس کا خوف چند سیکنڈ میں اس کے چہرے پر پہنچ جاتا ہے۔ میں اس وقت بہادر بننے کی کوشش کر رہا تھا اور میں نے اسی کوشش میں اس کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا میں اسے انسانی نعش لا کر دوں گا اور وہ ہمیں اس نعش کو اٹھا کر اور بولا کر دکھائے گا' وہ بھی پر اعتماد تھا اور میں بھی اپنے تمام تر خوف کے باوجود اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا تھا۔

میں اور میرا دوست ان دنوں غیر مرئی علوم کی جستجو میں تھے' ہمیں جہاں کسی اچھے دست شناس' نجومی' قیافہ شناس' صوفی' عامل یا پیراسائیکالوجی کے ماہر کی اطلاع ملتی تھی ہم وہاں پہنچ جاتے تھے اور گھنٹوں اس کے ساتھ گفتگو کرتے رہتے تھے' ہم نے اس دور میں کالے جادو کے بے شمار ماہر بھی تلاش کئے اور ہم جنوں اور پریوں کے "آقاؤں" کے پاس بھی گئے' ہم ٹھنڈی یخ اور منجمد راتوں میں قبرستانوں میں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر عمل کرنے والے عاملوں کے پاس بھی گئے اور ہم نے اس دور میں موکلوں کی گفتگو بھی سنی' ہم

نے نمک کی ڈلی کو مٹھائی بنتے اور دستر خوان سے پلیٹیں غائب ہوتے بھی دیکھیں' ہم نے رومال کو کبوتر بنتے اور کبوتر کو بلی بنتے بھی دیکھا' ہم نے ستاروں کی چال سے لوگوں کے مقدر تبدیل ہوتے اور صحت مند لوگوں کو بری نظر کا شکار ہوتے اور بیمار لوگوں کو پانی کے ایک گھونٹ سے شفایاب ہوتے بھی دیکھا۔ ہم نے اس دور میں ایک ایسا بزرگ بھی تلاش کر لیا جو پانی کے گلاس میں انگلی ڈبوتا تھا اور یہ پانی پی کر بیمار اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہم ایک ایسے بینکار سے بھی ملے جو درد کی جگہ پر ہاتھ رکھتا تھا اور درد غائب ہو جاتا تھا۔ ہم ایسے عامل سے بھی ملے جو اپنے گھٹنے پر ہاتھ رکھتا تھا اور دوسرے کے گھٹنے کا درد غائب ہو جاتا تھا۔ ہم ایسے شعبدہ بازوں سے بھی ملے جو سگریٹ خود پیتے تھے لیکن دھواں دوسرے کی ناک سے نکلتا تھا اور ایسے فنکاروں سے بھی ملے جو فضا میں ہاتھ بلند کرتے تھے' آسمان سے ان کے ہاتھ پر کاغذ گرتا تھا اور اس کاغذ پر تمام سوالوں کے جواب ہوتے تھے لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود ہم حیران نہیں ہوتے تھے کیونکہ ہمارے لئے یہ سب نارمل تھا' یہ تمام معجزے ٹریک تھے اور ہمیں ان ٹریکس کا طریقہ کار بھی معلوم تھا۔ اس دور میں ہمیں صرف چار لوگوں نے حیران کیا تھا۔ ایک شمیم قریشی صاحب تھے' یہ مقبوضہ کشمیر کے رہنے والے تھے' انہوں نے بنارس کی قدیم یونیورسٹی سے دست شناسی کی تعلیم حاصل کی تھی اور یہ نہ صرف انتہائی قابل پامسٹ تھے بلکہ وہ ایک درویش صفت انسان بھی تھے۔ ان کی ذات میں بے انتہا حلیمی' عاجزی اور انکساری تھی اور وہ ہاتھ کے معمولی ابھاروں اور چھوٹی سے چھوٹی لکیروں کو بھی پڑھ لیتے تھے۔ دوسرے بہاولپور کے ایک حافظ صاحب تھے' حافظ صاحب کورا کاغذ سائل کے سر پر رکھتے تھے اور بعدازاں اس کاغذ پر تصویریں سی چلنے لگتی تھیں۔ تیسرے مارگلہ کی پہاڑیوں کا ایک مجذوب تھا' یہ مجذوب ٹانگوں سے معذور تھا' یہ پہاڑوں میں رہتا تھا اور پیر تسمہ پا کی طرح مریدوں کے کندھوں پر سفر کرتا تھا' اس تک پہنچنے کیلئے سید پور گاؤں سے پیدل اوپر جانا پڑتا تھا اور چوتھا یہ شخص تھا جس کے سامنے ہم اس وقت موجود تھے۔ اس شخص کا دعویٰ تھا وہ چند لمحوں کیلئے نعشوں کو زندہ کر دیتا ہے اور یہ نعش ہر سوال کا جواب دیتی ہے۔ ہم دونوں یہ دعویٰ ماننے کیلئے تیار نہیں تھے کیونکہ نعش کا زندہ ہونا سائنس کے اصولوں کے بھی خلاف تھا اور اسے مذاہب بھی تسلیم نہیں کرتے بہرحال ہم اس کے پاس پہنچ گئے' وہ بکرا منڈی کی ایک کچی گلی میں رہتا تھا' گھر کے باہر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا' ہم پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے تو سامنے ایک تاریک ڈیوڑھی تھی' اس ڈیوڑھی کے بعد کچا صحن آتا تھا' صحن میں گندے پانی کی بو پھیلی تھی' صحن کے کونے میں ایک مریل سی گائے بندھی تھی' گائے کے جسم پر گوبر کے بڑے بڑے دھبے تھے اور ان دھبوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ گائے سے چند فٹ کے فاصلے پر ویران سی اجڑی ہوئی بیری تھی' بیری پر بیر تھے اور نہ ہی پتے۔ بس کانٹے ہی کانٹے تھے

اور بیری کو دیکھ کر دہشت ہوتی تھی۔ ہمیں "شاہ صاحب" کا شاگرد کوٹھری میں لے گیا' کوٹھری کے اندر بھی مرداروں جیسی بو اور قبرستانوں کی وحشت بکھری تھی' دیواروں پر گوبر ملی مٹی کا لیپ تھا' چھت سے پھٹی ہوئی پتنگوں کے رنگ برنگے کاغذ لٹک رہے تھے اور وہاں غیر معمولی حد تک اندھیرا تھا' اس کمرے کی ایک دلچسپ اور غیر معمولی بات اس کا ٹمپریچر تھا' کمرے کا فرش یخ ٹھنڈا تھا اور ہم نے جوتے اتار کر جوں ہی فرش پر پاؤں رکھے تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم نے برف کی سل پر پیر رکھ دیئے ہیں' کمرے میں سرسوں کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا اور اس لیمپ کی روشنی میں شاہ صاحب ننگی زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ہم شام تک "شاہ صاحب" سے گفتگو کرتے رہے' شاہ صاحب کا دعویٰ تھا وہ اللہ تعالٰی کے اذن سے مردوں کو بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں جبکہ ہم یہ دعویٰ ماننے کیلئے تیار نہیں تھے۔ ہماری یہ بحث اس وقت تک جاری رہی جب تک میں نے ان کا چیلنج قبول نہ کر لیا۔ شاہ صاحب کا کہنا تھا "نعش تازہ ہونی چاہئے" میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا "تازہ نعشوں کی زبان نرم ہوتی ہے چنانچہ اس کے الفاظ سمجھ آ جاتے ہیں" ہم نے اگلے دن کا وقت طے کیا اور وہاں سے واپس آ گئے۔

میرا دوست پریشان تھا۔ اس کا کہنا تھا ہم نعش کہاں سے لائیں گے؟ دوسرا اگر نعش واقعی بول پڑی تو کیا ہوگا؟ میں اسے راستہ بھر تسلی دیتا رہا' میں نے اسے یقین دلایا نعش کا بندوبست میں کروں گا اور نعش کبھی نہیں بولے گی اور یہ شخص بہت بڑا فراڈیا ہے' ہم وہاں سے سیدھے ہسپتال آ گئے' میرا ایک کلاس فیلو ڈاکٹر تھا اور وہ ہسپتال میں پوسٹ مارٹم یونٹ میں کام کرتا تھا' ہم اس کے پاس چلے گئے اور رات گئے تک اسے مدد کیلئے تیار کرتے رہے۔ ڈاکٹر اس خطرناک کام کیلئے تیار نہیں تھا لیکن میں نے اسے جیسے تیسے تیار کر لیا' ڈاکٹر ہمیں ایک گھنٹے کیلئے نعش دینے پر تیار ہو گیا لیکن اس کی شرط تھی ہم نعش کو ہسپتال سے باہر نہیں لے جائیں گے' وہ نعش الگ کمرے میں شفٹ کر دے گا اور ہم گھنٹہ بھر اس کے ساتھ رہ سکیں گے۔ ہم واپس شاہ صاحب کے پاس گئے' شاہ صاحب کا کہنا تھا نعش ان کے گھر لائی جائے اور یہ ظاہر ہے ہمارے لئے ممکن نہیں تھا چنانچہ معاملہ "نو ریٹرن" پر چلا گیا۔ ہم مایوسی کے عالم میں شاہ صاحب کے گھر سے نکل آئے' ہم ابھی گلی ہی میں تھے کہ شاہ صاحب کا شاگرد بھاگتا ہوا آیا اور ہمیں واپس شاہ صاحب کے پاس لے گیا۔ شاہ صاحب اگلی شام ہمارے ساتھ ہسپتال جانے کیلئے تیار ہو گئے یوں ہم نے ایک مرحلہ عبور کر لیا۔

ہم اگلے دن شاہ صاحب کو ساتھ لے کر ہسپتال پہنچ گئے' ڈاکٹر کے پاس اس دن کسی اشتہاری مجرم کی نعش موجود تھی' یہ نعش سرد خانے میں رکھی تھی اور اس کا پوسٹ مارٹم اگلے دن ہونا تھا' ڈاکٹر نے ہمیں وارڈ کا آخری کمرہ دے دیا' نعش کمرے میں شفٹ کر دی گئی' ہم نے دروازہ اندر سے بند کر لیا' ہم کمرے

میں اب تین لوگ موجود تھے' شاہ صاحب جو سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھے اور شام کے اترتے اندھیرے میں ان کے دانت چمک رہے تھے' میں اور میرے دوست کی دھڑکنیں تیز تھیں اور ہمارے ماتھوں پر پسینہ آ رہا تھا۔ میں نے اپنی مٹھی کھولی' وہ پسینے سے شرابور تھی' میں نے ہاتھ پتلون پر رگڑ کر صاف کیا اور نعش کے سٹریچر کی طرف دیکھنے لگا' نعش سٹریچر پر سفید کفن میں لپٹی پڑی تھی' کمرے میں آہستہ آہستہ پنکھا چل رہا تھا اور پنکھے کی ساں ساں اور گاں گاں کمرے کی فضا کو مزید خوفناک بنا رہی تھی۔ شاہ صاحب نے ہم دونوں کو اشارہ کیا اور ہم بھاری قدموں سے چلتے ہوئے سٹریچر کے قریب پہنچ گئے' شاہ صاحب نپے تلے قدموں سے نعش کے قریب پہنچے اور انہوں نے نعش کے منہ سے چادر سرکا دی' یہ چالیس پینتالیس برس کا کوئی گنوار سا شخص تھا' اس کی آنکھیں بند تھیں' ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور چہرے پر انتہائی اذیت کے خوفناک تاثرات منجمد تھے۔ ڈاکٹر نے نعش کی ٹھوڑی پر پٹی باندھ کر سر پر گرہ دے دی تھی۔ شاہ صاحب نے ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے سر کی پٹی کھول دی' پٹی کھلتے ہی نعش کا منہ کھل گیا اور ہمیں اس کے پیلے دانت نظر آنے لگے۔ شاہ صاحب نے ٹھنڈے لہجے میں پوچھا "تم نعش سے کس زبان میں بات کرنا چاہو گے" میں نے فوراً جواب دیا "انگلش میں" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا' چند قدم پیچھے ہٹے' نعش کی پائنتی کے پاس پہنچے' اس کے پاؤں ننگے کئے' نعش کے دائیں پاؤں کا انگوٹھا ہاتھ میں پکڑا' اپنی آنکھیں بند کیں اور منہ میں کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا۔ ہم کبھی شاہ صاحب کو دیکھتے اور کبھی نعش کے چہرے کی طرف دیکھنے لگتے' کمرے میں خوف ہلکورے لے رہا تھا' ہمارے دل کنپٹیوں میں دھڑک رہے تھے جبکہ میرا دوست اپنی زبان بار بار ہونٹوں پر پھیرتا تھا' میرا گلا بھی خوف سے خشک تھا لیکن میں بہادری کی اداکاری کر رہا تھا' میں سینہ تان کر کھڑا تھا' شاہ صاحب بڑبڑاتے بڑبڑاتے رہے' میرے دل کے کسی کونے سے بار بار یہ صدا آ رہی تھی یہ سب ڈھونگ ہے' شاہ صاحب ابھی آنکھیں کھولیں گے اور کوئی تکنیکی وجہ بتا کر اپنی ناکامی کا اعلان کر دیں گے۔ میں نے اپنے ذہن کو ممکن تکنیکی وجوہات کی طرف لگا دیا مثلاً شاہ صاحب کہہ سکتے تھے آج بدھ ہے اور نعشیں صرف سوموار کو بولتی ہیں' مثلاً نعش اور معنوی سیارے کے درمیان رابطہ نہیں ہو پا رہا اور جونہی مطلع صاف ہو جائے گا ہم دوبارہ کوشش کریں گے اور مثلاً یہ ظالم شخص کی نعش ہے' مجھے خطرہ ہے یہ زندہ ہو کر تم دونوں پر حملہ کر دے گا' ہمیں کسی نیک شخص کی نعش کا بندوبست کرنا چاہئے' وغیرہ وغیرہ۔ اور ہم شاہ صاحب کو لے کر ہسپتال سے نکل جائیں اور باقی زندگی ان کے فن پر لعنت بھیجتے رہیں۔ میں ذہن میں شاہ صاحب کے ممکنہ بہانوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک میرے دوست نے مجھے ٹہوکا دیا' میں نے گھبرا کر نعش کی طرف دیکھا اور خوف کی ایک لہر سی میرے پاؤں

سے ہو کر سر سے نکل گئی اور میں نے کانپنا شروع کر دیا۔ نعش کی آنکھیں کھلی تھیں' اس کی ناک سے آہستہ آہستہ سانس نکل رہی تھی اور اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ نعش واقعی زندہ ہو رہی تھی' میں نے خوف کے عالم میں شاہ صاحب کی طرف دیکھا' ان کا چہرہ سرخ تھا' سر کی چوٹی سے آبشار کی طرح پسینہ نکل رہا تھا' پسینے کی لکیریں چہرے کے زاویوں سے ہو کر ٹھوڑی پر جمع ہو رہی تھیں اور وہاں سے بے تاب ہو کر فرش پر گر رہی تھیں۔ شاہ صاحب کی بڑبڑاہٹ میں اضافہ ہو چکا تھا جبکہ نعش کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور اس نے اپنی آنکھیں ہمارے اوپر گاڑھ رکھی تھیں۔ میرا دل سینے سے باہر نکل کر دھڑک رہا تھا۔ میں نے وہاں سے بھاگنے کا فیصلہ کیا لیکن پھر اچانک کمرے میں آواز گونجی ''ہو واز دیئر' ڈسٹربنگ می'' میں نے گھبراہٹ کے عالم میں نعش کے چہرے کی طرف دیکھا' اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور آنکھیں میرے چہرے پر گڑی تھیں۔ شاہ صاحب نے پڑھتے پڑھتے آنکھیں کھولیں اور مجھے سوال کرنے کا اشارہ کر دیا لیکن میرے سارے حواس جواب دے چکے تھے' میری زبان تالو کے ساتھ چپک گئی تھی اور کنپٹیاں ڈھول کی طرح بج رہی تھیں۔ میں نے سٹریچر سے ہاتھ اٹھائے اور دروازے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ نعش مجھے ''وئیر آر یو گوئنگ مسٹر شودری' وئیر آر یو گوئنگ مسٹر شودری'' کی آوازیں دینے لگی لیکن میں باہر کے دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں دروازے کے پاس پہنچا اور چٹخنی کی تلاش کیلئے دیوانہ وار دروازے پر ہاتھ پھیرنے لگا' مجھے اچانک اپنے دوست کی چیخ کی آواز آئی' میں نے واپس مڑ کر دیکھا' نعش نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ اپنا ہاتھ چھڑوانے کیلئے زور آزمائی کر رہا تھا لیکن نعش کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ میں نے مدد کیلئے شاہ صاحب کی طرف دیکھا لیکن شاہ صاحب نعش کا انگوٹھا چھوڑ کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے تھے' ان کا رنگ پیلا زرد ہو چکا تھا' مجھے محسوس ہوا شاہ صاحب کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے اور وہ کسی بھی لمحے فرش پر گر کر دم توڑ جائیں گے۔ میں ابھی یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ نعش میں ایک اور تبدیلی آئی' نعش آہستہ آہستہ سٹریچر پر بیٹھنے لگی' اسی دوران میرا ہاتھ چٹخنی تک پہنچ گیا۔ میں نے چٹخنی کا راڈ سیدھا کیا لیکن اس سے پہلے کہ میں چٹخنی کو نیچے کی طرف سرکاتا' کمرے میں ایک فلک شگاف قہقہہ گونجا اور کھڑکی کے پردے ہلنا شروع ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر میرے ذہن نے میرا ساتھ چھوڑ دیا' میرے اوپر غنودگی اور اندھیرا سا چھانے لگا اور میں بے ہوش ہو کر دروازے کے قدموں میں گر گیا۔

جاوید چودھری
مکان نمبر: 491، گلی نمبر: 17
شہزاد ٹاؤن، اسلام آباد

تلوار سے پہلے

ہم ایک اور پہلو بھی نظر انداز کر رہے ہیں' جنگ' جہاد اور اسلامی سزائیں یہ تینوں ہمارے ایمان کا حصہ ہیں' اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو برائی کو ہاتھ' زبان اور احساس سے روکنے کا حکم دے رکھا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے انحراف کرتا ہے وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ اسلام ایک قانون' ایک آئین اور ایک مکمل ضابطہ اخلاق بھی ہے چنانچہ اسلامی ریاست کی حدود میں چور کے ہاتھ بھی کاٹے جائیں گے' قاتل کی گردن بھی اُتاری جائے گی اور بدکاروں کو کوڑے بھی مارے جائیں گے اور یہ ہمارے ایمان' ہمارے مذہب کا حصہ ہے اور ہم سب اسے دل اور روح کی گہرائی سے تسلیم کرتے ہیں لیکن سوال یہ ہے ''پھر مسئلہ کیا ہے؟'' مسئلہ یہ ہے ہم اسلام کو نبی اکرم ﷺ کی سنت اور طریقہ کار کے مطابق شروع نہیں کر رہے اور ہم آج بھی رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر عملدرآمد شروع کر دیں تو اسلام اور مسلمان پوری دُنیا کیلئے قابل قبول ہو جائیں اور دُنیا کے دل ہمارے لئے کھل جائیں' آپ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کو دیکھیں' آپ ﷺ نے نبوت کے اعلان سے قبل کیا کیا تھا؟ آپ ﷺ نے کفار مکہ میں اپنی کریڈیبلٹی سٹیبلش کی تھی' وہ معاشرہ جس میں جھوٹ' مکر' فریب' بے ایمانی' بددیانتی' ملاوٹ' سرقہ' چوری' جہالت' ضد' ہٹ دھرمی اور دھوکہ دہی گندگی میں بو کی طرح رچی بسی تھی آپ ﷺ نے اس معاشرے میں خود کو صادق' امین' حلیم' ایماندار اور پاک دامن سٹیبلش کیا' آپ کی صداقت کا یہ عالم تھا کہ جب لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو لوگوں سے فرمایا ''میں اگر آپ سے کہوں' اس پہاڑ کے پیچھے دشمن کی فوج چھپی ہے تو کیا آپ لوگ میری بات پر یقین کر لو گے'' تمام لوگوں نے باآواز بلند جواب دیا ''ہم فوراً یقین کر لیں گے'' پوچھا ''کیوں؟'' لوگوں نے جواب دیا ''ہم سمجھتے ہیں ہماری نظریں دھوکہ کھا سکتی ہیں لیکن آپ ﷺ غلط بیانی نہیں کر سکتے'' رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا اعتراف کرنے والے لوگوں میں ایسے اشخاص بھی شامل تھے جو پہاڑ کی دوسری طرف سے آئے تھے اور انہوں نے دیکھا تھا پہاڑ کی دوسری طرف کوئی فوج موجود نہیں لیکن یہ لوگ بھی اقرار کر رہے تھے' ہماری آنکھیں دھوکہ کھا سکتی ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ غلط نہیں فرما سکتے۔ آپ ﷺ کی امانت داری کا یہ عالم تھا کہ وہ کفار جو

آپ ﷺ کی جان کے پیاسے تھے وہ بھی اپنا مال' اپنی دولت اور اپنے زیورات آپ ﷺ کے پاس بطور امانت رکھواتے تھے' آپ ﷺ ہجرت کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انہی کفار کی امانتیں لوٹانے کیلئے مکہ میں چھوڑ گئے تھے۔ آپ ﷺ کی انصاف پسندی کا یہ عالم تھا کہ مکہ کے چالیس' چالیس برس کے دشمن قبائل اپنے فیصلے آپ ﷺ سے کراتے تھے' حجر اسود کو نصب کرنے کا وقت آتا تھا تو اس وقت بھی لوگوں کی نگاہیں آپ ﷺ کی طرف ہی اٹھتی تھیں۔ آپ ﷺ کی کریڈیبلٹی کا یہ عالم تھا کہ مکہ کی رئیس ترین خاتون حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا شادی کا فیصلہ کرتی ہیں تو ان کی نگاہ انتخاب بھی صرف اور صرف آپ ﷺ کی طرف اٹھتی ہے۔ آپ ﷺ چالیس برس کی اس کریڈیبلٹی کے بعد کیا کرتے ہیں' یہ بات بھی غور طلب ہے' آپ ﷺ اس کے بعد تبلیغ' دعوت اور ترغیب کا سلسلہ شروع کرتے ہیں اور آپ ﷺ کی کریڈیبلٹی اس تبلیغ میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے چنانچہ آپ ﷺ کے قریب ترین لوگوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا جبکہ دوسرے لوگ آہستہ آہستہ ایمان کے دائرے میں داخل ہوتے رہے۔ تبلیغ کا یہ وقت انتہائی سخت تھا' مکہ کے کفار نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیئے لیکن آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے اللہ کی رضا سمجھ کر سہہ گئے' مشکل کے اس دور میں مسلمان قرآن مجید اور نماز چھپ کر پڑھتے تھے اور اس وقت تک پڑھتے رہے جب تک مکہ مکرمہ کے ایک طاقتور شخص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول نہیں کیا اور وہ حرم شریف میں تلوار اٹھا کر مسلمانوں کی پہلی' اوپن اور باجماعت نماز کی حفاظت کیلئے کھڑے نہیں ہوئے لہٰذا یہ استقامت کا دور تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد کیا کیا؟ آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی' آپ ﷺ محفوظ مقام پر تشریف لے گئے' آپ ﷺ نے اس کے بعد کیا کیا؟ آپ ﷺ نے مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ ان کی شرائط پر معاہدہ کیا اور ان کی شرائط پر مدینہ منورہ میں زندگی گزارنے لگے' آپ ﷺ نے اس کے بعد کیا کیا؟ آپ ﷺ نے اس کے بعد کفار کے حملوں کا دفاع کیا' کفار مکہ نے تین لشکر بھجوائے اور آپ ﷺ نے بدر اور احد میں ان حملوں کا دفاع کیا جبکہ تیسرے حملے کے وقت آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کے گرد خندق کھود دی' دفاع کے بعد آپ ﷺ نے کیا کیا؟ آپ ﷺ نے اس کے بعد مدینہ منورہ کے قبیلوں کو اپنے ساتھ ملایا' یہودیوں کو وعدہ خلافیوں کی سزا دی' مدینہ کی سٹیٹ پر اپنی گرفت مضبوط کی اور اس کے بعد مکہ کی فتح کیلئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے' اس دوران آپ نے صلح حدیبیہ پر بھی دستخط کئے اور کفار کی بعض کڑی شرائط بھی تسلیم کیں۔ آپ ﷺ نے اس کے بعد کیا کیا؟ آپ ﷺ نے اس کے بعد مکہ کے ان ظالم لوگوں کو بھی معاف کر دیا جنہوں نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کی

ہ گی کو مشکل بنا دیا تھا اور جنہوں نے آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔ پ ﷺ نے اس کے بعد کیا کیا؟ آپ ﷺ نے اس کے بعد اسلام کے پیغام کو پوری دنیا میں لانے کا حکم دیا' آپ ﷺ نے شام کے دروازے پر دستک دینے کیلئے پہلا لشکر ترتیب دیا' یہ لشکر ابھی ے سے چند کوس دور گیا تھا کہ آپ ﷺ وصال فرما گئے۔

آپ ذرا اس ترتیب کو ملاحظہ کیجئے' اس ترتیب میں جہاد آخر میں آتا ہے جبکہ کریڈیبلٹی' ت' استقامت' تبلیغ' ہجرت' امن پر مبنی چھوٹی سی اسلامی ریاست' مضبوط دفاع' فتح مکہ اور عام معافی آتے ہیں لہٰذا آپ ﷺ کا پیغام آگے بھی بڑھا اور اس نے پوری دُنیا کو حیران بھی کر دیا جبکہ اس کے بلے میں آپ دُنیا کے ان تمام فاتحین کو لے لیجئے جنہوں نے اپنے فلسفے کی بنیاد تلوار سے رکھی تھی' ان ں نے بہت جلد آدھی آدھی دُنیا فتح کی لیکن پھر چند برس بعد ان کا نام' ان کی سلطنت اور ان کا فلسفہ ہب) دُنیا سے کچی سیاہی کے حروف کی طرح مٹ گیا۔ روم کا جولیس سیزر ہو' مقدونیہ کا سکندر اعظم ہو' یران کا دارا ہو' ہندوستان کا اشوک ہو یا پھر منگولیا کا چنگیز خان۔۔ آج ان کی سلطنتیں' ان کے فلسفے اور کے مقبرے کہاں ہیں؟ کہیں بھی نہیں' کیوں؟ کیونکہ ان کی تربیت غلط تھی' انہوں نے کریڈیبلٹی' ت' استقامت' تبلیغ' ہجرت' ایک چھوٹی سی ریاست' دفاع' عام معافی اور پھر طویل جنگ کی ترتیب کی ئے جنگ' قتل' ظلم اور ایک طویل سلطنت کو اپنی ترجیح بنایا تھا چنانچہ یہ لوگ' ان کے فلسفے اور ان کی تیں سب مٹی میں مٹی ہو گئیں جبکہ رسول اللہ ﷺ کا پیغام نہ صرف آج تک زندہ ہے بلکہ یہ آگے سے ے بڑھتا چلا جا رہا ہے' آپ اسلام کی پوری تاریخ نکال کر دیکھ لیجئے جب تک مسلمان رسول اللہ ﷺ وی ترتیب کے مطابق چلتے رہے اسلام پھیلتا رہا لیکن جب ان لوگوں نے تلوار کو کریڈیبلٹی' تبلیغ اور ں پر فوقیت دی' مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا چنانچہ ہم اگر آج بھی پوری دُنیا میں اسلام کا غلبہ ہتے ہیں تو پھر ہمیں رسول اللہ ﷺ کی دی ترتیب کے مطابق چلنا ہو گا' ہمیں سب سے پہلے صداقت امانت پر مبنی ایک ایسی کریڈیبلٹی سٹیبلش کرنا پڑے گی کہ کلنٹن' بش اور اوبامہ اور گورڈن براؤن' ڈی اور دشمن یا ہو سے لے کر پوری دُنیا اپنی امانتیں ہمارے پاس رکھوائے اور ہمیں آنکھیں بند کر کے پھر کے تصفیوں کیلئے ثالث مقرر کرے' ہم اس کے بعد دُنیا کو دعوت دیں' پیٹ پر دو پتھر باندھ لیں کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں' بے سروسامانی کے عالم میں اپنا دفاع کریں' غلبے کے بعد عام معافی ' ایک چھوٹی سی پرامن ریاست قائم کریں جس میں امن کے ساتھ علم بھی ہو اور رزق بھی اور پھر اس بعد دُنیا کے ہر فرعون سے ٹکرا جائیں۔

یہ عجیب بات لگتی ہے ہم دُنیا کے بدترین معاشروں میں رہتے ہوں' ہم نے جہالت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہو' ہم دواؤں کیلئے بھی دشمنوں کے محتاج ہوں' ہم ہتھیار بھی اپنے دشمنوں کے استعمال کرتے ہوں' ہم دودھ میں گندے جوہڑوں کا پانی ملاتے ہوں اور مسجدوں سے لوٹے اور کلاک چوری کرتے ہوں' ہمارا کشکول ہر وقت یہودیوں کے سامنے پھیلا ہو اور ہم اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے سر قلم کر رہے ہوں' مسجدوں' امام بارگاہوں اور قبرستانوں میں بم پھاڑ رہے ہوں اور اس کے بعد پوری دُنیا میں اسلام پھیلانے کا دعویٰ کر رہے ہوں' یہ کیسے ممکن ہے؟ کیونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی سلطنت میں کردار' تبلیغ اور استقامت ہمیشہ تلوار سے پہلے آتی ہے جبکہ ہم لوگ اسلام کو تلوار سے شروع کر رہے ہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

چائے کا ایک کپ، پرس کے دو ٹکڑے

میں نے ٹیلی ویژن بند کیا اور اپنے ساتھی کی طرف مڑ گیا' میرا دوست تولئے سے منہ صاف کر رہا تھا' میں نے اس سے عرض کیا "یار بے شک سپریم کورٹ نے تاریخی فیصلہ دیا' میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف کی واپسی پاکستانی سیاست کا یوٹرن ثابت ہوگی اور اگر میاں نواز شریف پاکستان پہنچ گئے تو فوج سیاست سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے فارغ ہو جائے گی" میرے دوست نے اثبات میں سر ہلا دیا' میں نے اس سے عرض کیا "لیکن اس کے باوجود میرے ذہن میں ایک عجیب سوال پیدا ہوتا ہے" میرے دوست نے سر اوپر اٹھایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا "کیا" میں نے عرض کیا "اگر میاں نواز شریف اور ان کے خاندان نے واپس ہی آنا تھا' انہوں نے دوبارہ اقتدار میں پہنچنا تھا تو اللہ تعالیٰ کو 12 اکتوبر ہٹانے کی کیا ضرورت تھی' نواز شریف فیملی کو قید تنہائی میں ڈالنے اور انہیں جدہ اور لندن بھجوانے کی کیا ضرورت تھی' اگر اللہ تعالیٰ نے 12 اکتوبر 1999ء اور 23 اگست 2007ء کو ایک دوسرے کے ساتھ ہی جوڑنا تھا تو آٹھ برس کا یہ کھیل کھیلنے کی کیا ضرورت تھی' مجھے اس سارے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت سمجھ نہیں آ رہی" میرے دوست نے قہقہہ لگایا' جیب سے پرس نکالا' پرس سے ایک میلی کچیلی رسید نکالی اور وہ میرے سامنے رکھ دی' رسید پر کچی پنسل سے 11 روپے لکھا تھا اور اس کے نیچے بھلوال تحریر تھا' اس کے بعد اس نے پرس سے ایک چھوٹی سی تصویر نکالی اور میز پر رکھ دی' یہ دس بارہ سال کے ایک بچے کی تصویر تھی' بچے نے کندھے پر سکول کا بستہ اٹھا رکھا تھا اور وہ شرما کر کیمرے کی طرف دیکھ رہا تھا' میں حیرت سے دوست کی طرف دیکھنے لگا' اس نے دونوں چیزیں واپس پرس میں رکھیں اور کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

"یہ پانچ برس پرانا واقعہ ہے اور تمہیں اس واقعے میں نواز شریف خاندان کی جلاوطنی کی تمام توجیہات معلوم ہو جائیں گی" میرے دوست کے چہرے پر رونق سی آ گئی' وہ بولا "میں ٹرین کے ذریعے بہاولپور سے سرگودھا آ رہا تھا' یہ رات کا وقت تھا' میں برتھ پر چڑھ کر سو گیا' میرا خیال تھا میں سرگودھا سے پہلے جاگ جاؤں گا لیکن شدید تھکاوٹ کی وجہ سے میری آنکھ نہ کھل سکی اور میں سرگودھا سے آگے نکل گیا' راستے میں چند لمحوں کیلئے ٹرین رکی تو میں جیسے تیسے گرتے پڑتے نیچے اتر آیا' یہ ایک دیہاتی سا سٹیشن تھا' اکتوبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور فضا میں سردی کا ہلکا ہلکا اثر موجود تھا' صبح ہونے میں ابھی چند گھنٹے باقی تھے اور پورے پلیٹ فارم پر میرے سوا کوئی مسافر نہیں تھا' میں نے گارڈ روم کے چوکیدار سے اگلی ٹرین

کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا صبح دس بجے سے پہلے کوئی ٹرین نہیں آئے گی لاری اڈہ وہاں سے دور تھا اور رات کے وقت سٹیشن سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا لہٰذا میں پلیٹ فارم کے اکلوتے بنچ پر بیٹھ گیا' یہ میری زندگی کی مشکل ترین رات تھی' پلیٹ فارم پر سناٹا بھی تھا اور اندھیرا بھی اور مجھے شدید سردی بھی لگ رہی تھی' میں اٹھ کر چوکیدار کے پاس چلا گیا اور اس سے کسی چائے خانے یا ہوٹل کے بارے میں پوچھنے لگا' چوکیدار نے بیزاری سے گیٹ کی طرف اشارہ کر دیا' میں نے اپنا سامان اس کے کمرے میں رکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسٹیشن سے باہر آ گیا'' میرا دوست سانس لینے کیلئے رکا۔

مجھے اس کی کہانی انتہائی فضول' بے معنی اور بور محسوس ہو رہی تھی لیکن میں خاموش بیٹھا رہا' وہ دوبارہ گویا ہوا ''سٹیشن سے باہر ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا' ہوٹل کے چولہے سرد تھے' کرسیاں کرسیوں پر اوندھی پڑی تھیں اور دروازہ آدھ کھلا تھا' میں نے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا' اندر کا منظر دلچسپ تھا' ہوٹل کے فرش پر دو گدے بچھے تھے' ایک گدے پر درمیانی عمر کا ایک بے ہنگم سا شخص خراٹے لے رہا تھا جبکہ دوسرے گدے پر پانچ چھ سال کا ایک بچہ بیٹھ کر سلیٹ پر کچھ لکھ رہا تھا' بچے کے سرہانے مٹی کے تیل کا لیمپ رکھا تھا اور وہ ناکافی روشنی میں بڑی مشکل سے لکھ رہا تھا' میں نے دروازے پر دستک دی تو بچے نے سہم کر میری طرف دیکھا' میں نے مسکرا کر اسے سلام کیا اور بڑے پیار سے پوچھا ''بیٹا میں مسافر ہوں کیا مجھے ایک کپ چائے مل سکتی ہے'' بچے نے اثبات میں سر ہلایا' سلیٹ گدے پر رکھی اور چولہے پر کھڑا ہو گیا' میں اس کی مدد کرنے لگا' ہم نے مٹی کے تیل کا چولہا جلایا' اس نے چولہے پر پتیلی رکھی' ہم دونوں نے چائے بنائی اور ہم چائے کا کپ لے کر ہوٹل کے باہر بیٹھ گئے' بچے نے مجھے اندر سے رس کے دو ٹکڑے اور ایک کیک پیس بھی لا دیا' مجھے سخت بھوک لگی تھی' اس بھوک میں چائے کا وہ کپ' وہ دو رس اور ایک کیک پیس مجھے دنیا کی سب سے بڑی نعمت محسوس ہوا'' وہ دم لینے کیلئے رکا تو میں نے بے چینی سے پوچھا ''لیکن اس سارے واقعے کا نواز شریف کی جلاوطنی سے کیا تعلق'' اس نے مجھے ہاتھ سے صبر کرنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ بولا ''میرے پاس وقت تھا لہٰذا میں نے بچے کے ساتھ گپ شپ شروع کر دی' مجھے معلوم ہوا وہ بچہ یتیم ہے اور اپنے دور پار کے کسی عزیز کے ساتھ ہوٹل میں کام کرتا ہے' وہ سارا دن بازار میں چائے سرو کرتا ہے' برتن دھوتا ہے اور چولہا جلاتا ہے اور رات کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے' بچے نے بتایا اسے پڑھنے کا بے تحاشا شوق ہے وہ اخبار سامنے رکھ کر کچھ لفظ منتخب کرتا ہے اور گھنٹوں یہ لفظ سلیٹ پر کاپی کرتا رہتا ہے' جب اسے یہ لفظ اچھی طرح لکھنے آ جاتے ہیں تو وہ کسی پڑھے لکھے گاہک سے ان کا تلفظ اور مطلب سیکھ لیتا ہے' اس نے مجھے چند لفظ لکھ کر بھی دکھائے' میں بچے کی ذہانت سے متاثر

ہوئے بغیر نہ رہ سکا' میں صبح نو بجے تک اس چائے خانہ پر بیٹھا رہا' اس دوران اس کا عزیز بھی جاگ گیا اور چائے خانے کا کاروبار بھی شروع ہو گیا' میں نے بچے کے عزیز کو پیشکش کی اگر وہ اس بچے کو سکول میں داخل کرا دے تو میں اسے ہر مہینے دو ہزار روپے بھجوا سکتا ہوں' وہ بھلا مانس تھا' اس نے فوراً میری پیش کش قبول کر لی' میں جب دس بجے بھلوال سے نکلا تو میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا' میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا اگر میں نے سرگودھا ہی جانا تھا تو اللہ تعالیٰ کو مجھے بھلوال لے جانے کی کیا ضرورت تھی' مجھے اس وقت سمجھ آ گئی اللہ تعالیٰ نے میرے نصیب میں بھلوال کی چائے کا ایک کپ' رس کے دو ٹکڑے اور کیک کا ایک پیس لکھ دیا تھا چنانچہ میں یہ سب کچھ کھائے پیئے بغیر سرگودھا نہیں پہنچ سکتا تھا اور دوسرا مجھے اللہ تعالیٰ نے اس بچے کی کفالت کی ذمہ داری دینی تھی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے میرا راستہ بدلا' وہ مجھے سرگودھا کی بجائے بھلوال لے گیا اور میں نے اس بچے کی کفالت اپنے ذمے لے لی'' وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے بوریت سے جمائی لی اور اس کی طرف دیکھ کر پوچھا ''لیکن نواز شریف فیملی'' اس نے قہقہہ لگایا اور اپنی چمکتی آنکھیں میرے اوپر جما کر بولا ''اللہ تعالیٰ نے نواز شریف خاندان کے نصیب میں جدہ اور لندن کا رزق لکھا تھا' وہ اس رزق کے بغیر واپس نہیں آ سکتے تھے' دوسرا اللہ تعالیٰ نے انہیں وطن کی محبت اور جلاوطنی کی تکلیفوں سے متعارف کرانا تھا' اللہ تعالیٰ نے انہیں بتانا تھا جن لوگوں کو ملک سنوارنے کا موقع دیا جاتا ہے ان کے کندھوں پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ نے انہیں بے گناہی کے دکھ اور جیلوں کی تکلیفوں کا احساس بھی دلانا تھا' اللہ تعالیٰ نے انہیں قانون اور انصاف کی اہمیت بھی بتانی تھی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ بھی سمجھانا تھا کوئی حکمران خواہ کتنا ہی بڑا ہو جائے اور اسے کتنا بھاری مینڈیٹ مل جائے وہ انسان ہی رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے مضبوط سے مضبوط کرسی بھی ریت کے ڈھیر سے زیادہ طاقتور نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ بتانا تھا جو لوگ اپنی نیت کو صاف اور ارادے کو مضبوط رکھتے ہیں وہی لوگ بالآخر فتح یاب ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں توبہ کی قوت بھی دکھائی تھی چنانچہ میاں صاحب کی جلاوطنی اور میرا بھلوال پہنچنا ایک ہی سلسلے کے دو الگ الگ واقعات ہیں' میں نے اس واقعے سے زندگی کا سب سے بڑا سبق سیکھا تھا' مجھے نہیں معلوم میاں صاحب نے اس سے کیا سیکھا اور وہ واپس آ کر اللہ تعالیٰ کے دیئے اس تجربے کو کیسے استعمال کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی عاجزی' نیک نیتی اور خدمت کائنات میں سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اگر میاں صاحب نے ان تینوں اصولوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا تو وہ تیسری دنیا کے سب سے بڑے لیڈر ثابت ہوں گے بصورت دیگر انہیں چند سال بعد دوبارہ کسی اقرار نامے کی ضرورت پڑے گی۔''

چھوٹی چھوٹی نیکیاں

یہ امریکہ‘ سرکس‘ باپ‘ بیٹے اور دس افراد کے خاندان کا قصہ ہے‘ میں نے یہ واقعہ ایک امریکی مصنف کی کتاب میں پڑھا تھا اور یہ میرے شعور کا حصہ بن گیا تھا اور اس کے بعد میں نے جب بھی کسی سینما ہاؤس‘ سرکس یا کسی ریستوران کے سامنے پانچ چھ بچوں کی فیملی دیکھی تو مجھے فوراً یہ واقعہ یاد آ گیا اور میں اس کے کرداروں کے سحر میں گرفتار ہو گیا‘ یہ مصنف کی ذاتی زندگی کا واقعہ تھا‘ مصنف کا نام غالباً ڈین کلارک تھا‘ ڈین کلارک نے اپنی بائیوگرافی میں لکھا ”بچپن میں ہمارے شہر میں ایک شاندار سرکس لگی تھی‘ میں نے اپنے والد سے سرکس دیکھنے کی ضد کی‘ اس وقت ہمارے معاشی حالات اچھے نہیں تھے‘ میرے والد نے مجھے ٹالنے کی بڑی کوشش کی لیکن میں جب ماننے پر تیار نہ ہوا تو میرے والد نے جیسے تیسے دو ٹکٹوں کی رقم کا بندوبست کیا اور ہم سرکس چلے گئے‘ سرکس کے سامنے تماشائیوں کی لمبی قطار لگی تھی‘ میں اور میرے والد بھی اس قطار میں کھڑے ہو گئے‘ ہم سے آگے ایک لمبی چوڑی فیملی کھڑی تھی‘ یہ درمیانی عمر کے دو میاں بیوی تھے جبکہ ان کے پیچھے آٹھ بچے کھڑے تھے‘ یہ بچے شائستگی اور تہذیب کے ساتھ قطار میں کھڑے تھے اور خوب تیاری کر کے سرکس دیکھنے آئے تھے‘ بچوں کے منہ تازہ تازہ دھلے ہوئے تھے‘ سب نے بڑی احتیاط سے بال بنا رکھے تھے‘ سب نے اپنے بہترین کپڑے پہن رکھے تھے اور سب کے جسم سے عطر کی خوشبو آ رہی تھی‘ یہ بچے دو دو کی جوڑی کی صورت میں کھڑے تھے اور انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے‘ میں نے زندگی میں بے شمار بچے دیکھے ہیں لیکن مجھے ان آٹھ بچوں جیسا کوئی مہذب بچہ نہیں ملا‘ وہ بچے اخلاقیات میں بڑی عمر کے لوگوں سے بھی بہتر تھے لیکن شائستگی اور تہذیب کے باوجود بچوں کے چہروں پر صاف لکھا تھا یہ ان کی زندگی کا سب سے بہترین دن ہے اور وہ پہلی مرتبہ تفریح کیلئے گھر سے نکلے ہیں‘ وہ ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیوں میں بات چیت کر رہے تھے اور ان کی بات چیت میں عموماً ہاتھی‘ شیر اور جادوگروں کا ذکر آ رہا تھا جس سے محسوس ہوتا تھا وہ بچے سرکس کے پردے کے پیچھے چھپی دنیا دیکھنے کیلئے بے تاب ہیں‘ بچوں کے ماں باپ بھی بہت خوش تھے‘ وہ خوشی سے کبھی ہاتھ ملتے تھے اور کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر مسرت کا اظہار کرتے تھے‘ ان کا والد خوشی سے

پھولے نہیں سما رہا تھا‘ وہ محبت اور شفقت سے اپنے بچوں کی طرف دیکھتا تھا اور اس کا سینہ فخر سے پھیل جاتا تھا‘ قطار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی‘ اس خاندان سے آگے ایک ادھیڑ عمر جوڑا تھا‘ بابا جی نے شکاریوں جیسے کپڑے پہن رکھے تھے جبکہ بوڑھی خاتون نے نیلے رنگ کا سکرٹ‘ وہ دونوں آگے بڑھے‘ انہوں نے ٹکٹ لیا اور اندرونی راہ داری کی طرف مڑ گئے‘ اب اس خاندان کی باری تھی‘ وہ صاحب اپنی بیگم کے ساتھ آگے بڑھے‘ انہوں نے پیار اور فخر سے بچوں کی طرف دیکھا‘ ٹکٹ کی کھڑکی پر جھکے اور انہوں نے ٹکٹ بیچنے والی خاتون سے پوچھا ”دو فل اور آٹھ ہاف ٹکٹس کے کتنے پیسے بنتے ہیں“ سرکس کی سٹاف خاتون نے کیلکولیٹر پر ہندسے ٹائپ کئے اور اسے رقم بتا دی‘ رقم سن کر باپ کا رنگ فق ہو گیا اور اس نے خاتون سے دوبارہ رقم پوچھی‘ خاتون نے رقم دہرا دی‘ اس نے اپنی ساری جیبیں الٹیں‘ رقم گنی اور مایوسی سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر بولا ”میرے پاس دس ڈالر کم ہیں“ بیوی کا رنگ بھی فق ہو گیا‘ دونوں نے مڑ کر بچوں کی طرف دیکھا‘ بچے چہرے پر امید سجا کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے‘ میں نے اس لمحے ان دونوں میاں بیوی کو جتنا پریشان دیکھا مجھے اس کے بعد زندگی میں کوئی جوڑا اتنا بے بس نظر نہیں آیا‘ میرے والد بڑی دیر سے اس فیملی کو واچ کر رہے تھے‘ ان کی جیب میں اس وقت صرف بیس ڈالر تھے‘ ان بیس ڈالروں سے ہم نے سرکس بھی دیکھنی تھی‘ ریفریشمنٹ بھی لینی تھی اور بس کے ذریعے واپس گھر بھی پہنچنا تھا‘ میرے والد نے چند سیکنڈ سوچا اور پھر وہ فیصلہ کیا جس نے مجھے اور میرے والد کو زندگی کے ایک نئے زاویئے سے متعارف کرا دیا‘ میرے والد آخری سانس تک اس فیصلے کی سرشاری میں ڈوبے رہے تھے اور ان کا خیال تھا وہ لمحہ اور وہ فیصلہ ان کی زندگی کا شاندار ترین وقت تھا جبکہ مجھے بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میرا حلق میٹھا ہو جاتا ہے اور میں خوشی اور سرشاری کے ناقابل بیان احساسات میں ڈوب جاتا ہوں‘ میرے والد نے جیب سے بیس ڈالر نکالے‘ زمین پر گرائے‘ نیچے جھکے‘ نوٹ اٹھائے اور آٹھ بچوں کے باپ سے مخاطب ہو کر بولے ”معاف کیجئے گا میرا خیال ہے یہ پیسے آپ کی جیب سے گرے ہیں“ دونوں میاں بیوی نے حیرت سے میرے والد کی طرف دیکھا‘ میرے والد آگے بڑھے اور وہ نوٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیئے‘ اس جوڑے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے گہری ممنونیت سے میرے والد کی طرف دیکھا‘ میرے والد نے شفقت سے بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور واپس مڑ گئے‘ میرے والد کی جیب خالی ہو چکی تھی‘ انہوں نے مسکرا کر مجھے دیکھا‘ میں نے اپنے والد کا ہاتھ پکڑا اور ہم باہر آ گئے‘ ہم دونوں سرکس دیکھے بغیر گھر آ گئے لیکن ہمارے دل محبت‘ سرشاری اور سکون سے لبریز تھے‘ میں اس وقت ایک شاندار احساس سے متعارف ہوا‘ اس احساس نے آنے والی زندگی کے ہر نازک وقت اور ہر کڑے

مرحلے میں میرا ساتھ دیا''

ڈین کلارک کی زندگی کا واقعہ بظاہر ایک معمولی سا قصہ ہے لیکن جب سے میں نے یہ واقعہ پڑھا ہے مجھے محسوس ہوتا ہے ہم لوگ زندگی بھر اللہ تعالیٰ کو بڑی بڑی عبادتوں اور بڑی بڑی خدمتوں میں تلاش کرتے رہتے ہیں' ہم اسے مسجدوں' کلیساؤں' سینا گوگا اور مندروں میں تلاش کرتے ہیں' ہم اسے قرآن مجید' بائبل اور توریت میں کھوجتے ہیں اور ہم اس تک پہنچنے' اس کو پانے کیلئے بڑے بڑے ہسپتال' بڑے بڑے خیراتی ادارے اور بڑے بڑے دارالامان بناتے ہیں لیکن ہمارا خدا ہماری زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات' ہماری چھوٹی چھوٹی نیکیوں اور ہمارے چھوٹے چھوٹے کاموں میں ہمارا انتظار کرتا رہتا ہے' وہ خدا جس تک پہنچنے کیلئے دنیا کے پرہیز گار پوری زندگی سجدے کرتے ہیں اور جسے پانے کیلئے متقی عمر بھر روزے رکھتے ہیں وہ خدا انسانوں کو پانی کے ایک گلاس' ایک وقت کی روٹی' ایک چادر اور سردیوں کی منجمد راتوں میں ایک رضائی کے عوض مل سکتا ہے' وہ خدا زمانے کے مارے بے بس لوگوں کے پاس بیٹھ کر صدیوں سے ہمارا انتظار کر رہا ہے' ہم اللہ تعالیٰ کی جس رحمت اور جس کرم کو قبلوں اور کعبوں میں تلاش کرتے رہتے ہیں' اللہ کی وہ رحمت اور وہ کرم اس کے بندوں کی چھوٹی چھوٹی امیدوں اور چھوٹی چھوٹی حسرتوں میں چھپی رہتی ہے' مجھے محسوس ہوا خدا تک پہنچنے کے تمام راستے اس کی مظلوم' بے بس اور نادار مخلوق کے دل سے گزرتے ہیں اور یہ راستے کبھی فقط بیس روپے اور کبھی پانی کے ایک گلاس کے عوض کھل جاتے ہیں' مجھے محسوس ہوا خدا ہمیشہ چھوٹے لوگوں کے دلوں میں رہتا ہے اور جب تک ہم ان لوگوں کے دلوں پر دستک نہیں دیتے اور جب تک ان لوگوں کا دل ہمارے لئے نہیں کھلتا اس وقت تک ہم اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچ پاتے' ڈین کلارک کی زندگی کے اس واقعے نے بتایا بعض اوقات بیس روپے کا نوٹ انسان کو خوشی کا وہ احساس دے دیتا ہے جو بیس ارب روپے خرچ کر کے بھی حاصل نہیں ہوتا' مجھے یہاں دنیا کے نامور نفسیات دان سگمنڈ فرائیڈ کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے' فرائیڈ کے پاس شہر کا امیر ترین شخص آیا اور اس سے کہنے لگا ''فرائیڈ میرے پاس دنیا کی تمام نعمتیں موجود ہیں لیکن میرے دل میں قرار نہیں' مجھے سکون اور خوشی کا احساس نہیں ہوتا' تم میرا علاج کرو'' فرائیڈ مسکرایا اور اسے مشورہ دیا'' آپ روزانہ سو مارک کے پھول خریدا کریں اور یہ پھول بچوں اور بوڑھوں میں تقسیم کر دیا کریں آپ کو خوشی بھی مل جائے گی اور سکون بھی'' وہ شخص گیا اور اس نے پھول تقسیم کرنا شروع کر دیئے' وہ ایک ماہ بعد واپس آیا تو اس کے چہرے پر خوشی بھی تھی اور سکون بھی' فرائیڈ نے اس وقت اسے بتایا خوشی ہمیشہ چھوٹی چھوٹی بے لوث خدمتوں میں ملتی ہے لیکن لوگ اسے زندگی بھر بڑے کاموں اور بڑی نیکیوں میں

تلاش کرتے رہتے ہیں لہٰذا لوگ عمر بھر اس سے محروم رہتے ہیں' مجھے یہاں اپنے ایک دوست بھی یاد آ رہے ہیں' میرے یہ دوست جب مایوس ہوتے ہیں تو یہ بازار سے فٹ بال' کرکٹ کی گیندیں اور جاگرز خریدتے ہیں اور کچی آبادیوں میں جا کر بچوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور جب یہ کچی آبادی سے باہر نکلتے ہیں تو ان کا دل خوشی سے لبریز اور چہرہ سکون کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے' وہ اکثر کہا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ جو سکون دس روپے کی گیند سے دیتا ہے وہ سو سال کی عبادت میں نہیں ملتا' وہ کہا کرتے ہیں بڑی نیکیوں کے راستے لمبے اور چھوٹی نیکیوں کی مسافتیں چھوٹی ہوتی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کیلئے چھوٹی نیکیاں کرو وہ تمہیں فوراً مل جائے گا۔

⊘ ⊘ ⊘

چوتھا سیکرٹ

وہ مسکرائے اور آہستہ سے بولے ''ایک دوسرا زاویہ نظر بھی ہے'' میں نے عرض کیا ''وہ کیا'' وہ بولے ''اللہ کا شکر'' میں نے عرض کیا ''جناب میں سمجھا نہیں'' انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر بولے ''میں آپ کو حضرت موسیٰؑ کا ایک واقعہ سناتا ہوں' آپ کو اس واقعے سے ساری بات سمجھ آ جائے گی'' میں نے عرض کیا ''جی فرمایئے'' وہ بولے ''حضرت موسیٰؑ کوہ طور پر تشریف لے جا رہے تھے' آپؑ کو راستے میں دو صاحب ملے' ایک صاحب نے آپ سے عرض کیا' میں بدحال ہوں' گھر میں فاقوں کی نوبت آ چکی ہے' آپ اللہ سے میرے لئے رزق کی دعا کیجئے گا۔ حضرت موسیٰؑ نے اس سے وعدہ کر لیا۔ دوسرا شخص آگے بڑھا اور عرض کیا' اے اللہ کے پیغمبر میں اس بستی کا خوشحال ترین شخص ہوں' میرے پاس زرخیز زمین ہے' بکریوں اور بھیڑوں کے گلے اور گھوڑوں کے اصطبل ہیں' میرے پاس خادموں اور غلاموں کا لشکر ہے اور اللہ نے مجھے اولاد کی خوشی سے بھی نوازا ہے۔ میں اب چاہتا ہوں میرا زیادہ تر وقت اللہ کی عبادت میں گزرے لیکن دنیاداری مجھے اتنی فرصت نہیں دے رہی' آپ اللہ سے درخواست کیجئے گا وہ میرے اوپر سے دنیاداری کا بوجھ کم کر دے تا کہ مجھے وقت ملے اور میں صدق دل سے اللہ کی عبادت کر سکوں۔ حضرت موسیٰؑ نے اس کے ساتھ بھی وعدہ کر لیا' حضرت موسیٰؑ کوہ طور سے واپس تشریف لائے تو دونوں اشخاص آپ کے راستے میں کھڑے تھے' آپ کو دیکھ کر بدحال شخص آگے بڑھا' آپؑ نے اسے دیکھ کر فرمایا اللہ نے تمہارے لئے پیغام بھجوایا ہے تم کثرت سے میری نعمتوں کا شکر ادا کیا کرو' تمہیں خوشحالی مل جائے گی' اس شخص نے چونک کر آپؑ کی طرف دیکھا اور غصے سے بولا' اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا کیا ہے جس کا میں شکر کروں' وہ مڑا اور واپس بستی کی طرف چل پڑا۔ دوسرا شخص آگے بڑھا اور عرض کیا میرے لئے کیا حکم ہے' آپؑ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے پیغام بھجوایا ہے تم میرے شکر میں کمی کر دو' تمہارا رزق کم ہو جائے گا' یوں تمہیں فرصت مل جائے گی' اس شخص نے ایک لحہ سوچا اور اس کے بعد بولا' میں یہ کیسے کر سکتا ہوں' میرے اوپر اللہ تعالیٰ کا بے تحاشا کرم ہے' میں خود کو اللہ کے شکر سے کیسے باز رکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی مڑا اور بستی کی طرف واپس چلا گیا''۔ وہ خاموش ہو گئے۔

میں چند لمحے تک ان کی طرف دیکھتا رہا' وہ بھی خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے' میں نے شرمندہ لہجے میں عرض کیا ''جناب مجھے اب بھی سمجھ نہیں آئی'' انہوں نے قہقہہ لگایا اور فرمایا ''خوشحالی اور سکون دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں لیکن یہ دونوں انسان کیلئے انتہائی ضروری ہوتی ہیں' اللہ کے رسول ﷺ نے جہاں لوگوں کو سکون اور اطمینان کا طریقہ سکھایا تھا وہاں آپ ﷺ اپنے لوگوں کی خوشحالی کیلئے بھی کثرت سے دعا کیا کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے غربت انسان کو کفر تک لے جاتی ہے۔ آپ غور کر لیجئے انسان کو دولت اور سکون دونوں درکار ہوتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی دشمن ہیں' دولت جب کسی شخص کے پاس پہنچتی ہے تو اس سے سکون رخصت ہو جاتا ہے اور جہاں سکون موجود ہوتا ہے وہاں سے دولت کھسکنے لگتی ہے لیکن اللہ کا شکر وہ واحد طاقت ہے جو سکون اور دولت دونوں کو نہ صرف ایک جگہ جمع کر سکتی ہے بلکہ انہیں سینکڑوں ہزاروں سالوں تک اکٹھا بھی رکھ سکتی ہے۔ تم دنیا میں ان تمام خوشحال' دولت مند اور ترقی یافتہ لوگوں کو بے سکون پاؤ گے جو اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے اور تمہیں وہ تمام لوگ پرسکون اور مطمئن ملیں گے جن کی زبان پر اللہ کا شکر ہوتا ہے''۔ وہ رک کر میری طرف دیکھنے لگے' میں نے عرض کیا ''لیکن ہم میں سے بے شمار لوگ ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتے رہتے ہیں' ہم پر اللہ کا کرم ہے' اللہ کا شکر ہے جیسے فقروں کو اپنی علیک سلیک کا حصہ بنا لیا ہے'' انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولے ''صرف زبانی کلامی۔ ہم لوگوں نے شکر اور کرم کو اس طرح اپنی روٹین بنا لیا ہے جس طرح ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر ہیلو ہائے یا سوری کہتے ہیں اور یہ بھی ایک طرح کی منافقت ہے''۔ میں نے عرض کیا ''پھر شکر ادا کرنے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے'' انہوں نے فرمایا ''ہمیں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے انعامات کو تسلیم کرنا چاہئے' اللہ نے ہمیں صحت دی' دنیا کا ہر انسان ساڑھے چار ہزار بیماریاں لے کر پیدا ہوتا ہے اور ان میں سے کوئی بھی بیماری کسی بھی وقت متحرک ہو سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان بیماریوں سے بچا کر رکھا ہے' دنیا میں کھانا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا اس کھائے ہوئے کو خارج کرنا مشکل ہے' پانی کا وہ گھونٹ جو ہم ہمیشہ بے خیالی میں پیتے ہیں اور رزق کا وہ لقمہ جو ہم ٹی وی دیکھتے دیکھتے نگل جاتے ہیں' ہم نے کبھی اس کے بارے میں سوچا اگر یہ لقمہ اور پانی کا یہ گھونٹ ہمارے اندر رہ جائے' قدرت اسے اخراج کی اجازت نہ دے تو ہمارا کیا حشر ہو؟ تم اس تکلیف کا اندازہ تک نہیں کر سکتے۔ اگر انسان کے منہ میں تھوک پیدا نہ ہو تو دنیا کی ساری دولت مل کر بھی یہ تھوک پیدا نہیں کر سکتی' ہماری سانس کی نالی میں مسور کے دانے کے برابر رکاوٹ آ جائے' ہمارے حلق میں مچھلی کا کانٹا پھنس جائے اور ہمارے انگوٹھے پر پھوڑا نکل آئے یا ہماری ریڑھ کی ہڈی کا آخری سرا ٹوٹ جائے تو ہماری ساری زندگی عذاب ہو جائے اور انسان موت کو اس تکلیف سے ہزار درجے اچھا سمجھنے لگے' دنیا میں اس شخص سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں ہوتا جس کی جیب میں سو روپے ہوں اور اس شخص کے پاس

یہ سو روپے خرچ کرنے کی مہلت موجود ہو۔ دنیا میں ایسے ہزاروں لاکھوں لوگ ہیں جن کے پاس کروڑوں' اربوں روپے ہیں لیکن قدرت انہیں یہ رقم خرچ کرنے کی اجازت نہیں دیتی' شاہ ایران کے اکاؤنٹس میں اربوں روپے تھے لیکن اس نے آخری زندگی دوسروں کے ٹکڑوں پر گزار دی۔ دولت ایک نوٹ کی شکل میں ہو یا اربوں روپے کی چیک بک کی صورت میں اس کو جو خرچ کر سکے' اللہ کا اس پر بڑا کرم ہوتا ہے اور ہاتھ کو دائیں سے بائیں گھما لینا اور اپنے پاؤں میں خود جوتا پہن لینا اور جب چاہنا اور جہاں چاہنا چلے جانا' دنیا میں یہ کتنی بڑی نعمت ہے' یہ تم کبھی اس شخص سے پوچھو جس کی ٹانگیں اور ہاتھ مفلوج ہیں اور دنیا میں ایک تولہ تھوک کی کیا قیمت ہے' یہ تمہیں صرف وہ بتا سکتا ہے جس کا منہ ہر وقت خشک رہتا ہے اور اسے زبان کو حرکت دینے کیلئے ہر پانچ منٹ بعد کیمیکل کا گھونٹ بھرنا پڑتا ہے چنانچہ تم سب سے پہلے اللہ کی ان نعمتوں کو تسلیم کرو اور اس کے بعد صدق دل سے پوری دنیا کو بتاؤ تم پر اللہ کا کتنا بڑا کرم ہے اور تم اس کرم پر اللہ کے بہت مشکور ہو"۔

وہ رکے' انہوں نے چند لمحے سوچا اور دوبارہ بولے "دنیا میں ان لوگوں سے بڑا بدقسمت کوئی نہیں ہوتا جنہیں اللہ ترقی' خوشحالی' رزق' صحت اور عزت سے نوازے اور وہ ہر وقت شکوہ کرتے رہیں' وہ ہر وقت روتے دھوتے رہیں' آپ ان سے جب بھی پوچھیں شیخ صاحب آپ کیسے ہیں تو وہ ہائے مر گئے' برباد ہو گئے' پیسے ختم ہو گئے' بجلی چلی گئی' پانی نہیں ہے' ملک کی حالت پتلی ہے' ملک برباد ہو رہا ہے' ہمیں پچھلی حکومت نے برباد کر دیا' ہمیں بھارت کھا گیا' ہمیں امریکہ لے کر ڈوب گیا اور تجارت میں بہت نقصان ہو رہا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ جیسے شکوے شروع کر دیتے ہیں۔ تم یقین کرو جب انسان سات بار اللہ کی دی کسی نعمت کا انکار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس نعمت سے مزہ اڑا دیتا ہے اور اس کے بعد انسان کھانا کھاتا ہے لیکن اسے اس کھانے کا مزہ نہیں آتا' اس انسان کے پاس رزق اور دولت تو ہوتی ہے لیکن اس کیلئے اس دولت اور اس رزق کی لذت ختم ہو جاتی ہے' وہ انسان ترقی یافتہ اور مشہور تو ہوتا ہے لیکن اس کی شہرت اور ترقی بے رنگ ہو جاتی ہے۔ یہ اللہ کا شکر ہے جو اللہ کی نعمتوں میں رنگ' لذت اور مزہ ڈالتی ہے چنانچہ جب بھی موقع ملے ایک لمبا سانس لو اور دوسروں کو بتاؤ تم پر اللہ کا بہت کرم ہے' ہمیشہ یہ کہو اللہ کا بڑا ہی شکر ہے' اللہ کا بڑا ہی کرم ہے اور کبھی اللہ کی نعمتوں کی موجودگی میں شکوہ نہ کرو کیونکہ اللہ شکر کرنے والوں سے محبت اور شکوہ کرنے والوں سے ناراض رہتا ہے"۔

وہ رکے' انہوں نے میری طرف دیکھا اور بولے "یہ اللہ کی سلطنت کا چوتھا سیکرٹ ہے' میں پہلے تین سیکرٹ تمہیں پھر کبھی بتاؤں گا"۔

⊘ ⊘ ⊘

دوسرا کتا

حاجی صاحب نے آخری عمر میں فیکٹری لگا لی اور وہ چوبیس گھنٹے فیکٹری میں رہنے لگے' وہ سولہ سے اٹھارہ گھنٹے دفتر میں کام کرتے تھے اور جب تھک جاتے تھے تو فیکٹری کے گیسٹ ہاؤس میں سو جاتے تھے' حاجی صاحب کے مزاج کی یہ تبدیلی سب کیلئے حیران کن تھی' وہ تیس برس تک دنیا داری' کاروبار اور روپے پیسے سے الگ تھلگ رہے تھے' انہوں نے یہ عرصہ عبادت اور ریاضت میں گزارا تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس ریاضت کا بڑا خوبصورت صلہ دیا تھا' وہ اندر سے روشن ہو گئے تھے' وہ صبح آٹھ بجے اپنی بیٹھک کھولتے تھے اور رات گئے تک ان کے گرد لوگوں کا مجمع رہتا تھا' لوگ اپنی اپنی حاجت لے کر ان کے پاس آتے تھے' وہ ان کیلئے دعا کا ہاتھ بلند کر دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ سائل کے مسائل حل فرما دیتا تھا' اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو قبولیت سے سرفراز کر رکھا تھا لیکن پھر اچانک حاجی صاحب کی زندگی نے پلٹا کھایا' وہ ایک دن اپنی گدی سے اٹھے' بیٹھک بند کی' اپنے بیٹوں سے سرمایہ لیا اور گارمنٹس کی ایک درمیانے درجے کی فیکٹری لگا لی' انہوں نے اس فیکٹری میں پانچ سو خواتین رکھیں' خود اپنے ہاتھوں سے مقامی خواتین کیلئے کپڑوں کے نئے ڈیزائن بنائے' یہ ڈیزائن یورپ بھجوائے' باہر سے آرڈر آئے اور حاجی صاحب نے مال بنوانا شروع کر دیا' یوں ان کی فیکٹری چل نکلی اور حاجی صاحب دونوں ہاتھوں سے ڈالر سمیٹنے لگے' دنیا میں اس وقت گارمنٹس کی کم و بیش دو' تین کروڑ فیکٹریاں ہوں گی اور ان فیکٹریوں کے اتنے ہی مالکان ہوں گے لیکن ان دو' تین کروڑ مالکان میں حاجی صاحب جیسا کوئی دوسرا کردار نہیں ہوگا۔ پوری دنیا میں لوگ بڑھاپے تک کاروبار کرتے ہیں اور بعد ازاں روپے پیسے اور اکاؤنٹس سے تائب ہو کر اللہ اللہ شروع کر دیتے ہیں لیکن حاجی صاحب ان سے بالکل الٹ ہیں' انہوں نے پینتیس سال کی عمر میں کاروبار چھوڑا' اللہ سے لو لگائی لیکن جب وہ اللہ کے قریب ہو گئے تو انہوں نے اچانک اپنی آباد خانقاہ چھوڑی اور مکروہات کے گڑھے میں چھلانگ لگا دی' وہ دنیا کے واحد بزنس مین ہیں جو فیکٹری سے درگاہ تک گئے تھے اور پھر درگاہ سے واپس فیکٹری پر آ گئے۔

حاجی صاحب کی کہانی ایک کتے سے شروع ہوئی تھی اور کتے پر ہی آ کر ختم ہوئی تھی' یہ

35 برس پرانی بات تھی' حاجی صاحب کی گارمنٹس فیکٹری تھی' حاجی صاحب صبح صبح فیکٹری چلے جاتے تھے اور رات بھیگنے تک کام کرتے تھے' ایک دن وہ فیکٹری پہنچے تو انہوں نے دیکھا ایک درمیانے قد کاٹھ کا کتا گھسٹ گھسٹ کر ان کے گودام میں داخل ہو رہا ہے' حاجی صاحب نے غور کیا تو پتہ چلا کتا شدید زخمی ہے' شائد وہ کسی گاڑی کے نیچے آ گیا تھا جس کے باعث اس کی تین ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں اور وہ صرف ایک ٹانگ کے ذریعے اپنے جسم کو گھسیٹ کر ان کے گودام تک پہنچا تھا' حاجی صاحب کو کتے پر بڑا رحم آیا' انہوں نے سوچا وہ کتے کو جانوروں کے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں' اس کا علاج کراتے ہیں اور جب کتا ٹھیک ہو جائے گا تو وہ اسے گلی میں چھوڑ دیں گے۔ حاجی صاحب نے ڈاکٹر سے رابطے کیلئے فون اٹھایا لیکن نمبر ملانے سے قبل ان کے دل میں ایک انوکھا خیال آیا اور حاجی صاحب نے فون واپس رکھ دیا۔ حاجی صاحب نے سوچا کتا شدید زخمی ہے' اس کی تین ٹانگیں ٹوٹ چکی ہیں' اس کا جبڑا زخمی ہے اور پیٹ پر بھی چوٹ کا نشان ہے چنانچہ کتا اب روزی' روٹی کا بندوبست نہیں کر سکتا' حاجی صاحب نے سوچا 'اب دیکھنا یہ ہے قدرت اس کتے کی خوراک کا بندوبست کیسے کرتی ہے' حاجی صاحب نے مشاہدے کا فیصلہ کیا اور چپ چاپ بیٹھ گئے' وہ کتا سارا دن گودام میں بے ہوش پڑا رہا' شام کو جب اندھیرا پھیلنے لگا تو حاجی صاحب نے دیکھا ان کی فیکٹری کے گیٹ کے نیچے سے ایک دوسرا کتا اندر داخل ہوا' کتے کے منہ میں ایک لمبی سی بوٹی تھی' کتا چھپتا چھپاتا گودام تک پہنچا' زخمی کتے کے قریب آیا' اس نے پاؤں سے زخمی کتے کو جگایا اور بوٹی اس کے منہ میں دے دی' زخمی کتے کا جبڑا حرکت نہیں کر پا رہا تھا چنانچہ اس نے بوٹی واپس اگل دی' صحت مند کتے نے بوٹی اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالی' بوٹی چبائی جب وہ اچھی طرح نرم ہو گئی تو اس نے بوٹی کا لقمہ سا بنا کر زخمی کتے کے منہ میں دے دیا' زخمی کتا بوٹی نگل گیا' اسکے بعد وہ کتا گودام سے باہر آیا' اس نے پانی کے حوض میں اپنی دم گیلی کی' واپس گیا اور دم زخمی کتے کے منہ میں دے دی' زخمی کتے نے صحت مند کتے کی دم چوس لی' صحت مند کتا اس کارروائی کے بعد اطمینان سے واپس چلا گیا' حاجی صاحب مسکرا پڑے' اس کے بعد یہ کھیل روزانہ ہونے لگا' روز کتا آتا' زخمی کتے کو بوٹی کھلاتا' پانی پلاتا اور چلا جاتا۔ حاجی صاحب کئی دنوں تک یہ کھیل دیکھتے رہے' ایک دن حاجی صاحب نے اپنے آپ سے پوچھا "وہ قدرت جو اس زخمی کتے کو رزق فراہم کر رہی ہے کیا وہ مجھے دو وقت کی روٹی نہیں دے گی؟" سوال بہت دلچسپ تھا' حاجی صاحب رات تک اس سوال کا جواب تلاش کرتے رہے یہاں تک کہ وہ توکل کی حقیقت بھانپ گئے' انہوں نے فیکٹری اپنے بھائی کے حوالے کی اور تارک الدنیا ہو گئے' وہ مہینے میں تیس دن روزے رکھتے اور صبح صادق سے اگلی صبح کاذب تک رکوع و سجود کرتے' وہ برسوں اللہ کے دربار میں کھڑے رہے' اس عرصے میں اللہ انہیں رزق بھی دیتا رہا اور ان کی دعاؤں کو قبولیت بھی۔ یہاں

تک کہ وہ صوفی بابا کے نام سے مشہور ہو گئے اور لوگ ان کے پاؤں کی خاک کا تعویذ بنا کر گلے میں ڈالنے لگے لیکن پھر ایک دوسرا واقعہ پیش آیا اور صوفی بابا دوبارہ حاجی صاحب ہو گئے۔

یہ سردیوں کی ایک نیم گرم دوپہر تھی' صوفی بابا کی بیٹھک میں درجنوں عقیدت مند بیٹھے تھے' صوفی بابا ان کے ساتھ روحانیت کی رموز شیئر کر رہے تھے' باتوں ہی باتوں میں صوفی بابا نے کتے کا قصہ سنا دیا اور اس قصے کے آخر میں حاضرین کو بتایا "رزق ہمیشہ انسان کا پیچھا کرتا ہے لیکن ہم بے وقوف انسانوں نے رزق کا پیچھا شروع کر دیا ہے' اگر انسان کی توکل زندہ ہو تو رزق انسان تک ضرور پہنچتا ہے' جس اس کتے کی طرح جو زخمی ہوا تو دوسرا کتا اس کے حصے کا رزق لے کر اس کے پاس آ گیا۔ میں نے زخمی کتے سے توکل سیکھی' میں نے دنیا داری ترک کی اور اللہ کی راہ میں نکلا آیا' آج اس راہ کا انعام ہے میں آپ کے درمیان بیٹھا ہوں۔ ان تیس برسوں میں کوئی ایسا دن نہیں گزرا جب اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی وسیلے سے مجھے رزق نہ دیا ہو یا میں کسی رات بھوکا سویا ہوں' میں ہمیشہ اس زخمی کتے کو تھینک یو کہتا ہوں جس نے مجھے توکل کا سبق سکھایا تھا" صوفی بابا کی محفل میں ایک نوجوان پروفیسر بھی بیٹھا تھا' اس نے جینز پہن رکھی تھی اور اس کے کان میں ایم پی تھری کا ائرفون لگا تھا' نوجوان پروفیسر نے ائر فون اتارا اور قہقہہ لگا کر بولا "صوفی بابا ان دونوں کتوں میں افضل زخمی کتا نہیں تھا بلکہ وہ کتا تھا جو روز شام زخمی کتے کو بوٹی چبا کر کھلاتا تھا اور اپنی گیلی دم سے اس کی پیاس بجھاتا تھا' کاش آپ نے زخمی کتے کے توکل کی بجائے صحت مند کتے کی خدمت' قربانی اور ایثار پر توجہ دی ہوتی تو آج آپ کی فیکٹری پانچ' چھ سو گھروں کا چولہا جلا رہی ہوتی" صوفی بابا کو پسینہ آ گیا' نوجوان پروفیسر بولا "صوفی بابا اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے افضل ہوتا ہے' وہ صحت مند کتا اوپر والا ہاتھ تھا جبکہ زخمی کتا نیچے والا۔ افسوس آپ نے نیچے والا ہاتھ تو دیکھ لیا لیکن آپ کو اوپر والا ہاتھ نظر نہ آیا۔ میرا خیال ہے آپ کا یہ سارا تصوف اور سارا توکل خود غرضی پر مبنی ہے کیونکہ ایک سخی بزنس مین دس ہزار نکھے اور بے ہنر درویشوں سے بہتر ہوتا ہے" نوجوان پروفیسر نے سلام کیا اور بیٹھک سے نکل گیا' حاجی صاحب نے دو رکعت نفل پڑھے' بیٹھک کو تالا لگایا اور فیکٹری کھول لی' وہ اب عبادت بھی کرتے ہیں اور کاروبار بھی۔

⊘ ⊘ ⊘

دُعا عبادت ہے

"جناب مجھے آج تک انسان' خواہش اور اللہ تعالیٰ کے تعلق کی سمجھ نہیں آئی" وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے' میں نے عرض کیا "انسان کی 80 فیصد خواہشیں جائز' بے ضرر اور معصوم ہوتی ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ یہ خواہشیں پوری کر دے تو اس میں بظاہر کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا لیکن خواہشوں کی یہ فائلیں ایک میز سے دوسری اور ایک صاحب سے دوسرے صاحب کے دفتر میں دھکے کھاتی رہتی ہیں" میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا' اس پر اطمینان' سکون اور مسکراہٹ تھی' میں نے عرض کیا "مثلاً ایک طالب علم محنت کرتا ہے اور اس محنت کے بعد گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی دعا کرتا ہے لیکن وہ اس کے باوجود فیل ہو جاتا ہے مثلاً ایک مریض شہر کے سب سے اچھے ڈاکٹر سے علاج کراتا ہے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے شفاء کی دعا کرتا ہے' ایک بزنس مین شہر کے مرکزی علاقے میں دکان کھولتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے کاروبار میں برکت کی دعا کرتا ہے' نوجوان اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا ہے' بے روزگار شخص ویزے کی درخواست دیتا ہے' نوکری کا طلب گار دفتروں میں درخواستیں دیتا ہے' کھلاڑی سارا سال محنت کرتا ہے' کارخانے دار پوری ایمانداری سے مال تیار کرتا ہے' بیوی شوہر کی خدمت کرتی ہے' ماں' باپ بچوں کو اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم دلاتے ہیں' کسان سارا سال کھیت تیار کرتا ہے' سرکاری ملازم پوری زندگی ایک ایک پیسہ جمع کرتا ہے' ہزاروں لاکھوں بزرگ عمر بھر دیار حرم کی جھلک دیکھنے کیلئے تڑپتے ہیں' بھوکا روٹی کی خواہش کرتا ہے اور پیاسے کو پانی کا ایک پیالہ چاہیے' مریض کو درد کی گولی درکار ہے' کلرک سارے دن کے کام کے بعد باس کو خوش دیکھنا چاہتا ہے اور خانساماں دن بھر کی خدمت کے بعد روٹی کے چند نوالے چاہتا ہے لیکن جناب ان لوگوں کی یہ تمام جائز خواہشیں حسرتیں بن جاتی ہیں' مریض شفاء کی دعائیں کرتا کرتا مر جاتا ہے' خانساماں کو سوکھی روٹی تک نہیں ملتی' باس کلرک کو گالی دے کر گھر بھجواتا ہے' لوگ اللہ کے گھر کی خواہش دل میں لئے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں' نوکری کا طلب گار درخواستیں دے دے کر بوڑھا ہو جاتا ہے' طالب علم محنت اور ذہانت کے باوجود فیل ہو جاتا ہے اور بزنس مین مرکزی چوک میں دکان کھول کر بھی مکھیاں مارتا رہتا ہے' کیوں؟ خواجہ صاحب کیوں' آخر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی یہ جائز خواہشیں پوری کیوں نہیں کرتا؟ اس میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟" میرا سانس پھول گیا اور میں تھک کر

خاموش ہو گیا۔

خواجہ صاحب ہنسے اور ذرا سے توقف کے بعد بولے "آپ کا شکوہ بجا ہے لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے" وہ رکے' مسکرائے اور دوبارہ بولے "میں یہ پہلو بتانے سے پہلے آپ کو ایک تمثیل بتانا چاہتا ہوں" میں ہمہ تن گوش ہو گیا' خواجہ صاحب بولے "آپ نے اکثر چھوٹے بچوں کو دیکھا ہو گا' بعض اوقات یہ بچے رات کو اٹھتے ہیں اور اپنی ماؤں سے دودھ کیلئے ضد شروع کر دیتے ہیں' دودھ کے فیڈر ماؤں کے سرہانے پڑے ہوتے ہیں لیکن مائیں بچوں کو دودھ نہیں دیتیں' بچے روتے رہتے ہیں' بلکتے رہتے ہیں اور بعض اوقات ایڑیاں رگڑتے رہتے ہیں لیکن مائیں ٹس سے مس نہیں ہوتیں' اسی طرح جب بچوں کو ہیضہ ہوتا ہے اور وہ تربوز' خربوزے اور گرمے کی ضد کرنے لگتے ہیں تو والدین ان کی یہ ضد بھی پوری نہیں کرتے' بچے رات کو گڑ' چینی اور کھجور کی ضد کرتے ہیں' وہ سڑک پر بھاگنے دوڑنے کی خواہش کرتے ہیں' وہ جلتا ہوا بلب پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں' وہ چلتی گاڑی کی چھت پر بیٹھنے کی ضد کرتے ہیں اور وہ چھری سے کھیلنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن والدین ان کے یہ مطالبے مسترد کر دیتے ہیں' کیوں؟" وہ میری طرف دیکھنے لگے' میں خاموش رہا' وہ بولے "کیونکہ ماں جانتی ہے اگر رات کے اس پہر بچے کو فیڈر دے دیا گیا تو اس کا پیٹ خراب ہو جائے گا' یہ بیمار پڑ جائے گا' والدین جانتے ہیں بچے کو ہیضہ ہے اور اگر اس ہیضے میں اسے ذرا سی کچی یا بھاری خوراک دے دی گئی تو اس کا مرض بڑھ جائے گا' وہ جانتے ہیں بچے کو کس وقت گڑ' چینی اور کھجور دینی چاہیے' بچے کو سڑک پر نہیں جانے دینا' بچے نے اگر جلتا ہوا بلب پکڑ لیا تو اس کا ہاتھ جل جائے گا" "وہ اگر گاڑی کی چھت پر بیٹھ گیا تو اس کو چوٹ لگ جائے گی' ذرا سوچئے اگر والدین اس وقت بچے کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیں تو اس کے کیا نتائج نکلیں گے" وہ خاموش ہو گئے' میں نے کسمسا کر پہلو بدلا اور ان سے عرض کیا "جناب بچوں کی مثال اور انسانی خواہشات میں کیا چیز مشترک ہے' مجھے سمجھ نہیں آئی" خواجہ صاحب دھیمے لہجے میں بولے "انسان اس کائنات کا بچہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے دل میں اس کیلئے ستر ماؤں جتنی محبت ہے چنانچہ وہ جانتا ہے انسان کو کس وقت کیا چاہیے' اللہ تعالیٰ کی ذات وقت پر حاوی ہے' اس کی نظروں میں ماضی' حال اور مستقبل کوئی حیثیت نہیں رکھتا جبکہ انسانی زندگی ماضی' حال اور مستقبل میں تقسیم ہے' انسان اپنے ماضی کو تبدیل نہیں کر سکتا' وہ حال کے سلسلے میں ہمیشہ گومگو کا شکار رہتا ہے جبکہ اس کا مستقبل ہمیشہ اندیشوں' خدشوں اور خواہشات کی دھند میں لپٹا رہتا ہے چنانچہ انسان ہمیشہ وقت سے لڑتا رہتا ہے' وہ ذرا سا رک کر دوبارہ بولے "اللہ تعالیٰ ہمیں ہماری پیدائش سے پہلے سے جانتا ہے' وہ ہمارے حال سے بھی پوری طرح واقف ہے اور اسے مستقبل کی چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی معلوم ہیں' وہ ہم سے بہتر جانتا ہے ہمارے لئے کس وقت کون سی

چیز اہم ہے‘ وہ جانتا ہے یہ بے وقوف جس وقت دودھ مانگ رہا ہے اگر اس وقت اسے دودھ دے دیا گیا تو اسے ہیضہ ہو جائے گا اور یہ اگلے پندرہ دن بستر سے نہیں اٹھ سکے گا چنانچہ وہ ہمارے گڑگڑانے‘ ہماری منتوں اور ہماری فریادوں کے باوجود ہمیں دودھ نہیں دیتا اور ہم کیونکہ تھڑدلے اور محدود سوچ کے حامل لوگ ہیں لہٰذا ہم اسے اپنی بدنصیبی یا نعوذباللہ اللہ تعالیٰ کی سنگدلی سمجھنے لگتے ہیں“

وہ رکے اور دوبارہ بولے ”اگر کوئی یونیورسٹی کسی طالب علم کو نکال دے تو یہ طالب علم کی بہت بڑی ناکامی سمجھی جاتی ہے لیکن ہارورڈ یونیورسٹی نے مسٹر گیٹس کا نام خارج کر دیا تو اس نے باہر جا کر مائیکرو سافٹ کی بنیاد رکھی اور بل گیٹس کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہو گیا‘ ذرا سوچو بل گیٹس کی وقتی ناکامی اس کی زندگی کی کتنی بڑی کامیابی ثابت ہوئی تھی‘ اگر وہ یونیورسٹی میں رہتا تو کیا ہوتا؟ وہ آج زیادہ سے زیادہ کسی کمپنی میں ملازمت کر رہا ہوتا یا پھر یونیورسٹی میں پروفیسر ہوتا لیکن قدرت نے اسے ناکام طالب علم بنا کر اس پر کامیابی کا سب سے بڑا راستہ کھول دیا‘ میرا خیال ہے جب بل گیٹس کو یونیورسٹی سے نکالا گیا ہو گا تو اس نے بھی اللہ تعالیٰ سے بڑا شکوہ کیا ہو گا‘ اس نے بھی اپنی بحالی کیلئے بڑی دعائیں اور بڑی منتیں کی ہوں گی لیکن اللہ تعالیٰ اس کے مستقبل سے واقف تھا چنانچہ اس نے مسکرا کر اس کی ساری دعائیں رد کر دی ہوں گی“ وہ رکے اور مسکرا کر بولے ”ہماری دعاؤں کے رد‘ ہماری خواہشوں کی عدم قبولیت اور ہماری آرزوؤں کی عدم تکمیل میں اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں اور جب تک ہماری ناکام آرزوؤں کے کھنڈروں سے کامیابی کی کونپلیں نہیں پھوٹتیں ہم اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی مصلحت نہیں سمجھ پاتے‘ میری نظر میں دنیا کی سب سے بڑی حکمت عملی ”ویٹ اینڈ سی“ ہے‘ آپ دعا کرو اور چپ چاپ بیٹھ جاؤ‘ اس کے نتائج اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو“ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا اور عرض کیا ”خواجہ صاحب اگر آپ کی بات مان لی جائے تو پھر دنیا میں دعاؤں کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے“ خواجہ صاحب نے انکار میں سر ہلایا اور مسکرا کر جواب دیا ”دعا تو عبادت ہوتی ہے‘ اللہ رب کائنات ہے‘ اسے اچھا لگتا ہے اس کے بندے اس کے سامنے سر جھکائیں اور اس سے مانگیں اور جب تک ہماری طلب‘ ہماری درخواست اور ہماری دعاؤں میں شکوے کی ملاوٹ نہیں ہوتی اس وقت تک اللہ تعالیٰ ہماری دعا کو عبادت سمجھتا رہتا ہے لیکن جس دن ہم اس میں شکوے کی کڑواہٹ ڈال دیتے ہیں اس دن ہماری نماز‘ نماز اور ہماری دعا‘ دعا نہیں رہتی‘ میرے بچے اللہ کا شکر ادا کیا کرو اور اس سے شکوے کے بغیر مانگا کرو‘ اللہ تعالیٰ تم سے ہمیشہ خوش رہے گا“

⊘ ⊘ ⊘

علم اور دولت

”میری دال روٹی چل رہی ہے‘ مزید کام کرنے کی کیا ضرورت ہے“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکنا شروع کر دیا‘ میں نے ایک لمبا سانس لیا اور اس سے پوچھا ”کام کا دال روٹی کے ساتھ کیا تعلق ہے؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا‘ ذرا سا سوچا اور ذرا سے گرم لہجے میں بولا ”کیوں نہیں ہے کیا؟ انسان کی تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں تو اسے حرص‘ ہوس اور لالچ کا دامن نہیں چھوڑ دینا چاہیے؟ اسے قناعت سے کام نہیں لینا چاہیے؟ اور اسے اللہ کا شکر نہیں ادا کرنا چاہیے؟ لیکن دنیا کے زیادہ لوگ ننانوے کے چکر میں رہتے ہیں‘ یہ شروع میں لاکھ روپے کیلئے کام کرتے ہیں‘ پھر کروڑ کو اپنا ٹارگٹ بنا لیتے ہیں‘ پھر ارب کی دوڑ میں لگ جاتے ہیں اور آخر میں کھرب پتیوں کی ریس میں شامل ہو جاتے ہیں‘ یہ ہوس کی دنیا کے لوگ ہیں جن کا پیٹ صرف قبر کی مٹی بھر سکتی ہے“ وہ رکا‘ اس نے لمبا سانس لیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے اس سے پوچھا ”اس کا مطلب ہے انسان دنیا میں صرف دال روٹی کا بندوبست کرنے آیا ہے‘ اس کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے‘ اس کا چولہا تین وقت جلنا چاہیے‘ اس کے پاس تن کے چار کپڑے ہونے چاہئیں‘ اس کا تین چار مرلے کا گھر ہونا چاہیے اور اگر اس دوران اسے ایک آدھ سکوٹر بھی مل جائے تو غنیمت ہے اور بس! اس کے بعد اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا‘ وہ اب باقی زندگی کھیاں مارے اور موت کے فرشتے کا انتظار کرے“ اس نے کروٹ بدل کر فوراً جواب دیا ”نہیں وہ اللہ کا شکر ادا کرے‘ اللہ کی عبادت کرے“ میں نے عرض کیا ”اس کا مطلب ہوا ہم سب دنیا میں صرف دو کاموں کیلئے بھجوائے گئے ہیں‘ ہم دال روٹی کا بندوبست کریں اور باقی زندگی عبادت کریں“ اس نے ہاں میں سر ہلا دیا‘ میں نے عرض کیا ”لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کاموں کیلئے دوسری مخلوقات بنا دی ہیں‘ جانوروں اور پودوں کی زندگی کا مقصد دال روٹی کا حصول ہوتا ہے جبکہ فرشتے اللہ کی عبادت کیلئے بنائے گئے ہیں‘ اللہ تعالیٰ نے جب فرشتے اور جانور بنا دیئے تھے اور یہ دونوں قدرت کے مقاصد پورے کر رہے تھے تو پھر انسان کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی“ وہ بے بس ہو گیا اور بے بسی کے عالم میں میری

طرف دیکھنے لگا' میں تھوڑی دیر اس کی اس کیفیت سے لطف لیتا رہا اور پھر میں نے اس سے عرض کیا'' ہمارے دو مسئلے ہیں' ایک ہم لوگ دولت اور کام کے بارے میں غلط تصورات کے شکار ہیں' دولت اور کام برا نہیں ہوتا دولت کا غلط استعمال اور منفی کام برے ہوتے ہیں اور ہم لوگ مقدس ہستیوں کی سنت ادا کرنے کی کوشش میں انسانی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں' دنیا میں ایسی بے شمار نعمتیں اور لاتعداد کام ہیں جو ہم عام انسانوں کیلئے جائز ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ کام انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کیلئے ناجائز قرار دے دیئے تھے مثلاً انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو دولت جمع کرنے کی اجازت نہیں' ان کیلئے دولت کے حصول کیلئے تگ ودو' اپنے پاس اپنی ضرورت سے زائد اشیاء رکھنا' دوسرے سے بدلہ لینا اور دوسرے کو جسمانی' ذہنی اور روحانی نقصان پہنچانا بھی جائز نہیں لیکن عام لوگوں کیلئے یہ تمام چیزیں جائز ہیں' اللہ کے کسی نبی نے اپنے لئے قصاص یا دیت نہیں لی تھی لیکن یہ دونوں چیزیں عام شخص کیلئے جائز بھی ہیں اور اس کا حق بھی' اللہ کے کسی نبی نے دنیا میں کوئی زمین یا جائیداد نہیں چھوڑی جبکہ زمین جائیداد عام شخص کا حق بھی ہے اور فرض بھی' اللہ کے کسی نبی' کسی ولی کا کوئی خزانہ تھا اور نہ ہی بینک اکاؤنٹ جبکہ یہ عام شخص کا حق بھی ہے اور اس کیلئے جائز بھی اور اللہ کے کسی نبی نے نبوت اور ولی نے ولایت کے بعد دعوت اور تبلیغ کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا جبکہ کام' محنت' مزدوری اور تجارت عام آدمی کا حق بھی ہے اور فرض بھی' نبی اور ولی پر تبلیغ اور دعوت فرض ہوتی ہے جبکہ یہ عام آدمی کیلئے ''نفل'' کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ ہم لوگ بعض اوقات نادانستگی میں ان چیزوں پر عملدرآمد شروع کر دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے صرف نبیوں اور اولیاء پر لاگو کی ہیں' اللہ نے دولت سے صرف نبیوں اور اولیاء کو اجتناب کی ہدایت کی' آپ جیسے عام لوگوں کو نہیں لہٰذا وہ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے زیادہ پوٹینشل اور استطاعت دے رکھی ہے اس کا چند لاکھ روپے کیلئے کام کرنا' دال روٹی' چند مرلوں کا مکان اور چھوٹی سی سواری پر قناعت کر لینا خود غرضی ہو گی اور اپنی ضرورت پوری ہونے کے بعد کام کرنا صدقہ' کوئی سیٹھ اگر اپنی دکان اور فیکٹری نہ لگائے یا لاکھ پتی لوگ کروڑ' ارب اور کھرب کی دوڑ میں شامل نہ ہوں تو لاکھوں کروڑوں لوگ بھوکے مر جائیں' شیر کو دن میں صرف پانچ کلو گوشت درکار ہوتا ہے لیکن وہ پانچ کلو گوشت کیلئے پانچ من کا بھینسا شکار کرتا ہے' اگر شیر قناعت پر آ جائے' وہ روزانہ بھیڑ یا بکریوں کے بچوں کا شکار شروع کر دے تو جنگل کے وہ آدھے جانور بھوکے مر جائیں جن کی خوراک کا انحصار شیر کے شکار پر ہے'' میں خاموش ہو گیا۔

وہ تھوڑی دیر تک میری طرف دیکھتا رہا اور اس کے بعد بولا ''اللہ تعالیٰ نے پھر قارون کو برا کیوں کہا تھا'' میں نے مسکرا کر جواب دیا ''اس لئے کہ قارون نے انویسٹمنٹ کی بجائے ڈیپازٹ کو

ایسی بنا لیا تھا' اس نے دولت جمع کی تھی اور اللہ تعالیٰ دولت جمع کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا' وہ سرمایہ کاری' سرمائے کو آگے پھیلانے' دولت کو تقسیم کرنے' ایک دکان کے بعد دوسری دکان' ایک فیکٹری کے بعد دوسری فیکٹری اور ایک کمپنی کے بعد دوسری کمپنی بنانے والوں کو پسند کرتا ہے اور اس نے اس میں برکت بھی رکھی ہے' تم یقین کرو کام کا معاوضے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا' دنیا کے جو لوگ معاوضے کیلئے کام کرتے ہیں وہ خود غرض اور لالچی ہوتے ہیں اور اللہ انہیں پسند نہیں کرتا' اللہ ان لوگوں کو برکت سے نوازتا ہے جو ضرورت نہ ہونے کے باوجود کام کرتے ہیں' تم اس تھیوری کو ایک دوسرے زاویے سے بھی دیکھو' نبی اکرمؐ نے مکہ کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کیا جواب دیا' انہوں نے کہا تھا اللہ تعالیٰ نے تمہیں نبی کیوں بنایا؟ کیا اللہ کو قریش کے وہ سردار نظر نہیں آئے جن کے پاس روپے پیسے ہیں' طاقت بھی' وجاہت بھی' نام وری بھی اور بزرگی بھی' یہ لوگ حیران تھے کہ اللہ تعالیٰ نے (نعوذ باللہ) ایک غریب' یتیم اور بے آسرا شخص کو نبی کیوں بنا دیا؟ اسی طرح جب نبی اکرمؐ دعوت دینے کیلئے طائف تشریف لے گئے تو طائف کے سردار عبد یالیل نے آپؐ پر اعتراض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں (آپؐ) نبی بناتے ہوئے تم (آپؐ) میں کیا دیکھا تھا' تمہارے (آپؐ) پاس تو سواری کیلئے گدھا تک نہیں ہے' آپ ملاحظہ کیجئے طائف اور مکہ کے لوگ ایک غریب شخص کو نبی تک تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھے انہیں اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے پیغام پر اتنا اعتراض نہیں جتنا انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غربت' یتیمی اور مفلسی پر اعتراض تھا' آپ اب اس کے بعد اسلام کی جدوجہد کا مطالعہ بھی کیجئے اور یہ دیکھئے اسلام چھ براعظموں تک کب پھیلا تھا' یہ اس وقت پھیلا تھا جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمان طاقت' وجاہت' دولت اور اثر و رسوخ میں دوسری قوموں سے آگے نکل گئے تھے اور ان کے پاس دنیا کی ''بیسٹ پراڈکٹس'' تھیں' وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

میں نے عرض کیا ''تمہیں معلوم ہے امیر تیمور کو امیر تیمور کس نے بنایا تھا'' اس نے انکار میں سر ہلا دیا' میں نے عرض کیا ''امیر تیمور ایک عام اور غریب شخص تھا لیکن پھر اس نے سعدی شیرازی کا ایک فقرہ پڑھا' سعدی شیرازی نے لکھا انسان کو دنیا میں بے تحاشا علم حاصل کرنا چاہیے اور بے انتہا دولت کمانی چاہیے' سعدی شیرازی کا کہنا تھا' انسان کو دولت اس لئے جمع کرنی چاہیے کہ دنیا پرست لوگ آپ کو کمتر سمجھ کر مسترد نہ کر سکیں اور علم اس لئے حاصل کرنا چاہیے کہ آپ خود کو عالموں میں کمتر محسوس نہ کریں' امیر تیمور نے یہ فقرہ پڑھا اور علم اور دولت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا' اس نے زندگی میں 54 ملک فتح کئے اور تیمور دی گریٹ کہلایا' اس نے جو ملک' جو شہر فتح کیا اس نے اس کی ساری آبادی کو قتل کر دیا اور شہر کو جلا

کررا کھ کر دیا لیکن جب وہ شیراز پہنچا تو اس نے سعدی شیرازی کے ایک فقرے کے صدقے پورے شہر کو امان دے دی" میں رکا اور اس سے عرض کیا "تم پوری دنیا پر نظر ڈالو تمہیں ہر وہ خاندان' وہ معاشرہ اور وہ ملک ترقی کرتا نظر آئے گا جس میں علم اور دولت ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ہر وہ ملک جس نے دولت یا علم کسی ایک چیز کو بنیاد بنا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی وہ ترقی کی دوڑ میں مار کھا گیا چنانچہ دولت اور کام کو کبھی برا نہ سمجھو' یہ قوموں اور انسانوں کو عزت دیتی ہے' تم صرف اس کے استعمال کو جائز اور درست رکھو"۔

⦸ ⦸ ⦸

اصل سکندر اعظم

سکندر اعظم کون تھا مقدونیہ کا الیگزینڈر یا تاریخ اسلام کے حضرت عمر فاروقؓ' یہ وہ سوال ہے جس کا جواب دینا دنیا بھر کے مؤرخین پر فرض ہے' آج "ایس ایم ایس" کا دور ہے' موبائل کا میسجنگ سسٹم چند سیکنڈ میں خیالات کو دنیا کے دوسرے کونے میں پہنچا دیتا ہے' جدید دور کی اس سہولت سے اب قارئین اور ناظرین بھی بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں' گزشتہ روز کسی صاحب نے پیغام بھجوایا "کاش آپ نے آج حضرت عمر فاروقؓ پر کالم لکھا ہوتا" یہ پیغام پڑھتے ہی یاد آیا آج تو حضرت عمر فاروقؓ کا یوم شہادت تھا اور میں اس وقت سے سوچ رہا ہوں مقدونیہ کا الیگزینڈر سکندر اعظم تھا یا حضرت عمر فاروقؓ۔

ہم نے بچپن میں پڑھا تھا مقدونیہ کا الیگزینڈر بیس سال کی عمر میں بادشاہ بنا' 23 سال کی عمر میں مقدونیہ سے نکلا' اس نے سب سے پہلے پورا یونان فتح کیا' اس کے بعد وہ ترکی میں داخل ہوا' پھر ایران کے دارا کو شکست دی' پھر وہ شام پہنچا' پھر اس نے یروشلم اور بابل کا رخ کیا' پھر وہ مصر پہنچا' پھر وہ ہندوستان آیا' ہندوستان میں اس نے پورس سے جنگ لڑی' اپنے عزیز از جان گھوڑے کی یاد میں پھالیہ شہر آباد کیا' مکران سے ہوتا ہوا واپسی کا سفر شروع کیا' راستے میں ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہوا اور 323 قبل مسیح میں 33 سال کی عمر میں بخت نصر کے محل میں انتقال کر گیا' دنیا کو آج تک بتایا گیا وہ انسانی تاریخ کا عظیم جرنیل' فاتح اور بادشاہ تھا اور تاریخ نے اس کے کارناموں کی وجہ سے اسے الیگزینڈر دی گریٹ کا نام دیا اور ہم نے اسے سکندر اعظم یعنی بادشاہوں کا بادشاہ بنا دیا لیکن آج اکیسویں صدی کے نویں سال کے پہلے دن میں پوری دنیا کے مؤرخین کے سامنے یہ سوال رکھتا ہوں کیا حضرت عمر فاروقؓ کے ہوتے ہوئے الیگزینڈر کو سکندر اعظم کہلانے کا حق حاصل ہے؟ میں دنیا بھر کے مؤرخین کو سکندر اعظم اور حضرت عمر فاروقؓ کی فتوحات اور کارناموں کے موازنے کی دعوت دیتا ہوں' آپ بھی سوچئے الیگزینڈر بادشاہ کا بیٹا تھا' اسے دنیا کے بہترین لوگوں نے گھڑ سواری سکھائی' اسے ارسطو جیسے استادوں کی صحبت ملی تھی اور جب وہ بیس سال کا ہو گیا تو اسے تخت اور تاج پیش کر دیا گیا جبکہ اس کے مقابلے میں حضرت عمر فاروقؓ کی سات پشتوں میں کوئی بادشاہ نہیں گزرا تھا' آپؓ بھیڑ بکریاں اور اونٹ چراتے چراتے بڑے ہوئے

تھے اور آپؓ نے تلوار بازی اور تیر اندازی بھی کسی اکیڈمی سے نہیں سیکھی تھی' سکندر اعظم نے آرگنائزڈ آرمی کے ساتھ دس برسوں میں 17 لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کیا تھا جبکہ حضرت عمر فاروقؓ نے دس برسوں میں آرگنائزڈ آرمی کے بغیر 22 لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کیا اور اس میں روم اور ایران کی دو سپر پاورز بھی شامل تھیں' آج کے سیٹلائیٹ' میزائل اور آبدوزوں کے دور میں بھی دنیا کے کسی حکمران کے پاس اتنی بڑی سلطنت نہیں جو حضرت عمر فاروقؓ نے نہ صرف گھوڑوں کی پیٹھ پر فتح کرائی تھی بلکہ اس کا انتظام و انصرام بھی چلایا تھا' الیگزینڈر نے فتوحات کے دوران اپنے بے شمار جرنیل قتل کرائے' بے شمار جرنیلوں اور جوانوں نے اس کا ساتھ چھوڑا' اس کے خلاف بغاوتیں بھی ہوئیں اور ہندوستان میں اس کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار بھی کر دیا لیکن حضرت عمر فاروقؓ کے کسی ساتھی کو ان کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہ ہوئی' وہ ایسے کمانڈر تھے کہ آپ نے عین میدان جنگ میں عالم اسلام کے سب سے بڑے سپہ سالار حضرت خالد بن ولیدؓ کو معزول کر دیا اور کسی کو یہ حکم ٹالنے کی جرأت نہ ہوئی' آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو کوفے کی گورنری سے ہٹا دیا' آپ نے حضرت حارث بن کعبؓ سے گورنری واپس لے لی' آپ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کا مال ضبط کر لیا اور آپ نے حمص کے گورنر کو واپس بلا کر اونٹ چرانے پر لگا دیا لیکن کسی کو حکم عدولی کی جرأت نہ ہوئی۔

الیگزینڈر نے 17 لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کیا لیکن دنیا کو کوئی نظام' کوئی سسٹم نہ دے سکا جبکہ حضرت عمر فاروقؓ نے دنیا کو ایسے سسٹم دیئے جو آج تک پوری دنیا میں رائج ہیں' آپؓ نے نماز فجر میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کرایا' آپؓ کے عہد میں نماز تراویح کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا' آپؓ نے شراب نوشی کی سزا مقرر کی' سن ہجری کا اجراء کیا' جیل کا تصور دیا' مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں' مسجدوں میں روشنی کا بندوبست کرایا' پولیس کا محکمہ بنایا' ایک مکمل عدالتی نظام کی بنیاد رکھی' آب پاشی کا نظام قائم کرایا' فوجی چھاؤنیاں بنوائیں اور فوج کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا' آپؓ نے دنیا میں پہلی بار دودھ پیتے بچوں' معذوروں' بیواؤں اور بے آسراؤں کے وظائف مقرر کئے' آپؓ نے دنیا میں پہلی بار حکمرانوں' سرکاری عہدیداروں اور والیوں کے اثاثے ڈکلیئر کرنے کا تصور دیا' آپؓ نے بے انصافی کرنے والے ججوں کو سزا دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا اور آپؓ نے دنیا میں پہلی بار حکمران کلاس کی اکاؤنٹیبلٹی شروع کی' آپؓ راتوں کو تجارتی قافلوں کی چوکیداری کرتے تھے' آپؓ فرمایا کرتے تھے جو حکمران عدل کرتے ہیں وہ راتوں کو بے خوف سوتے ہیں' آپؓ کا فرمان تھا ''قوم کا سردار قوم کا سچا خادم ہوتا ہے'' آپؓ کی مہر پر لکھا تھا ''عمر! نصیحت کیلئے موت ہی کافی ہے'' آپؓ کے دستر خوان پر کبھی دو سالن نہیں رکھے گئے' آپؓ زمین

پر سر کے نیچے اینٹ رکھ کر سو جاتے تھے' آپؓ سفر کے دوران جہاں نیند آ جاتی تھی آپؓ کسی درخت پر چادر تان کر سایہ کرتے تھے اور سو جاتے تھے اور رات کو ننگی زمین پر دراز ہو جاتے تھے' آپؓ کے کرتے پر چودہ پیوند تھے اور ان پیوندوں میں ایک سرخ چمڑے کا پیوند بھی تھا' آپؓ موٹا کھردرا کپڑا پہنتے تھے' آپؓ کو نرم اور باریک کپڑے سے نفرت تھی' آپؓ کسی کو جب سرکاری عہدے پر فائز کرتے تھے تو اس کے اثاثوں کا تخمینہ لگوا کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور اگر سرکاری عہدے کے دوران اس کے اثاثوں میں اضافہ ہو جاتا تو آپؓ اس کی اکاؤنٹیبلٹی کرتے تھے' آپؓ جب کسی کو گورنر بناتے تو اسے نصیحت فرماتے تھے' کبھی ترکی گھوڑے پر نہ بیٹھنا' باریک کپڑے نہ پہننا' چھنا ہوا آٹا نہ کھانا' دربان نہ رکھنا اور کسی فریادی پر دروازہ بند نہ کرنا' آپؓ فرماتے تھے ظالم کو معاف کر دینا مظلوموں پر ظلم ہے اور آپؓ کا یہ فقرہ آج انسانی حقوق کے چارٹر کی حیثیت رکھتا ہے ''مائیں بچوں کو آزاد پیدا کرتی ہیں تم نے انہیں کب سے غلام بنا لیا؟'' فرمایا میں اکثر سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں ''عمرؓ بدل کیسے گیا'' آپؓ اسلامی دنیا کے پہلے خلیفہ تھے جنہیں ''امیر المومنین'' کا خطاب دیا گیا' دنیا کے تمام مذاہب کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہے اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت عدل ہے اور حضرت عمر فاروقؓ وہ شخصیت ہیں جو اس خصوصیت پر پورا اترتے ہیں' آپؓ کے عدل کی وجہ سے عدل دنیا میں عدل فاروقیؓ ہو گیا' آپ شہادت کے وقت مقروض تھے چنانچہ آپؓ کی وصیت کے مطابق آپ کا واحد مکان بیچ کر آپ کا قرض ادا کر دیا گیا اور آپؓ دنیا کے واحد حکمران تھے جو فرمایا کرتے تھے میرے دور میں اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی سزا عمر (حضرت عمر فاروقؓ) کو بھگتنا ہوگی' آپؓ کے عدل کی یہ حالت تھی آپؓ کا انتقال ہوا تو آپ کی سلطنت کے دور دراز علاقے کا ایک چرواہا بھاگتا ہوا آیا اور چیخ کر بولا ''لوگو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا'' لوگوں نے حیرت سے پوچھا ''تم مدینہ سے ہزاروں میل دور جنگل میں ہو تمہیں اس سانحے کی اطلاع کس نے دی'' چرواہا بولا ''جب تک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ زندہ تھے میری بھیڑیں جنگل میں بے خوف پھرتی تھیں اور کوئی درندہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا لیکن آج پہلی بار ایک بھیڑیا میری بھیڑ کا بچہ اٹھا کر لے گیا' میں نے بھیڑیئے کی جرأت سے جان لیا آج دنیا میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ موجود نہیں ہیں''۔

میں دنیا بھر کے مؤرخین کو دعوت دیتا ہوں وہ الیگزینڈر کو حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے رکھ کر دیکھیں انہیں الیگزینڈر حضرت عمر فاروقؓ کے حضور پہاڑ کے سامنے کنکر دکھائی دے گا کیونکہ الیگزینڈر کی بنائی سلطنت اس کی وفات کے پانچ سال بعد ختم ہو گئی جبکہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور میں جس جس

خطے میں اسلام کا جھنڈا بھجوایا وہاں سے آج بھی اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائیں آتی ہیں' وہاں آج بھی لوگ حضرت عمر فاروقؓ کے اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں' دنیا میں الیگزینڈر کا نام صرف کتابوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے جبکہ حضرت عمر فاروقؓ کے بنائے نظام دنیا کے 245 ممالک میں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں' آج بھی جب کسی ڈاک خانے سے کوئی خط نکلتا ہے' پولیس کا کوئی سپاہی وردی پہنتا ہے' کوئی فوجی جوان چھ ماہ بعد چھٹی پر جاتا ہے یا پھر حکومت کسی بچے' معذور' بیوہ بے آسرا شخص کو وظیفہ دیتی ہے تو وہ معاشرہ' وہ سوسائٹی بے اختیار حضرت عمر فاروقؓ کو گریٹ تسلیم کرتی ہے' وہ انہیں تاریخ کا سب سے بڑا سکندر مان لیتی ہے ماسوائے ان مسلمانوں کے جو آج احساس کمتری کے شدید احساس میں کلمہ تک پڑھنے سے پہلے دائیں بائیں دیکھتے ہیں' لاہور کے مسلمانوں نے ایک بار انگریز سرکار کو دھمکی دی تھی'' اگر ہم گھروں سے نکل پڑے تو تمہیں چنگیز خان یاد آ جائے گا'' اس پر جواہر لال نہرو نے مسکرا کر کہا تھا'' افسوس آج چنگیز خان کی دھمکی دینے والے مسلمان یہ بھول گئے ان کی تاریخ میں ایک (حضرت) عمر فاروقؓ بھی تھا'' ہم آج بھی یہ بھولے ہوئے ہیں کہ ہم میں ایک (حضرت) عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی تھے جن کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا تھا ''میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ حضرت عمرؓ بن خطاب ہوتے''۔

⊘ ⊘ ⊘

کاش

یہ 27 جون کی شام تھی اور 2008ء کا سن' اس نے کاغذ پر دستخط کیے' فائل بند کی اور کاغذوں کا پلندہ اپنی سیکرٹری کے ہاتھ میں دے دیا' اس کے سٹاف کے پچاس افراد نے تالیاں بجائیں اور اس کی زندگی کا ایک باب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا' اس کی دائیں آنکھ کے کونے سے پانی کا ایک قطرہ ابھرا' قطرہ ایک لمحہ کیلئے رکا' لکیر بنا اور ٹھوڑی پر آ کر ختم ہو گیا' اس نے فوراً آنکھوں پر ٹشو رکھ لیا' سامنے مائیکرو سافٹ کا چیف ایگزیکٹو سٹیو بالمر بیٹھا تھا' اس نے بل گیٹس کو روتے ہوئے دیکھا تو اس کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی اور یوں پورا دفتر آہوں اور سسکیوں میں ڈوب گیا' وہ زندگی میں صرف تین بار رویا تھا' پہلی بار اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے جب وہ ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک نالائق طالب علم تھا' ایک بار اس کا استاد اس کے ساتھ ناراض ہوا اور اس نے اسے ڈانٹ کر کہا ''بل تم میری بات کان کھول کر سن لو تم زندگی میں زیادہ سے زیادہ ٹرک ڈرائیور بن سکتے ہو'' پوری کلاس نے قہقہہ لگایا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' اس دن اس نے ہارورڈ یونیورسٹی چھوڑ دی' شام وہ اپنے جگری دوست پال ایلن سے ملا اور اس نے اس کو دعوت دی ''آؤ پال ہم اس دنیا کی بنیاد رکھیں جو آج تک صرف ہمارے ذہن میں تھی'' پال ایلن نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ 28 اکتوبر 1955ء کو واشنگٹن ریاست کے شہر سیاٹل میں پیدا ہوا' اس کے والد وکیل تھے' سارا گھرانہ پڑھا لکھا اور معزز تھا لیکن بل پڑھائی میں کمزور تھا' اس میں یکسوئی نہیں تھی' اس کی سوچیں منتشر ہو جاتی تھیں لہٰذا اس کے والدین اس کی وجہ سے پریشان رہتے تھے' اس کے والد کی خواہش تھی وہ ہارورڈ یونیورسٹی سے ڈگری لے لیکن یونیورسٹی نے اس کا نام خارج کر دیا' اس کے والد کو شدید صدمہ پہنچا لیکن بل مطمئن تھا' اس کا خیال تھا ہارورڈ یونیورسٹی کسی نہ کسی دن اپنے اس نالائق طالب علم پر فخر کرے گی آنے والے دنوں میں اس کی بات سچ ثابت ہوئی اور ہارورڈ یونیورسٹی نے نہ صرف اپنے گیٹ پر اس کے نام کی تختی لگا دی تھی بلکہ خود کو بل گیٹس کی یونیورسٹی کہلانے لگی لیکن یہ بہت بعد کی بات تھی' ہم ابھی 1975ء میں ہیں' 1975ء میں اس نے اپنے دوست پال ایلن کے ساتھ مل کر دنیا کی پہلی سافٹ ویئر

کمپنی بنائی‘ اس کمپنی کا نام انہوں نے ”مائیکروسافٹ“ رکھا‘ لوگ اس کے آئیڈیاز اور کمپنی کے نام دونوں پر ہنستے تھے لیکن اس نے ہمت نہ ہاری‘ وہ کام کرتا چلا گیا یہاں تک کہ 1979ء تک کمپنی نے پر پرزے نکال لئے اور وہ ٹھیک ٹھاک امیر ہوگیا لیکن ابھی وہ اس کامیابی سے دور تھا جو بچپن سے اس کے ذہن پر دستک دیتی آ رہی تھی‘ 1980ء میں سٹیو بالمر نے کمپنی جوائن کی اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے مائیکروسافٹ واشنگٹن ریاست کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی اور اس پر دولت بارش کی طرح برسنے لگی یہاں تک کہ 1994ء میں وہ صرف 39 برس میں دنیا کا امیر ترین شخص بن گیا‘ وہ اتنا مشہور ہوگیا کہ امریکی صدر یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوگیا ”وی آر دی نیشن آف بل گیٹس“ یہ ہارورڈ یونیورسٹی کے اس نالائق طالب علم کا پہلا اعزاز تھا اور یہ اعزاز پا کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے‘ یہ دوسری بار تھی جب وہ دروازہ بند کر کے رو پڑا تھا۔

جی ہاں اس شخص کا نام بل گیٹس ہے اور یہ پچھلے 14 برس سے دنیا کا امیر ترین شخص چلا آ رہا ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا واحد شخص ہے جو 39 برس کی عمر میں دنیا کا امیر ترین شخص بنا اور اس نے مسلسل 14 سال تک یہ اعزاز برقرار رکھا‘ مائیکروسافٹ دنیا کی پانچ بڑی کمپنیوں میں شمار ہوتی ہے‘ اس میں اس وقت 63 ہزار 5 سو 64 لوگ ملازم ہیں‘ اس کا کاروبار 102 ممالک تک پھیلا ہے جبکہ یہ کمپنی اب تک دنیا کے ایک لاکھ 28 ہزار لوگوں کو ارب پتی بنا چکی ہے‘ مائیکروسافٹ کے ملازمین اوسطاً 89 ہزار 6 سو ڈالر سالانہ تنخواہ لیتے ہیں‘ مائیکروسافٹ کے پانچ ڈائریکٹر ہیں اور بل گیٹس کے پاس سب سے زیادہ شیئرز ہیں‘ وہ 97 کروڑ 74 لاکھ 99 ہزار 3 سو 36 شیئرز کا مالک ہے اور پچھلے 15 برسوں میں میڈیا نے بل گیٹس کو پوری دنیا میں سب سے زیادہ کوریج دی‘ وہ دنیا کی بااثر ترین شخصیات میں شمار ہوتا ہے‘ لوگ اس کے ساتھ ہاتھ ملانا اور اس کے ساتھ تصویر کھنچوانا اعزاز سمجھتے ہیں جبکہ اسے دنیا کے 35 ممالک میں سربراہ مملکت کا پروٹوکول دیا جاتا ہے‘ بل گیٹس نے 15 جون 2006ء کو اعلان کیا تھا وہ جولائی 2008ء کو مائیکروسافٹ چھوڑ دے گا اور باقی زندگی فلاح عامہ کے کاموں کے لئے وقف کر دے گا۔ اس کا کہنا تھا وہ یکم جولائی 2008ء سے اپنا سارا وقت فلاح عامہ کیلئے صرف کرے گا‘ اس اعلان کے بعد وہ پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد شخص بن گیا تھا‘ اس سے پہلے دنیا میں عورتوں کیلئے تخت اور تاج چھوڑنے والے بے شمار لوگ تھے‘ دنیا میں مہاتما بدھ جیسے لوگ بھی تھے جنہوں نے سکون کیلئے اقتدار تیاگ دیا تھا لیکن یہ تاریخ کا پہلا شخص تھا جس نے عام لوگوں کیلئے دنیا کی سب سے بڑی کمپنی چھوڑنے کا اعلان کیا تھا اور اس نے باقی زندگی بل اینڈ میلینڈا گیٹس فاؤنڈیشن کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

بل گیٹس نے اپنی بیوی میلینڈا کے ساتھ مل کر جنوری 2000ء میں فلاح عامہ کی ایک فاؤنڈیشن بنائی تھی‘ اس کا نام ”بل اینڈ میلینڈا گیٹس فاؤنڈیشن“ تھا‘ اس وقت یہ دنیا کا ویلفیئر کا سب سے بڑا ادارہ ہے‘ فاؤنڈیشن کے اکاؤنٹس میں 29 بلین ڈالر ہیں یہ کتنی بڑی رقم ہے اس کا اندازہ آپ پاکستان کے بجٹ سے لگا لیجئے پاکستان کا ٹوٹل بجٹ 12 بلین ڈالر ہوتا ہے‘ بل گیٹس کی یہ فاؤنڈیشن پوری دنیا میں صحت‘ تعلیم‘ لائبریریوں اور کمپیوٹر کی تربیت کے لئے کام کرتی ہے‘ یہ فاؤنڈیشن ہر سال غریب ممالک کے ذہین طالب علموں کو ایک ارب ڈالر کے وظائف دیتی ہے‘ یہ تنظیم غیر امریکی لائبریریوں کو ایک ملین ڈالر کا ایوارڈ دیتی ہے‘ فاؤنڈیشن ہر سال تیسری دنیا کے سو ذہین طالب علموں کو اپنے خرچ پر کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم دلاتی ہے‘ فاؤنڈیشن ڈیوک یونیورسٹی کی ہر کلاس کے دس ذہین طالب علموں کو وظیفے دیتی ہے‘ بل گیٹس نے پندرہ ملین ڈالر سے کمپیوٹر ہسٹری میوزیم بنایا‘ اس نے چاول کی نئی قسم دریافت کرائی‘ وہ ہر سال دنیا کے کروڑوں بچوں کو پولیو ویکسین فراہم کرتا ہے‘ اس کی فاؤنڈیشن ایڈز کا علاج دریافت کر رہی ہے اور بل گیٹس کی یہ فاؤنڈیشن سات سال سے پوری دنیا میں کام کر رہی ہے‘ بل گیٹس نے اعلان کیا وہ جولائی 2008ء کو مائیکروسافٹ سے فاؤنڈیشن کے دفتر شفٹ ہو جائے گا اور اپنی باقی زندگی لوگوں کی صحت اور تعلیم کے لئے وقف کر دے گا‘ اس کا کہنا تھا وہ انتقال سے قبل اپنے بچوں کو صرف ایک ایک ملین ڈالر دے گا اور اپنی باقی ساری دولت دنیا کے ضرورت مندوں کے حوالے کر دے گا‘ اس کا کہنا تھا یہ دولت ضرورت مندوں کی امانت ہے اور وہ یہ امانت ان لوگوں کو لوٹا کر واپس جائے گا‘ بل گیٹس کے اس اعلان کے بعد دنیا بڑی شدت سے 27 جون 2008ء کا انتظار کرتی رہی‘ دنیا دیکھنا چاہتی تھی کیا بل گیٹس واقعی اپنے وعدے کا پاس کرے گا‘ اس دوران بے شمار تبصرے آئے‘ لوگوں نے کہا 60 ارب ڈالر کی دولت اور 200 بلین ڈالر کی کمپنی چھوڑنا اتنا آسان کام نہیں‘ بل گیٹس 2008ء میں اپنا ارادہ بدل دے گا لیکن پھر 27 جون آ گیا‘ بل گیٹس دفتر آیا‘ اس نے اپنے ملازمین کو جمع کیا اور کمپنی چھوڑنے کا اعلان کر دیا‘ بل گیٹس کے اعلان نے تمام لوگوں کی آنکھیں گیلی کر دیں‘ اس کی اپنی آنکھ سے آنسو نکلا اور ٹھوڑی پر آ کر رک گیا‘ بل گیٹس زندگی میں تیسری بار رو دیا تھا۔

میں نے واشنگٹن پوسٹ میں اس کی آخری تقریر کے اقتباسات پڑھے تو میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے‘ آپ ذرا سوچئے خیرات‘ صدقہ اور فلاح و بہبود اسلام میں عبادت کی حیثیت رکھتی ہے لیکن دنیا کے سب سے بڑے مخیر کا اعزاز کسی مسلمان کو نصیب نہ ہوا‘ دنیا کے امیر ترین لوگوں کی فہرست میں تین مسلمان بھی شامل تھے لیکن لوگوں کی خدمت کرنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے بل گیٹس کو عطا فرمائی

'آپ سوچئے دنیا کا پانچواں امیر ترین شخص ایک عرب مسلمان شہزادہ ولید بن طلال ہے' اس کی دولت جوا خانوں میں خرچ ہو رہی ہے جبکہ بل گیٹس اپنی دولت ایڈز کے علاج پر خرچ کر رہا ہے' وہ مسلمان بچوں کو تعلیم دے رہا ہے' آپ سوچئے کیا یہ بل گیٹس جیسے لوگ نہیں ہیں جنہیں حقیقتاً رول ماڈل سمجھنا چاہیے' ذرا سوچئے پوری اسلامی دنیا رئیس لوگوں سے بھری پڑی ہے' اسلامی دنیا میں ایسے ایسے لوگ ہیں جو ہیروں کی کئی کئی کانوں کے مالک ہیں' جن کی زمینوں سے سونا نکلتا ہے اور جو تیل کے درجنوں کنوؤں کے مالک ہیں لیکن انہیں کسی ضرورت مند کو دس روپے دینے کی توفیق نہیں ہوتی جبکہ بل گیٹس اپنی ساری دولت لے کر ضرورت مندوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ہے' میں نے سوچا 62 اسلامی ممالک کی اس دنیا میں ایک ارب 45 کروڑ مسلمان آباد ہیں لیکن ان ڈیڑھ ارب لوگوں میں ایک بھی بل گیٹس نہیں' ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جو 53 سال کی عمر میں اپنی کمپنی کا دروازہ کھولے اور اپنا سارا مال' اپنی ساری زندگی اللہ کے بندوں کے لئے وقف کر دے' جو لوگوں میں دوا اور کتاب بانٹے' جو لوگوں کے زخم دھوئے' جو لوگوں کو کھانا کھلائے اور جو لوگوں کے آنسو پونچھے' میں ہمیشہ اپنے آپ سے پوچھتا تھا عالم اسلام پر یورپ اور امریکہ کیوں غالب ہیں؟ مجھے آج معلوم ہوا امریکہ اور یورپ بل گیٹس جیسے لوگوں کی وجہ سے ہم پر غالب ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے پاس بڑے انسان ہیں جبکہ عالم اسلام بڑے تاجروں' بڑے بیوپاریوں اور بڑے صنعت کاروں کی غلامی میں زندگی گزار رہا ہے۔ مجھے محسوس ہوا مغرب کے پاس انسان ہیں جبکہ ہم لوگ آدمیوں کی چاکری میں عمر گزار رہے ہیں' کاش پاکستان کے سو ارب پتی تاجر بل گیٹس سے سبق سیکھیں اور آج سے اپنا وقت اور سرمایہ عام اور غریب لوگوں کیلئے وقف کر دیں' کاش اللہ تعالیٰ مسلمان تاجروں کو بھی بل گیٹس جیسا ظرف اور توفیق دے دے' کاش!

⊘ ⊘ ⊘

کاش کبھی ایسا ہو جائے

نکولس سرکوزی فرانس کا "نوجوان" صدر ہے' وہ 28 جنوری 1955ء کو فرانس میں پیدا ہوا' ں کے والد پال سرکوزی کا تعلق ہنگری سے تھا۔ سوویت یونین کی سرخ فوج 1944ء میں ہنگری میں ل ہوئی تو سرکوزی کے والد جرمنی بھاگ گئے اور وہ وہاں سے فرانس آ گئے۔ ان کے والد نے 19ء میں اینڈری مالہ سے شادی کر لی' نکولس سرکوزی ان کا دوسرا بیٹا تھا' پال سرکوزی اور اینڈری مالہ بعد ازاں اختلافات ہوئے اور سرکوزی کے والد ان کی ماں کو چھوڑ کر چلے گئے چنانچہ سرکوزی اور ان دونوں بھائیوں کی پرورش ان کے ننھیال کو کرنا پڑ گئی لیکن سرکوزی' اس کا خاندان اور اس کے بچپن کے ات ہماری اس کہانی میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتے چنانچہ ہم تیزی سے آگے بڑھتے ہیں۔ سرکوزی اچھا ب علم ثابت نہیں ہوا' وہ مختلف سکولوں اور کالجوں سے پاس' فیل ہوتا ہوا یونیورسٹی آف پیرس میں پہنچ یا اور اس نے بزنس لاء کی ڈگری لے لی۔ بعد ازاں اس نے سیاسیات کے انسٹیٹیوٹ میں داخلہ لیکن انگریزی کمزور ہونے کی وجہ سے فیل ہو گیا۔ وہ اس کے بعد قانون کی تعلیم کیلئے نکلا' اس نے بار کا ان پاس کیا اور وکیل بن گیا۔ سرکوزی نے 1982 میں پہلی شادی کی اور 1996ء میں بیوی کو طلاق ے دی۔ اس سال اس نے دوسری شادی کی لیکن مارچ 2005ء میں اس نے دوسری بیوی کو بھی لاق دے دی۔ اب کیونکہ سرکوزی کی خانگی زندگی بھی ہماری کہانی میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی چنانچہ ہم ں سے بھی تیزی سے آگے بڑھتے ہیں۔ سرکوزی نے 22 سال کی عمر میں سیاست شروع کی' وہ پیرس شہر کی ایک مضافاتی بستی کے کونسلر بن گئے' وہ چند برسوں بعد اس بستی کے میئر منتخب ہو گئے' وہ فرانس کے جوان ترین میئر تھے۔ وہ 1988ء میں فرانس کی قومی اسمبلی کے ڈپٹی منتخب ہو گئے اور 1993ء میں ٹ کے وزیر اور کابینہ کے ایگزیکٹو بن گئے' وہ ژاک شیراک کے اسسٹنٹ بھی رہے۔ صدر ژاک یراک نے 2002ء میں سرکوزی کو وزیر داخلہ بنا دیا' وہ 2004ء میں وزیر خزانہ بن گئے اور 2005ء میں انہیں ایک بار پھر وزیر داخلہ بنا دیا گیا' وہ فرانس کی تاریخ کے مقبول ترین وزیر داخلہ تھے جبکہ سرکوزی کو ن کی سیاسی جماعت (یو ایم پی) نے 14 جنوری 2007ء کو اپنا صدارتی امیدوار منتخب کر لیا۔ سرکوزی

نے 16 مئی 2007ء میں الیکشن لڑا اور وہ 16 مئی 2007ء کو فرانس کے صدر منتخب ہو گئے۔ وہ فرانس کے پہلے صدر تھے جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد جنم لیا تھا لیکن سرکوزی کا سیاسی کیریئر اور پروفائل بھی ہمارے لئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا چنانچہ ہم اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں۔

فرانسیسی صدر نکولس سرکوزی 2007ء کے آخر میں اچانک سابق سپر ماڈل اور گلوکارہ کارلا برونی کے ساتھ دیکھے جانے لگے۔ کارلا برونی اٹلی کے بزنس مین خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور وہ یورپ کی سپر ماڈل اور گلوکارہ تھی۔ وہ 1967ء میں اٹلی میں پیدا ہوئی تھی اور اس وقت وہ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہے۔ کارلا برونی ایک خوشحال خاتون ہے' اس کی ذاتی آمدنی ساڑھے سات لاکھ یورو سالانہ ہے اور وہ عام زندگی میں ایک گرم جوش اور متحرک خاتون ہے۔ کارلا برونی صدر سرکوزی سے پہلے میک جاجز' اریک کیلپٹن' کیون کوسٹر' ونسیٹ پریز' ڈونلڈ ٹرمپ اور فرانس کے سابق وزیراعظم لورینٹ فیبس کو بھی بھگتا چکی ہے' یہ تمام لوگ اس کے بوائے فرینڈ رہے تھے اور کارلا برونی ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ 2007ء میں نکولس سرکوزی اور کارلا برونی کی ملاقات ہوئی' دونوں قریب آئے' میڈیا کی نظروں میں آئے اور پوری دنیا کے اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز نے اس نئے جوڑے کو کوریج دینا شروع کر دی لیکن صدر سرکوزی اور کارلا برونی نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی' اسی دوران کارلا برونی نے فرانسیسی صدر سرکوزی کے ساتھ بے شمار ممالک کے دورے کئے اور دونوں نے ان تمام ممالک میں اچھا وقت گزارا۔ 2008ء کے شروع میں فرانس کے چند اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز نے دعویٰ کیا ہے نکولس سرکوزی کارلا برونی کے ساتھ شادی کر چکے ہیں اور وہ چند ہی دنوں میں شادی کا اعلان کرنے والے ہیں لیکن یہ بات ابھی صرف افواہوں اور سرگوشیوں تک محدود ہے اور یہ سرگوشیاں' یہ افواہیں' یہ شادی اور سرکوزی اور کارلا برونی کی ازدواجی زندگی بھی ہمارے لئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی چنانچہ ہم اس قصے سے بھی آگے بڑھتے ہیں۔

فرانس کے صدر نکولس سرکوزی 25 اور 26 جنوری 2008ء کو بھارت کے سرکاری دورے پر آئے تھے۔ یہ دورہ دو ماہ قبل طے ہوا تھا' جنوری کے وسط میں کارلا برونی نے بھی صدر کے ساتھ بھارت جانے کا فیصلہ کیا' وہ آگرہ میں تاج محل دیکھنا چاہتی تھی اور اس کے سامنے کھڑی ہو کر تصویر کھنچوانا چاہتی تھی۔ فرانسیسی حکومت نے بھارت کو صدر کے ساتھ کارلا برونی کی آمد کی اطلاع دے دی' یہ اطلاع جوں ہی بھارت پہنچی تو بھارتی حکومت پریشان ہو گئی۔ بھارتی حکومت کی پریشانی کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ اول' بھارت میں کبھی کوئی صدر اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ نہیں آیا تھا اور بھارتی حکومت کا خیال تھا اگر اس

فرانسیسی صدر کی گرل فرینڈ کو سرکاری پروٹوکول دیا تو عوام ناراض ہو جائیں گے۔ بھارت ابھی اس تک "میچور" نہیں ہوا کہ لوگ حکومت کو کسی صدر کی گرل فرینڈ کا استقبال کرتے دیکھیں اور خاموش ں۔ دوم' فرانسیسی صدر کارلا برونی کو اہلیہ سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں لہٰذا سرکوزی کی خواہش ہو گی تی حکومت کارلا برونی کو "فرسٹ لیڈی" کا پروٹوکول دے اور اگر حکومت اس خواہش کا احترام کرتی تو یہ سفارتی بددیانتی ہو گی جبکہ دوسری صورت میں اگر کارلا برونی کو پروٹوکول نہیں دیا جاتا تو صدر س سرکوزی ناراض ہو سکتے ہیں۔ بھارت کی وزارت خارجہ نے چند دن اس مسئلے پر سوچا اور اس کے کارلا برونی کو بھارت اترنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ بھارتی حکومت کا کہنا تھا "ہم مشرقی ہیں اور ہمارے ملک میں گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ کے تعلق کو معیوب سمجھا جاتا ہے چنانچہ ہربانی فرما کر کارلا برونی کو اپنے ساتھ نہ لائیں" یہ بھارت جیسے غریب ملک کی طرف سے فرانس امیر ملک کی ٹھیک ٹھاک توہین تھی اور ممکن تھا فرانسیسی صدر اپنا دورہ منسوخ کر دیتے لیکن سرکوزی نے منسوخ نہ کیا۔ اس کی وجہ بھی بہت دلچسپ تھی' فرانسیسی صدر کے ساتھ تین سو لوگوں کا وفد بھارت آ رہا ن میں 60 بڑے بزنس مین اور فرانس کے تعلیمی اداروں کے 20 مالکان بھی شامل تھے' یہ تمام لوگ و بھاری معاہدے کرنے بھارت جا رہے تھے اور سرکوزی فرانس کے تاجروں کی اہمیت سے واقف چنانچہ سرکوزی اپنی محبوب گرل فرینڈ کو پیرس چھوڑ کر 25 جنوری کو بھارت پہنچ گئے اور انہوں نے 26 ی کو تاج محل کی سیر کی اور وہ تاج محل کے سامنے بیٹھ کر دو گھنٹے تک اپنی گرل فرینڈ کو یاد کرتے رہے۔ گھنٹے بھارتی حکومت کا انکار اور کارلا برونی کی ادھوری خواہش ہمارے لئے اہمیت رکھتی ہے اور میں کو اس نکتے پر لانا چاہتا تھا۔

فرانسیسی صدر کی گرل فرینڈ کارلا برونی اس سے قبل سرکوزی کے ساتھ سعودی عرب' قطر' دوبئی' ر اور اردن کا دورہ کر چکی ہے' یہ پانچوں اسلامی ملک ہیں اور ان پانچوں ممالک میں کارلا برونی سیسی صدر نکولس سرکوزی کے ساتھ گئی تھی اور کسی اسلامی ملک نے کارلا برونی' اس کے ناجائز رشتے اور "ناجائز دورے" پر اعتراض نہیں کیا تھا اور ان پانچوں ممالک نے کارلا برونی کو فرسٹ لیڈی کا کول اور استقبال دیا تھا۔ میں نے جب سے بھارت کے انکار کے بارے میں پڑھا ہے' مجھے اس ت سے یوں محسوس ہوتا ہے اگر نکولس سرکوزی پاکستان کا دورہ کرتے اور کارلا برونی ان کے ساتھ کستان آتی تو شائد ہم نہ صرف اسے سرکاری پروٹوکول دیتے بلکہ ہو سکتا ہے گلے ہاتھوں اسے بادشاہی جد کی سیر بھی کرا دیتے اور سرکوزی اور کارلا برونی کو اردن' مصر' دوبئی' قطر اور سعودی عرب کی طرح

پاکستان میں بھی کسی قسم کا مسئلہ پیش نہ آتا۔ یہ نوجوان جوڑا کراچی' لاہور یا اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر اترتا' ہم اسے 21 توپوں کی سلامی دیتے' اسے گارڈ آف آنر پیش کرتے اور جب تک یہ دونوں ہمارے ملک میں رہتے' ہم ان کے راستے میں پھولوں کی پتیاں بچھاتے رہتے لیکن کیونکہ صدر سرکوزی اور ان کی گرل فرینڈ کارلا برونی پاکستان نہیں آئی چنانچہ یہ دونوں ہماری میزبانی اور ہم ان کی خدمت سے محروم رہے اور ہم سعودی عرب' قطر' دوبئی' مصر اور اردن کی طرح شرف میزبانی بھی حاصل نہیں کر سکے مگر میری خواہش ہے ہماری زندگی میں ایسا وقت ضرور آئے جب ہم نہ صرف کارلا برونی کا استقبال کر رہے ہوں بلکہ اس کی پالتو بلیوں کی خدمت بھی کر رہے ہوں۔ آخر ہمیں کسی نہ کسی شعبے میں تو اپنے ہمسائے ملک سے آگے بڑھنا چاہئے۔ مجھے نہیں معلوم وہ سنہری دن کب طلوع ہوگا لیکن اس دن سے پہلے ایک بات طے ہے قومیں' انا' عزت نفس اور وقار کے بغیر زندہ نہیں رہتیں اور یہ عزت نفس' وقار اور انا کی قوت ہوتی ہے جو قوموں کو اقوام عالم کی بھیڑ میں سر اٹھا کر چلنے کی جرأت دیتی ہے اور بدقسمتی سے عالم اسلام اس قوت سے محروم ہے۔ میں نے جب سے یہ خبر پڑھی ہے میرے دل سے آہ نکل رہی ہے اور میں دعا کر رہا ہوں کاش بھارت کی جگہ ہم ہوتے' کاش ہمارے اندر اتنی طاقت ہوتی کہ ہم فرانس' امریکہ اور برطانیہ جیسے ملکوں کے سربراہان کو ٹوک سکتے۔ کاش ہم انہیں یہ کہہ سکتے اگر تم نے پاکستان آنا ہے تو تمہیں ہماری شرائط پر آنا پڑے گا' تمہیں ہماری خواہشات کا احترام کرنا پڑے گا۔ کاش کبھی ایسا ہو جائے۔

⦸ ⦸ ⦸

چڑھتے سورجوں کے دوست

وہ 1925ء میں پیدا ہوا' چھ سال کی عمر میں ولی عہد بنا اور 22 سال کی عمر میں ایران کا بادشاہ گیا' وہ محمد رضا شاہ پہلوی تھا لیکن پوری دنیا اسے شاہ ایران کے نام سے جانتی تھی۔ وہ ایشیا میں امریکہ سب سے بڑا دوست تھا' یورپی پریس اسے ''امریکن گورنر'' کہتا تھا' وہ امریکی وفاداری میں بہت آگے گیا' امریکہ نے اسے روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا حکم دیا اور اس نے ایران میں داڑھی اور پردہ پر ری لگادی۔ اس کے دور میں کوئی باپردہ عورت گھر سے نکلتی تھی تو پولیس سر عام اس کا برقعہ پھاڑ دیتی تھی' ایران نے تمام زنانہ سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سکرٹ کو یونیفارم بنا دیا' شراب نوشی' رقص نا فیشن بن گیا۔ شاہ کے دور میں ایران دنیا کا واحد ملک تھا جس میں کالجوں میں شراب کی دکانیں ں یونیورسٹیوں میں خواتین کی سودے بازی ہوتی تھی اور اس مکروہ کاروبار کو قانونی حیثیت حاصل تھی' کے زمانے میں دو جرنیلوں کے ہم جنس پرست بیٹوں نے آپس میں شادی کی' سرکاری سطح پر نہ صرف ی دعوت ولیمہ ہوئی بلکہ شاہ اور اس کی کابینہ نے خصوصی طور پر اس تقریب میں شرکت کی۔ شاہ نے ہ کی محبت میں ایران میں موجود 42 ہزار امریکیوں کو سفارتی حیثیت دے دی' امریکہ نے شاہ ایران تر میں ''گرین فون'' لگا رکھا تھا اور اسے امریکہ سے جو ہدایات ملتی تھیں' وہ ان پر فوری عملدر آمد کراتا کن پھر شاہ کی امریکہ نواز پالیسیوں پر بغاوت ہوئی' یہ بغاوت تین سال تک چلتی رہی' شاہ نے شہروں میں مارشل لاء لگا دیا' عوام نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا' شاہ نے حکومت شاہ پور بختیار والے کی اور ملک سے فرار ہو گیا' اس کا خیال تھا امریکہ اب اس کی وفاداریوں کا بدلہ دے گا لیکن ں ہی شاہ ایران کا طیارہ ایران کی حدود سے نکلا' امریکہ نے آنکھیں پھیر لیں' شاہ پہلے مصر گیا' راکش' پھر بہاماس اور پھر میکسیکو' وہ اس دوران امریکہ سے مسلسل مدد مانگتا رہا لیکن وائٹ ہاؤس اس فون تک نہیں سنتا تھا۔ شاہ ایران سوا سال تک مارا مارا پھرتا رہا لیکن کسی نے اس کی مدد نہ کی' امریکہ اس کے اکاؤنٹس تک ''سیز'' کر دیئے' آخر میں انور السادات کام آیا اور اس نے اسے پناہ دے دی۔ ی 1980ء میں قاہرہ میں اس کا انتقال ہوا' انتقال کے وقت اس کے پاس اس کی تیسری بیوی کے

سوا کوئی نہ تھا' لوگ اس کا جنازہ تک پڑھنے نہ آئے چنانچہ اسے اس کے بیڈروم ہی میں امانتاً دفن کر دیا گیا۔

یہ صرف رضا شاہ پہلوی کی کہانی نہیں' امریکہ کا ہر دوست حکمران اسی انجام کا شکار رہا' آپ ''اناس تاسیوسو'' کی مثال لیجئے' وہ نکاراگوا میں امریکی ایجنٹ تھا' نکاراگوا میں کمیونزم کی تحریک شروع ہوئی تو امریکہ نے اناس تاسیوسو کو ڈالر اور اسلحہ دے کر کمیونزم کے خلاف کھڑا کر دیا۔ تاسیوسو امریکہ کی جنگ کو اپنی جنگ سمجھ کر لڑتا رہا' 1979ء میں نکاراگوا میں اس کے لئے حالات مشکل ہو گئے' وہ ملک سے فرار ہوا لیکن جوں ہی اس نے نکاراگوا سے باہر قدم رکھا' امریکا نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا' اس نے امریکہ آنے کی کوشش کی لیکن امریکی حکومت نے اجازت نہ دی' یوں اناس تاسیوسو جنگلوں اور غاروں میں چھپ کر زندگی گزارنے لگا' وہ 1980ء میں اسی پریشانی کے عالم میں انتقال کر گیا اور اس کے چند قریبی دوستوں نے اسے پیراگوئے کے شہر اسنشن میں دفن کر دیا' آج لوگ اس کے نام تک سے واقف نہیں ہیں۔ چلی کے آمر ''جنرل اگارتے اگستو پنوشے'' نے 1973ء میں سی آئی اے کی مدد سے جنرل ایلینڈو کی منتخب حکومت پر شب خون مارا تھا' پنوشے نے اقتدار میں آتے ہی چلی کی عوام کے خلاف آپریشن شروع کر دیا۔ پنوشے 1990ء تک چلی پر حکمران رہا' ان 17 برسوں میں پنوشے نے امریکہ کے کہنے پر ہزاروں شہری قتل کرائے' امریکہ کی ناپسندیدہ تنظیموں پر پابندیاں لگائیں اور امریکہ کی خواہش پر اپنے شہریوں کے انسانی حقوق غصب کئے' عوام 1990ء میں پنوشے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے' وہ مارچ 1990ء میں لندن فرار ہو گیا' اس کا خیال تھا برطانیہ اور امریکہ اسکی وفاداریوں کی قدر کریں گے لیکن لندن آتے ہی برطانوی پولیس نے اسے گرفتار کیا اور اسے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا' اس نے اس ناروا سلوک پر امریکہ سے احتجاج کیا لیکن امریکی حکومت نے اسے جواب تک دینے کی زحمت نہ کی' برطانوی حکومت نے اسے 2000ء میں چلی کے حوالے کر دیا' اس کے خلاف مقدمہ چلا' 3 دسمبر 2006ء کو اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ دم توڑ گیا' اس کی موت پر پورے ملک میں خوشیاں منائی گئیں جبکہ امریکی حکومت نے ایک سطر کا تعزیتی پیغام تک جاری نہ کیا۔ انگولا کا باغی سردار ''جوناس سیومبی'' بھی امریکہ نواز لیڈر تھا' وہ برسہا برس انگولا میں امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا' نومبر 1992ء میں امریکہ نے اسے کمیونسٹوں کے ساتھ امن معاہدے کا حکم دیا' اس نے معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے نتیجے میں جوناس سیومبی بے دست و پا ہو گیا' معاہدے پر دستخطوں کے دو ماہ بعد کمیونسٹوں نے ''ہامبو'' میں اس کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کر دیا' وہ فرار ہو گیا' آج اس واقعہ کو پندرہ سال گزر چکے ہیں' جوناس سیومبی

ن بچانے کیلئے چھپتا پھر رہا ہے لیکن امریکی حکومت اس کا ٹیلی فون تک نہیں سنتی۔ ''جنرل نوریگا'' پانامہ ں امریکہ کا آلہ کار تھا' اسے بھی امریکیوں نے کمیونسٹوں کے خلاف استعمال کیا۔ وہ 1990ء تک ریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا لیکن امریکہ کی تسلی نہ ہوئی لہٰذا امریکہ نے پانامہ پر حملہ کر دیا' صدر نوریگا رفتار ہوا' امریکی ایما پر عدالت نے اسے 40 سال قید بامشقت کی سزا سنا دی اور نوریگا گزشتہ چودہ ں سے جیل میں امریکی دوستی کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ ''فرڈی ننڈ مارکوس'' 22 برس تک فلپائن میں ریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا۔ اس نے فلپائن سے کمیونسٹوں کو چن چن کر ختم کر دیا لیکن 1986ء میں ریکہ ہی نے اس کی حکومت ختم کرا دی' مارکوس امریکہ آ گیا' امریکہ نے اسے پناہ تو دے دی لیکن اسے عزت اور وہ توقیر نہ دی جس کا وہ حق دار تھا' مارکوس نے باقی زندگی ہونولولو کے ایک چھوٹے سے مکان ں گزاری اور اسے ایک عام پناہ گزین کے برابر وظیفہ ملتا تھا' مارکوس 1999ء میں اسی بے بسی کے عالم ں آنجہانی ہو گیا۔ 1979ء ہی میں امریکہ نے رہوڈیشیا میں بشپ ایبل منرور یوا کو موغابے اور نکومو مقابلے میں کھڑا کیا' بشپ امریکیوں کیلئے لڑتا رہا لیکن جب وہ لڑتے لڑتے کمزور ہو گیا تو امریکہ نے ں کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا اور صدر صدام حسین کی کہانی تو پوری دنیا جانتی ہے۔ انقلاب ایران کے بعد ریکہ نے صدام حسین کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا' صدام حسین نے امریکہ کی ایماء پر 22 ستمبر 198ء کو ایران پر حملہ کیا' یہ جنگ 20 اگست 1988ء تک 8 سال جاری رہی اور اس میں دس لاکھ اد ہلاک اور 20 لاکھ زخمی ہوئے۔ صدام حسین 1990ء تک امریکہ کا دوست رہا لیکن پھر امریکہ نے ں کے لالچ میں عراق پر حملہ کر دیا' اس جنگ میں 86 ہزار عراقی شہری شہید ہوئے' 2003ء میں ریکہ نے ایک بار پھر عراق پر حملہ کیا' صدام حسین گرفتار ہوا اور امریکی ہدایات پر سے 30 دسمبر 2006ء کو بغداد میں پھانسی دے دی گئی۔

شاہ ایران سے لے کر صدام حسین تک امریکی تاریخ دوست کشی کی ہزاروں مثالوں سے ری پڑی ہے۔ امریکی اپنی خارجہ پالیسی کو ''ڈسپوزل ڈپلومیسی'' کہتے ہیں' ان کا فلسفہ ہے خریدو' استعمال رو اور پھینک دو' امریکی قوم بلیڈ کند ہونے سے پہلے بیوی بدل لیتے ہیں چنانچہ یہ لوگ اپنے دوستوں کو غذ کے گلاس' پلیٹ' ٹشو اور گندی جراب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ لوگ ہمیشہ کیس ٹو کیس اور جیکٹ ٹو پراجیکٹ چلتے ہیں چنانچہ ان کے دوست جنرل اگستو پنوشے ہوں' جنرل رضا شاہ پہلوی ں یا جنرل صدام حسین یہ لوگ اس وقت انہیں دوست سمجھتے ہیں جب تک وہ ان کیلئے خدمات سرانجام ے سکتے ہیں اور جس دن انہیں محسوس ہوتا ہے یہ شخص ان کی ''ذمہ داری'' بنتا جا رہا ہے' یہ اس کے ساتھ

ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق جیسا سلوک کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ ان کی قبروں تک پر "سابق" کی مہر لگا دیتے ہیں۔ یہ ہے امریکی دوستی اور اس کا انجام اور امریکہ پچھلے دو سو چودہ برس سے "دوستی" کے اسی فلسفے پر کاربند ہے اور اس نے آج تک کسی شخص کیلئے اپنی یہ پالیسی نہیں بدلی لیکن ہمارے مہربان یہ سمجھ رہے ہیں 2007ء تک پہنچ کر امریکہ نے اپنا سارا فلسفہ بدل لیا ہے اور وہ اب بحیرہ عرب کے آخری ساحل اور بحر اوقیانوس کی آخری لہر تک ہمارا ساتھ دے گا' ہمارے یہ دوست بھول گئے ہیں وہ امریکی جو اپنی ماں' اپنے باپ کو بھول جاتے ہیں وہ بحرانوں میں ان کا کیا ساتھ دیں گے۔ امریکہ ڈوبتے سورجوں کی زمین ہے اور ڈوبتے سورجوں کے بیٹے ہمیشہ چڑھتے سورجوں کے دوست ہوتے ہیں اور اس وقت ہمارے مہربانوں کا سورج ڈوب رہا ہے چنانچہ امریکہ کی وفاداری کا رخ بھی بدل رہا ہے۔ بس ایک دو ہفتوں کی بات ہے اور اس کے بعد نیا کپ' نئی پلیٹ اور نیا گلاس ہوگا اور کونڈا لیزا رائس ہوگی۔

⊘ ⊘ ⊘

محمد شاہ رنگیلا

شہزادے کا اصل نام روشن اختر تھا' وہ شاہ جہاں خجستہ اختر کا بیٹا اور شاہ عالم بہادر شاہ اول کا پوتا تھا' سید برادران نے اسے جیل سے رہا کرایا اور 17 ستمبر 1719ء کو تخت پر بٹھا دیا' اس نے اپنے لئے ناصر الدین محمد شاہ کا لقب پسند کیا لیکن تاریخ نے اسے محمد شاہ رنگیلا کا نام دے دیا' محمد شاہ رنگیلا ایک تلون طبع غیر متوازن شخص تھا' چوبیس گھنٹے نشے میں دھت رہتا تھا اور رقص و سرود اور فحاشی و عریانی کا دلدادہ تھا' وہ قانون بنانے اور قانون توڑنے کے خبط میں بھی مبتلا تھا' وہ ایک ایسا پارہ صفت انسان تھا جو ایک لمحے میں کسی شخص کو ہندوستان کا اعلیٰ ترین عہدہ سونپ دیتا تھا اور جب چاہتا وزیراعظم کو کھڑے کھڑے جیل بجھوا دیتا تھا' وہ اکثر دربار میں ننگا آ جاتا تھا اور درباری بھی اس کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری میں کپڑے اتار دیتے تھے' وہ بعض اوقات جوش اقتدار میں دربار میں سر عام پیشاب کر دیتا تھا اور تمام امراء' وزراء' دلی کے شرفاء اور اس وقت کے علماء اور فضلاء واہ واہ کہہ کر بادشاہ سلامت کی تعریف کرتے تھے' وہ بیٹھے بیٹھے حکم دیتا تھا کل تمام درباری زنانہ کپڑے پہن کر آئیں اور فلاں فلاں وزیر پاؤں میں گھنگھرو باندھیں گے اور وزراء اور درباریوں کے پاس انکار کی گنجائش نہیں ہوتی تھی' وہ دربار میں آتا تھا اعلان کر دیتا تھا جیل میں بند تمام مجرموں کو آزاد کر دیا جائے اور اتنی ہی تعداد کے برابر مزید لوگ جیل میں ڈال دیئے جائیں' بادشاہ کے حکم پر سپاہی شہروں میں نکلتے تھے اور انہیں راستے میں جو بھی شخص ملتا تھا اسے پکڑ کر جیل میں پھینک دیتے تھے' وہ وزارتیں تقسیم کرنے اور خلعتیں پیش کرنے کا بھی شوقین تھا' وہ روزانہ پانچ نئے لوگوں کو وزیر بناتا تھا اور سو پچاس لوگوں کو شاہی خلعت پیش کرتا تھا اور اگلے ہی دن یہ وزارتیں اور یہ خلعتیں واپس لے لی جاتی تھیں' وہ طوائفوں کے ساتھ دربار میں آتا تھا اور ان کی ٹانگوں' بازوؤں اور پیٹ پر لیٹ کر کاروبار سلطنت چلاتا تھا' وہ قاضی شہر کو شراب سے وضو کرنے پر مجبور کرتا تھا اور اس کا حکم تھا ہندوستان کی ہر خوبصورت عورت بادشاہ کی امانت ہے اور جس نے اس امانت میں خیانت کی اس کی گردن مار دی جائے گی اور اس نے اپنے دور میں اپنے عزیز ترین گھوڑے کو وزیر مملکت کا منصب دے دیا اور یہ گھوڑا شاہی خلعت پہن کر وزراء کے ساتھ بیٹھتا تھا' محمد شاہ رنگیلا کثرت شراب

نوشی کے باعث 26 اپریل 1748ء کو انتقال کر گیا لیکن آج بھی جب تاریخ محمد شاہ رنگیلا تک پہنچتی ہے تو اس کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔

محمد شاہ رنگیلا اس نوعیت کا واحد کردار نہیں تھا' انسانی تاریخ ایسے سینکڑوں' ہزاروں کرداروں سے لتھڑی پڑی ہے' آپ دنیا کی قدیم تہذیبوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو معلوم ہو گا دنیا کی ہر تہذیب کو شروع میں نیک اور سمجھ دار بادشاہ ملے' ان بادشاہوں نے ملک میں میرٹ' عدل اور مساوات قائم کی جس کے نتیجے میں ملک نے ترقی کی اور وہ تہذیب معاشی خوشحالی کے دور میں داخل ہو گئی لیکن پھر اچانک ایک دن ملک میں کوئی نہ کوئی محمد شاہ رنگیلا آیا اور اس نے اپنے پاگل پن اور انا کو دستور' قانون اور آئین کی شکل دے دی اور وہ ملک اور وہ تہذیب بادشاہ کے پاگل پن کے ہاتھوں فنا ہو گئی' آپ مصر کے بادشاہوں کو دیکھئے' بادشاہوں کی ایک نسل نے اہرام مصر جیسے تعمیراتی معجزے برپا کئے جبکہ دوسری نسل کے رنگیلے خدائی کے دعوے کرنے لگے' شداد جیسے بادشاہ نے زمین پر جنت بنا ڈالی' نمرود نے آگ دہکائی اور حضرت ابراہیمؑ کو اس آگ میں دھکیل دیا اور ایک بادشاہ نے اللہ کے نبی کو آرے سے چیرنے کا حکم دے دیا' روم کے ایک بادشاہ نے جوش شاہی میں پورے روم کو آگ لگا دی اور خود محل کی چھت پر بیٹھ کر بانسری بجانے لگا' ایک بادشاہ نے روم کے درمیان میں ایمپی تھیٹر بنایا اور 80 ہزار لوگوں کے درمیان بیٹھ کر بھوکے شیروں کو انسان کا شکار کرتے اور گوشت کھاتے دیکھنے لگا' روم کے ایک بادشاہ نے اپنی سگی بہن سے شادی کر لی' یونان کا ایک بادشاہ ملکہ کے ساتھ برہنہ باہر نکلا اور عوام کو حکم دے دیا تمام لوگ باآواز بلند کہیں ''بادشاہ نے بڑا خوبصورت لباس پہن رکھا ہے'' ایران کا ایک بادشاہ اپنی ملکہ کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا اور اس بازی کے دوران اگر ملکہ ہارتی تھی تو وہ بادشاہ کو ایک غلام پیش کر دیتی تھی اور اگر بادشاہ کو مات ہوتی تھی تو وہ ایک غلام ملکہ کے حوالے کر دیتا' یہ غلام کھیل کے آخر میں سرِ عام ذبح کر دیئے جاتے تھے' ہندوستان کا ایک بادشاہ قطب الدین مبارک شاہ ہم جنس پرست تھا' وہ ایک ہندو لڑکے پر عاشق تھا' بادشاہ ایک دن دلہن بنتا تھا اور ہندو لڑکا دلہا' دربار میں دونوں کا باقاعدہ نکاح ہوتا تھا' رخصتی ہوتی تھی' ولیمہ ہوتا تھا اور سارے عمائدین سلطنت ''جوڑے'' کو باقاعدہ سلامیاں دیتے تھے' دوسرے دن وہ لڑکا دلہن اور بادشاہ دلہا بنتا تھا اور اس تقریب میں بھی تمام درباری اور شرفاء شریک ہوتے تھے' فرانس کے بادشاہوں نے ایک طویل عرصے تک غسل کو خلاف قانون قرار دیئے رکھا تھا' برطانیہ کے ایک بادشاہ کے دور میں شادیوں پر پابندی تھی اور جب تک کوئی شہری بادشاہ سے سرٹیفکیٹ نہیں لے لیتا تھا اس وقت تک اسے وظیفہ زوجیت ادا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی' اس اجازت کو

"Fornication Under Consent of King" کہا جاتا تھا اور انگریزی کا لفظ ایف یو سی کے یعنی فک اسی اجازت نامے کا مخفف ہے' امیر تیمور اسلامی دنیا کا بہت بڑا ہیرو تھا لیکن وہ قتل اور علم کے خبط میں مبتلا تھا اس نے اپنی زندگی میں 54 ممالک میں کھوپڑیوں کے مینار بنائے اور علمائے کرام کو جمع کر کے قرآن مجید کی ترتیب بدلنے کا حکم دے دیا' چین کے ایک بادشاہ نے مردوں کو برقعہ پہننے اور عورتوں کو ''انڈر گارمنٹس'' میں باہر آنے کا حکم دے دیا' جاپان کے ایک محمد شاہ رنگیلے نے کشتی بنانے کی سزا موت طے کر دی اور دوسرے نے دال پکانے کو ناقابل ضمانت جرم قرار دے دیا' اٹلی کے ایک بادشاہ نے عورتوں کے ہنسنے پر پابندی لگا دی جبکہ دوسرے نے قانون بنا دیا سلطنت کی تمام عورتیں دانتوں پر راکھ ملا کریں گی' یہ وہ وقت تھا جب لیونارڈو ڈا ونچی مونا لیزا بنا رہا تھا' شاید یہی وجہ تھی اس پینٹنگ میں مونا لیزا نے ہونٹ بھینچ رکھے ہیں اور پولینڈ کے ایک محمد شاہ رنگیلا نے ملک کی تمام عورتوں کو کتے پالنے کا حکم دے دیا تھا۔

آپ تاریخ کا کوئی باب اٹھا کر دیکھیں' آپ کو اس میں بے شمار محمد شاہ رنگیلے ملیں گے' پوری دنیا میں بیسویں صدی تک بادشاہت ہوتی تھی اور بادشاہ قانون کا درجہ رکھتے تھے لہٰذا جب کبھی یہ قانون کسی غیر متوازن اور پاگل شخص کے ہاتھ میں آ جاتا تھا تو وہ لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کرتا تھا جو محمد شاہ رنگیلا نے ہندوستان میں کیا تھا' انسان نے دس ہزار سال کے سفر کے آخر میں سیکھا اختیارات فرد واحد کے پاس نہیں ہونے چاہئیں کیونکہ اقتدار کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر اکثر بادشاہ ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں اور پھر وہ لاکھوں کروڑوں لوگوں کے مقدر کا فیصلہ انا اور غرور سے کرنے لگتے ہیں جس کے نتیجے میں معاشرے کے تار پود ہل جاتے ہیں چنانچہ دنیا کے 245 ممالک میں سے 191 ملکوں میں لوگوں نے بادشاہوں کے اختیارات مختلف اداروں میں تقسیم کر دیئے جس کے نتیجے میں محمد شاہ رنگیلوں کا سلسلہ بھی ترک گیا اور رعایا بھی انسانی حقوق' انسانی شعور اور انسانی عزت نفس کے دور میں داخل ہو گئی' اس دور میں پھر وہ ملک ترقی' امن و امان اور سکون کی لذت سے آشنا ہوتا چلا گیا جس میں اختیار اور اقتدار اداروں کے پاس تھا اور یہ ادارے قانون کے دائرے میں رہ کر کام کرتے تھے جبکہ وہ تمام ملک خلفشار' بدامنی' خانہ جنگی اور خانہ بربادی کا شکار ہوتے چلے گئے جن میں فیصلے ایک شخص یا چند لوگوں تک محدود رہے اور بدقسمتی سے ہمارا شمار دوسری فہرست کے لوگوں میں ہوتا ہے' میں نے کل ہی اخبار میں پڑھا تھا حکومت عدلیہ کو کنٹرول کرنے کیلئے آئین میں نئی ترمیم لا رہی ہے' اس نئے آئینی بندوبست کے بعد حکومت سپریم کورٹ کے کسی بھی جج کو چیف جسٹس لگا سکے گی اور یہ چیف جسٹس صرف دو برس تک اس عہدے پر

متمکن رہ سکے گا اور اس دوران بھی اگر حکومت کو محسوس ہوا چیف جسٹس ٹھیک کام نہیں کر رہا تو وہ اسے ہٹا بھی سکے گی' میں نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے محسوس ہوا پوری دنیا نے دس ہزار سال میں محمد شاہ رنگیلے سے جارج بش' گورڈن براؤن اور لی کو آن یو کی طرف سفر کیا لیکن ہم 21 ویں صدی میں محمد شاہ رنگیلے کی طرف لوٹ رہے ہیں اور پوری دنیا شخصی اختیار سے اداروں کی طرف آ گئی' وہ بادشاہوں سے جمہوریت' درباروں سے پارلیمنٹ اور ظل سبحانی سے آزاد عدلیہ کی طرف پہنچ گئی لیکن ہم عدلیہ' پارلیمنٹ اور انسانی حقوق کو واپس ایک بادشاہ کی ذات میں جمع کر رہے ہیں' کیا بات ہے ہماری' ہم وہ لوگ ہیں جو تاریخ کے دھارے سے الٹ سفر کر رہے ہیں لیکن ساتھ ہی ہمیں اپنی کامیابی کا بھی یقین ہے' ہم کیا زبردست لوگ ہیں' ہم گرم توے پر برف جمانے کی کوشش کر رہے ہیں' ہم 21 ویں صدی میں محمد شاہ رنگیلے کا دور واپس لا رہے ہیں۔ ہم جنرل پرویز مشرف جیسے محمد شاہ رنگیلا سے نکلتے ہیں تو جناب آصف علی زرداری نئے رنگیلے بن کر ہمارے سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ کیا بات ہے ہماری۔۔!!

⊘ ⊘ ⊘

مبارک ہو

ہم اگر تاریخ کے غیر معمولی انسانوں کی فہرست بنائیں تو لیونارڈو ڈاونچی کا نام شروع میں آئے گا' وہ اٹلی کے شہر فلورنس میں پیدا ہوا' اس کا والد ایک دولت مند قانون دان تھا' لیونارڈو نے جوانی میں بیک وقت مصوری' مجسمہ سازی' تعمیرات' موسیقی اور سائنس کو اپنا ذریعہ شناخت بنایا لیکن اس کی شہرہ آفاق پینٹنگ ''مونالیزا'' اس کا حوالہ بن گئی' یہ فلورنس کی ایک رئیس زادی ساڈی گرارڈینی کی پورٹریٹ تھی' یہ 1507ء میں مکمل ہوئی اور اس پورٹریٹ کی ملکوتی مسکراہٹ نے لیونارڈو کو تخلیق اور مصوری کی کتاب میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے امر کر دیا' یہ تصویر آج کل پیرس کے عجائب گھر لوور میں رکھی ہے اور میں تیرہ مرتبہ اس کی ''زیارت'' کر چکا ہوں' مونالیزا نے جہاں لیونارڈو کو آفاقی پذیرائی بخشی وہاں ڈاونچی کا اصل ٹیلنٹ اور کنٹری بیوشن اس تصویر کے پیچھے چھپ گیا' لیونارڈو مصور سے کہیں زیادہ اچھا سائنس دان تھا اور اس نے انسانیت کی فلاح کیلئے ایسی بے شمار اشیاء کے تصور دیئے جنہوں نے ہماری سماجی زندگی کا ڈھانچہ بدل دیا مثلاً آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی قینچی لیونارڈو ڈاونچی نے ایجاد کی تھی' ڈرل مشین اس کی ایجاد تھی' اس نے دنیا کا پہلا ''موو ایبل'' گھر بنایا تھا' سریا بنانے کی مشین اس کی ایجاد تھی' زمین سے پانی نکالنے والی بورنگ مشین اس نے بنائی تھی' خراد مشین اس کی ایجاد تھی' بل ڈوزر اس نے بنایا' سیمنٹ بجری اور ریت کو ملانے والا مکسچر اس نے ایجاد کیا تھا' سوت کاتنے والی مشین اور دریاؤں سے کیچڑ نکالنے والی کشتی اس نے بنائی تھی' وہ پہلا شخص تھا جس نے مقناطیسی سوئی کو افقی محور پر لگایا تھا اور اس سے قطب نما بنا تھا' دنیا کا پہلا فوجی پل اس نے بنایا تھا' نہریں کھودنے کی جدید سائنس کا بانی لیونارڈو ڈاونچی تھا' انسانی جسم میں موجود وریدوں کا نظام اس نے دریافت کیا تھا اور انسانی جسم کے مختلف اعضاء کا اندرونی ساخت کی تصویریں اس نے بنائی تھیں' جدید توپ کا ڈیزائن بھی اس نے دیا تھا' مشین گن کا نقشہ بھی اس نے بنایا تھا' گیلائیڈرز اس نے بنائے تھے اور گوشت روسٹ کرنے والی مشین بھی اس نے ایجاد کی تھی' ان تمام سائنسی ایجادات کے ساتھ ساتھ لیونارڈو ڈاونچی پہلا شخص تھا جس نے کیلکولیٹر بنایا اور جس نے کمپیوٹر کا تصور دیا تھا لیکن اس کی یہ ساری ایجادات مونالیزا کے پیچھے چھپ گئیں' دنیا میں

بعض اوقات کسی تخلیق کار کی کوئی ایک تخلیق اس کے باقی تمام کارناموں کو نگل جاتی ہے اور لیونارڈو کا شمار انہی تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔

لیونارڈو ڈاونچی کا ایک اور کارنامہ بکتر بند گاڑی تھا' ڈاونچی نے دنیا میں پہلی بکتر بند گاڑی بنائی تھی' اس نے بادشاہوں کیلئے لکڑی کی ایک ایسی گاڑی بنائی تھی جس میں بیٹھ کر وہ بے خطر لمبے سفر کر سکتے تھے' یہ گاڑی ساڑھے چار سو سال تک بادشاہوں کے استعمال میں رہی لیکن جب دنیا میں انجن ایجاد ہوا اور انسان نے پہیئے میں بال بیئرنگ ڈالے تو برطانوی فوج نے جدید بکتر بند گاڑیاں بنانا شروع کر دیں' دنیا کی پہلی بکتر وین کا نام "ٹھیپر" تھا اور اس کی پہلی کھیپ 1912ء میں برطانوی فوج کے حوالے کی گئی تھی' 1919ء میں امریکہ کی ایک کمپنی نے امریکی تاجروں کیلئے بکتر بند کار بنانے کا فیصلہ کیا' یہ گاڑی جنوری 1920ء میں مکمل ہوئی اور یکم فروری 1920ء کو سینٹ پاؤل من میں اس کی پہلی نمائش ہوئی' اس گاڑی کو بلٹ پروف کار کا نام دیا گیا' 1923ء میں بلٹ پروف گاڑیوں کا تصور امریکہ سے یورپ پہنچا اور برطانیہ' فرانس اور جرمنی میں بھی ان کی تیاری شروع ہو گئی لیکن ان گاڑیوں کو قبول عام دوسری جنگ عظیم میں حاصل ہوئی' دوسری عظیم جنگ میں دنیا کے زیادہ تر بڑے تاجر' صنعت کار' سیاستدان' شاہی خاندانوں کے افراد اور لیڈر بلٹ پروف گاڑیوں میں "شفٹ" ہو گئے' یہ جنگ ختم ہوئی تو بلٹ پروف گاڑیاں باقاعدہ تجارت کی شکل اختیار کر گئیں اور گاڑیاں بنانے والی تمام بڑی کمپنیاں اپنے گاہکوں کو بلٹ پروف کا آپشن دینے لگیں' 1970ء تک ان گاڑیوں میں صرف تین سے چھ انچ موٹا خصوصی شیشہ لگایا جاتا تھا اور ان کی باڈی میں سیسہ ڈال کر اسے گولی سے محفوظ بنا دیا جاتا تھا لیکن 80ء کی دہائی میں ایسی گاڑیاں بھی مارکیٹ میں آ گئیں جن میں آگ بجھانے کے آٹو میٹک آلات تھے' جو ٹائروں کے بغیر رم پر ایک سو بیس کلو میٹر کی رفتار سے چل سکتی تھیں' جن کا فیول ٹینک گولی' بم اور آگ سے محفوظ رہتا تھا' جو ریموٹ کنٹرول سے سٹارٹ ہو سکتی تھیں' جن میں گاڑی میں بیٹھ کر ٹائروں کا درجہ حرارت اور ہوا کم اور زیادہ کی جا سکتی تھی' جن میں سائرن اور الارم لگے تھے' جن میں انٹر کام ہوتا تھا' جن میں آکسیجن کا خود کار نظام تھا اور جو بم پروف بھی تھیں' آج 2007ء میں یہ صورتحال ہے تمام بڑی کمپنیاں بلٹ پروف گاڑیاں بنا رہی ہیں لیکن تین کمپنیاں زیادہ مشہور ہیں' بی ایم ڈبلیو کی سیون سیریز میں ہائی سیکورٹی' مرسڈیز بینز کی ایس کلاس میں گارڈ اور اوڈی کی اے 6 اور اے 8 میں اچھی بلٹ پروف گاڑیاں آ رہی ہیں' ایک عام گاڑی کو بھی بلٹ پروف بنایا جا سکتا ہے لیکن اس پر کم از کم 60 سے 90 لاکھ روپے خرچ آتا ہے جبکہ دنیا کی مہنگی ترین بلٹ پروف گاڑی کی قیمت 92 کروڑ روپے ہے۔

پاکستان میں پہلی بلٹ پروف گاڑی جنرل ضیاء الحق کے دور میں آئی تھی' افغان جنگ کے دوران جنرل ضیاء الحق اور ان کے "رفقائے کار" روسی ایجنسیوں کا ٹارگٹ تھے چنانچہ امریکہ نے پاکستانی فوج کو بارہ بلٹ پروف گاڑیاں دیں' ان میں سے تین گاڑیاں جنرل ضیاء الحق استعمال کرتے تھے جبکہ باقی گاڑیاں ان کے منظور نظر جرنیلوں کے زیر استعمال تھیں' جنرل ضیاء الحق کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف بھی اپنی اپنی وزارت عظمیٰ کے دور میں بلٹ پروف گاڑیاں استعمال کرتے رہے' میاں نواز شریف کے دوسرے دور میں وزرائے اعلیٰ اور گورنروں کو بھی یہ سہولت دے دی گئی لیکن بلٹ پروف گاڑیوں نے باقاعدہ کلچر کی شکل صدر جنرل پرویز مشرف کے دور میں اختیار کی' نائن الیون کے بعد جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو پاکستان میں خودکش حملے شروع ہو گئے' 25 دسمبر 2003ء کو صدر پرویز مشرف اور 30 جولائی 2004ء کو اٹک میں شوکت عزیز پر خودکش حملہ ہوا جس کے بعد صدر اور وزیراعظم کے لئے انتہائی مہنگی اور جدید بلٹ اور بم پروف گاڑیاں منگوائی گئیں' ان گاڑیوں میں سیٹلائٹ گائیڈڈ سسٹم اور موبائل فون اور ریموٹ کنٹرول کے سگنل منجمد کرنے والے "جیمر" بھی تھے' 2005ء میں حکومت نے بلٹ پروف گاڑیوں کا سلسلہ دراز کر دیا اور وزراء کو بھی ڈیوٹی فری بلٹ پروف گاڑیوں کی سہولت دے دی' یوں اسلام آباد' لاہور' کراچی' پشاور اور کوئٹہ میں بڑی بڑی سرکاری بلٹ پروف گاڑیاں دکھائی دینے لگیں' حکومت نے غیر حکومتی شخصیات میں چودھری شجاعت حسین اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی بلٹ پروف گاڑی دے رکھی ہے۔

نومبر کی 16 تاریخ کو نگران حکومت بنی اور 20 نومبر 2007ء کو ہماری نگران حکومت نے بلٹ پروف گاڑیوں کے سلسلے میں مزید ایک قدم آگے بڑھا دیا' حکومت نے نہ صرف بلٹ پروف گاڑیوں کی درآمد کی اجازت دے دی بلکہ انہیں کسٹم ڈیوٹی سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا' وزارت خزانہ نے اس سلسلے میں ایس آر او 1121(1)2007 جاری کیا جس کے بعد اب پاکستان کے تمام امراء وزارت داخلہ اور وزارت خزانہ کی اجازت سے کسٹم ڈیوٹی دیئے بغیر بلٹ پروف گاڑی درآمد کر سکتے ہیں' میں نے جب یہ حکم پڑھا تو میں بے اختیار ہنس پڑا اور میں نے سوچا ہمارے نگران وزیراعظم پلس چیئرمین سینٹ محمد میاں سومرو نے ثابت کر دیا اس ملک میں اب تمام حکومتی اور سرکاری اہلکار' تمام سیاستدان' صنعت کار' بزنس مین' تاجر' بینکار اور چھوٹے بڑے سرمایہ دار غیر محفوظ ہیں اور اب پاکستان کا کوئی "اہم شخص" بلٹ پروف گاڑی کے بغیر سڑک پر نہیں آ سکتا اور ہمارے نگران وزیراعظم نے ثابت کر دیا پاکستان کی اشرافیہ کو ضرورت کی ہر چیز ڈیوٹی فری ملتی ہے جبکہ عوام کو پانی تک پر ٹیکس اور ڈیوٹی دینا

پڑتی ہے' آپ دلچسپ امر دیکھئے پاکستان میں اس وقت 4227 آئٹمز درآمد ہوتی ہیں' ان میں سے 81 فیصد اشیاء عام لوگوں تک پہنچتی ہیں لیکن آج تک محمد میاں سومرو سے جناب شوکت عزیز تک کسی سربراہ نے ان میں سے کسی آئٹم کو ٹیکس اور کسٹم سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جبکہ بلٹ پروف گاڑیاں وہ خوش نصیب ''ضروریات'' ہیں جنہیں حکومت نے ایک ہی جھٹکے میں ڈیوٹی فری کر دیا چنانچہ اب ملک میں بلٹ پروف گاڑیاں عام ملیں گی اور لوگ ان گاڑیوں میں بیٹھ کر پاکستان زندہ باد' پاکستان پائندہ باد اور شاد باد' منزل مراد کے نعرے لگائیں گے۔ واہ کیا بات ہے' کیا ہم اس ملک میں نہیں رہ رہے جس میں عوام کو سورج کی روشنی' آکسیجن اور پانی تک فری نہیں ملتا جبکہ حکمران کلاس کیلئے بلٹ پروف گاڑیاں تک ڈیوٹی فری ہیں' واہ' ہم سب کو مبارک ہو۔

⊘ ⊘ ⊘

دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں

یہ 1996ء کی ایک سرد دوپہر تھی' شکاگو لاء سکول کے ٹھنڈے کوریڈور تھے اور وہ ان [illegible]وں میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا' اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس تھا' دوسرے ہاتھ میں فائلیں تھیں [illegible]س نے یہ فائلیں سینے پر رکھ کر انہیں ہاتھ سے دبا رکھا تھا' اس کے چہرے پر فکر کی کئی لکیریں بکھری [illegible]' وہ اس عالم میں سٹاف روم میں داخل ہوا' اس کے زیادہ تر کولیگز کافی کے مگ اٹھا کر ایک دوسرے [illegible]پ شپ کر رہے تھے۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا' اس کا دوست کھڑکی کے پاس اکیلا کھڑا تھا' اس [illegible]ائلیں اور بریف کیس میز پر رکھا' اوور کوٹ کھونٹی پر لٹکایا اور مسکراتا ہوا دوست کے پاس پہنچ گیا' [illegible]ت نے مسکرا کر پوچھا ''آج کا دن کیسا گزرا؟'' اس نے گرم جوشی سے جواب دیا ''گڈ'' اس کا [illegible]ت ماہر نفسیات تھا اور وہ شکاگو لاء سکول میں مجرموں کی نفسیات پڑھاتا تھا' وہ فوراً اس کی کشمکش تک [illegible]گیا ''تم کیا سوچ رہے ہو'' اس کے دوست نے اس سے براہ راست پوچھ لیا' وہ مسکرایا اور بڑے [illegible]ن سے بولا ''میں نے امریکہ کا صدر بننے کا فیصلہ کر لیا ہے'' اس کے دوست کے پیٹ سے ایک قہقہہ [illegible]یکن اس نے قہقہے کو حلق میں روک لیا' وہ اپنے دوست کی نفسیات سے واقف تھا' وہ جانتا تھا یہ قہقہہ ان [illegible] دوستی میں دراڑ ڈال دے گا چنانچہ دوست نے فوراً کھڑکی سے باہر دیکھا اور مسکرا کر کہا ''آج سردی [illegible]زیادہ نہیں؟'' اس نے دوست کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا' دوست کی نظریں کھڑکی سے پھسلتی ہوئی [illegible]یں اس کے چہرے پر آئیں' دوست نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے پوچھا ''آر [illegible]یرئس'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا ''پاگل پن کی حد تک سیرئس'' اس کے دوست نے اس کا [illegible]پکڑا' دونوں کھڑکی سے چند قدم پیچھے ہٹے اور کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔

نفسیات دان دوست نے چند لمحے سوچا اور پھر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا ''میں تمہارے [illegible]یے کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا'' اس نے پوچھا ''کیوں'' وہ بولا ''اس کی تین وجوہات ہیں' نمبر ون [illegible]ری رنگت' تم سیاہ فام ہو اور امریکہ کی تاریخ میں صدر تو رہا دور آج تک کوئی سیاہ فام کسی کلیدی عہدے [illegible]نہیں پہنچ سکا۔ نمبر ٹو' تمہارا والد مسلمان تھا' تمہارا سوتیلا والد بھی مسلمان تھا اور امریکہ ابھی اتنا لبرل نہیں [illegible]کہ وہ تمہارا یہ جرم معاف کر دے اور نمبر تھری تمہارے خاندان میں آج تک کوئی سیاستدان نہیں گزرا

چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں انسان کو کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہئے جس کا اسے تجربہ نہ ہو' جس میں کامیابی کے امکانات کم ہوں اور جس کی پہلے کوئی مثال بھی موجود نہ ہو' اس کا دوست خاموش ہو گیا' اس نے غور سے دوست کی بات سنی اور اس کے بعد بولا "میرے پاس بھی اپنے اس فیصلے کی تین وجوہات ہیں۔ نمبر ون' امریکہ تبدیل ہو رہا ہے' امریکہ کے 80 فیصد لوگ مڈل کلاس ہیں' ان میں سے اکثریت گوروں کی ہے اور مجھے ان گوروں کی آنکھوں میں اپنے لئے ہمدردی محسوس ہوتی ہے' اس ہمدردی کی وجہ پانچ سو سال کا وہ جبر ہے جو گوروں نے میرے رنگ اور میری نسل سے روا رکھا' امریکہ کا مڈل کلاس گورا آج اس زیادتی پر شرمندہ ہے' میں اس شرمندگی کا فائدہ اٹھا سکتا ہوں" وہ رکا' اس نے سوچا اور دوبارہ بولا "میں نے تاریخ کا بڑے غور سے مطالعہ کیا' مجھے تاریخ نے بتایا' دنیا میں کسی قوم کا صبر کبھی ضائع نہیں جاتا' اس ملک کے سیاہ فاموں نے پانچ سو سال تک صبر کیا' مجھے محسوس ہوتا ہے اب اس صبر کے نتیجے کا وقت آ چکا ہے اور میں اس وقت کا فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ نمبر ٹو' میرا کالا رنگ اور میرے والد کا مسلمان ہونا میری سب سے بڑی طاقت ہے' میں اپنی کمزوریوں سے واقف ہوں چنانچہ میں اپنی کمزوری کو بڑی آسانی سے اپنی قوت بنا سکتا ہوں اور نمبر تھری' میں یہ سمجھتا ہوں انسان قدرت کی واحد مخلوق ہے' جس کیلئے دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں' جس انسان نے سمندر میں اترنے اور ہواؤں اور فضاؤں میں تیرنے کا فن سیکھ لیا' جس نے خلئے کے اندر کی دنیا جان لی اس انسان کیلئے امریکہ کا صدر بننا زیادہ مشکل نہیں" وہ خاموش ہو گیا' دوست نے چند لمحے سوچا اور اس کے بعد پوچھا "تم مجھے اپنی کوئی پانچ خوبیاں بتاؤ" وہ چند لمحے خاموش رہا اور اس کے بعد بولا "میری پہلی خوبی' میں ہارنے کے بعد حوصلہ نہیں ہارتا۔ دوسری خوبی میں جب کوئی کام شروع کرتا ہوں تو پھر اس میں وقفہ نہیں آنے دیتا۔ میری تیسری خوبی' میں عام لوگوں کی نفسیات سمجھتا ہوں' میں ان کے جذبات' احساسات اور ضروریات کو سمجھتا ہوں۔ میری چوتھی خوبی اخلاص ہے' میں نے آج تک کسی کو دھوکہ نہیں دیا' میں نے کبھی وعدہ نہیں توڑا' میں نے کبھی صلے کو سامنے رکھ کر نیکی نہیں کی اور میری پانچویں خوبی امید ہے' میں برے سے برے حالات میں بھی امید کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ میرے دوست میرے بارے میں کہتے ہیں اسے اگر تنور میں بھی پھینک دیا جائے تو یہ اپنے پسینے سے آگ بجھانے کی کوشش شروع کر دے گا" وہ خاموش ہو گیا' اس کے دوست نے چند لمحے سوچا اور اس کے بعد بولا "میں تمہیں ایک چھٹی خوبی کا تحفہ دینا چاہتا ہوں" وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا' دوست بولا "میں نے دنیا کے تمام بڑے لیڈروں میں ایک مشترکہ خوبی دیکھی' یہ تمام لوگ مسکراہٹ اور سنجیدگی کے استعمال کے ماہر تھے' یہ ایک منٹ میں مسکرا بھی سکتے تھے اور اسی منٹ میں ان کے چہرے پر موت جیسی سنجیدگی بھی آ جاتی تھی' تم نے جس دن سنجیدگی اور مسکراہٹ کا استعمال سیکھ لیا' تم کامیاب لیڈر ثابت ہو گے" اس کے ساتھ ہی وہ اپنی سیٹ سے اٹھا' اس

امنے جھکا اور مسکرا کر بولا "میں آپ کی کامیابی کیلئے دعا گو ہوں مسٹر پریذیڈنٹ"۔

شکا گولاء سکول کا یہ استاد بارک حسین اوباما تھا' اس نے 1996ء میں ایک ناممکن کام کا بیڑا
وہ تمام ملاقاتیوں سے پوچھتا تھا "تم امریکہ کو کیسا دیکھنا چاہتے ہو" 90 فیصد لوگ جواب دیتے تھے
امریکہ کو تبدیل ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں' اس کا اگلا سوال ہوتا تھا "تمہاری نظر میں امریکہ کے صدر کو
ونا چاہئے" اس کے جواب میں بھی نوے فیصد لوگ کہتے تھے "ایسا شخص جو امریکہ کو ہر سطح پر تبدیل کر
اس نے ان دونوں سوالوں کے جوابوں کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیا' وہ تبدیلی کا لیڈر بن گیا' اس نے
ء میں ایلینائس سٹیٹ سے سینیٹر کا الیکشن لڑا اور جیت گیا' سینٹ میں اس نے ایسے قوانین پاس
ئے جن کا اثر براہ راست عام شہری پر ہوا' جس سے اس کی شہرت میں اضافہ ہوا' اس کی یادداشت بڑی
تھی' اس نے امریکہ کے تمام چھوٹے بڑے صحافیوں کے نام رٹ لئے' وہ امریکہ کا واحد سیاستدان تھا
یس کانفرنس میں صحافیوں کو ان کے نام سے پکارتا تھا اور وہ ان کے خاندان تک سے واقف تھا۔
20ء میں اس نے قومی سینٹ کا الیکشن لڑا اور وہ امریکہ کی تاریخ کا پانچواں سیاہ فام سینیٹر بن گیا' سینٹ
کر اس نے اٹھارہ' اٹھارہ گھنٹے کام کیا' اس کو سینٹ کی تمام کارروائی' ایشوز کی بیک گراؤنڈز اور آئینی
ت کی تفصیلات تک ازبر ہوتی تھیں' اس کی اس محنت کا یہ نتیجہ نکلا وہ امریکہ کے گیارہ طاقتور ترین سینیٹرز
مار ہونے لگا' 2007ء میں اس نے خود کو صدارتی امیدوار ڈکلیئر کر دیا' امریکہ کے تمام صدارتی
وار انتخابی مہم کیلئے امیروں سے چندے لیتے ہیں لیکن اس نے چندہ جمع کرنے کی مہم غریبوں سے
ع کی' اس نے عوام سے پانچ ڈالر سے 200 ڈالر تک امداد کی درخواست کی' نتیجہ حیرت انگیز نکلا' اس
چھ ماہ میں 58 ملین ڈالر جمع کر لئے' یہ امریکی تاریخ میں ریکارڈ تھا۔ جنوری 2008ء میں اس نے
ماہ میں 36 ملین 80 ہزار ڈالر جمع کئے یہ بھی ریکارڈ تھا اور اس نے ڈیموکریٹک پارٹی کی مقبول ترین
وار ہیلری کلنٹن کو بھی صدارتی دوڑ سے باہر نکال دیا' یہ بھی ایک ریکارڈ تھا۔

بارک حسین اوباما 4 نومبر 2008ء کو امریکہ کا نیا صدر منتخب ہو گیا' اس نے 5 نومبر کی شام
نو میں قوم سے پہلا خطاب کیا' اس خطاب میں اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر نعرہ لگایا "دنیا میں کوئی
ممکن نہیں" اور اس کے ساتھ ہی شکاگو کی پوری فضا گونج اٹھی "دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں" اوباما نے
ھا' واقعی دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں' بس حوصلہ' امید' محنت' اخلاص اور وژن چاہئے اور ایک سیاہ فام
ن صرف بارہ سال میں دنیا کی واحد سپر پاور کا صدر بن جاتا ہے' بارک حسین اوباما دنیا کے ان تمام
انوں کیلئے مشعل راہ ہے جو مشکل کو ناممکن سمجھتے ہیں' جنہیں اپنی ذات اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقین
ں' جو خود کو حقیر اور کمزور سمجھتے ہیں۔

خواب تو خواب ہیں

''تم گوروں کے ایوان میں نہیں بیٹھ سکتے'' یہ وہ الفاظ تھے جو نومبر 1868ء میں امریکی ایوان نمائندگان میں گونجے اور جان ولز مینارڈ کا سیاہ رنگ سرخ ہوگیا' وہ اپنی نشست سے اٹھا اور سپیکر کو مخاطب کر کے بولا ''جناب عالی میں بھی دوسرے معزز ارکان کی طرح عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آیا ہوں' مجھے اس ایوان میں بیٹھنے اور بولنے کیلئے بھیجا گیا ہے' اگر مجھے بولنے اور بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی تو یہ جمہوریت کی توہین ہوگی'' ابھی مینارڈ کی بات جاری تھی کہ ایوان کے گورے ارکان نے اس کے خلاف نعرے لگانا شروع کر دیئے' وہ اونچی آواز میں چلا رہے تھے' ہم اس ایوان میں کسی کالے کو برداشت نہیں کر سکتے' مینارڈ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جان ولز مینارڈ امریکہ کی تاریخ کا پہلا سیاہ فام رکن اسمبلی تھا' امریکہ میں 1860ء تک سیاہ فام باشندوں کو صرف ایک ہی حق حاصل تھا اور وہ حق تھا غلامی۔ ابراہم لنکن نے 1860ء میں امریکہ میں غلامی کے خاتمے کا اعلان کیا جس کے بعد امریکہ کے تمام کالے آزاد ہوگئے۔ جان ولز مینارڈ نے اس آزادی کو حقیقت سمجھ لیا' وہ الیکشن میں کھڑا ہوا اور 1868ء میں رکن اسمبلی منتخب ہو کر ایوان نمائندگان میں داخل ہوگیا۔ وہ ایوان کے دوسرے ارکان کی طرح کرسی پر بیٹھنے لگا تو ایک گورے رکن نے اس کے بیٹھنے کے حق کو چیلنج کر دیا' جان ولز مینارڈ نے اس زیادتی پر احتجاج کیا لیکن اس کی آواز جلد ہی گوروں کی سرخ زبان تلے دب گئی اور اسے بالآخر ایوان سے باہر نکلنا پڑ گیا۔ جان ولز مینارڈ کا تعلق غلاموں کی نسل سے تھا' یہ نسل امریکہ کیسے پہنچی؟ اس کے بارے میں دو تھیوریاں تھیں' 30 ہزار سال پہلے امریکہ اور ایشیا کے درمیان پندرہ سو کلو میٹر لمبی ایک پٹی ہوتی تھی' اس پٹی پر سفر کرتے ہوئے ایشیا اور افریقہ کے باشندے امریکہ پہنچے تھے بعد ازاں دنیا میں طوفان اور سیلاب آئے' سمندروں کا پانی بلند ہوا اور یہ پٹی سمندر میں ڈوب گئی جس کے بعد امریکہ اور ایشیا کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ 1492ء تک یورپ' افریقہ' ایشیا اور مشرق بعید کے ممالک امریکہ کے وجود سے ناواقف رہے' 1492ء میں کرسٹوفر کولمبس بھارت جانے کیلئے سپین سے نکلا اور غلطی سے امریکہ کے ساحل پر جا اترا تو وہ نئی دنیا دیکھ کر حیران رہ گیا' لاکھوں کروڑوں میل تک جنگلات پھیلے تھے' ان جنگلات میں کروڑوں جانور پھر رہے تھے اور ان کروڑوں جانوروں کے درمیان مختلف نسلوں کے لاکھوں انسان رہ رہے تھے'

[...]بس جنوری 1493ء میں امریکہ سے واپس سپین پہنچا تو اس کے پاس سینکڑوں کی تعداد میں سگار اور [...]ں کے بیج تھے' ان بیجوں اور سگاروں نے یورپ کو نیا راستہ دکھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے سپین' فرانس' [...]انیہ' جرمنی' بلجیئم اور ہالینڈ کے ہزاروں لوگ امریکہ روانہ ہو گئے۔ ان لوگوں نے امریکہ میں سینکڑوں [...]یاں بسائیں' یہ لوگ جنگل کاٹنے لگے' کانیں کھودنے لگے' جانوروں کا شکار کرنے لگے اور جانوروں کی [...]الیں اور دانت اتارنے لگے اور یہ سارا مال بعد ازاں یورپ میں ایکسپورٹ ہونے لگا' اسی دوران [...]لی امریکہ میں کپاس اور تمباکو کے بڑے بڑے فارم بھی بنائے گئے' یورپی باشندوں نے شروع شروع [...] مقامی لوگوں کو غلام بنایا لیکن آنے والے دنوں میں یہ لوگ کم پڑ گئے چنانچہ یورپی جاگیردار غلاموں [...]تلاش میں افریقہ کے ساحلوں پر جا اترے' یہ لوگ افریقہ کے جنگلوں میں جال لگا کر سیاہ فام لوگوں کو [...]تے اور انہیں غلاموں کیلئے خصوصی طور پر ڈیزائن کردہ بحری جہازوں میں جا پھینکتے' یہ سات' سات [...]ل کے جہاز ہوتے تھے جن میں تختوں پر لوہے کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لگی ہوتی تھیں' غلاموں کو ان [...]یوں میں جکڑ دیا جاتا تھا' یہ لوگ چار ماہ تک اسی جگہ جکڑے رہتے تھے' یہیں پر پیشاب کرتے تھے [...]یہیں پر انہیں کھانا دیا جاتا تھا۔ امریکہ پہنچ کر ان کی منڈیاں لگتی تھیں اور یہ جانوروں کی طرح بیچ دیئے [...]تے تھے' نئے مالکان انہیں جانوروں کی طرح باڑوں میں رکھتے تھے' یہ لوگ اٹھارہ' اٹھارہ گھنٹے کانوں' [...]توں اور باڑوں میں کام کرتے تھے' یہ لوگ سات نسلوں تک اسی صورتحال کا شکار رہے' ان کی [...]ریت مسلمان تھی لیکن غلامی نے انہیں عیسائی بنا دیا' پھر ان کی زندگی میں ابراہم لنکن آیا اور اس نے 186[...]ء میں انہیں غلامی سے آزاد کر دیا۔ ابراہم لنکن کا تعلق ری پبلکن پارٹی سے تھا چنانچہ امریکہ کے [...]ہ فام سو سال تک ری پبلکن پارٹی کو ووٹ دے کر ابراہم لنکن کی مہربانی کا قرض اتارتے رہے۔

ابراہم لنکن نے انہیں آزادی تو دے دی لیکن انہیں امریکہ میں انسانی حقوق نہ مل سکے' ان [...]بچوں کو گوروں کے سکول میں داخلے نہیں ملتے تھے' یہ لوگ گوروں کی بسوں اور ٹرینوں میں سفر نہیں کر [...]تے تھے' بیکریوں' سینما گھروں اور مارکیٹوں میں گوروں اور کالوں کی الگ الگ قطاریں لگتی تھیں حتیٰ کہ [...]لوگوں کے چرچ تک الگ ہوتے تھے' یہ لوگ دنیا کی جدید ترین ریاست میں قدیم ترین زندگی گزار [...]ہے تھے لیکن پھر 1950ء میں انہیں مارٹن لوتھر کنگ کی شکل میں ایک نجات دہندہ مل گیا' مارٹن لوتھر سیاہ [...]م پادری تھا' ایک دن اس نے ایک سفید فام شخص کو بائبل پیش کی لیکن اس شخص نے اس کے کالے [...]ھوں سے بائبل لینے سے انکار کر دیا' یہ وہ لمحہ تھا جب مارٹن لوتھر کنگ نے اس نظام کو للکارنے کا فیصلہ کیا' [...]ں نے کالوں کو جمع کیا اور سیاہ فاموں کے حقوق کیلئے لانگ مارچ شروع کر دیئے' مارٹن لوتھر کنگ کو اللہ

تعالیٰ نے تقریر کے فن سے نواز رکھا تھا' وہ بولتا تھا تو اس کے لفظ سننے والوں کے دل کی دھڑکن بن جاتے تھے' مارٹن لوتھر نے اپنی تقریروں سے پورے امریکہ میں آگ لگا دی' انہی دنوں جان ایف کینیڈی ڈیموکریٹک پارٹی کا صدارتی امیدوار بنا' کینیڈی اور لنڈن بی جانسن نے مارٹن لوتھر کنگ کے مطالبہ کو اپنا صدارتی نعرہ بنالیا' کینیڈی 20 جنوری 1961ء میں منتخب ہوا تو اس نے صدر بنتے ہی سیاہ فام باشندوں کو سفید فام لوگوں کے برابر حقوق دے دیئے۔ یوں مارٹن لوتھر کنگ کا ایک خواب پورا ہو گیا' اس کے کالے بچے گورے آقاؤں کے بچوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو گئے لیکن ابھی دوسرا خواب دور تھا۔

امریکہ کی سیاہ فام نسل کو جس زمانے میں برابری کے حقوق ملے تھے اسی دور میں کینیا کا ایک غریب مسلمان طالب علم امریکہ پہنچا' اس کا نام بارک حسین اوبامہ تھا' اس نے اپنی کلاس فیلو این ڈنہم کے ساتھ شادی کی' وہ دونوں دو سال تک اکٹھے رہے' ان دو سالوں کی ایک نشانی بارک حسین اوبامہ جونیئر کی شکل میں ظاہر ہوئی' میاں بیوی کے درمیان طلاق ہوئی' بارک حسین اوبامہ واپس کینیا چلا گیا لیکن وہ اپنی جدوجہد کی ایک نشانی امریکہ میں چھوڑ گیا' بارک حسین اوبامہ جونیئر نے زندگی کی سختیوں کو اپنا ہتھیار بنایا' وہ کولمبیا اور ہارورڈ یونیورسٹی سے ہوتا ہوا معاشرے میں اترا' اس نے سیاست شروع کی اور اس خواب کی تعبیر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جو اس کے سیاہ فام آباؤ اجداد نے دیکھا تھا' اس نے 21 ماہ قبل صدارتی مہم شروع کی' پوری دنیا کا خیال تھا وہ یہ مہم سر نہیں کر سکے گا کیونکہ سفید امریکی ذہن وائٹ ہاؤس میں کبھی کسی سیاہ بدن کی پرچھائی نہیں پڑنے دے گا لیکن پھر 5 نومبر 2008ء کو یہ معجزہ ہو گیا۔ ایک ایسا سیاہ فام شخص جس کے نام میں اسلام کی نشانی موجود تھی' وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا صدر بن گیا۔ بارک حسین اوبامہ کا سیاہ رنگ جیت گیا۔ میں جب ٹیلی ویژن پر اسے شکاگو کے سٹیڈیم میں لاکھوں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے اللہ کی شان پر لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ کینیا دنیا کا وہ ملک تھا جس سے امریکیوں نے 1541ء میں پہلی بار غلام درآمد کیے تھے' یہ غلام مسلمان تھے اور صدیوں کے جبر نے ان لوگوں کو کلمہ تک بھلا دیا تھا لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اسی کینیا سے ایک مسلمان امریکہ بھجوایا اور یہ مسلمان امریکہ میں تبدیلی کی ایک ایسی "جاگ" لگا گیا جس نے آنے والے دنوں میں دنیا کے تمام سیاہ فاموں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ یہ بارک اوبامہ مذہباً عیسائی ہے لیکن اس کے نام کے درمیان حسین آتا ہے اور یہ حسین آنے والے دنوں میں کیا شکل اختیار کرتا ہے ہم آج کے دن میں بیٹھ کر اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اللہ کے رنگ بھی عجیب ہیں' وہ جب عقل کو حیران کرنا چاہتا ہے تو وہ بتوں کو کعبے کی حفاظت کی ذمہ داری سونپ دیتا ہے' وہ امریکہ جیسی طاقتوں کے اندر

حسین اوبامہ جیسے لوگ پیدا کر دیتا ہے اور وہ فرعونوں کو اندر سے موت دے دیتا ہے لہٰذا ہو سکتا ہے
یکہ کے کالوں کو صدیوں کی غلامی سے آزادی دینے والا یہ بارک اوبامہ آنے والے دنوں میں دنیا بھر
مسلمانوں کا نجات دہندہ بھی بن جائے۔ دنیا میں صرف اللہ تعالیٰ ہے جو ناممکنات کو ممکنات میں
یل کر سکتا ہے' ہو سکتا ہے یہ بارک حسین اوبامہ ہمارے آج کے ناممکن کو بھی ممکن بنا دے۔ خواب تو
ب ہیں اگر مارٹن لوتھر خواب دیکھ سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں دیکھ سکتے۔

⊘ ⊘ ⊘

”ہم شرمندہ ہوں گے“

پادری دعا کیلئے آگے بڑھا' اس کے سامنے 20 لاکھ لوگ موجود تھے جبکہ ٹیلی ویژن سکرینوں کے ذریعے پوری دنیا اسے دیکھ رہی تھی' پادری نے مجمعے کی طرف دیکھا اور بولا ”یہ ہمارے خدا کی دین اور ہمارے معاشرے کی ترقی کا ثبوت ہے کہ آج افریقہ کے ایک مہاجر کا بیٹا دنیا کی واحد سپر پاور یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ کا صدر بن گیا“ پورے مجمعے نے نعرے لگائے اور تالیاں بجائیں' حلف کی تقریب کے آخر میں بارک حسین اوبامہ نے خطاب کیا' اس خطاب میں انہوں نے اعتراف کیا ”میرے والد کا تعلق کینیا کے ایک پسماندہ گاؤں سے تھا' وہ تارک وطن تھے' انہوں نے امریکہ میں پناہ لی تھی' وہ سکالر تھے لیکن غربت اور مالی کسمپرسی کا شکار تھے چنانچہ وہ ساٹھ برس قبل ریستوران میں ویٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے“ صدر اوبامہ کے اس اعتراف پر لوگوں کی آنکھیں بھیگ گئیں اور انہوں نے ”یس وی کین اوبامہ“ کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔

20 جنوری 2009ء امریکہ کی اخلاقی فتح اور اس کے نظام کی کامیابی کا دن تھا اور ہم اگر چند لمحوں کیلئے اپنا تعصب' اپنی نفرت اور امریکہ کے خلاف اپنی رنجش ایک طرف رکھ دیں اور امریکہ کی جمہوری خوبیوں کا تجزیہ کریں تو ہمیں امریکہ کی کامیابی اور عروج کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔ امریکہ صرف تعلیم' معیشت' انڈسٹری' ٹیکنالوجی اور انفراسٹرکچر میں پوری دنیا سے آگے نہیں بلکہ اس کی اصل خوبصورتی' اس کی اصل طاقت اس کی جمہوریت' اس کا نظام ہے اور یہ وہ نظام ہے جس کی بنیاد آج سے چودہ سو سال پہلے نبی اکرم ﷺ نے مدینہ میں رکھی تھی۔ اسلام کے ظہور سے قبل عرب طبقاتی تقسیم کا شکار تھے' ان کی اشرافیہ کو سات قتل معاف تھے جبکہ غلاموں کو پورے کپڑے پہننے' حرم میں داخل ہونے اور بنو ہاشم کے کنوئیں سے پانی تک پینے کی اجازت نہیں تھی لیکن پھر اسلام کا ظہور ہوا اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے عربی اور عجمی اور گورے اور کالے کی تمیز ختم کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے شام کی طرف پہلا لشکر بھجوایا تو اس کا سالار ایک غلام زادے اسامہ بن زید کو بنایا اور عرب کے بڑے بڑے سرداروں کو ان کا ماتحت بنا دیا۔ نبی اکرم ﷺ کے وصال کے بعد یہ لشکر واپس لوٹ آیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے

سے دوبارہ روانہ کیا اور خود اس غلام زادے کے گھوڑے کی رکاب پکڑ کر لشکر کو مدینہ سے باہر دور تک چھوڑنے گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے جب حضرت خالدؓ بن ولید کو معزول کیا تو انہوں نے دنیا کے سب سے بڑے سپہ سالار کی گرفتاری کا فریضہ غلام ابن غلام حضرت بلال حبشیؓ کو سونپا' حضرت بلالؓ حضرت خالدؓ بن ولید کے قریب پہنچے' انہیں خلیفہ کا پیغام سنایا' ان کی پگڑی کھول کر اس سے ان کے ہاتھ باندھے اور انہیں سوا لاکھ جوانوں کے لشکر کے درمیان سے لے کر مدینہ روانہ ہو گئے اور کسی کو اُف تک کرنے کی جرأت نہ ہوئی' یہ اسلام کی وہ خوبی تھی جس نے مسلمانوں کو دنیا کی سپر پاور بنا دیا لیکن پھر اسلام کی یہ خوبی زوال پذیر ہوئی اور اسلامی مساوات خاندانوں' حسب نسب اور ”پدرم سلطان بود“ کی نخوت تلے روند دی گئی اور یوں سمندروں جیسی وسیع اسلامی ریاست چھوٹے چھوٹے بدبودار جوہڑوں میں تبدیل ہو گئی جبکہ ہمارے دشمنوں نے اسلام کی یہ خوبی ”ہائی جیک“ کر لی چنانچہ آج سیاہ رنگ کا ایسا معمولی پروفیسر جس کا مسلمان والد 60 سال قبل غربت سے تنگ آ کر کینیا سے امریکہ پہنچا تھا اور جو تعلیمی اخراجات پورے کرنے کیلئے ریستوران پر ویٹری کرتا تھا وہ دنیا کی اس واحد سپر پاور کا صدر بن گیا ہے جس کا دفاعی بجٹ چار سو بلین ڈالر ہے' جس کا ایک ”اوکے“ گیارہ منٹ میں آدھی دنیا کو صفحہ ہستی سے مٹا سکتا ہے اور جس کی ایک ہاں پاکستان جیسے درجنوں ملکوں کو خوشحال اور رئیس بنا سکتی ہے۔ افسوس کا مقام ہے وہ اسلام جس نے دنیا میں پہلی بار گورے اور کالے کی تمیز ختم کی تھی اس کے ماننے والے تو آج غیر عربی کو عمرے تک کی اجازت نہیں دیتے' وہ تین تین نسلوں سے اپنے ملک میں رہنے والے مسلمانوں کو شہریت نہیں دیتے اور وہ آج بھی خارجی کہہ کر غیر عربی مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں جبکہ اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ملک نہ صرف کینیا کے ایک کالے مسلمان کی اولاد کو اپنا صدر منتخب کر لیتا ہے بلکہ اس کا اسلامی نام ”بارک حسین اوبامہ“ بھی تسلیم کر لیتا ہے۔ افسوس صد افسوس برابری' مساوات' انسانی حقوق اور انسانیت کو قانون کی شکل دینے والے مذہب کے پیروکار تو کم تر نسل کے مسلمان کے ہاتھ سے پانی نہیں پیتے جبکہ مسلمانوں کے دشمن امریکہ کے تخت پر ایک کالا بیٹھ گیا اور پورے امریکہ کے گورے جشن منا رہے ہیں۔

میں آج کے دن دنیا بھر کے مسلمانوں کو دعوت دیتا ہوں' وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیں اسلامی جمہوریہ پاکستان کا کوئی ایسا سیاہ فام پروفیسر جس کا والد ریستوران میں ویٹر رہا ہو کیا وہ کسی اسلامی ملک کا صدر یا وزیراعظم بن سکتا ہے؟ کیا سعودی عرب' متحدہ عرب امارات' کویت' عراق' شام' مصر' اردن اور انڈونیشیا سمیت 58 اسلامی ممالک میں کوئی سیلف میڈ' کوئی غریب انسان' کوئی مہاجر اور

کوئی ایسا باشندہ جس کا والد کسی دوسری قومیت اور رنگ سے تعلق رکھتا ہو وہ ان ملکوں کا سربراہ منتخب ہو سکتا ہے؟ مجھے یقین ہے صدر‘ وزیراعظم یا بادشاہ تو بڑی دور کی بات ہے ہمارے 58 اسلامی ملکوں میں کوئی غریب‘ کوئی خارجی اور کوئی کالا (افریقی اسلامی ممالک کے سوا) پارلیمانی امور تک کا وزیر نہیں بن سکتا اور یہ وہ بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے آج امریکہ ان داتا اور اسلامی دنیا بھکاری ہے۔ آپ کو اگر یقین نہ آئے تو آپ عربوں کا وہ دور نکال کر دیکھ لیجئے جب ابولہب اور ابوجہل جیسے سردار کالے غلاموں کو خانہ کعبہ کے سائے تک میں نہیں بیٹھنے دیتے تھے اور پھر آپ وہ دور دیکھ لیجئے جب حضرت بلال حبشیؓ کی اذان پر مدینہ کے سارے سردار نماز کیلئے مسجد نبویؐ میں حاضر ہوتے تھے اور ایک سردار زادہ (حضرت خالدؓ بن ولید) اپنے ہاتھ بوڑھے حبشی غلام (حضرت بلالؓ) کے آگے کر دیتا تھا اور وہ اسلام کے سب سے بڑے سپہ سالار کے ہاتھ اسی کی پگڑی سے باندھ دیتا تھا۔ آپ دونوں ادوار کا موازنہ کر لیجئے‘ آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی طبقاتی تقسیم کے دور میں عرب غلام بھی تھے‘ مفلس بھی‘ بے آسرا بھی اور بے حیثیت بھی لیکن جب معاشرے میں مساوات آئی تو مدینہ پوری دنیا کا دارالحکومت بن گیا۔ مسلمانوں کے پاس اتنی دولت آئی کہ پوری اسلامی ریاست میں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں ہوتا تھا اور ایک عام عربی سردار روزانہ ہزار ہزار مہمانوں کو کھانا کھلاتا تھا۔

دنیا کی دس ہزار سال کی تاریخ کا متفقہ فیصلہ ہے جس معاشرے میں مساوات‘ برابری اور تمام شہریوں کیلئے ترقی کے یکساں مواقع نہیں ہوتے ان معاشروں میں خوشحالی‘ طاقت اور اطمینان نہیں آتا۔ آپ یقین کیجئے آج اگر امریکا ایک سیاہ فام باشندے کو اقتدار منتقل نہ کرتا تو امریکا کو ٹوٹتے‘ بکھرتے اور زوال پذیر ہوتے دیر نہ لگتی۔ یہ اسلامی اصول صرف قوموں اور ملکوں تک محدود نہیں بلکہ میرا ذاتی تجربہ ہے جس سیاسی جماعت‘ تنظیم‘ ادارے‘ محکمے‘ کمپنی‘ فیکٹری اور فرم میں بھی اس اصول کی پیروی ہوتی ہے وہ فرم‘ وہ ادارہ اور وہ سیاسی جماعت بے تحاشا ترقی کرتی ہے۔ میرا مشاہدہ ہے جس دکان‘ فیکٹری اور ادارے میں ملازمین اور مالکان اور ورکرز اور افسروں میں مساوات ہوتی ہے‘ جس سیاسی جماعت میں بارک اوبامہ جیسے لوگوں کیلئے ترقی کے راستے کھلے ہوتے ہیں اور جس محکمے میں گورے اور کالے اور چھوٹے اور بڑے برابر ہوتے ہیں وہ آگے بھی بڑھتے ہیں اور مضبوط بھی ہوتے ہیں۔ آپ نے کبھی سوچا پاکستان میں فوج کا ادارہ کیوں مضبوط ہے اور سیاسی جماعتیں کیوں زوال پذیر ہیں؟ اس کی وجہ یکساں مواقع ہیں‘ فوج میں آج بھی جنرل اشفاق پرویز کیانی جیسے لوئر مڈل کلاس بیک گراؤنڈ کے افسر آرمی چیف بن جاتے ہیں‘ فوج میں آج بھی جنرلوں کے صاحبزادے اور کلرکوں کے بچے ایک ہی

ل سے گزر کر اوپر آتے ہیں جبکہ ہماری سیاسی جماعتوں میں چند اعلیٰ خاندانوں کا قبضہ ہے یا ان پر یف کیس مافیا قابض ہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں میں باراک حسین اوبامہ جیسے مڈل کلاسیئے لیکن ینوئن سیاسی کارکن اوپر نہیں آسکتے۔ آپ پورے ملک کی سیاسی جماعتوں کا پروفائل نکال لیجئے اور غور یجئے آپ کو ایم کیو ایم اور جماعت اسلامی کے علاوہ کسی سیاسی جماعت کی بالائی صف میں مڈل کلاس ھائی نہیں دے گی اور یہ وہ وجہ ہے جس پر ہم جتنا غور کریں‘ ہمیں اتنی ہی شرم آئے گی‘ ہم شرمندہ ہوں ے۔

امریکہ کے نظام کی دوسری خوبی ٹرانسفر آف پاور یا اقتدار کی منتقلی کا طریقہ ہے‘ یہ طریقہ کیا یئے میں اس کی وضاحت کل کروں گا۔

⊘ ⊘ ⊘

اُداس نسل

پاکستان بنا تو میرے والد کی عمر بارہ تیرہ سال تھی' وہ گاؤں کے دوسرے بچوں کے ساتھ جنگل میں جانور چرا رہے تھے' شہر سے ڈاکیا آیا اور اس نے سب بچوں کو جمع کر کے خوشخبری سنائی "ہمارے دیس کا نام بدل گیا ہے اب ہم ہندوستان کے بجائے پاکستان کے شہری ہیں" میرے والد نے حیرت سے پوچھا "اس سے کیا فرق پڑے گا" ڈاکیے نے بتایا "بے وقوفو! ہم آزاد ہو گئے ہیں" میرے والد نے فوراً جذباتی ہو کر پوچھا "اس کا مطلب ہے انگریز یہاں سے چلے جائیں گے اور اب ہمارے سارے صاحب دیسی ہوں گے" ڈاکیے نے فوراً اثبات میں سر ہلایا اور سائیکل پر بیٹھ کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا' اس نے شام تک پانچ دیہات میں یہ خوشخبری سنائی تھی' یہ پاکستان کے ساتھ میرے والد کا پہلا تعارف تھا' میرے والد انتہائی سیلف میڈ شخص ہیں' انہوں نے دو کلاس تک تعلیم پائی' گاؤں کی زندگی اور دشمنیاں ترک کیں' شہر میں آ کر دکانداری سے سٹارٹ لیا' پچاس برس تک مسلسل محنت کی اور لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کمائے' وہ پوری زندگی سچے اور پکے پاکستانی رہے' وہ اخبار نہیں پڑھ سکتے لیکن جب میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا تو انہوں نے گھر میں اخبار لگوایا اور مجھے اخبار پڑھنے کی "لت" ڈال دی' انہوں نے ایک منشی رکھا ہوا تھا' یہ منشی انہیں روزانہ اخبار پڑھ کر سناتا تھا' انہوں نے 1971ء میں ٹیلی ویژن لیا اور آج تک پی ٹی وی کا خبرنامہ سنتے ہیں' 1999ء میں انہوں نے سیلف ریٹائرمنٹ لے لی' اپنا سارا کاروبار بند کیا' اپنی ساری جائیداد فروخت کر دی اور رقم ہم سب بہن بھائیوں میں تقسیم کر دی اور باقی زندگی ٹیلی ویژن کیلئے وقف کر دی' وہ روز صبح حقہ تازہ کرتے ہیں اور رات گئے تک ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں چنانچہ پاکستان کے کس شعبے میں کیا ہو رہا ہے' دنیا کے کس ملک کے سیاسی حالات کیا ہیں اور کون سے رہنما نے کیا کہا تھا وہ سب کچھ جانتے ہیں۔

میرے والد نے زندگی میں صرف دو بڑے سفر کئے' وہ ایک بار میرے ساتھ عمرے کیلئے گئے اور ایک مرتبہ انہوں نے حج کیا' پچھلے مہینے انہوں نے ایک عجیب فرمائش کی' انہوں نے فرمایا "میں ملک سے باہر جانا چاہتا ہوں" میں نے پوچھا "ابا جی کہاں؟" انہوں نے فرمایا "میں آزاد ملکوں میں جانا چاہتا

ں' میں ایسے ملکوں ایسے شہروں میں پھرنا چاہتا ہوں جہاں لوگ قول' فعل اور سوچ میں آزاد ہوں' جہاں ...فارم والے حکمران نہ ہوں' جہاں کے سیاستدان کی زبان میں ضمیر بولتا ہو اور جہاں پولیس احتجاج ...نے والوں پر ڈنڈے نہ برساتی ہو" میں نے حیرت سے پوچھا "ابا جی میں آپ کی بات نہیں سمجھا" وہ ...لے "ہمارے گاؤں کے ڈاکیے نے مجھے 13 سال کی عمر میں آزادی کی خوشخبری سنائی تھی' میں اس وقت ...ر سے نکل آیا تھا' آج مجھے گاؤں سے نکلے ساٹھ سال ہو چکے ہیں لیکن مجھے اس ملک میں کہیں آزادی ...یں ملی' مجھے محسوس ہوتا ہے پچھلے ساٹھ برسوں میں صرف میرے آقا بدلتے چلے آ رہے ہیں' 1947ء ...ے پہلے برطانیہ سے کوئی لارڈ آ جاتا تھا اور 1947ء کے بعد کوئی فیلڈ مارشل یا کوئی جرنیل میرے اوپر ...مت شروع کر دیتا ہے' 1947ء سے پہلے انگریز ہمیں ڈنڈے مارتے تھے' ہمیں سڑکوں پر گھسیٹتے اور ...وں میں پھینکتے تھے اور آج ہمیں ہماری اپنی پولیس مار رہی ہے' مجھے آج محسوس ہوتا ہے یہ ملک آزاد ...یں ہوا چنانچہ میں مرنے سے پہلے کوئی آزاد ملک دیکھنا چاہتا ہوں' تم خدا کیلئے مجھے کوئی آزاد ملک دکھا ...میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے اپنے والد سے وعدہ کیا میں آپ کو یورپ لے کر جاؤں گا' ...ان کے کاغذات بنانے اور ویزے لگوانے میں ایک مہینہ لگ گیا' اسی دوران میرے بزرگ دوست ...مہربان جسٹس رانا بھگوان داس نے بھی یورپ میں دس پندرہ دن چھٹی گزارنے کا پروگرام بنا لیا' ...ٹس صاحب کا فرمانا تھا اگر آپ بھی وقت نکال لیں تو اکٹھے چلے جاتے ہیں' میں نے ابا جی کا بتایا تو ...ں نے فرمایا انہیں میرے ساتھ بھجوا دیں' میں نے ابا جی سے بات کی لیکن انہوں نے فرمایا "ہم عید ...ے بعد جاتے ہیں" جبکہ جسٹس صاحب نے دو اکتوبر کو روانہ ہونے کا پروگرام بنا رکھا تھا' میں نے اس ...لب سے اپنی مصروفیات ترتیب دے دیں لیکن پھر 28 اور 29 ستمبر کے دن آئے' پہلے سپریم کورٹ ...فیصلے نے پوری قوم کا دل توڑا اور اس کے بعد 29 ستمبر کو حکومت نے میڈیا کے کارکنوں اور وکلاء پر ...یت کی انتہا کر دی' آج کی دنیا کیلئے ایسے اقدامات اور مناظر ناقابل یقین ہیں' آج دنیا کے بدترین ...ر اور سنگدل ترین حکومتیں بھی کاغذ' قلم اور کیمرے کا احترام کرتی ہیں لیکن پولیس نے حکومت کی ایما ...س طرح روزہ دار صحافیوں پر تشدد کیا اور سڑک پر لٹا کر جس طرح ان پر ڈنڈے برسائے دنیا کی تاریخ ...یں اس کی مثال نہیں ملتی' میرے والد ٹیلی ویژن پر یہ منظر دیکھ رہے تھے' انہوں نے مجھے فون کیا اور حکم دیا ...یں فوراً باہر جانا چاہتا ہوں' میرا دم گھٹ رہا ہے" میں نے عرض کیا "لیکن عید" انہوں نے فرمایا میں عید ...ں باہر منانا چاہتا ہوں" میں فوراً ٹریول ایجنسی گیا اور اپنا اور اپنے والد کا ٹکٹ خرید لایا' آپ جس وقت ...طریں پڑھ رہے ہوں گے میں اس وقت اپنے والد کے ساتھ پیرس پہنچ چکا ہوں گا اور جسٹس رانا

بھگوان داس بھی ہمیں ایک دن بعد جوائن کر لیں گے' میں عید تک واپس آ جاؤں گا جبکہ میرے والد ویزے کے خاتمے تک یورپ میں رہیں گے۔

میں نے کل اپنے والد سے پوچھا ''آپ کو پاکستان کا کون سا فوجی حکمران نسبتاً بہتر لگا'' انہوں نے فوراً فرمایا ''ایوب خان'' میں نے وجہ پوچھی تو وہ بولے ''ایوب خان کو عوام نے ایک بار گالی دی تھی اس نے اسی وقت استعفیٰ دیا اور گھر چلا گیا جبکہ اس کے بعد جو بھی فوجی حکمران آیا وہ پاکستان توڑ کر واپس گیا یا پھر اس نے مر کر جان چھوڑی'' وہ رکے اور دوبارہ بولے ''صدر پرویز مشرف بھی نہیں جائے گا'' میں نے پوچھا ''کیوں'' وہ بولے ''کیونکہ یہ صدر ایوب خان نہیں ہے'' میرے والد خاموش ہو گئے جبکہ میں دیر تک سوچتا رہا' میں نے ذرا سی خاموشی کے بعد اباجی سے پوچھا ''کیا صدر مشرف نے پاکستان کو کچھ نہیں دیا'' اباجی ذرا سے مسکرائے اور بولے ''صدر مشرف نے عوام کو غصہ اور شدت دی ہے' موجودہ حالت نے لوگوں کو حساس اور جذباتی بنا دیا ہے' اب لوگوں میں برداشت نہیں رہی چنانچہ پورا ملک اب ایک دوسرے کے ساتھ الجھ اور لڑ رہا ہے' لوگ خودکشیوں اور خودکش حملوں کے بارے میں سوچتے ہیں' اب وزراء عوام میں نہیں جا سکتے اور ہمارے فوجی جوان چھاؤنیوں سے باہر نہیں نکل سکتے' حکومت نے عوام کو یہ تحفہ دیا ہے'' میرے والد پیکنگ کیلئے چلے گئے اور میں سوچنے لگا اگر ملک اور قوم کے سیاسی اور سماجی حالات اسی طرح جاری رہے اور آج سے دس پندرہ برس بعد میرے بچوں نے بھی مجھ سے یہی مطالبہ کر دیا' اگر انہوں نے بھی مجھ سے یہ کہہ دیا ''ہمارا دم گھٹتا ہے اور ہم زندگی میں کوئی آزاد اور خودمختار ملک دیکھنا چاہتے ہیں'' تو اس وقت میری جذباتی حالت کیا ہو گی اور میں اپنے آپ کو کیا جواب دوں گا' آج میں اپنے آپ کو بری طرح ایک اداس نسل سمجھ رہا ہوں' میں ایک ایسی اداس نسل ہوں جو اپنے بزرگوں کو ایک پرسکون ملک اور اپنے بچوں کو ایک ترقی پذیر اور مہذب معاشرہ نہیں دے سکی' جس کا ملک تو کامیاب ہے لیکن خود وہ ناکام ہو چکی ہے' آیئے ہم سب اپنی ناکامی تسلیم کر لیں' ہم مان لیں ہم نے اداس نسل بن کر زندہ رہنا ہے اور اپنی طبعی عمر پوری کر کے اداسی کے قبرستان میں دفن ہو جانا ہے' آیئے ہم تسلیم کر لیں ہم اپنے بزرگوں کو سکھ دے سکتے ہیں اور نہ ہم اپنے بچوں کو تحفظ' ہم ایک ہاری ہوئی قوم ہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

اورنگ زیب ثانی

ڈاکٹر خالد رانجھا ملک کے نامور قانون دان ہیں' وہ وفاقی وزیر قانون رہے اور آخری
لاعات تک وہ مسلم لیگ ق سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پچھلے دنوں نگران وزیراعظم اور
مین سینٹ محمد میاں سومرو کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ سنایا تھا' ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا ''میں
زندگی میں اتنا شائستہ' مہذب' منکسر المزاج اور عاجز سیاستدان نہیں دیکھا' میں چند سینیٹرز کے ہمراہ
رو صاحب کے ساتھ عمرے کی ادائیگی کیلئے حجاز مقدس گیا تھا' خانہ کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے
رو صاحب نے جیب سے بڑا شاپنگ بیگ نکالا اور ساتھیوں سے فرمایا' آپ تمام لوگ اپنے اپنے
تے اس بیگ میں ڈال دیں' ہم سب لوگوں نے سمجھا سومرو صاحب جوتے شاپنگ بیگ میں ڈال کر
ی ستون کے پیچھے رکھ دیں گے یا جوتوں کے کسی ریک میں فٹ کر دیں گے چنانچہ ہم نے اپنے اپنے
تے ان کے شاپنگ بیگ میں ڈال دیئے' اس کے بعد سومرو صاحب نے یہ بیگ اٹھایا اور طواف میں
ل ہو گئے''۔ ڈاکٹر خالد رانجھا کے بقول یہ وہ لمحہ تھا جس نے تمام سینیٹرز کے ماتھے بھگو دیئے' تمام لوگ
مندگی کے شدید احساس میں ڈوب گئے اور اسی احساس کے ساتھ ان تمام سینیٹرز نے طواف مکمل کیا'
ف کے بعد بھی سینیٹرز نے سومرو صاحب سے جوتوں کا بیگ واپس لینے کی کوشش کی لیکن انہوں نے
ے عمرے کے دوران یہ بیگ اٹھائے رکھا' ڈاکٹر خالد رانجھا کا فرمانا تھا ''یہ میری زندگی کا حیران کن
تھا اور میں نے آج تک ان سے بڑا درویش سیاستدان اور فقیر منش حکمران نہیں دیکھا'' ڈاکٹر
حب جب یہ واقعہ سنا رہے تھے تو اس وقت وہاں چار لوگ موجود تھے اور ان چاروں میں ایک میں بھی
میں نے خود کو متاثر ہونے سے بچانے کی پوری کوشش کی لیکن میری کوشش کامیاب نہ ہوئی اور میں
رو صاحب کی ذات سے پوری طرح متاثر ہو گیا۔ مجھے یہ واقعہ حقیقی لگا کیونکہ میں خود محمد میاں سومرو کی
زی اور انکساری کا عینی شاہد تھا' وہ 2001ء میں سندھ کے گورنر تھے اور مجھے کسی صاحب کے ساتھ
نر ہاؤس جانے کا اتفاق ہوا تھا' وہ صاحب سومرو صاحب کے دوست تھے' ہم ان کے آفس کے
ب پہنچے تو سومرو صاحب نے دفتر سے باہر آ کر ہمارے لئے دروازہ کھولا اور جب تک ہم لوگ اندر

داخل نہ ہو گئے وہ دروازہ پکڑ کر کھڑے رہے' میرے سر میں درد ہو رہا تھا' میں نے گورنر ہاؤس کے بٹلر سے سر درد کی گولی مانگی تو سومرو صاحب یک دم پریشان ہو گئے' وہ اٹھے' اپنے بیڈ روم میں گئے' میرے لئے سر درد کی گولی لائے اور گلاس میں پانی بھر کر مجھے گولی کھلائی اور اس کے بعد ہم جتنی دیر وہاں بیٹھے رہے' وہ مجھ سے میری خیریت پوچھتے رہے۔ یہ میری ان کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ محمد میاں سومرو جتنی دیر سندھ میں گورنر رہے انہوں نے گورنر ہاؤس میں قیام نہیں کیا' وہ سارا دن گورنر ہاؤس میں کام کرتے تھے اور شام کو اپنے ذاتی گھر چلے جاتے تھے۔ سومرو صاحب نے سندھ کے تمام سیکرٹریوں کو اپنے بیڈ روم کا ٹیلی فون نمبر دے رکھا تھا او وہ رات تین بجے بھی ان لوگوں کا فون سنتے تھے' وہ 2002ء کی پارلیمنٹ تشکیل پانے کے بعد کراچی سے اسلام آباد شفٹ ہوئے تو بھی ان سے ایک آدھ ملاقات ہوئی اور ان تمام ملاقاتوں میں بھی ان کی عاجزی' انکساری' خدا خوفی اور درویشی نمایاں رہی اور میں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے ان کے بعض دوستوں نے بھی ان کی زندگی کے بارے میں محیر العقول واقعات سنائے تھے' یہ تمام لوگ ڈاکٹر خالد رانجھا کی طرح سومرو صاحب کی پیر پرستی اور درگاہوں سے خصوصی شغف کے معترف تھے اور ان سب کا فرمانا تھا' "ہم نے زندگی میں اتنا سادا اور مہربان شخص نہیں دیکھا" یہ تمام لوگ ان کی اتنی تعریف کرتے تھے کہ میں ان سے ذرا سی "جیلسی" محسوس کرنے لگا اور حسد میں آ کر اکثر اوقات ان کی روحانیت سے انکار بھی کر دیتا لیکن پھر 24 فروری کا دن آ گیا اور میں اس درویش وزیراعظم اور منکسر المزاج چیئرمین سینٹ کی روحانیت کا پوری طرح قائل ہو گیا اور میں نے فیصلہ کر لیا اگر میں نے زندگی میں کبھی کسی زندہ پیر کے ہاتھوں پر بیعت کی تو وہ محمد میاں سومرو ہی ہوں گے۔ میں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا' میں اس ملک کے 16 کروڑ لوگوں سے بھی درخواست کروں گا وہ بھی فوراً اپنے اپنے منہ عرق گلاب سے دھو لیں اور انہیں جب بھی موقع ملے وہ اپنے ہونٹ سومرو صاحب کے دست روحانیت پر رکھ دیں اور اپنی دنیا اور آخرت دونوں سیدھی کر لیں۔ وہ کیا واقعہ تھا جس نے مجھے ان کے انتہائی احترام پر مجبور کر دیا' میں آگے بڑھنے سے قبل آپ کو اس واقعے میں شریک کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

محمد میاں سومرو چیئرمین سینٹ ہیں اور وہ 15 نومبر 2007ء کو شوکت عزیز حکومت کے خاتمے کے بعد نگران وزیراعظم بنائے گئے تھے' ان کی وزارت عظمیٰ کی مدت نئے الیکشنز اور نئی حکومت کے قیام تک ہے۔ 26 دسمبر 2007ء کو محمد میاں سومرو کے اصلی دفتر سینٹ سیکرٹریٹ کے ایک ایڈیشنل سیکرٹری نثار محمد نے وزیراعظم سیکرٹریٹ کو ایک سمری بھجوائی' اس سمری میں وزیراعظم سے درخواست کی گئی

ظم اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے سینٹ کے تمام سابق اور آئندہ ریٹائر ہونے چیئرمینوں کی مراعات میں اضافہ کر دیں۔ اس سمری میں ریٹائر چیئرمین سینٹ کے لئے دس ت مانگی گئیں' ان مراعات میں چیئرمین سینٹ اور ان کے تمام اہل خانہ کیلئے ملک اور بیرون ملک ت طبی سہولیات کی مفت فراہمی' تاحیات پرائیویٹ سیکرٹری' سیکورٹی گارڈز' ڈرائیور اور خانساماں کی ت' تاحیات سرکاری گیسٹ ہاؤسز میں مفت رہائش' سفارتی پاسپورٹ اور فری ٹیلی فون' تین ممنوعہ پو غیر ممنوعہ بور ہتھیاروں کے لائسنس' ملک کے تمام ائرپورٹس سے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت' ول کو ریج اور ائرپورٹ سیکورٹی فورس کے خصوصی اجازت نامے شامل ہیں۔ یہ تمام سہولیات نہ چیئرمین سینٹ کو ریٹائرمنٹ کے بعد آخری سانس تک ملتی رہیں گی بلکہ ان کی اہلیہ اور بچے بھی ان ون سے فائدہ اٹھائیں گے' اگر خدانخواستہ دو سو سال کی عمر میں چیئرمین سینٹ انتقال فرما گئے تو ان انتقال کے بعد بھی یہ سہولتیں ان کے اہل خانہ کو حاصل رہیں گی۔ یہ سمری 26 دسمبر 2007ء کو مین آفس سے وزیراعظم ہاؤس گئی تھی اور محمد میاں سومرو نے نگران وزیراعظم کی حیثیت سے اس ی پر دستخط فرما دیئے تھے اور یوں انہیں یہ تمام سہولیات حاصل ہو گئیں۔ نگران وزیراعظم نے اپنے اس و میرٹ اور غیر جانبداری کی شکل دینے کیلئے سینٹ کے تمام سابق چیئرمینوں کو بھی ان سہولیات میں ل کر لیا لیکن بدقسمتی سے اس وقت جناب وسیم سجاد کے سوا کوئی چیئرمین سینٹ حیات نہیں لہٰذا صرف سجاد ہی ان سے فائدہ اٹھا سکیں گے چنانچہ وسیم سجاد کو محمد میاں سومرو کا مشکور ہونا چاہئے۔

میرے کچھ دوست نگران وزیراعظم کے اس حکم کو غیر قانونی اور غیر اخلاقی قرار دے رہے ' ان ناسمجھ لوگوں کا خیال ہے ایک نگران وزیراعظم اپنے دستخطوں سے اپنی ہی مراعات میں کیسے افہ کر سکتا ہے؟ میرے یہ دوست ناسمجھ اور بے وقوف ہیں' یہ لوگ ہماری پاک سرزمین کی روایات سے ف نہیں ہیں' ہم تو بہت دلچسپ لوگ ہیں' 28 نومبر 2007ء تک صدر پرویز مشرف یونیفارم میں ' صدر نے 2004ء میں اپنے ہی ایک حکم کے ذریعے خود کو بطور چیف آف آرمی سٹاف ایکسٹینشن ے دی تھی' اس ایکسٹینشن کے بعد صورتحال بہت دلچسپ تھی' جناب پرویز مشرف صدر کی حیثیت سے یراعظم اور وزیر دفاع کے باس تھے لیکن چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت میں وزیر دفاع اور یراعظم کے ماتحت تھے' وہ صدر کی حیثیت میں افواج پاکستان کے سپریم کمانڈر تھے اور اس حیثیت ں چیف آف آرمی سٹاف کے باس تھے اور چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت میں خود اپنے ہی ماتحت چنانچہ وہ ایک فائل پر دستخط کرتے تھے اور یہ فائل ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پکڑا دیتے' خود ہی

مہربانی فرماتے تھے اور خود ہی اپنا شکریہ ادا کرتے تھے اور ایک ہاتھ کی اس سخاوت کی دوسرے ہاتھ تک کو خبر نہ ہوتی تھی۔ ہمارے درویش چیئرمین سینٹ اور حالیہ نگران وزیر اعظم صدر صاحب کی پراڈکٹ ہیں چنانچہ انہوں نے اس حکم کے ذریعے حق نمک ادا کر دیا' انہوں نے ایک جیب سے پرس نکال کر دوسری جیب میں ڈال دیا ہے اور مجھے یقین ہے جب اس کی اطلاع صدر صاحب کو ملی ہو گی تو انہیں نگران وزیر اعظم کی اطاعت اور فرمانبرداری پر رشک آیا ہو گا۔ میں نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے بے اختیار ہندوستان کے درویش ترین امیر المومنین اورنگزیب عالمگیر یاد آ گئے' انہوں نے 52 برس تک ہندوستان پر حکومت کی تھی اور اس حکومت کے دوران ظل الٰہی کے صرف دو مشغلے تھے' اپنے بھائیوں کو قتل کرنا اور اس کے بعد جتنا وقت بچ جائے اس میں ٹوپیاں سینا۔ برصغیر کے نامور مزاح نگار اور کالم نگار ابن انشاء نے مرحوم بادشاہ کی اس خوبی پر بڑا خوبصورت فقرہ تحریر کیا تھا' انہوں نے کہا تھا ''اورنگزیب عالمگیر نے کوئی نماز چھوڑی تھی اور نہ ہی کوئی بھائی'' ہمارے درویش نگران وزیر اعظم اور چیئرمین سینٹ نے آج اورنگزیب عالمگیر کی یاد تازہ کر دی اور میرا دل چاہتا ہے پوری قوم اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر درخواست کرے ''یا پروردگار ہمارے سومرو صاحب کی نگرانی کو مستقل کر دے تاکہ ان کے اس قسم کے درویشانہ احکامات کا سلسلہ جاری رہے اور ہم انہیں اورنگزیب ثانی کا لقب دے سکیں''۔

⊘ ⊘ ⊘

شہاب صاحب جیسے استاد

یہ بہاولپور کی ایک نیم گرم شام تھی' شام کے سائے صحرائی پودوں اور ریگستانی درختوں پر ے دھیرے اتر رہے تھے' میں اسلامیہ یونیورسٹی کی کینٹین پر بیٹھا تھا' کینٹین کی ٹاہلیوں کے پتوں میں ں کی زردی اتر چکی تھی اور جوں ہی ہوا پتوں کو گدگداتی تھی' پتوں کا ٹہنیوں سے رشتہ ٹوٹ جاتا تھا اور وہ ں لرزتے' کانپتے اور ڈولتے ہوئے نیچے آ گرتے تھے' میرے قدموں' سامنے پڑی آڑھی ترچھی ں اور دور تک بچھی زمین پر ایسے ہزاروں لاکھوں پتے پڑے تھے' میں کبھی ان پتوں کی طرف دیکھتا ر کبھی ہاتھ میں پکڑی آدھ کھلی کتاب کی طرف' یہ کتاب میرا ایک کلاس فیلو مجھے پکڑا گیا تھا' وہ لائبریری تھا اور یہ کتاب اس نے لائبریری سے چرائی تھی لہٰذا وہ اسے لائبریری لے جانے کا رسک نہیں لے سکتا را دوست جا چکا تھا اور میری زندگی میں دور دور تک بوریت پھیلی تھی' میں نے بوریت کے کسی ایسے ہی میں ٹانگیں سیدھی کیں' میز پر رکھیں اور کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی' یہ کتاب انتہائی دلچسپ میں نے کتاب کے درمیان میں انگلی رکھی اور پلٹ کر ٹائٹل دیکھا' یہ ممتاز مفتی کی ''الکھ نگری'' تھی' میں دوبارہ صفحے کھولے اور کتاب پڑھنی شروع کر دی' یہ ممتاز مفتی صاحب' الکھ نگری اور قدرت اللہ شہاب میرا پہلا تعارف تھا' میں وہاں بیٹھ کر ایک گھنٹہ کتاب پڑھتا رہا' میرا کلاس فیلو واپس آیا تو میں نے اس ''الکھ نگری'' مانگ لی اور یہ کتاب ہوسٹل لے آیا اور میں اگلے دو دن بستر پر لیٹا رہا اور یہ کتاب پڑھتا کتاب ختم ہوئی تو میرے اندر ایک عجیب دکھ' ایک انوکھا درد بھر گیا اور مجھے اندر ہی اندر تبدیلی سی محسوس نے لگی' مجھے لگا کہیں دور دل کے کسی ان دیکھے' ان چھوئے گوشے میں کسی نے کوئی چھوٹا سا دیا جلا دیا ہو۔

میں آگے بڑھنے سے پہلے آپ کو اپنا بیک گراؤنڈ بتاتا چلوں' میں ایک دیہاتی شخص ں' میرا تعلق گجرات کے ایک پسماندہ گاؤں سے ہے' میرے بزرگ دینی اور دنیاوی ہر قسم کی تعلیم سے تھے' میں بچپن میں بیمار ہو گیا' مجھے تاپ چڑھتا تھا اور میں دس دس دن چارپائی پر گزار دیتا تھا' میں ں بھر کی بیماری کے بعد بچ گیا لیکن جسمانی کمزوری کا شکار ہو گیا اور میں گاؤں کے دوسرے بچوں کی ح بھاگ دوڑ نہیں سکتا تھا' میں دو قدم اٹھاتا تھا تو میرا سانس الٹ جاتا تھا' میں جسمانی کمزوری کے ے ڈور ڈنگر بھی نہیں چرا سکتا تھا' یہ ان دنوں گاؤں کے تمام بچوں کا شغل ہوتا تھا چنانچہ میرے والدین

نے مجھے گاؤں کے سکول میں داخل کرا دیا' یہ سکول بھی کیا تھا؟ برگد کا ایک بڑا درخت تھا' ایک سکول ٹیچر تھا 'اس ٹیچر کو بچوں سمیت پورا گاؤں منشی جی کہتا تھا اور ایک ڈنڈا تھا' میں جسمانی نقاہت اور کمزوری کے باعث ڈنڈے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ پڑھائی میری مجبوری بن گئی' میرے گاؤں میں دینی تعلیم کا کوئی رواج نہ تھا' میرے گاؤں کے لوگوں کا خیال تھا نماز' روزہ اور قرآن خوانی عورتوں کا کام ہوتا ہے چنانچہ ہمارے گاؤں میں قرآن مجید کی تلاوت صرف خواتین کرتی تھیں' خواتین ہی پانچ وقت نماز پڑھتی تھیں اور 30 روزے بھی خواتین ہی رکھتی تھیں جبکہ مرد حضرات ان فرائض سے مکمل طور پر فارغ تھے' اسلام سے مردوں کی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ ہمارے گاؤں کی مسجد برسوں کسی جوان شخص کی منتظر رہتی تھی لیکن اسے لاغر اور بیمار بوڑھوں کے سوا کوئی نمازی نصیب نہیں ہوتا تھا' اگر کبھی بدقسمتی سے کوئی جوان اور صحت مند شخص مسجد میں داخل ہو جاتا تو امام بڑی دیر تک اسے سمجھاتا رہتا تھا ''برخوردار یہ عصر کی نماز ہے اس میں چار فرض ہوتے ہیں اور تم نے اس قطار میں کھڑے ہو کر وہ کچھ کرنا ہے جو دوسرے کریں گے'' ہمارے امام صاحب کی دینی قابلیت اور علم و فضل بھی نماز تک محدود تھا لہٰذا دوسرے دینی فرائض کے لئے عموماً پڑوس کے گاؤں سے علماء کرام امپورٹ کئے جاتے تھے' مجھے اچھی طرح یاد ہے ہمارے گاؤں میں جب مرگ ہو جاتی تھی تو لواحقین جنازہ پڑھانے کیلئے مولوی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے تھے' ایک بار مولوی صاحب نے آنے سے معذوری کا اظہار کیا تو لواحقین اسے اسلحے کی نوک پر گھر سے اٹھا لائے تھے اور اسے لا کر جنازے کے سامنے کھڑا کر دیا تھا' مولوی نے اس زیادتی کا انتقام اس طرح لیا کہ اس نے بھی میت کی بخشش کی دعا نہیں کرائی تھی اور ہمارے گاؤں میں شاید ہی کوئی مرد ہو جسے اس دور میں قرآن مجید پڑھنا آتا ہو' قرآن مجید ان دنوں حلف اٹھانے' اونچے طاق میں رکھنے یا پھر عورتوں کے پڑھنے کے کام آتا تھا' میری تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی چنانچہ مذہب کے بارے میں میرا علم پہلے کلمے تک محدود تھا' انہی دنوں میرا خاندان گاؤں سے شہر منتقل ہو گیا' وہاں سکول ہمارے گھر کے سامنے تھا اور والدین نے میری علمی ''کارکردگی'' کی بنیاد پر مجھے اس سکول میں داخل کرا دیا تھا' یوں میں گرتے پڑتے' لرزتے' ڈولتے پڑھتا چلا گیا' میں سکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی آ گیا لیکن جہاں تک دینی تعلیم کا تعلق تھا تو وہ پہلے کلمے سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔

میں الکھ نگری کی طرف واپس آتا ہوں' میں عرض کر رہا تھا میں نے دو دن میں ''الکھ نگری'' پڑھ ڈالی' اس کتاب سے مجھے تین چیزیں ملیں' ممتاز مفتی صاحب' تصوف اور قدرت اللہ شہاب۔ اسی کتاب سے مجھے ''شہاب نامہ'' کا علم بھی ہوا' میں ذرا متوسل قسم کا طالب علم تھا' میرے پاس پیسے کی کمی نہ تھی چنانچہ میں دوسرے ہی دن ''شہاب نامہ'' خرید لایا' یہ ایک ضخیم کتاب تھی' مجھے اس کے مطالعے میں

ں دن لگ گئے' آپ نے بھی یقیناً یہ کتاب پڑھی ہو گی' آپ میں سے بہت سے لوگ اسے بائیوگرافی ھے ہوں گے' کچھ لوگوں نے اسے دلچسپ ناول سمجھ کر پڑھا ہو گا' چند لوگوں نے تصوف کی عملی کتاب سمجھ ر اسے پڑھا ہو گا لیکن میرے لئے یہ اسلام کی پہلی کتاب تھی' یہ کتاب ایک ایسے نوجوان کیلئے قاعدے ی حیثیت رکھتی تھی جس کا دین' جس کا مذہب پہلے کلمے سے آگے نہیں بڑھ سکا ہو' جسے وضو کا پورا طریقہ نہ تا ہو اور جو یونیورسٹی تک مکہ اور مدینہ کو ایک ہی شہر سمجھتا ہو' اس کتاب سے میرا مذہب کی طرف رجحان ا اور میں نے اسلام اور تاریخ اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا' اس کتاب کے ذریعے میرا قدرت اللہ ب صاحب سے بھی تعارف ہوا اور مجھے تصوف کی مختلف جہتیں سمجھنے میں بھی مدد ملی' مجھے یہ کتاب پڑھ لم ہوا ہر انسان کیلئے اللہ کی ذات بہت ضروری ہوتی ہے اور ہر انسان کے اندر ایک صوفی ہوتا ہے اور سے ان کہے' ان چھوئے سوال ہمیں اس صوفی کے قریب لے جاتے ہیں اور ہم اپنے اور اپنی حقیقت ے جا ملتے ہیں' 1993ء میں میری ممتاز مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی تو یہ ملاقات جلد ہی دوستی میں یل ہو گئی' میں مفتی صاحب کے انتقال تک ان سے ملتا رہا اور ان تمام ملاقاتوں میں شہاب صاحب ا موضوع ہوتے تھے' ممتاز مفتی صاحب نے بعد ازاں مجھے صدیق راعی صاحب سے ملایا' صدیق ی شہاب صاحب کے روحانی شاگرد ہیں' شہاب صاحب نے انہیں روحانی ٹریننگ دی تھی' میری دیق راعی کے ساتھ دوستی ہو گئی' اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی روحانیت کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے' یق راعی صاحب راولپنڈی میں رہتے تھے لیکن بعد ازاں وہ جھنگ شفٹ ہو گئے اور میرا ان کے تھ ٹیلی فون پر اکثر رابطہ رہتا ہے' دو دن پہلے صدیق راعی صاحب نے مجھے فون کیا اور بتایا ''آج 24 ئی ہے اور میرے بابے شہاب کی برسی ہے اور میں تمہارے ساتھ شہاب صاحب کی باتیں کرنا چاہتا ' اس کے بعد صدیق راعی صاحب دیر تک قدرت اللہ شہاب کے بارے میں گفتگو کرتے رہے' میں ے ان سے پوچھا ''روحانیت میں شہاب صاحب کا کیا مقام ہے'' صدیق راعی صاحب نے بتایا ''وہ لام اور تصوف کے پبلک ریلیشننگ افسر ہیں'' میں نے وضاحت کی درخواست کی تو انہوں نے فرمایا '' تصوف میں کسی کا کوئی استاد نہ ہو اور وہ کشف المحجوب کو اپنا استاد بنا لے تو وہ سلوک کی منزلیں طے ر جاتا ہے بالکل اسی طرح اگر کوئی عام شخص اسلام اور تصوف کو سمجھنا چاہتا ہے' اگر وہ اپنے اندر کے صوفی ے ملنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے وہ ''شہاب نامہ'' پڑھ لے' اسے کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں رہے ' اسی طرح اگر کسی کو روحانی استاد دستیاب نہ ہو تو وہ شہاب صاحب کو اپنا استاد بنا لے' اسے زندگی ں کسی پیر' کسی استاد کی ضرورت نہیں رہے گی''

1557

جم نے انکار میں سرہلایا اور پر یقین لہجے میں بولا ''ڈاکٹر صاحب قید ہی میں انتقال کر جائیں گے' تم لوگ انہیں کبھی سڑک پر چلتے پھرتے' لوگوں سے ملتے' ہاتھ ملاتے' قہقہہ لگاتے اور لوگوں کو آٹو گراف دیتے نہیں دیکھو گے'' وہ خاموش ہوا' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا' ٹیڑھا میڑھا سا سگریٹ نکالا' سگریٹ ہونٹوں کے ساتھ چپکایا' لائٹر جلایا' آگ کا شعلہ سگریٹ کے سرے کے ساتھ جوڑا' ایک لمبا کش لیا اور مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگا' میں حیرت اور شرمندگی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا' وہ آہستہ سے بولا ''میں معافی چاہتا ہوں' میں نے تمہارے جذبات کی توہین کی لیکن مجھے ڈاکٹر عبدالقدیر کا انجام اچھا دکھائی نہیں دے رہا'' وہ دوبارہ خاموش ہو گیا' میں بات کو آگے بڑھانے سے قبل جم سے آپ کا تعارف کراتا چلوں' جم لوون امریکی مؤرخ ہے' اس نے اسلامی تاریخ میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے اور آج کل وہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ پر تحقیق کر رہا ہے' وہ سال کے تین' تین ماہ بھارت اور پاکستان میں گزارتا ہے اور چھ ماہ نیو یارک میں' وہ پچھلے چھ برس سے پاکستان آ رہا ہے۔ وہ اس دوران نہ صرف پاکستان کی تاریخ' جغرافیے' رسوم و رواج اور پاکستانیوں کی نفسیات کا حافظ ہو چکا ہے بلکہ وہ اس خطے کے لوگوں کو ہم سے زیادہ جانتا ہے' وہ گزشتہ روز میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا ''ڈاکٹر عبدالقدیر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے'' میں نے فوراً جواب دیا ''ڈاکٹر صاحب تمام پاکستانیوں کے ہیرو ہیں' اس ملک کا بچہ بچہ ان سے محبت کرتا ہے'' جم نے ذرا دیر سوچا اور اسکے بعد پوچھا ''ڈاکٹر کا مستقبل کیا ہے'' میں نے بغیر سوچے' بغیر رکے جواب دیا ''ڈاکٹر صاحب انشاء اللہ رہا ہوں گے' عوام میں پہنچیں گے اور لوگ انہیں عزت کی اس کرسی پر بٹھائیں گے جس کے وہ اہل اور حقدار ہیں'' جم نے میری بات غور سے سنی' ذرا دیر سوچا اور اس کے بعد نرم آواز میں بولا ''میں تم سے اتفاق نہیں کرتا' میرا خیال ہے ڈاکٹر عبدالقدیر کبھی رہا نہیں ہوں گے'' میں نے اس سے اس آبزرویشن کی وضاحت چاہی تو وہ بولا ''میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر صاحب قید ہی میں انتقال کر جائیں گے' تم لوگ انہیں کبھی سڑک پر چلتے پھرتے' لوگوں سے ملتے' ہاتھ ملاتے' قہقہہ لگاتے اور لوگوں کو آٹو گراف دیتے نہیں دیکھو گے''۔

میں نے بے چینی اور اضطراب میں پہلو بدلا' وہ دوبارہ گویا ہوا ''تم مجھے ایک سوال کا جواب دو'' میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا' وہ بولا ''کیا ڈاکٹر عبدالقدیر اس ملک کے ہیرو ہیں'' میں نے

ت میں سرہلا دیا' وہ فوراً بولا ''تمہاری ہاں میرے تھیسس کی بنیاد ہے' مسلمان ایک ایسی بدقسمت قوم جس کے ہیروز کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے' تم حضرت امام حسینؓ سے ٹیپو سلطان تک اپنے تمام ہیروز کی یخ نکال کر دیکھ لو اور بتاؤ ان کا انجام کیا ہوا تھا؟ حضرت امام حسینؓ کیسے شہید ہوئے تھے' حضرت خالدؓ ولید کی زندگی کا آخری حصہ کیسے گزرا' موسیٰ بن نصیر کا کیا بنا' طارق بن زیاد کا انجام کیا ہوا' محمد بن قاسم بسی کے کس عالم میں دنیا سے رخصت ہوا اور سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کو کس نے کفن دیا تھا؟ یہ ف چند مثالیں ہیں تم مسلمانوں کی تاریخ غور سے پڑھو' میرا دعویٰ ہے تمہیں اپنے تمام ہیروز اسی انجام کا ر ملیں گے جبکہ ان کے مقابلے میں تم بدبخت' بے ایمان' ظالم اور سفاک بادشاہوں کو دیکھو' تمہیں ج بن یوسف سے امیر تیمور تک اور محمود غزنوی سے اکبر اعظم تک اسلامی تاریخ کے تمام آمر آخری ں تک تخت پر بیٹھے اور بڑے بڑے عظیم الشان مقبروں میں دفن ہوتے ملیں گے چنانچہ میری تحقیق مسلمان اپنے ہرولن کو آخری سانس تک عزت دیتے ہیں جبکہ اپنے ہیروز کو قید خانوں' جنگوں اور یوں کے حوالے کر دیتے ہیں' مسلمان اپنے ہرولن کے ساتھ وفاداری نبھاتے ہیں جبکہ ہیروز کے دغا کرتے ہیں' انہیں فریب دیتے ہیں اور ان کے ساتھ دھوکہ کرتے ہیں'' میں خاموشی سے سنتا رہا' لا ''یہ ایک پہلو تھا' تم اب دوسرا پہلو بھی دیکھو' پاکستانی قوم نے پچھلے ساٹھ برسوں میں اپنے ہیروز ساتھ کیا سلوک کیا' قائداعظم اس ملک کے بانی تھے' تم بانی پاکستان کے آخری لمحات دیکھو' قائداعظم ارت سے کراچی لایا گیا' کراچی ائر پورٹ پر صرف ایک ایمبولینس کھڑی تھی' یہ گاڑی راستے میں ب ہو گئی' قائداعظم کا سانس اکھڑ گیا' محترمہ فاطمہ جناح نے قائداعظم کا سٹریچر فٹ پاتھ پر رکھوا دیا' ں بار بار ان کی ناک اور منہ پر بیٹھتی تھیں' قائداعظم بے چینی سے آنکھیں کھولتے تھے اور فاطمہ جناح ں کے عالم میں انہیں دیکھ کر رہ جاتی تھیں' قائداعظم اس عالم میں فٹ پاتھ پر انتقال فرما گئے' آپ ں نے فاطمہ جناح کو مادر ملت کا خطاب دیا' آپ نے پھر اس مادر ملت کا کیا انجام کیا' ایوب خان لے جلسوں میں مادر ملت کے کردار پر کیچڑ اچھالا تھا' ذوالفقار علی بھٹو نے پریس کانفرنس میں انکشاف ر ملت نے شادی کیوں نہیں کی تھی' یہ الزام اخلاق سے اس قدر گرا ہوا تھا کہ غیر ملکی صحافیوں تک کی ں سے آنسو نکل آئے' خان لیاقت علی خان بھی تم لوگوں کے ہیرو تھے' تم نے ان کے ساتھ کیا کیا' تم آج تک ان کے قتل کی وجہ تک معلوم نہیں کر سکے۔ حسین شہید سہروردی بھی ایک ایماندار ان تھے' وہ لبنان میں انتقال کر گئے' ان کی بیٹی کے پاس نعش لانے کیلئے رقم نہیں تھی اور حکومت اس بسی پر قہقہے لگاتی رہی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو بھی اس ملک کے ہیرو تھے' اس بھٹو کا کیا انجام ہوا' انہیں پر لٹکا دیا گیا اور قوم خاموش رہی اور جنرل ضیاء الحق کو تم لوگ فاتح روس کہتے تھے' اس فاتح روس کا

کیا انجام ہوا؟ تم اپنی تاریخ نکال کر دیکھ لو اس ملک میں ہر ایماندار‘ بااصول اور جرات مند شخص خوفناک انجام سے دوچار ہوا جبکہ ہر بے ایمان‘ بے اصول اور بزدل شخص اس ملک میں آخری وقت تک اقتدار‘ عزت اور پروٹوکول سے لطف لیتا رہا‘ تم ملک غلام محمد سے صدر پرویز مشرف تک اپنی ساری تاریخ کھنگال کر دیکھ لو تمہیں ہر مجرم جیل سے باہر اور ہر بے گناہ اور معصوم شخص قید میں نظر آئے گا‘‘ وہ سانس لینے کیلئے رکا۔

میں نے بے چینی سے ایک اور کروٹ بدلی‘ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا اور ایک لمبا سانس بھر کر بولا ’’تم تازہ ترین صورتحال بھی دیکھ لو‘ تم لوگ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو اپنا ہیرو سمجھتے ہو‘ تمہارا وہ ہیرو اس وقت کہاں ہے؟ تمہارا ہیرو سڑکوں پر دھکے کھا رہا ہے جبکہ وہ لوگ جنہوں نے ملک‘ آئین‘ قانون اور عدلیہ کے ساتھ غداری کی وہ اقتدار‘ کرسی اور عہدے کے مزے لوٹ رہے ہیں‘ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نظر بند ہیں لیکن جن لوگوں نے اس ملک کو غیر ملکی لشکروں کی چراہ گاہ بنا دیا‘ جن کی مہربانیوں سے یہ ملک خودکش حملوں سے لرز رہا ہے اور جنہوں نے تمہاری مسجدوں اور مدرسوں کو توپوں سے اڑا دیا‘ تمہارے نمازی ایجنسیوں اور سی آئی اے کی حراست میں ہیں جبکہ تاریخ کے کرپٹ ترین لوگ ’’این آر او‘‘ کی مشین سے ڈرائی کلین ہو چکے ہیں‘ تم ڈاکٹر قدیر کو دیکھو اور پھر اپنے کرپٹ جرنیلوں‘ بے ایمان افسروں اور منافق سیاستدانوں کو دیکھو اور یہ فیصلہ کرو تمہارے ملک کے اصول‘ تمہارے ملک کے ضابطے اور تمہارے ملک کی روایات کیا ہیں اور اسکے بعد دل پر ہاتھ رکھو اور مجھے بتاؤ تمہارے ڈاکٹر عبدالقدیر کا کیا انجام ہو گا؟ کیا وہ نظر بندی کے عالم میں دنیا سے رخصت نہیں ہوں گے؟‘‘ وہ خاموش ہو گیا‘ میری زبان بے بسی کے عالم میں میرے جبڑوں میں تڑپتی رہی لیکن یہ تڑپ کوئی لفظ‘ کوئی فقرہ پیدا نہ کر سکی‘ میں بے بسی سے اس کی طرف دیکھتا رہا‘ وہ مسکرایا اور اسی نرم آواز میں بولا ’’آج ڈاکٹر عبدالقدیر کی نظر بندی کو ایک ہزار 5 سو 57 دن ہو چکے ہیں‘ تم مجھے اتنا بتاؤ کیا ایڈمرل منصور الحق اربوں روپے کی کرپشن کے بعد اتنے دن نظر بند رہا تھا؟ کیا جنرل یحییٰ خان ملک توڑنے کے بعد اتنے دن نظر بند رہا تھا اور اگر کبھی جنرل پرویز مشرف ملزم یا مجرم ثابت ہوئے تو کیا وہ بھی اتنے دن نظر بند رہیں گے‘‘ میں خاموش رہا‘ اس نے قہقہہ لگایا اور میرا گھٹنا دبا کر بولا ’’تمہاری یہ خاموشی میرے ہر سوال کا جواب ہے لہٰذا میرے عزیز اگر تم اور تمہاری قوم ڈاکٹر عبدالقدیر کو آزاد دیکھنا چاہتی ہے تو تمہیں چاہیے تم ڈاکٹر کو ہیرو کی بجائے ولن ثابت کر دو‘ تم ان پر کرپشن اور بے ایمانی کے الزامات لگا دو‘ یقین کرو تمہارا نظام نہ صرف انہیں باعزت بری کر دے گا بلکہ انہیں اقتدار کی کرسی پر بھی بٹھا دے گا اور یاد رکھو اگر ڈاکٹر عبدالقدیر کرپٹ شخص ہوتے تو وہ کبھی 1557 دن نظر بند نہ رہتے‘ وہ آج اس ملک کے حکمران ہوتے‘‘۔

جوتے

نعش جوتوں اور کپڑوں سے پہچانی گئی‘ سیاہ رنگ کے بوٹ کی آب و تاب ابھی تک باقی تھی‘ تلوے کے ایک کونے میں مگرمچھ کی تصویر بھی موجود تھی اور بکل کی سنہری نکل بھی قائم تھی‘ کمپنی کا دعویٰ سچ نکلا‘ جوتوں کی شان و شوکت تیس برس بعد بھی قائم رہی‘ سوئٹزرلینڈ کی کمپنی دنیا کے صرف ایک ہزار خاندانوں کیلئے جوتے بناتی تھی‘ جوتوں کے تلوے نیوزی لینڈ کی گائے کے چمڑے سے بنائے جاتے تھے‘ یہ سنہری چمڑے اور نیلے سینگوں والی گائے ہے اور دنیا کے کسی دوسرے خطے میں گائے کی یہ قسم نہیں ملتی۔ جوتے کی ’’ٹو‘‘ برازیل کے مگرمچھوں کی جلد سے بنائی جاتی ہے‘ جوتے کا ’’کوا‘‘ افریقہ کے سیاہ ہاتھیوں کے کانوں کے چمڑے سے تیار کیا جاتا تھا اور جوتے کے اندر ہرن کے نرم چمڑے کی تہ چپکائی جاتی تھی اور پیچھے رہ گیا دھاگہ تو ان جوتوں کیلئے بلٹ پروف جیکٹ میں استعمال ہونے والے دھاگے استعمال کیے جاتے تھے۔ کمپنی کا دعویٰ تھا پچاس برس تک جوتے کی پالش خراب نہیں ہوتی جبکہ مٹی میں دفن ہونے کے ایک سو سال بعد تک جوتے کی آب و تاب برقرار رہتی ہے۔ افغانستان کا بادشاہ ظاہر شاہ اس کمپنی کا ممبر تھا‘ ظاہر شاہ جلاوطن ہوا تو سردار داؤد نے اس کمپنی کی ممبر شپ لے لی اور اس کے بعد اس نے ہمیشہ اس کمپنی کا جوتا استعمال کیا یہاں تک کہ جب 1978ء کو اسے خاندان کے ساتھ قتل کر دیا گیا اور قتل کے بعد اس کی نعش جیپ کے ساتھ باندھ کر کابل شہر میں گھسیٹی گئی تو اس وقت بھی اس نے یہی جوتا پہن رکھا تھا۔ وہ ایک بدقسمت حکمران تھا‘ اسے مرنے کے بعد غسل‘ کفن اور جنازہ نصیب نہیں ہوا تھا‘ لوگوں نے دو بڑی بڑی قبریں کھودی تھیں اور اسے اس کے خاندان کے 30 افراد کے ساتھ ان میں سے کسی ایک قبر میں دفن کر دیا تھا‘ اس کے خاندان کے کسی فرد کا جنازہ نہیں پڑھا گیا تھا‘ وہ تیس برس تک اس قبر میں پڑا رہا لیکن 26 جون 2008ء کو ایک اتفاقی کھدائی کے دوران یہ دونوں قبریں دریافت ہوئیں اور یوں جوتوں کے باعث اس کی نعش شناخت کر لی گئی‘ یہ جوتوں کے ذریعے شناخت ہونے والی دنیا کی پہلی نعش تھی اور دنیا کو پہلی بار جوتوں نے بتایا ان کا مالک جنرل سردار محمد داؤد خان تھا۔

سردار محمد داؤد خان افغانستان کے شاہی خاندان محمد زئی سے تعلق رکھتا تھا‘ وہ 18 جولائی

1909ء کو پیدا ہوا‘ اس نے ابتدائی تعلیم حبیبیہ سکول کابل‘ ثانوی تعلیم امینیہ کالج اور اعلیٰ تعلیم فرانس سے حاصل کی‘ وہ سینٹ کرائی ملٹری اکیڈمی کا گریجوایٹ تھا‘ اس نے واپسی پر افغان فوج جوائن کی اور 24 برس کی عمر میں میجر جنرل بنادیا گیا۔ وہ 1932ء میں محض 25 سال کی عمر میں صوبہ ننگرہار کا جی او سی بن گیا‘ 1935ء میں وہ قندھار کا جی او سی بنا اور اسی سال اسے لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر پروموٹ کر دیا گیا‘ وہ دنیا کا کم عمر ترین جنرل تھا۔ 1946ء میں اسے یونیفارم کے ساتھ وزیر دفاع بنادیا گیا‘ وہ پیرس‘ برن اور برسلز کیلئے سفیر بھی بنایا گیا اور اسی دوران افغانستان کے بادشاہ محمد ظاہر شاہ نے اسے اپنی ہمشیرہ شہزادی زینب کا رشتہ بھی دے دیا۔ وہ 1952ء میں شاہ کے ذاتی ایلچی کی حیثیت سے سوویت یونین کے صدر مارشل سٹالن کی تدفین کیلئے ماسکو گیا اور یہاں سے اس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ وہ روسی حکمرانوں اور کے جی بی کا منظور نظر بنا اور اس نے اس کی پشت پناہی کا آغاز کر دیا۔ ستمبر 1953ء کو شاہ نے اسے افغانستان کا وزیراعظم بنا دیا‘ وہ دنیا کا یونیفارم میں پہلا وزیراعظم تھا‘ وہ وزیراعظم بھی تھا‘ وزیر دفاع بھی اور آرمی چیف بھی۔ اس نے وزیراعظم کا حلف اٹھاتے ہی اپنے بھائی سردار محمد نعیم کو افغانستان کا وزیر خارجہ بنا دیا اور آہستہ آہستہ پورے ملک کے اختیارات اپنے قبضے میں لے لئے‘ وہ سوویت یونین کا فکری حلیف تھا چنانچہ اس نے روس کے کہنے پر پاکستان میں پشتونستان کی تحریک شروع کرادی‘ ظاہر شاہ سردار داؤد کے عزائم اور طالع آزما فطرت کو پہچان گیا چنانچہ اس نے 3 مارچ 1963ء کو اس سے استعفیٰ لے لیا جس کے بعد سردار داؤد نے شاہ کے خلاف سازشیں شروع کر دیں‘ شاہ کو اطلاع ملی تو اس نے یکم اکتوبر 1964ء کو افغانستان کا آئین بدل دیا جس کی رو سے اب افغانستان کے شاہی خاندان کا کوئی رکن سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ شاہ نے سردار داؤد کا راستہ روکنے کا بندوبست تو کر دیا لیکن وہ یہ بھول گیا دنیا کا مضبوط سے مضبوط ترین آئین بھی فوج کا راستہ نہیں روک سکتا چنانچہ 17 جولائی 1973ء کو ظاہر شاہ علاج کے سلسلے میں اٹلی گیا اور پیچھے سے سردار داؤد نے شاہ کا تختہ الٹ دیا اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا‘ اس نے 1964ء کا آئین منسوخ کیا‘ افغانستان کو جمہوریہ افغانستان کا نام دیا اور بیک وقت افغانستان کا صدر‘ وزیراعظم اور سنٹرل کمیٹی کے چیئرمین کا عہدہ سنبھال لیا‘ اس نے 28 جولائی کو پارلیمنٹ بھی توڑ دی اور وہ ملک کا مطلق العنان حکمران بن گیا۔

وہ ایک روشن خیال اور اعتدال پسند شخص تھا‘ اس نے اقتدار سنبھالتے ہی ملک میں پردے اور داڑھی پر پابندی لگادی‘ اس نے زنانہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سکرٹ لازمی قرار دے دی‘ مسجدوں پر تالے لگوا دیئے اور ملک کے آٹھ بڑے شہروں میں شراب خانے اور ڈسکو کلب بنوائے‘ سردار داؤد کے

ور میں کابل دنیا بھر کے سیاحوں کیلئے عیاشی کا اڈہ بن گیا‘ اس دور میں ’’یورپ‘‘ کابل سے [illegible]
بل کے بعد تہران عیاشی کا دوسرا اڈہ تھا‘ استنبول تیسرا اور اس کے بعد پورا مشرقی یورپ عیاشوں پر مکمل
تا تھا۔ سردار داؤد نے پورے ملک میں سینکڑوں کی تعداد میں عقوبت خانے بھی بنا رکھے تھے‘ خفیہ
داروں کے اہلکار اس کے مخالفین کو دن دیہاڑے اٹھا لے جاتے تھے اور اس کے بعد کسی کو ان کا نام
ور پتہ تک معلوم نہیں ہوتا تھا۔ سردار داؤد کے زمانے میں تیس ہزار کے قریب لوگ ’’مسنگ پیپل‘‘
کہلائے اور ان لوگوں کے لواحقین کو بعد ازاں ان کی قبروں کا نشان تک نہ ملا۔ جنوری 1974ء کو اس
کے خلاف ایک چھوٹی سی بغاوت ہوئی لیکن اس نے تمام باغیوں کے سر قلم کرادیئے‘ ایک طرف اس کے
ظالم جاری تھے اور دوسری طرف وہ عالمی میڈیا کو ایک جمہوریت پسند اور روشن خیال لیڈر کا چہرہ پیش
کر رہا تھا۔ اس نے روس کے ساتھ ساتھ مغرب کے ساتھ بھی تعلقات استوار کئے‘ 27 فروری 1977ء
کو اس نے ملک کو نیا آئین دیا‘ ملک میں صدارتی طرز حکومت اور یک جماعتی نظام قائم کر دیا اور یہ وہ
ت تھا جب اس کا اعتماد آسمان کو چھونے لگا‘ اس نے مارچ 1977ء کو نئی کابینہ بنائی اور اس کابینہ کے
ارے عہدے اپنے خاندان اور دوستوں میں تقسیم کر دیئے‘ اس وقت تک ملک میں اس کے خلاف لاوا
ک چکا تھا چنانچہ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتیں خلق اور پرچم پارٹی اس کی مخالف ہو گئیں‘ ملک میں
ے‘ سیاسی قتل وغارت گری اور مظاہرے شروع ہو گئے۔ وہ ظالم انسان تھا لہٰذا اس نے اپنی عادت
ے مطابق مخالفین کو قتل کرانا شروع کر دیا‘ اس نے 17 اپریل 1978ء کو اپنے سب سے بڑے مخالف
ونسٹ لیڈر میر اکبر خان کو قتل کرا دیا اور یہ وہ قتل تھا جس نے سردار داؤد خان کے خلاف نفرت کو ایک
ے پر جمع کر دیا اور میر اکبر کے قتل کے محض دس دن بعد 27 اپریل کو سردار داؤد کے خلاف فوجی بغاوت
ی اور فوج نے اسے‘ اس کے بھائیوں‘ بیویوں‘ بیٹیوں‘ پوتوں اور پوتیوں کو گولی ماردی‘ اس بغاوت میں
سمیت اسکے خاندان کے 30 افراد ہلاک ہو گئے‘ داؤد کی نعش کو جیپ کے ساتھ باندھا گیا اور کابل
ں میں گھسیٹا گیا‘ داؤد کی نعش جس جگہ سے گزرتی تھی لوگ اس پر تھوکتے تھے اور اسے ٹھڈے مارتے
شام کو جب نعش کا سفر مکمل ہوا تو اسے جنازے‘ غسل اور کفن کے بغیر خاندان کی دوسری نعشوں کے
تھ اجتماعی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ یوں سردار محمد داؤد خان کی نعش 30 برس تک ایک گمنام قبر میں پڑی
ی لیکن پھر 26 جون 2008ء کو کھدائی کے دوران کابل شہر میں دو اجتماعی قبریں دریافت ہوئیں‘
ن قبروں میں سولہ سولہ نعشیں تھیں‘ ان نعشوں میں سے ایک نعش کے پاؤں پر مگرمچھ کی کھال کا جوتا تھا‘
ں ہی جوتے پر پڑی خاک جھاڑی گئی اسکی پالش چمکنے لگی اور یوں اس جوتے نے یہ راز فاش کر دیا

اور سردار داؤد کی نعش سامنے آ گئی۔

میں نے یہ خبر پڑھی تو میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ کا نظام بھی کیسا عجیب ہے' وہ جب کسی ظالم سے نفرت کرتا ہے تو اس کی قبر کی بھی بخشش نہیں ہوتی اور ظالم کے مرنے کے 30 برس بعد اس کی سزا ختم نہیں ہوتی' بے شک ظالم پورے ملک کو اپنے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کر سکتے ہیں لیکن یہ لوگ وقت کو شکست نہیں دے سکتے۔ یہ اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے اور جب اللہ کسی سے نفرت کرتا ہے وہ جوتوں کو اسکی نعش کا حوالہ اور قبر کا کتبہ بنا دیتا ہے۔ وہ اسے مرنے کے بعد بھی مرنے نہیں دیتا۔

⊘ ⊘ ⊘

جوتا ماری کا عالمی دن

کیلنڈر میں 365 دن ہیں اور ان 365 دنوں میں سے 162 روز کسی نہ کسی واقعے کی سبت سے خصوصی دن کہلاتے ہیں' کوئی دن ویلنٹائن ڈے کہلاتا ہے' کوئی مدرز ڈے' کوئی فادرز ڈے' ں نیو ائیر ڈے' کوئی کرسمس ڈے' کوئی لیبر ڈے' کوئی میڈیا ڈے اور کوئی چائلڈ لیبر ڈے وغیرہ وغیرہ ں 14 دسمبر 2008ء کو بغداد میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا اور مجھے توقع ہے اس واقعے کی مناسبت آگلے سال پوری دنیا میں 14 دسمبر منایا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی خصوصی ایام میں شوز ڈے یا جوتا ں کے خصوصی دن کا اضافہ بھی ہو جائے گا۔ میں نے گزشتہ رات پوری دنیا کے ساتھ اس دن کی بنیاد تے دیکھی' بغداد کے انتہائی سیکورٹی زون کے انتہائی محفوظ محل کے انتہائی ''سیکور'' ہال میں عراق کے اعظم نور المالکی اور دنیا کی واحد سپر پاور کے صدر جارج بش راسٹرم پر کھڑے تھے' صدر بش عراق الوداعی دورے پر بغداد تشریف لائے تھے' ان دونوں کے سامنے عراق کے بڑے بڑے صحافی بیٹھے صدر بش میڈیا سے خطاب کرتے ہیں' اس کے بعد عراقی وزیر اعظم کی طرف شفقت سے دیکھتے ہیں' دوران ہال میں موجود ایک صحافی اپنا جوتا اتارتا ہے اور پوری قوت سے یہ جوتا صدر بش کی طرف ں دیتا ہے' صدر بش فوراً جھک جاتے ہیں اور جوتا ان کے دائیں کندھے کے قریب سے گزر جاتا ہے' میں سراسیمگی پھیل جاتی ہے' سیکورٹی گارڈز آگے بڑھتے ہیں لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے دوسرا جوتا ہوا میں تیرتا ہوا صدر بش کی طرف بڑھتا ہے اور ان کے سر سے ہوتا ہوا امریکی جھنڈے سے جا ٹکراتا اس کے ساتھ ہی صحافی چلا کر کہتا ہے ''کتے یہ تمہارے لئے الوداعی بوسہ ہے'' عراقی میڈیا کی طرف دیئے گئے اس اعزاز کے بعد صدر بش خجالت سے کیمروں کی طرف دیکھتے ہیں اور کھسیانی آواز میں تے ہیں ''میرا خیال ہے یہ دس نمبر کا جوتا تھا'' صدر بش پر یہ دہشت گردانہ حملہ عراق کے ایک ٹیلی ن چینل کے رپورٹر منتظر الزیدی نے کیا تھا اور اس حملے کے بعد وہ نہ صرف پوری دنیا میں مشہور ہو گیا لیوبا سے لے کر ایران تک دنیا کے 145 غریب ممالک نے اسے ہیرو کا درجہ بھی دے دیا۔ منتظر ی واقعی ہیرو ہے یا اس کی یہ حرکت دہشت گردی کی نئی شکل تھی اس کا جواب تو ہم وقت پر چھوڑ دیتے کن یہ بات طے ہے منتظر الزیدی نے 14 دسمبر کو ایک نئی شناخت دے دی' آج سے یہ دن جوتا ماری کا

عالمی دن کہلائے گا۔

دنیا میں ظالم ہو یا مظلوم تمام لوگ مر جاتے ہیں لیکن جوتا ماری جیسے واقعات ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب بڑی بڑی شخصیات اس قسم کے واقعات سے یاد رکھی جاتی ہیں مثلاً آپ شاہ ایران کی مثال لے لیجئے' شاہ 1980ء میں قاہرہ میں انتقال کر گیا لیکن اس سے منسوب ایک واقعہ آج تک زندہ ہے' شاہ کے دور میں شاہی محل میں مکھیاں مارنے کا ایک محکمہ ہوتا تھا' اس محکمے میں ایک ہزار ملازمین تھے' ان ملازمین کے ہاتھوں میں چار فٹ کی ایک چھڑی ہوتی تھی جس کے سرے پر کپڑے کی ایک نرم گدی ہوتی تھی' یہ ملازمین شاہی محل میں گھومتے پھرتے رہتے تھے اور انہیں جہاں کہیں کوئی مکھی نظر آتی تھی وہ چھڑی کے ذریعے اس مکھی کو مارتے تھے اور اسے مخمل کی تھیلی میں ڈال کر کوڑا دان میں پھینک دیتے تھے' انقلاب ایران سے ایک دن پہلے کا واقعہ ہے' شاہ محل سے باہر نکل رہا تھا' راستے میں ایک مکھی مار ملازم کھڑا تھا' شاہ تھکے تھکے قدموں سے محل کے کوری ڈور میں چل رہا تھا' شاہ کے سارے محافظ' سارے سیکرٹری اور سارے ذاتی ملازم محل سے فرار ہو چکے تھے اور شاہ دنیا کی اس بے ثباتی پر انتہائی مغموم اور اداس تھا' وہ چلتے چلتے اس مکھی مار کے قریب پہنچا تو مکھی مار نے آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھا' مکھیاں مارنے والی چھڑی اٹھائی' ہوا میں لہرائی اور شاہ کی گردن پر دے ماری' شاہ کے منہ سے چیخ بلند ہوئی اور اس نے گھبرا کر مکھی مار کی طرف دیکھا' مکھی مار نے شاہ کی طرف حقارت سے دیکھا اور اونچی آواز میں بولا ''میں نے اس چھڑی سے اب تک تین سو دس مکھیاں ماری ہیں' تم مجھے اس وقت مکھی نظر آ رہے ہو' کاش تم اس چھڑی کے تین سو گیارہویں شکار ہوتے'' شاہ نے بے بسی کے عالم میں اس کی طرف دیکھا' واپس مڑا اور چپ چاپ باہر نکل گیا' انقلاب کے بعد اس مکھی مار ملازم اور اس کی چھڑی کو تہران کے سٹیڈیم میں لایا گیا' سٹیڈیم میں موجود لوگوں کو چھڑی دکھائی گئی اور اس کے بعد اعلان کیا گیا ''یہ دنیا کی واحد چھڑی ہے جس سے شاہ کی پٹائی ہوئی تھی' ہم آج یہ چھڑی نیلام کرنا چاہتے ہیں' جو صاحب اس تاریخی چھڑی کو خریدنا چاہے وہ بولی دے اور یہ نادر چھڑی گھر لے جائے'' اس کے بعد اس چھڑی کی بولی لگی اور ایران کے ایک تاجر نے وہ چھڑی دو لاکھ تمن میں خرید لی۔ آپ کو یاد ہو گا 7 اپریل 2008ء کو سندھ اسمبلی میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا' کراچی کے ایک گستاخ شخص نے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کو اسمبلی کے کوریڈور میں جوتا دے مارا تھا' یہ جوتا بھی بعد ازاں نیلامی کیلئے پیش ہوا تھا اور سانگھڑ کے ایک صاحب نے یہ جوتا بیس لاکھ روپے میں خرید لیا تھا۔ جوتا کھانے کا ایک واقعہ ہمارے ماضی کے ایک چیف جسٹس کے ساتھ بھی پیش آیا تھا' یہ جج صاحب پی سی او پر حلف لینے کے بعد امریکہ گئے اور ان کے ایک دوست انہیں کسی انڈین ریسٹورنٹ میں کھانا کھلانے

لئے لے گئے' وہاں ایک پاکستانی گاہک نے جج صاحب کو پہچان لیا' وہ ان کے قریب گیا' اس نے اپنا اتارا اور انہیں دے مارا' یہ جوتا بھی بعد ازاں نیویارک میں فروخت ہوا' ایک دوسرے پاکستانی نے یہ پانچ ہزار ڈالر میں خریدا' جج صاحب کی تصویر کے ساتھ اسے فریم کروایا اور اپنے ڈائننگ روم میں لٹکا ' مجھے یقین ہے منتظر الزیدی کے یہ دونوں جوتے بھی عنقریب بولی کیلئے پیش ہوں گے اور کوئی شوقین اج رئیس ایک دو لاکھ ڈالر میں یہ تاریخی جوتے بھی خرید لے گا۔

14 دسمبر کے اس واقعے نے دنیا میں دہشت گردی کی ایک نئی تکنیک متعارف کرا دی ہے ن کے بعد اب دنیا بھر کا میڈیا بھی مشکوک ہو گیا ہے اور جوتے بھی تابکاری کی شکل اختیار کر گئے ہیں چہ اب دنیا کے تمام بڑے صدور اور وزرائے اعظم صحافیوں اور اپنے درمیان اتنا فاصلہ ضرور رکھیں ے کہ اگر صحافت کا کوئی اسامہ بن لادن ان کی طرف جوتا پھینکنا چاہے تو وہ اس سے محفوظ رہ سکیں۔ میرا زہ ہے آج سے دنیا کے وی وی آئی پیز اور صحافیوں کے درمیان باریک جال لگا دیا جائے تاکہ اگر ندہ کوئی صحافی جوتا پھینکنے کی کوشش کرے تو اس کا جوتا صدر محترم تک پہنچنے کی بجائے جال میں الجھ ئے اور یوں یہ لوگ خفت سے بچ جائیں۔ میں پاکستانی حکومت کو بھی ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں' ہم کیونکہ امریکی روایات پر دنیا میں سب سے پہلے عملدرآمد کے عادی ہیں' امریکہ اگر ائیر پورٹس پر ی شروع کرتا ہے تو ہم بھی فوری طور پر تلاشی کا عمل شروع کر دیتے ہیں' امریکہ میں اگر مائع اشیاء کو ی جہازوں میں لے جانے پر پابندی لگتی ہے تو ہم بھی اپنی فلائیٹس میں پرفیوم اور کاسمیٹکس ''بین'' دیتے ہیں اور امریکہ اگر پاکستان سے مشکوک افراد کی فہرست منگواتا ہے تو ہم احتیاطاً تمام مشکوک وں کو گرفتار کر لیتے ہیں چنانچہ ہمیں اس ناخوشگوار واقعے کے فوراً بعد پریس کانفرنسوں اور پریس بریفنگز دوران جوتے پہننے پر پابندی لگا دینی چاہیے' پاکستان میں جو بھی صحافی پریس کانفرنس میں شامل ہو سے پہلے اس کی جوتا اتروائی کی رسم ادا کی جائے اور اس کے بعد اسے کسی وی آئی پی کے سامنے جایا جائے کیونکہ پاکستان میں بے شمار طالبان صحافی بھی موجود ہیں اور یہ لوگ پندرہ پندرہ کلو کے بارہ نمبر کے جوتے پہنتے ہیں اور اگر پاکستانی صحافیوں نے عراقی جرنلسٹوں کی پیروی شروع کر دی تو ک کی تو خیر کوئی بات نہیں یہ آنے جانے والی چیز ہے لیکن دہشت گردی کے ان نئے آلات سے کسی قیمتی انسان کی جان جا سکتی ہے۔

⊘ ⊘ ⊘

سو روپے کا نوٹ

1980-81ء میں سب سے بڑا نوٹ سو روپے کا ہوتا تھا' مہنگائی اس وقت بھی تھی لیکن ضروریات زندگی کی قیمتیں سو روپے تک پہنچ کر رک جاتی تھیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے اس وقت سب سے مہنگا جوتا ننانوے روپے میں ملتا تھا اور لوگ جوتوں کی دکان پر جا کر جوتا دیکھتے تھے اور افسوس سے کہتے تھے ''اتنا مہنگا' توبہ توبہ'' میں اس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا' ہماری کلاس میں ایک عارضی ماسٹر صاحب آئے' یہ ماسٹر صاحب ''سابق استاد'' تھے' وہ بھی اسی سکول میں پڑھایا کرتے تھے لیکن پھر وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے ملک سے باہر چلے گئے' وہاں سے واپس آئے تو انہوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے خوشحال ہو گئے لیکن کبھی کبھی ان کے اندر کے استاد کو مرگی کا دورہ پڑتا تو وہ بے چین ہو جاتے اور چند دنوں کیلئے سکول کی کوئی کلاس سنبھال لیتے' وہ طالب علموں کو درسی کتابیں پڑھانے کی بجائے انہیں زندگی کا درس دیتے تھے' ان کے دیئے ہوئے بے شمار درس آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں اور میں جب بھی زندگی کی کسی اندھی اور بہری صورتحال میں جا پھنستا ہوں تو اس عارضی ماسٹر صاحب کے دیئے ہوئے سبق میرے لئے روشنی کا کام کرتے ہیں اور میں ٹٹول ٹٹول کر اپنا راستہ تلاش کر لیتا ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں اگر ہمارے ملک کے تمام ڈاکٹرز' انجینئرز' پروفیسرز' سرکاری ملازم' سیکرٹریز' بزنس مین' گلوکار' اداکار' صحافی اور سیاستدان سال میں ایک ہفتے کیلئے عارضی ماسٹر صاحب بن جائیں' وہ دور دراز علاقے کے کسی مڈل یا ہائی سکول میں ڈیرہ ڈال لیں اور وہ طالب علموں کو زندگی کا درس دیں' انہیں مطالعہ کرنے' محنت کرنے' آگے بڑھنے' کامیاب ہونے اور لوگوں کے کام آنے کا سبق دیں' وہ ان طالب علموں کو وژن' حب الوطنی' نیک نیتی' لائف سٹائل اور پازیٹو تھینکنگ سکھا دیں تو پورا ملک تبدیل ہو سکتا ہے' اس ملک کے بچے بچے کی سوچ کا دھارا بدل سکتا ہے' کاش ہم میں سے کوئی شخص اس نیک کام کا بیڑا اٹھا لے۔ بہرحال میں موضوع کی طرف واپس آتا ہوں' ہمارے عارضی ماسٹر صاحب ایک دن ہماری کلاس میں آئے' وہ کلاس کے سامنے کھڑے ہوئے' انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا' سو روپے کا کڑکڑاتا ہوا تازہ نوٹ نکالا اور کلاس کو دکھا کر بولے ''یہ کتنے کا نوٹ ہے'' پوری کلاس گلا پھاڑ کر بولی ''سو روپے کا'' ماسٹر صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی' نوٹ کا گولہ سا بنایا اور اس گولے کو دونوں

میں مسلنا شروع کر دیا' وہ تھوڑی دیر تک نوٹ کو مسلتے رہے' اس کے بعد انہوں نے نوٹ کو سیدھا ...وٹ بری طرح چرمرا گیا تھا' اس پر سلوٹیں ہی سلوٹیں تھیں' انہوں نے وہ نوٹ دوبارہ کلاس کو دکھایا ...چھا ''یہ اب کتنے کا نوٹ ہے'' کلاس دوبارہ بولی ''سو روپے کا'' ماسٹر صاحب مسکرائے' انہوں نے ...زمین پر گرایا' اس پر پاؤں رکھا اور پاؤں کے ساتھ نوٹ کو رگڑنا شروع کر دیا' وہ تھوڑی دیر بعد جھکے' ...نے نوٹ اٹھایا' نوٹ اب بری طرح کچلا جا چکا تھا' اس پر مٹی اور کیچڑ کے داغ لگ چکے تھے' اس کا ...کونا پھٹ چکا تھا اور جوتے اور فرش کی رگڑ سے اس کا رنگ اور عبارت بھی مٹ چکی تھی' انہوں نے ...دوبارہ کلاس کی طرف لہرایا اور پوچھا ''اب بتاؤ یہ نوٹ کتنے کا ہے'' کلاس کا جواب وہی تھا ''جناب ...اب بھی سو روپے کا ہے'' ماسٹر صاحب نے نوٹ تہہ کیا اور جیب میں رکھ لیا۔

وہ کلاس کی طرف مڑے اور آہستہ اور نرم آواز میں بولے ''اس نوٹ کی قیمت سو روپے تھی' ...ت بھی جب یہ نیا' نکور اور خوبصورت تھا' اس وقت بھی جب میں نے اسے ہاتھ میں مسلا اور اس ...بھی جب میں نے اسے جوتے تلے رگڑا'' وہ رکے' مسکرائے اور بولے ''سو روپے کا نوٹ سو روپے ...ٹ ہی رہا' نوٹ کی کسی تذلیل' کسی زیادتی اور کسی بے حرمتی نے نوٹ کی اہمیت' نوٹ کی ویلیو اور ...کی وقعت میں کمی نہیں کی'' ہم حیرت سے ماسٹر صاحب کی طرف دیکھتے رہے' ماسٹر صاحب بولے ...کے بڑے لوگ سو روپے کے نوٹ کی طرح ہوتے ہیں' یہ لوگ جب اپنی مقبولیت کی انتہا پر ہوتے ...بھی یہ سو روپے کے نوٹ ہوتے ہیں اور جب یہ لوگ زندگی کی سختیوں' زندگی کی ٹھوکروں اور زندگی ...لوں میں گھرے ہوتے ہیں تو اس وقت بھی یہ لوگ سو روپے کے نوٹ ہی ہوتے ہیں' سو روپے کا ...سیٹھ صاحب کی جیب میں ہو یا کسی بھنگی کی بدبودار شلوار کے نیفے میں وہ سو روپے کا نوٹ ہی رہتا ...وہ سہرے کی لڑی میں لٹک رہا ہو' کسی مزار کے سرہانے پڑا ہو' خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر دھرا ہو' کسی ...کے قدموں میں بکھرا ہو یا کسی بدبودار نالی میں تیر رہا ہو اس کی قدر' اس کی قیمت میں کوئی فرق ...پڑتا'' ماسٹر صاحب رکے' انہوں نے لمبا سانس بھرا اور نرم آواز میں بولے ''تم لوگ زندگی میں سو ...کا نوٹ بننے کی کوشش کرنا' ملک کا سب سے بڑا کرنسی نوٹ۔ اگر تم ایک بار سو روپے کا نوٹ بن ...تو اس کے بعد اپنی قدر کو پہچاننا اور پھر حالات کی سختی' مسائل کی گرمائش اور آزمائشوں کی دھوپ سے ...رانا کیونکہ حالات جو بھی ہوئے' آزمائشیں' مسائل اور سختیاں کتنی ہی کڑی کیوں نہ ہوئیں تمہاری قدر ...رہے گی' تمہاری قیمت وہی رہے گی' وقت کی کوئی سختی' آزمائش کی کوئی توہین اور حالات کا کوئی الٹا ...چکر تمہیں پونے سو روپے نہیں کر سکے گا۔ ہاں مگر تم'' وہ رکے اور دوبارہ بولے ''ہاں اگر تم خود

حالات کے سامنے ڈھیر ہو گئے' اگر تم نے خود شکست مان لی اگر تم خود وقت کی چوکھٹ پر لیٹ گئے تو دوسری بات ہے ورنہ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں تمہارے مقام' تمہاری قدر اور تمہاری قیمت سے نہیں گرا سکے گی' ماسٹر صاحب کا لیکچر ختم ہو گیا لیکن وہ لیکچر ساٹھ طالب علموں کو ان کی قدر و قیمت بتا گیا' ساٹھ طالب علم جان گئے وہ قدرت کے ٹکسال سے نکلے ہوئے کرنسی نوٹ ہیں اور ہر کرنسی نوٹ پر قدرت نے ایک قدر نقش کر دی ہے اور جب تک ان کا وجود سلامت ہے ان کی قدر قائم رہے گی اور دنیا کی کوئی طاقت اس قدر میں کمی نہیں کر سکے گی۔

میں آج جب صدر پرویز مشرف کو دیکھتا ہوں اور پوری دنیا کو ان سے استعفے کے مطالبے کرتے دیکھتا ہوں اور ان مطالبوں کے جواب میں صدر پرویز مشرف کے اس قسم کے بیان سنتا ہوں "میں ہرگز استعفیٰ نہیں دوں گا' میں پسپا نہیں ہوں گا' میں مقابلہ کروں گا' وغیرہ' وغیرہ' تو میں بے اختیار ہنس پڑتا ہوں اور سوچتا ہوں شائد صدر پرویز مشرف اپنی قدر و قیمت کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھے' وہ ایک روپے کا ایک ایسا کرنسی نوٹ تھے جو خود کو ملین ڈالر کا بانڈ سمجھ بیٹھا تھا یا وہ کانچ کا ایک ایسا ٹکڑا تھے جو دس تولے سونے کے ہار میں پرویا ہوا تھا اور جب سونا ان کے وجود سے الگ ہوا اور ان کی اپنی بولی شروع ہوئی تو انہیں پہلی بار اپنی کم مائیگی کا اندازا ہوا' جب بانڈ کی مدت ایکسپائر ہو گئی اور وہ کاغذ کا محض ایک حقیر سا ٹکڑا رہ گیا' ایک ایسا ٹکڑا جس سے اب کوئی انگلی تک صاف کرنے کیلئے تیار نہیں تو اسے اس وقت اپنی اصل قیمت کا اندازا ہوا لیکن یہ انا بھی عجیب چیز ہوتی ہے' یہ وہ پتھر ہوتی ہے جو شیشوں میں رہتے رہتے خود کو شیشہ سمجھ بیٹھتا ہے اور یہ وہ سیاہ' کالا بھنورا ہوتی ہے جو پھولوں میں رہ رہ کر خود کو خوشبو سمجھ بیٹھتا ہے لیکن جب بہار گزر جاتی ہے یا شیشے چکنا چور ہو جاتے ہیں' جب عکس روٹھ جاتے ہیں اور جب خوشبوئیں بکھر جاتی ہیں تو اس وقت بھنورے کو بھنورا اور پتھر کو پتھر ہونے کا احساس ہوتا ہے لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے بھنورے کا دل ہو یا پتھر کا دماغ وہ کبھی حقیقت تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا اور یہ بھی ہو سکتا ہے صدر پرویز مشرف واقعی سو روپے کا نوٹ ہوں اور حالات کی سختیاں انہیں کچلنے' مسلنے اور رگیدنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر حقیقت کیا ہے؟ اس کا فیصلہ اب وقت نے کرنا ہے اور وقت کو وقت دینا اب صدر پرویز مشرف کا کام ہے' وہ اونچی دیواروں کے محل سے باہر آئیں اور خود کو حالات کی بھٹی میں گرنے دیں' اگر وہ سو روپے کا اصلی نوٹ ہوئے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کی قدر کو نہیں مٹا سکے گی اور اگر وہ شیشوں کے دیس کے پتھر ہوئے تو محل کی دیواریں ان کو زیادہ دیر تک نہیں بچا پائیں گی۔ صدر مشرف کیا تھے؟ اور کیا ہیں اب اس کا فیصلہ وقت نے کرنا ہے اور وقت اب صدر مشرف سے زیادہ دور نہیں۔

اگر کوئی ٹنل نہ ہوتی

پاکستان کی سیاست میں ہر دس' پندرہ روز بعد ایک نیا سوال جنم لیتا ہے اور یہ سوال اس وقت
پوچھا اور بتایا جاتا رہتا ہے جب تک کوئی نیا سنگین اور مشکل سوال اس کی جگہ نہیں لے لیتا۔
مارچ سے پہلے لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے "کیا افتخار محمد چودھری بحال ہو جائیں گے"
16 مارچ کے بعد لوگ پوچھ رہے ہیں "کیا میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری کے درمیان
مفاہمت ہو جائے گی' ایک سوال کا جواب مل چکا ہے اور دوسرے کے جواب کی تلاش شروع ہو
ہے۔ میں جب بھی کسی سے یہ سوال سنتا ہوں تو مجھے سرد جنگ کے دور کا ایک لطیفہ یاد آ جاتا ہے۔ یہ
1960ء کی دہائی میں ایجاد ہوا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں مشہور ہو گیا' ٹرین کے کسی
میں چار لوگ بیٹھے تھے' ایک طرف امریکی صدر جان ایف کینڈی بیٹھا تھا' اس کے سامنے سوویت
کا وزیراعظم خروشچیف تھا' خروشچیف کے ساتھ اسرائیل کی آئرن لیڈی گولڈا مائر بیٹھی تھی جبکہ کینڈی
ساتھ ہالی وڈ کی شہرہ آفاق اداکارہ الزبتھ ٹیلر بیٹھی تھی۔ یہ چاروں عالمی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے' اس
ن ٹرین ایک ٹنل میں داخل ہو جاتی ہے اور ڈبے میں گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے' اندھیرے میں
سے کی آواز آتی ہے اور ساتھ ہی ایک زوردار تھپڑ کی آواز گونجتی ہے۔ ٹنل ختم ہوتی ہے تو ڈبے کے مسافر
ہیں صدر کینڈی نے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا ہے اور اس کا گال تھپڑ سے سرخ ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ڈبے
چاروں مسافر کیا سوچتے ہیں' یہ لطیفہ اس کے بارے میں ہے۔ اس لمحے صدر کینڈی سوچتا ہے
یف نے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے الزبتھ ٹیلر کو "کس" کیا' خود سائیڈ پر ہو گیا اور الزبتھ ٹیلر
ھے تھپڑ مار دیا۔ الزبتھ ٹیلر کینڈی کا سرخ گال دیکھ کر سوچتی ہے جان ایف کینڈی نے اندھیرے کا
اٹھاتے ہوئے گولڈا مائر کو "کس" کیا اور گولڈا مائر نے اس جسارت پر اسے تھپڑ مار دیا' گولڈا مائر اس
سوچ رہی ہوتی ہے کینڈی کس قدر گھٹیا انسان ہے اس نے الزبتھ ٹیلر کو "کس" کیا اور دنیا کی اتنی
شخصیات کے سامنے بے عزتی کرالی جبکہ خروشچیف اس لمحے سوچتا ہے آدھ گھنٹے بعد ایک اور ٹنل
گی' ڈبے میں اندھیرا ہو گا' وہ منہ سے چومنے کی نقلی آواز نکالے گا اور ایک بار پھر کینڈی کے منہ پر
ارے گا۔

یہ لطیفہ محض ایک لطیفہ نہیں بلکہ ایک بہت بڑا سیاسی فلسفہ ہے اور آپ اگر دنیا بھر کے سیاسی مسائل کو اس فلسفے میں رکھ کر دیکھیں تو آپ کو محسوس ہو گا دنیا کے ہر ملک میں کوئی نہ کوئی سیاستدان کسی نہ کسی لنل کا فائدہ اٹھا رہا ہے' وہ منہ سے چومنے کی جعلی آواز نکالتا ہے اور ساتھ ہی مخالف کے منہ پر تھپڑ مار دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ بے چارہ بدنام ہو جاتا ہے اور سیاسی کھیل آگے بڑھتا رہتا ہے۔ پاکستان میں بھی پچھلے ایک سال سے یہی ہو رہا تھا' پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن کی مفاہمت ذرا سی آگے بڑھتی تھی تو کوئی نہ کوئی لنل آ جاتی تھی اور اس کے بعد سارے کھلاڑی ایک دوسرے کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتے تھے۔ اس دوران دونوں پارٹیوں کے بہی خواہ آگے بڑھتے تھے' ڈپلومیسی کا کوئی نہ کوئی پچھلا دروازہ کھولا جاتا تھا' مذاکرات اور مفاہمت کا نیا سلسلہ شروع ہوتا تھا لیکن اس دوران ایک بار پھر لنل آ جاتی تھی اور دونوں جماعتیں دوبارہ ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہو جاتی تھیں۔ 16 مارچ کو تنازعے کی بڑی وجہ درمیان سے نکل گئی' عدلیہ بحال ہو گئی چنانچہ دونوں جماعتیں ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ اس قربت کی چار بڑی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ گورنر پنجاب سلمان تاثیر ہیں' گورنر پنجاب سلمان تاثیر ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود پاکستان مسلم لیگ ن کی صفوں میں "ڈینٹ" نہیں ڈال سکے لہٰذا پنجاب میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نہیں بن پا رہی۔ گورنر سلمان تاثیر نے پاکستان مسلم لیگ ق کے ساتھ مل کر حکومت بنانے کی کوشش بھی کی لیکن یہ کوشش بھی بار آور ثابت نہیں ہوئی کیونکہ ایک تو پاکستان مسلم لیگ ق کے 75 فیصد ارکان پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ بیٹھنے کیلئے تیار نہیں ہیں اور دوسرا چودھری پرویز الٰہی اور سلمان تاثیر دونوں مل کر بھی فارورڈ بلاک کو واپس نہیں لا سکے اور فارورڈ بلاک کی واپسی کے بغیر پنجاب میں دونوں کی مشترکہ حکومت نہیں بن سکتی' ہاں البتہ چودھریوں نے 25 فروری کی صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت سے اپنے زیادہ تر مسائل حل کرا لئے ہیں' پنجاب کے بے شمار اضلاع میں چودھریوں کی سفارش پر ڈی پی اوز اور ڈی سی اوز تعینات کئے گئے اور ان افسروں نے چودھریوں اور ان کے دوستوں کے زیادہ تر مسائل حل کرا دیئے ہیں۔ دوم' پاکستان مسلم لیگ ن بھی پنجاب میں "سولو فلائیٹ" نہیں کر سکتی۔ اس کے پاس ارکان کی کمی ہے' اس کے پاس پاکستان مسلم لیگ ق کا فارورڈ بلاک موجود ہے لیکن یہ فارورڈ بلاک پاکستان مسلم لیگ ن کی حکومت سازی میں آئینی طور پر کوئی بڑا کردار ادا نہیں کر سکتا کیونکہ اگر فارورڈ بلاک نے پاکستان مسلم لیگ ن کے امیدوار کو ووٹ دیئے تو یہ لوگ ڈس کوالی فائیڈ ہو جائیں گے جس کے بعد حکومت دوبارہ ٹوٹ جائے گی۔ پاکستان مسلم لیگ ن کے پاس مسلم لیگ ق سے اتحاد

آپشن موجود ہے لیکن مسلم لیگ ن کے وہ تمام ارکان اس اتحاد کیلئے راضی نہیں ہیں جنہیں پاکستان مسلم
ق اپنے پانچ سالہ دور میں سیاسی انتقام کا نشانہ بناتی رہی۔ یہ لوگ چودھری شجاعت حسین کو ساتھ
نے کیلئے تیار ہیں لیکن چودھری پرویز الٰہی کو کسی قیمت پر قبول کرنے کیلئے رضامند نہیں ہیں۔ پچھلے دو ماہ
کے دوران چودھری نثار اور سینیٹر اسحاق ڈار نے دونوں مسلم لیگوں کے ادغام کیلئے ٹھیک ٹھاک کام کیا۔ ان
مہینوں میں اسحاق ڈار کی ایک شاندار خفیہ صلاحیت کھل کر سامنے آئی۔ ڈار صاحب ایک کامیاب ثالث
بت ہوئے' ان کی جیب میں بے شمار فارمولے ہوتے ہیں اور ان کا کوئی ایک فارمولہ ناکام ہو جاتا ہے
یہ فوراً دوسرا فارمولہ نکال کر پیش کر دیتے ہیں چنانچہ اسحاق ڈار دونوں جماعتوں کو مفاہمت کے قریب
لے آئے تھے لیکن مسلم لیگ ن کے وہ عقاب جو چودھری پرویز الٰہی کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں وہ
ن وقت میں سامنے آ گئے چنانچہ مسلم لیگوں کے اتحاد کا معاملہ تعطل کا شکار ہو گیا۔ نمبر تین' میاں نواز
ریف نے پچھلے نو برسوں میں حالات سے بہت کچھ سیکھا صاحب اب واقعی ایک لیڈر کی طرح ابھر
ہے ہیں' میاں صاحب نے عدلیہ کو بحال کرا کر ایک بہت بڑا سیاسی سنگ میل عبور کر لیا ہے جس سے ان
نیک نامی اور سیاسی قد کاٹھ میں بہت اضافہ ہوا۔ میاں صاحب حالات کی نزاکت کو سمجھ رہے ہیں' یہ
نتے ہیں اگر یہ نظام نہ چلا تو ایک اور بارہ اکتوبر آ جائے گا اور ان لوگوں کو سسٹم میں واپس آنے کے لئے
ید دس برس جدوجہد کرنا پڑے گی چنانچہ یہ اس حکومت کو پانچ سال تک چلانا چاہتے ہیں اور چوتھی وجہ
ک کی گھمبیر صورتحال ہے۔ ملک معاشی' سیاسی' جغرافیائی' لسانی اور دہشت گردی کے شدید مسائل میں
را ہوا ہے۔ بھارت اور امریکہ کی طرف سے دباؤ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے' ملک سے پانی' بجلی'
س' روزگار اور امن وامان غائب ہو چکا ہے لہٰذا ان حالات میں اگر کوئی بڑا سیاسی بحران پیدا ہوا تو
زیرو پوائنٹ پر چلا جائے گا جس کے بعد بانس اور بانسری دونوں فارغ ہو جائیں گے چنانچہ ملک کو
حالات سے نکالنے کیلئے دونوں پارٹیوں کا اتحاد ناگزیر ہے۔

ہم اگر ان چاروں وجوہات کا جائزہ لیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا ان حالات میں پاکستان
ز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن کا اتحاد انتہائی ضروری ہے چنانچہ دونوں پارٹیاں دوبارہ ایک
رے کی طرف بڑھ رہی ہیں لیکن اس بار معاہدہ صدر آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف کی
ئے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور میاں نواز شریف کے درمیان ہو گا اور قومی اور بین الاقوامی
شعث اس معاہدے کی ضامن ہو گی۔ حالات سے یوں محسوس ہوتا ہے سپریم کورٹ 25 فروری کے
پر نظر ثانی کر لے گی اور پنجاب کی حکومت کو 24 فروری 2009ء کی پوزیشن پر بحال کر دے گی

جس کے بعد پنجاب اور وفاق میں پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن دوبارہ ایک دوسرے کی ساتھی بن جائیں گی۔ آج کے دن تک مستقبل کا سیاسی سیناریو اسی طرح دکھائی دے رہا ہے' اگر کل تک راستے میں کوئی نئی ٹنل نہ آئی اور کسی نے اندھیرے کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی تو معاملات اسی طرح آگے بڑھتے رہیں گے ورنہ دوسری صورت میں یہ ٹرین دوبارہ کسی ایسی پٹڑی پر چڑھ جائے گی جس کے آخر میں سرنگیں ہی سرنگیں ہوں گی۔

⦸ ⦸ ⦸

بدقسمت قوم

یہ سوویت یونین کے مشہور حکمران خروشیف کا واقعہ ہے' جب وہ سوویت یونین کا صدر بنا تو نے پارلیمنٹ میں اپنے پہلے خطاب میں سابق صدر سٹالن اور اس کی پالیسیوں پر تنقید شروع کر دی' کہنا تھا سٹالن میں برداشت نہیں تھی' وہ ایک بدبودار آمر تھا' وہ ظالم تھا' وہ اختلاف کرنے والے وں تک کو دشمن سمجھ لیتا تھا' اس کے خوشحالی اور معاشی استحکام کے دعوے بھی جھوٹے تھے اور سوویت ن کو جتنا نقصان سٹالن نے پہنچایا اتنا ساری سرمایہ دار دنیا مل کر نہیں پہنچا سکی وغیرہ وغیرہ' خروشیف ان خیالات کا اظہار کر رہا تھا تو معزز ارکان میں سے کسی نے چٹ پر کچھ لکھا اور اس تک پہنچا دیا' یف نے ایک لمحے کیلئے رک کر چٹ پڑھی' لکھا تھا ''آپ کو سٹالن کے قریب رہنے کا موقع ملا جب وویت یونین کو نقصان پہنچا رہا تھا تو آپ نے اس وقت اس کو کیوں نہیں روکا تھا'' خروشیف کا چہرہ ہو گیا' اس نے وہ چٹ ایوان کی طرف لہرائی اور چلا کر کہا ''یہ کس گستاخ نے لکھا ہے' ایوان میں '' راپ سائلنس'' ہو گئی اور تمام ارکان بغلیں جھانکنے لگے' خروشیف دوبارہ چلایا ''میں پوچھ رہا ہوں' یہ خ کون ہے'' ایوان میں خاموشی رہی' خروشیف نے قہقہہ لگایا' چٹ پھاڑی اور پرزے ہوا میں ل کر بولا ''جب سٹالن سوویت یونین کو نقصان پہنچا رہا تھا تو ہم بھی ایسی ہی چٹیں لکھا کرتے تھے اور ں رہتے تھے''۔

یہ اقتدار کی ٹریجڈی ہے' شاہوں کی قربت میں امام یوسف ہوں' نصیر الدین طوسی جنرل گلزار کیانی' شیخ رشید یا پھر اعجاز الحق اختلاف رائے ہمیشہ مزاج شاہ کے تابع ہوتا ہے اور بڑے سے الم بڑے سے بڑا فلاسفر' بڑے سے بڑا دانشور اور بڑے سے بڑا جرنیل بھی جب حلقہ بگوش شاہ ہو ہے تو پھر وہ اختلاف کی طاقت کھو بیٹھتا ہے' بادشاہوں کی صحبت میں تو کلمہ حق کہنے کیلئے بھی شاہ کی ت درکار ہوتی ہے لہٰذا جب تک اقتدار کا سورج سوا نیزے پر رہتا ہے بڑے سے بڑا حق گو بھی نقطہ لکھنے اور جلال شاہی کے وقت سر جھکا کر چپ چاپ بیٹھے رہنے پر اکتفا کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے قت سر اٹھانے کی جرأت کی تو اس کا سر سلامت نہیں رہے گا اور اگر سر بچ بھی گیا تو بھی وہ قربت

شاہی سے ضرور ہاتھ دھو بیٹھے گا اور ظاہر ہے ایوان اقتدار سے باہر کھڑے سیاستدانوں اور دریا کے خشک کناروں پر پڑی مچھلی میں کوئی فرق نہیں ہوتا' قربت شاہی میں زندگی بسر کرنے والے لوگ اس ماحول اور اس ماحول کے پروٹوکول سے اتنے آشنا ہوتے ہیں کہ اگر انہیں کبھی بادشاہ سلامت خود بھی اختلاف رائے کا حق عنایت کر دیں تو بھی وہ چٹ لکھنے تک ہی محدود رہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں اختلاف کا یہ حق کسی بھی وقت گستاخی میں تبدیل ہو سکتا ہے اور اقتدار کے ایوانوں میں گستاخی کی سزا موت ہوتی ہے' جسمانی یا سیاسی موت! روشن خیال اور وسیع القلب بادشاہ ڈاکوؤں کے اس سردار کی طرح ہوتے ہیں جس نے ڈاکے کا ایک منصوبہ بنایا' اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھا اور آخر میں پوچھا' اگر کسی کو اعتراض ہو تو وہ کھڑا ہو کر اختلاف کر لے میں بڑا لبرل سردار ہوں' میں اختلاف رائے کو ہمیشہ پسند کرتا ہوں' سردار کا اعلان سن کر ایک نوجوان ڈاکو کھڑا ہوا اور جرأت سے بولا' یہ ایک بالکل خام منصوبہ ہے اور مجھے یقین ہے اس منصوبے کے آخر میں ہم سب پکڑے جائیں گے' سردار نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی اور جب وہ نوجوان خاموش ہوا تو سردار نے جیب سے ریوالور نکالا' نوجوان ڈاکو کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی' نوجوان پیچھے گر گیا' سردار نے ریوالور کی نلی پر پھونک ماری اور پسینہ پونچھتے ہوئے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بولا "کسی اور کو اعتراض ہو تو وہ بھی کھڑا ہو جائے"۔

میں پچھلے کچھ عرصے سے سابق حکومت میں شامل چند وزراء کو سچ بولنے کے ہیضے میں مبتلا دیکھ رہا ہوں' اعتراف جرم کا یہ معاملہ شروع میں شیخ رشید تک محدود تھا' انہوں نے سب سے پہلے فرمایا تھا لال مسجد آپریشن اور چیف جسٹس کی معطلی شوکت عزیز حکومت کی سب سے بڑی غلطی تھی' پھر شیر افگن کا ضمیر جاگا' پھر وصی ظفر بولے' اس کے بعد آفتاب احمد شیر پاؤ بولنے لگے' پھر مخدوم فیصل صالح حیات نے اعتراف شروع کر دیا' اسی دوران سید مشاہد حسین نے پچھلی حکومت کی غلطیاں تسلیم کیں اور اب اعجاز الحق کا فرمانا ہے کہ وہ لال مسجد آپریشن کے حوالے سے اپنے رویئے پر پشیمان ہیں اور معافی کے خواستگار ہیں' صدر پرویز مشرف نے جون کے وسط میں میرے ساتھ ایک خصوصی ملاقات میں شوکت عزیز کی خامیوں کا اعتراف کیا' صدر صاحب کا کہنا تھا میں نے شوکت عزیز کو تین بار پاکستان بلایا لیکن وہ خوف کا شکار ہیں چنانچہ انہوں نے واپس آنے سے انکار کر دیا' میں نے جب سابق حکومت کے سابق وزراء کے منہ سے یہ اعترافی بیانات سنے تو مجھے خروشیف کا واقعہ یاد آ گیا اور میرا دل چاہا میں ان حضرات سے پوچھوں جب 9 مارچ کو چیف جسٹس کو معطل کیا گیا تھا یا جولائی میں مدرسہ حفصہ اور لال مسجد پر فوج کشی کی جا رہی تھی تو اس وقت آپ لوگ کہاں تھے' آپ اس وقت کیوں نہیں بولے؟ اس وقت صدر پرویز مشرف اور

شوکت عزیز جو فیصلہ چاہتے تھے کر گزرتے تھے اور آپ خاموشی سے ان کے ہر فیصلے پر گردن ہلا دیتے تھے لیکن آج آپ کا ضمیر بھی جاگ گیا' آپ کو اپنی غلطیوں کا احساس بھی ہو گیا ہے اور آپ میں اعتراف کی جرأت بھی پیدا ہو گئی ہے' واہ کیا لوگ ہیں آپ!

دنیا میں سچ کا ایک دور اور ایک وقت ہوتا ہے' اگر سچ اس وقت' اس دور میں نہ بولا جائے تو وہ سچ انکشاف تو کہلا سکتا ہے لیکن سچ نہیں' دنیا میں سقراط کہلانے کا حق صرف اس شخص کو پہنچتا ہے جو ایتھنز کے اس قید خانے میں اس وقت زہر کا پیالہ پیئے جب اس کے شاگرد فرار کے لئے دروازے کھلوا چکے ہوں اور منصور بھی صرف وہی شخص کہلا سکتا ہے جو موت کو انچ انچ اپنی طرف بڑھتا دیکھے لیکن مسلسل انا الحق کے نعرے لگاتا رہے' مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے ملک میں سیاستدان تو بہت ہیں' ابوالفضل' طوسی اور ابو یوسف بھی بہت ہیں' انکشافات کرنے والے حق گو بھی بہت ہیں لیکن سقراط اور منصور کوئی نہیں اور یہ سچ ہے قوموں اور ملکوں کو جابر سلطان کے سامنے چٹیں لکھنے والے ابو یوسف اور انکشاف کرنے والے ابوالفضل کی نہیں بلکہ درباروں میں سچ بولنے والے سقراط اور وقت کی دہلیز پر حق کہنے والے منصوروں کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم اس معاملے میں ایک بدقسمت قوم ہیں اور ہمارے تمام باضمیر سیاستدانوں کا ضمیر صرف اپوزیشن میں جاگتا ہے' یہ لوگ اقتدار سے فارغ ہو کر سچ بولنا شروع کر دیتے ہیں' معافیاں مانگنا شروع کر دیتے ہیں اور جوں ہی انہیں اقتدار میں شامل ہونے کا دوبارہ موقع ملتا ہے یہ لوگ اپنے ضمیر کو کسی گہری کھائی میں جا پھینکتے ہیں' یہ اسے زمین کی سات تہوں میں دفن کر دیتے ہیں اور جب تک اقتدار میں ان کی شراکت برقرار رہتی ہے یہ لوگ بادشاہ سلامت کی بڑی سے بڑی غلطی اور بڑی سے بڑی حماقت پر سر ہلاتے رہتے ہیں' واہ واہ کرتے رہتے ہیں لیکن جوں ہی بادشاہ سلامت کے پنجے اور دانت جھڑ جاتے ہیں تو ان لوگوں کا ضمیر دوبارہ جاگ اٹھتا ہے اور یہ میں نے کہا تھا' میں اس آپریشن کا مخالف تھا اور میں نے بڑا سمجھایا تھا کا راگ الاپنے لگتے ہیں' ہم حقیقتاً ایک ایسی بدقسمت قوم ہیں جسے ہمیشہ نماز کے بعد وضو یاد آتا ہے اور تدفین کے بعد غسل۔

⊘ ⊘ ⊘

چند دن انتظار کیجئے

بریگیڈئر نیاز احمد ایک پراسرار کردار ہیں' وہ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اور پاکستان کے سیاسی معاملات میں ان کا کیا عمل دخل ہے؟ ہم جب ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں نکلتے ہیں تو ہم بے شمار کہانیوں میں الجھ جاتے ہیں' مثلاً پہلی کہانی بریگیڈئر نیاز احمد کے پس منظر کے بارے میں مشہور ہے۔ بریگیڈئر نیاز احمد چکوال کے گاؤں درمیال کے رہنے والے ہیں' درمیال کی آدھی آبادی قادیانی مذہب سے تعلق رکھتی ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے بریگیڈئر صاحب کا تعلق بھی اسی مسلک سے ہے۔ بریگیڈئر صاحب آرٹلری کی ایک ایسی یونٹ سے وابستہ رہے ہیں جس میں صدر پرویز مشرف نے بھی اپنے کیریئر کے شروع میں کام کیا تھا۔ 1977ء میں بریگیڈئر نیاز لاہور میں تعینات تھے' یہ بھٹو کے خلاف تحریکوں کا دور تھا' ذوالفقار علی بھٹو نے تحریک دبانے کیلئے لاہور میں جزوی مارشل لاء لگا دیا لیکن جب اس کے باوجود ''مرض'' کنٹرول نہ ہوا تو بھٹو صاحب نے جلوس پر براہ راست گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ جنرل ضیاء الحق اس وقت چیف آف آرمی سٹاف تھے اور جنرل اقبال لاہور کے کور کمانڈر۔ جنرل اقبال نے وزیراعظم کا حکم اپنے بریگیڈئرز کو بھجوا دیا لیکن لاہور کے تین بریگیڈئرز نے یہ بے رحمانہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس حکم عدولی پر تینوں بریگیڈئرز کو نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ ان بریگیڈئرز میں بریگیڈئر نیاز احمد بھی شامل تھے' بھٹو صاحب کے بعد جب جنرل ضیاء الحق نے ''ٹیک اوور'' کیا تو انہوں نے بریگیڈئر نیاز کو بلایا اور انہیں ''تلافی'' کی پیش کش کی' اس ملاقات کے دوران طے ہوا فوج آئندہ بریگیڈئر نیاز اور بریگیڈئر اشرف کے ذریعے ہتھیار اور فوجی آلات درآمد کرے گی۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے ''فوجی رفقاء'' کو اس حکم سے مطلع کر دیا جس کے بعد بریگیڈئر نیاز کا نیا کیریئر شروع ہوا اور وہ آج تک اسی پیشے سے وابستہ ہیں' اس کاروبار میں بریگیڈئر صاحب نے بعدازاں اربوں روپے کمائے اور ان کا شمار فوج کے انتہائی امیر ریٹائر افسروں میں ہونے لگا۔

بریگیڈئر صاحب کے بارے میں دوسری کہانی ان کے صدر پرویز مشرف کے ساتھ تعلقات کے بارے میں مشہور ہے' جنرل پرویز مشرف نے جونیئر افسر کی حیثیت سے بریگیڈئر نیاز کی رجنٹ میں

م کیا تھا اور اس کام کے دوران دونوں میں برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے اور یہ تعلقات تیس برس زرنے کے بعد آج تک برقرار ہیں' دونوں ''برج'' کے کھلاڑی بھی ہیں اور جب بھی ان کی ملاقات تی ہے تو ان کا زیادہ تر وقت ''برج'' کھیلتے گزرتا ہے۔ 12 اکتوبر 1999ء کی شام جنرل پرویز رف نے جب میاں نواز شریف کی حکومت ''رول بیک'' کی اور وہ ملک کے چیف ایگزیکٹو بن گئے تو سرے یا تیسرے دن بریگیڈئر نیاز جنرل پرویز مشرف سے ملنے گئے اور دونوں نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ یہ شتہ ان کے دیرینہ تعلقات کی واضح دلیل تھی۔ بریگیڈئر صاحب کے بارے میں تیسری کہانی نواز یف فیملی سے ان کے تعلقات کے بارے میں مشہور ہے۔ بعض احباب کا کہنا ہے بریگیڈئر نیاز ہی خصیت تھی جو میاں نواز شریف کو پنجاب کے گورنر جنرل جیلانی کے پاس لے کر گئی تھی اور اس ملاقات بعد نواز شریف کا سیاسی کیریئر شروع ہوا تھا لیکن یہ کہانی زیادہ قرین قیاس نہیں لگتی کیونکہ اس میں زیادہ یگیڈئر قیوم کا نام آتا ہے۔ بریگیڈئر قیوم ایک سوشل افسر تھے اور وہ جنرل جیلانی کی یونٹ سے تعلق تے تھے چنانچہ انہوں نے نواز شریف کا رابطہ جنرل جیلانی سے کرایا اور یوں میاں نواز شریف پر ست اور اقتدار کا دروازہ کھل گیا اور اس کے بعد میاں صاحب نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا لیکن یہاں یہ ل پیدا ہوتا ہے پھر بریگیڈئر نیاز اور نواز شریف خاندان کے تعلقات کب شروع ہوئے اور ان کی ت کیا تھی۔ اس کے بارے میں بھی بے شمار کہانیاں گردش کر رہی ہیں لیکن ان میں دو زیادہ مشہور ۔ پہلی کہانی شریف خاندان کی سعودی عرب جلاوطنی کے بارے میں تھی' بعض احباب کا کہنا ہے یف برادران کی اسیری کے دوران میاں صاحب کے کسی مہربان نے بریگیڈئر نیاز سے رابطہ کیا اور یڈئر صاحب نے صدر پرویز مشرف کو سمجھا بجھا کر شریف خاندان کو جلاوطن کرنے پر راضی کر لیا لیکن یہ پرویز مشرف کی شرط تھی ''اگر کوئی برادر ملک شریف خاندان کی گارنٹی دے تو میں انہیں دس سال ے باہر بھجوانے پر تیار ہوں'' بریگیڈئر صاحب نے یہ پیغام میاں نواز شریف کے دوستوں کو پہنچا دیا اور ف خاندان نے اس پیغام کے بعد امریکہ' سعودی عرب اور لبنان میں موجود اپنے دوستوں سے کیا' لبنان کے وزیراعظم رفیق الحریری کا پائلٹ پاکستانی تھا (اس پائلٹ کے بھائی وزیراعظم شوکت کی کابینہ میں وزیر مملکت رہے ہیں) اور اس پائلٹ نے بھی رابطے کیلئے بڑا کام کیا تھا' آخر کار یہ ے رابطے نتیجہ خیز ثابت ہوئے اور شریف خاندان رفیق الحریری اور شاہ عبداللہ (اس وقت سعودی ب کے ولی عہد) کی گارنٹی پر سعودی عرب جلاوطن ہو گیا۔ دوسری کہانی کے مطابق بریگیڈئر نیاز لندن رہتے تھے اور جب شریف برادران لندن منتقل ہوئے تو میاں شہباز شریف کا ان سے رابطہ استوار

ہوا اور بریگیڈئر صاحب کے ذریعے میاں شہباز شریف اور صدر پرویز مشرف کے درمیان ڈائیلاگ اور تہنیتی پیغامات کا سلسلہ شروع ہو گیا' میاں نواز شریف نے ستمبر 2007ء میں پاکستان واپسی کا اعلان کیا تو بریگیڈئر نیاز ایک پاکستانی بزنس مین کے ساتھ صدر پرویز مشرف کا پیغام لے کر لندن گئے' صدر کی خواہش تھی اگر میاں نواز شریف اپنی واپسی صدارتی انتخاب تک مؤخر کر دیں تو حکومت ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالے گی لیکن میاں نواز شریف اس وقت تک اپنی واپسی کا شیڈول دے چکے تھے چنانچہ انہوں نے یہ پیش کش مسترد کر دی' یوں یہ وفد ناکام واپس آ گیا اور اس کے بعد میاں نواز شریف 10 ستمبر کو واپس آئے اور حکومت نے انہیں خصوصی طیارے کے ذریعے سعودی عرب بھجوا دیا۔ پاکستان کے سیاسی افق پر اس کے بعد بڑی تیزی سے تبدیلیاں آئیں اور بریگیڈئر نیاز کا نام تبدیلیوں کے اس گرد و غبار میں گم ہو گیا۔

بریگیڈئر نیاز گزشتہ اتوار کو ایک بار پھر سامنے آ گئے' جنوری کے دوسرے ہفتے میاں شہباز شریف نے اسلام آباد میں بریگیڈئر نیاز سے ملاقات کی' اس ملاقات کے بعد ان کی سعودی سفیر سے میٹنگ ہوئی اور ان ملاقاتوں کے دو دن بعد میاں صاحب لندن روانہ ہو گئے' اسی دوران بریگیڈئر نیاز بھی لندن پہنچ گئے اور ان دونوں کی روانگی کے بعد صدر پرویز مشرف کے یورپ کے نو روزہ دورے کا اعلان ہو گیا۔ صدر 20 جنوری کو بیلجیئم روانہ ہوئے' وہ 21 جنوری کو فرانس' 23 جنوری کو ڈیوس (سوئٹزر لینڈ) اور 26 جنوری کو برطانیہ جائیں گے' صدر کی روانگی سے پہلے ہی ملک میں میاں شہباز شریف اور صدر پرویز مشرف کی ملاقات کے امکانات پر سرگوشیاں شروع ہو گئی تھیں' گو میاں شہباز شریف نے لندن میں ان افواہوں کی بھرپور تردید کر دی لیکن اس کے باوجود افواہوں اور سرگوشیوں میں کمی نہ آئی اور لوگ لندن میں میاں شہباز شریف' بریگیڈئر نیاز اور صدر پرویز مشرف کی موجودگی کو محض اتفاق ماننے پر تیار نہ ہوئے۔ صدر نے بھی اس دوران یہ اعتراف کر لیا وہ لندن میں اپنے دوست بریگیڈئر نیاز سے ملیں گے۔ اسی دوران جمعرات کے دن میاں شہباز شریف کی ملاقات برطانیہ کے وزیر خارجہ ڈیوڈ ملی بینڈ سے بھی ہوئی اور ہفتے کے دن چھوٹے میاں صاحب نے یہ بیان بھی جاری کر دیا ''اگر صدر پرویز مشرف شفاف الیکشن اور ق لیگ کی حمایت ختم کرنے کا اعلان کر دیں تو ان سے مذاکرات ہو سکتے ہیں'' اسی دوران ملک میں ایک سال کیلئے قومی حکومت کے قیام کی سرگوشیاں بھی شروع ہو گئیں اور میاں نواز شریف کی طرف سے اس کی حمایت میں بیانات بھی آنے لگے۔ ان بیانات کے بعد سیاسی فضا ٹھیک ٹھاک گرم ہو گئی۔ 26 جنوری ابھی دور ہے اور ہم آج بیٹھ کر حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے آیا

ن میں صدر اور میاں شہباز شریف کے درمیان ملاقات ہو گی یا نہیں اور اگر یہ ملاقات ہوئی تو اس کا کیا نکلے گا لیکن یہ طے ہے محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد صدر پرویز مشرف کے پاس صرف میاں وران کا آپشن بچا ہے' صدر صاحب کو صاف دکھائی دے رہا ہے 18 فروری کے بعد پیپلز پارٹی ریت حاصل کر لے گی اور میاں نواز شریف کے ساتھ مل کر حکومت بنا لے گی اور اگر ایک بار پیپلز پارٹی کومت بن گئی تو وہ صدر پرویز مشرف کو چند ماہ میں فارغ کر دے گی۔ صدر صاحب یہ بھی جانتے ہیں سلم لیگ ق کا گھوڑا کمزور ہو چکا ہے اور اب یہ گھوڑا صدر کا بوجھ برداشت نہیں کر سکے گا چنانچہ اگر صدر بار کا کارڈ دکھا کر مسلم لیگ ن کو پیپلز پارٹی سے دور لے جاتے ہیں اور 18 فروری کے بعد مسلم لیگ مسلم لیگ ق اور ایم ایم اے کی مدد سے حکومت بنا لیتے ہیں تو حالات ان کے قابو میں آ جائیں گے ن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے' کیا پاکستان مسلم لیگ ن اور میاں برادران صدر پرویز مشرف کے پ میں آ جائیں گے؟ ہمیں اس فیصلے کیلئے بریگیڈئر نیاز' صدر پرویز مشرف اور میاں شہباز شریف کی ی تک انتظار کرنا پڑے گا لہٰذا چند دن انتظار کیجئے۔

⊘ ⊘ ⊘

چندری گل

یہ دنیا کتاب ہے اور کتاب کے بعض واقعات مقناطیس کی طرح آپ کے دماغ میں چپک جاتے ہیں' اسی قسم کا ایک واقعہ چند ماہ قبل پاکستان مسلم لیگ ن کے ایک عہدیدار نے سنایا تھا' یہ عہدیدار میاں برادران کے بہت قریب ہے اور عموماً ان کی اہم میٹنگز میں بھی شریک ہوتا ہے' حکومت کے قیام کے چند دن بعد میاں نواز شریف' میاں شہباز شریف اور آصف علی زرداری کی ایک میٹنگ تھی' میٹنگ کے دوران آصف علی زرداری نے میاں برادران سے کہا'' ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے انجام گلستان کیا ہوگا؟ میاں صاحب میں پریشان ہوں' میں کہاں سے شروع کروں' کس چیز کو ٹھیک کروں' کس کو بہتر بناؤں اور کس معاملے کو وقت پر چھوڑ دوں'' میاں شہباز شریف نے یہ بات سنی تو وہ مسکرائے اور آصف علی زرداری سے کہا'' زرداری صاحب ہماری والدہ پنجابی ہیں' وہ ہمیشہ پنجابی میں گفتگو کرتی ہیں اور وہ بچپن سے ہمیں ایک نصیحت کرتی چلی آ رہی ہیں'' آصف علی زرداری نے فوراً صوفے پر کروٹ بدلی اور اپنی'' گاڈ فادر'' مسکراہٹ کے ساتھ بولے'' مینوں پنجابی آندی اے' تسی پوری گل پنجابی وچ کرو'' میاں شہباز شریف آصف علی زرداری کے منہ سے پنجابی سن کر حیران رہ گئے' ان کا خیال تھا آصف علی زرداری سندھی بلوچ ہیں' محترمہ بے نظیر بھٹو کے قریب رہے ہیں چنانچہ انہیں سندھی' بلوچی اور انگریزی آتی ہوگی لیکن آصف علی زرداری نے پنجابی بول کر سب کو حیران کر دیا' زرداری صاحب اور میاں شہباز شریف کی فطرت میں بہت فرق ہے' زرداری صاحب فیصلے میں بہت وقت لگاتے ہیں' یہ وقت بعض اوقات اتنا لمبا ہو جاتا ہے کہ اس کے بطن سے جو فیصلہ نکلتا ہے اس پر عملدرآمد کی نوبت ہی نہیں آتی جبکہ میاں شہباز شریف ایک عملی انسان ہیں اور یہ اکثر اوقات کام پہلے شروع کر دیتے اور فیصلہ بعد میں کرتے ہیں' بہر حال دونوں کی عادت کے کچھ مثبت پہلو بھی ہیں اور کچھ منفی بھی لیکن فطرت کے اس فرق کے باوجود دونوں میں ایک قدر مشترک بھی ہے' دونوں حضرات کو زبانیں سیکھنے کا بہت شوق ہے' آصف علی زرداری بھی مختلف زبانوں کے مختلف الفاظ سیکھتے رہتے ہیں اور میاں شہباز شریف بھی نصف درجن زبانیں روانی سے بول سکتے ہیں' ہم واپس واقعے کی طرف آتے ہیں' میاں شہباز شریف نے آصف علی زرداری کو بتایا

''ہماری والدہ نے ہمیں بچپن سے سکھایا تھا' انسان کو کبھی منہ سے چندری گل نہیں نکالنی چاہیے'' زرداری صاحب سنجیدگی سے میاں صاحب کی طرف دیکھتے رہے' میاں صاحب نے بتایا'' ہم پنجابی لوگ بری بات کو چندری گل کہتے ہیں اور ہمارے خاندانوں میں صدیوں بلکہ ہزاروں سالوں سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ دن میں بے شمار قبولیت کی گھڑیاں ہوتی ہیں اور قبولیت کی گھڑی میں آپ کے منہ سے کوئی چندری گل نکل جائے تو قدرت بری بات کو قبول کر لیتی ہے اور وہ بری بات بعد ازاں سچ ثابت ہو جاتی ہے چنانچہ ہماری والدہ نے بچپن سے ہمیں ٹریننگ دی تھی حالات کیسے بھی ہوں مگر کبھی منہ سے چندری گل نہ نکالیں' ہم سب بہن بھائی والدہ کی اس بات پر ہمیشہ عملدرآمد کرتے ہیں لیکن 1999ء میں میرے منہ سے ایک بار چندری گل نکل گئی تھی اور وہ قبولیت کا وقت تھا اور بعد ازاں ہمارے پورے خاندان نے اس چندری گل کا خمیازہ بھگتا'' میاں شہباز شریف خاموش ہو گئے۔

آصف علی زرداری بڑی توجہ سے میاں صاحب کی بات سنتے رہے' میاں صاحب نے بتایا ''ہم لوگوں نے پچھلے دور میں سیف الرحمن پر بہت اعتماد کیا تھا اور یہ ہماری بڑی غلطی تھی' سیف الرحمن میں کوئی صلاحیت نہیں تھی جتنی بڑی ذمہ داری ہم نے اس پر ڈال دی تھی چنانچہ جب وہ غلطیاں کرتے تھے تو میں میاں نواز شریف صاحب کے سامنے احتجاج کرتا تھا اور اس احتجاج کی وجہ سے میرے سیف الرحمن ان کے ساتھ تعلقات خراب ہو گئے تھے' 1999ء کے تمبر میں وزیراعظم ہاؤس میں ایک اجلاس تھا' اس اجلاس میں سیف الرحمن بھی شامل تھے' میری ان کے ساتھ تلخ کلامی ہو گئی' اجلاس ختم ہوا تو میں نے سلام کیلئے سیف الرحمن کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن سیف الرحمن نے غصے سے میرا ہاتھ جھٹک دیا' اسی دوران ان کا سیکرٹری ہاتھ ملانے کیلئے میری طرف بڑھا تو خان صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے' وہاں موجود تمام لوگ ان کے رویے پر حیران رہ گئے' مجھے بڑی شرمندگی ہوئی اور میں نے شرمندگی کے اس عالم میں چودھری نثار علی کو مخاطب کر کے کہا' چودھری صاحب میری بات لکھ لیں یہ شخص ہمیں چھ مہینے میں جیل تک لے جائے گا' بس میرے منہ سے چندری گل نکلنے کی دیر تھی اور حالات خراب ہونا شروع ہو گئے' 12 اکتوبر 1999ء کے بعد جب مجھے مری سے اٹک جیل لے جایا گیا اور وہاں میری ملاقات چودھری نثار علی خان سے ہوئی تو میں نے انہیں وہ وقت یاد کرایا اور ان سے کہا' چودھری صاحب میری والدہ نے مجھے منع کیا تھا' بیٹا کبھی منہ سے چندری گل نا نکالنا مگر میرے منہ سے بری بات نکل گئی اور ہم آج جیل میں بیٹھے ہیں' کاش میں اس وقت اپنا غصہ پی لیا ہوتا'' میاں شہباز شریف رکے' انہوں نے لمبا سانس لیا اور آصف علی زرداری سے مخاطب ہو کر

بولے" زرداری صاحب میں آج ایک بار پھر چندری گل نکالنے لگا ہوں' مجھے اللہ معاف کرے گا اور اللہ کرے میری بات غلط ثابت ہو لیکن میں کوشش کے باوجود اپنے آپ کو روک نہیں پا رہا" آصف علی زرداری آگے جھک گئے' میاں شہباز شریف نے دور کونے میں بیٹھے ایک صاحب کی طرف اشارہ کیا اور بولے" مجھے یہ شخص آپ کا سیف الرحمٰن لگتا ہے' یقین کیجئے اس شخص اور سیف الرحمٰن میں کوئی فرق نہیں اور میں آج دعویٰ سے کہتا ہوں اگر یہ شخص اسی طرح آپ کا مشیر رہا تو آپ کا بھی وہی انجام ہوگا جو 1999ء میں ہمارا ہوا تھا" میاں شہباز شریف رکے اور دوبارہ بولے" میں دعویٰ سے کہتا ہوں یہ شخص آپ سے بے شمار ایسی غلطیاں کرائے گا جن کے نتیجے میں آپ کے وفادار ساتھی آپ کا ساتھ چھوڑ جائیں گے' آپ کی پارٹی آپ سے ناراض ہو جائے گی' حکمران اتحاد ٹوٹ جائے گا' آپ کی حکومت ختم ہو جائے گی اور ہم سب ایک بار پھر 1999ء کی پوزیشن پر آ جائیں گے' اللہ نہ کرے وہ وقت آئے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے میری یہ چندری گل بھی کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گی" میاں شہباز شریف نے بات مکمل کی اور صوفے کے ساتھ ٹیک لگا دی' آصف علی زرداری نے دور صوفے پر بیٹھے اس شخص کی طرف دیکھا' مسکرائے اور دوسری باتیں شروع کر دیں۔

مجھے یہ واقعہ میاں برادران کے قریبی دوست نے سنایا تھا' میں پچھلے مہینے میاں شہباز شریف کے ساتھ مری جا رہا تھا تو میں نے راستے میں انہیں یہ واقعہ سنایا اور ان سے اس کی تصدیق چاہی' میاں صاحب نے نہ صرف اس واقعے کی تصدیق کر دی بلکہ افسوس سے کہا" میں جس بحران کو ایک دو برس دور دیکھ رہا تھا افسوس آصف علی زرداری کے سیف الرحمٰن نے ہمیں اس پر چار ماہ میں پہنچا دیا' مجھے اپنی چندری گل پر افسوس ہے لیکن کیا کیا جائے دنیا کی تمام حکومتوں اور تمام حکمرانوں کی ناکامیوں کے پیچھے ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں" میاں صاحب نے اتنا کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے' گاڑی سے باہر مری کی اونچائی شروع ہو چکی تھی۔

(نوٹ: چندری گل کے وہ کردار رحمان ملک تھے)

⊘ ⊘ ⊘

چینی کے برتن

انسان نے پہلا برتن کب بنایا' یہ برتن پتھر کا تھا' ہڈی' لکڑی یا پھر مٹی کا' تاریخ خاموش ہے ثابت ہو چکا ہے تہذیبی زندگی کے آغاز ہی میں برتن سازی کا عمل شروع ہو گیا تھا' انسان نے میں گیلی مٹی سے گھڑے' پیالے' پلیٹیں اور ہانڈیاں بنانا سیکھیں اور وہ بعدازاں برتنوں کو آگ میں ن کی عمر میں اضافے کا فن جان گیا' یہ سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہا لیکن 206ء قبل مسیح میں نے برتن سازی کے فن کو ایک نئی شکل دے دی' انہوں نے سفید رنگ کا میٹریل بنایا' اس میٹریل سے چودہ سو ڈگری گریڈ تک حرارت دی اور اس سے سفید رنگ کے برتن بنا دیئے' یہ برتن خاکی کے برتنوں کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت' مضبوط اور دیرپا تھے' چینیوں نے اس میٹریل کو پورسلین دیا لیکن دنیا اسے چینی مٹی کہنے لگی' پاکستان سمیت دنیا کے بے شمار ملک آج بھی سفید برتنوں کو" کے برتن" کہتے ہیں' 708ء میں جرمنی نے پورسلین میں چند نئے عناصر شامل کئے' جس کے بعد چینی کے برتنوں کا نیا دور شروع ہو گیا' اس دور کو ہم" یورپی دور" کہہ سکتے ہیں' جرمنی دنیا کا پہلا ملک تھا نے چینی کے برتنوں پر شیشے کی" پرت" چڑھائی اور اس پرت پر پھول بوٹے بنانا شروع کئے' برتن کی صنعت میں پورسلین سے برتن بنانے' برتن پر شیشے کی پرت چڑھانے اور اس پرت پر پھول بنانے کے دوران برتنوں کو مختلف درجوں پر مختلف حرارت دی جاتی ہے اور جب تک اس حرارت کا نہیں رکھا جاتا اس وقت تک برتن ٹھیک نہیں بنتے' برتن سازی میں حرارت کی سب سے زیادہ ابتدائی مرحلے میں ہوتی ہے' اس وقت برتن کو 1200 سے 1400 ڈگری سینٹی گریڈ تک دی جاتی ہے' ماہرین اس ابتدائی حرارت کو" مقدر" کہتے ہیں' ان کا خیال ہے اگر ابتدائی مرحلے ٹھیک نہ ہو' اگر اس وقت برتن ساز ایندھن کی بچت کرے یا وہ برتن کا پورا خیال نہ رکھے تو برتن میں کچا پن رہ جاتا ہے اور بعدازاں اس پر شیشے کی کتنی ہی اچھی" لیئر" چڑھا دی جائے یا اس پر کتنا ہی صورت پھول بنا دیا جائے وہ برتن دیرپا ثابت نہیں ہوتا۔

اگر دیکھا جائے تو سیاست اور سیاسی عمل بھی برتن سازی کی طرح ہوتا ہے' سیاستدان کا تجربہ

پورسلین کی وہ حرارت ہوتی ہے جو بعدازاں ملک کو ایک خوبصورت اور مضبوط نظام دیتا ہے' ہم اس سلسلے میں بھارت کی مثال دے سکتے ہیں' 22 جولائی 2007ء کو بھارت میں 15 ویں صدر کا انتخاب ہوا' اس دن بھارتی عوام نے مہاراشٹر کی 72 سالہ خاتون پرتیبھا پاٹل کو صدر منتخب کیا' پرتیبھا پاٹل 72 سال پہلے مہاراشٹر کے شہر جل گاؤں میں پیدا ہوئیں' وہ 1962ء میں 27 سال کی عمر میں سیاست میں آئیں' 1967ء میں مہاراشٹر کی ڈپٹی منسٹر بنیں' 1972ء میں وزیر بنیں' 1978ء میں اپوزیشن میں چلی گئیں' 1982ء میں ایک بار پھر وزیر بنیں' دو سال کیلئے راجیہ سبھا کی ڈپٹی چیئر مین بھی منتخب ہوئیں' 1991ء میں لوک سبھا کی کمیٹی کی چیئر پرسن بنیں' 2004ء میں راجستھان کی گورنر بنیں اور آج 2007ء میں وہ پورے بھارت کی صدر ہیں' پرتیبھا پاٹل کی ذاتی زندگی بھی بڑی متنوع اور خوبصورت تھی' وہ سٹوڈنٹ لائف میں کالج کوئین تھی' وہ ٹیبل ٹینس کی کھلاڑی تھی اور انہیں رنگین اور ملے گلے والی زندگی اچھی لگتی تھی' پرتیبھا نے اپنی 45 سالہ سیاسی زندگی میں سیاست کے سارے رنگ اور ساری اونچ نیچ دیکھی چنانچہ ذرا تصور کیجئے جب وہ کوئی سیاسی فیصلہ کریں گی تو وہ فیصلہ کتنا میچور ہوگا' اسی طرح آپ بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ کو بھی لے لیجئے' من موہن سنگھ کی عمر اس وقت 75 برس ہے اور وہ 1971ء سے سیاست میں ہیں' اس دوران انہوں نے اقتدار سے اپوزیشن تک سارے سیاسی رنگ دیکھے چنانچہ آپ ان کے فیصلوں کی گہرائی ملاحظہ کر سکتے ہیں' دنیا کے تمام شعبوں اور محکموں میں تجربہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے لیکن سیاست وہ شعبہ ہے جس میں تجربے کے بغیر نتائج حاصل نہیں ہوتے' شاید یہی وجہ ہے دنیا کے تمام سمجھدار ممالک اپنی سیاست کو ناتجربہ کار اور نااہل لوگوں سے بچا کر رکھتے ہیں' اگر تجربے کو بنیاد بنا کر دیکھا جائے تو اس وقت پوری دنیا میں سب سے زیادہ بزرگ سیاستدان بھارت میں ہیں چنانچہ یہ ان بزرگ سیاستدانوں کی عقل مندی اور دانش مندی کا نتیجہ ہے پچھلے ساٹھ برسوں میں بھارت نے کوئی کمزور اور بچگانہ سیاسی فیصلہ نہیں کیا' سیاستدانوں کی طرح سیاسی عمل اور سیاسی اداروں کی ''بزرگی'' بھی انتہائی ضروری ہوتی ہے' اگر کسی ملک میں سیاسی ادارے قائم ہوں اور ان اداروں کو پورسلین کی طرح پوری حرارت ملتی رہے تو ان اداروں کی بھٹیوں سے ایسے سیاسی برتن نکلتے ہیں جو کبھی کچی مٹی کے لوٹے ثابت نہیں ہوتے۔

ہم اگر آج پاکستان کی سیاسی صورتحال کا جائزہ لیں تو ہمیں اپنا ملک شدید افراتفری اور لاقانونیت کا شکار دکھائی دیتا ہے' ہماری حکومت ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس میں سستی چلی جا رہی ہے' ایسا کیوں ہے! مختلف تجزیہ نگار اس کی مختلف وجوہات بیان کرتے ہیں لیکن تمام لوگ افغانستان' جنوبی

ن' چیف جسٹس کی غیر فعالیت اور لال مسجد کو اس کی بنیادی وجہ قرار دیتے ہیں' یہاں یہ سوال پیدا ہے اگر ملک میں پرتیبھا پاٹل' من موہن سنگھ اور اٹل بہاری واجپائی جیسے سیاستدان ہوتے' اگر سیاسی ادارے مضبوط ہوتے اور ان اداروں کی کوکھ سے جنم لینے والی قیادت ملک پر حکمران ہوتی جنوبی وزیرستان اور لال مسجد جیسے ایشو پیدا ہوتے' کیا ہم افغانستان کے مسئلے پر امریکہ کی غیر حمایت کرتے اور کیا چیف جسٹس کا ایشو پیدا ہوتا؟ یقیناً نہیں کیونکہ ایک تجربہ کار سیاستدان اپنے تجربے کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے اور اس کے فیصلے کبھی ایسے بحران پیدا نہیں ہونے دیتے' دنیا کی دس سالہ تاریخ کا متفقہ فیصلہ ہے دنیا کے تمام شعبوں کیلئے تجربہ کار لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جس ح ہاکی کا کھلاڑی کرکٹ نہیں کھیل سکتا اور انجینئر گردے سے پتھری نہیں نکال سکتا بالکل اسی طرح فوجی جرنیل اپنی تمام تر دانش مندی' ذہانت' اخلاص اور بہادری کے باوجود ایک اچھا حکمران ثابت نہیں ہوسکتا' اس کی بنیادی وجہ ٹریننگ ہوتی ہے' فوج ایک جرنیل کو 40 سال لڑنے کی تربیت دیتی ہے وہ اس کڑی ٹریننگ کے بعد ہمیشہ بندوق کی نالی سے سوچتا ہے جبکہ سیاست مذاکرات' برداشت' سلوک اور سمجھوتے کا کھیل ہوتا ہے اور ایک اچھا اور تجربہ کار سیاستدان وہ شخص ہوتا ہے جو میز پر کچھ لئے اور کچھ دیئے بغیر نہ اٹھے جبکہ اس کے مقابلے میں جب بھی کوئی فوجی مذاکرات کرے گا تو ا نتیجہ جنگ ہوگا شاید یہی وجہ ہے دنیا نے فوج اور جرنیلوں کو پارلیمنٹس کے ماتحت کر دیا ہے اور جب کوئی پارلیمنٹ اجازت نہیں دیتی مہذب دنیا کے کسی ملک کی فوج دشمن پر حملہ نہیں کرتی۔

پاکستان کے آنے والے دن انتہائی حساس ہیں' ستمبر اکتوبر میں بے نظیر بھٹو کے سوئس کیسوں مدت ختم ہو رہی ہے چنانچہ حکومت کی کوشش ہے وہ کیس کی مدت ختم ہونے سے پہلے بے نظیر بھٹو سے ارم کے حق میں ووٹ لے لے' صدر صاحب جس دن صدارتی انتخاب کی تاریخ کا اعلان کریں گے دن ان کی یونیفارم اور صدارتی انتخاب سپریم کورٹ میں چیلنج ہو جائے گا' پاکستان بھر کے وکلاء اور ی جماعتیں اس کیس کے دوران بھی سپریم کورٹ کو اسی طرح گھیرنے کی کوشش کریں گی جس طرح جسٹس کے کیس کے دوران گھیرا گیا تھا' امریکہ جنوبی وزیرستان پر حملوں کے منصوبے بنا رہا ہے جبکہ دنوں میں نواز شریف فیملی کی واپسی کا امکان بھی موجود ہے فرض کیجئے ان حالات میں میاں برادران میں واپس آجاتے ہیں تو تصور کیجئے حکومت کیلئے کتنے مسائل پیدا ہو جائیں گے اور ان حالات میں تجربہ کار سیاستدان سامنے نہ آئے تو شاید ملک تاریخ کے نازک ترین دور میں داخل ہو جائے اور جودہ قیادت کیلئے ملک کو سنبھالنا مشکل ہو جائے' مجھے اس وقت چین کے قدیم کمہاروں کا ایک محاورہ

یاد آ رہا ہے' چینی کمہار کہا کرتے تھے اگر برتن کو شروع میں پوری آگ نہ ملے تو پوری دنیا کی آگ مل کر بھی اس کی کمی پوری نہیں کر سکتی' ہم نے پاکستان میں سیاسی عمل کو پروان نہیں چڑھنے دیا تھا چنانچہ آج ہم اس غلطی کا تاوان ادا کر رہے ہیں' ہم آج اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں اور آنے والے چند دنوں میں مزید بھگتیں گے' سیاست چینی کے برتنوں کی طرح ہوتی ہے جنہیں پکانے میں صدیاں لگ جاتی ہیں اور جو قومیں صدیوں کا یہ عمل پورا نہیں کرتیں ان کی بھٹیوں سے ہمیشہ لوٹے نکلتے ہیں' ہم نے اگر اس ملک کو بچانا ہے تو ہمیں بھارت سمیت دنیا کے ان تمام ملکوں کے ماڈلز پر عمل کرنا ہوگا جنہوں نے سیاست کی پرورش چینی کے برتنوں کی طرح کی۔

⊘ ⊘ ⊘

ڈیڈ اینڈ

''قومی حکومت کب بن رہی ہے'' اس نے سرگوشی کی' میں نے حیرت سے اس کی طرف ...وہ سفارتکاروں کی روایتی خوش دلی سے میری طرف دیکھ رہا تھا' اس کے ایک ہاتھ میں پکوڑوں کی ...ٹی اور دوسرے ہاتھ میں کھانے کا کانٹا تھا' ہمارے گرد سفارت کاروں کی مختلف ٹولیاں بکھری تھیں' ...ٹولیوں سے سرگوشیوں اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے لئے یہ سوال غیر متوقع تھا۔

...یہ نومبر کا مہینہ تھا' اسلام آباد کے سفارتی محلے میں سفارتی تقریب تھی اور میرا دوست اسے ...ے پاس چھوڑ گیا' وہ مشرق بعید کے ایک خوشحال ملک کا پریس اتاشی تھا۔ اس نے ٹوکیو یونیورسٹی سے ...کیونیکیشن کی ڈگری لی تھی اور یہ اس کے سفارتی کیریئر کی چوتھی پوسٹنگ تھی' وہ مختلف موضوعات پر ...گو کرتے ہوئے اچانک میرے کان پر جھکا اور مسکرا کر بولا ''قومی حکومت کب بن رہی ہے'' میرے ...یہ سوال غیر متوقع تھا چنانچہ میں نے فوراً جواب دیا ''شائد کبھی نہیں'' اب میرا جواب اس کیلئے ...متوقع تھا چنانچہ اس نے چند لمحے میری طرف غور سے دیکھا اور سفارتی احتیاط سے بولا ''ہاں شائد کبھی ...'' اس کے بعد اس نے موضوع بدل دیا۔ تقریب ختم ہو گئی لیکن اس کا سوال بار بار میرے دماغ پر ...دیتا رہا مگر میں نے ہر بار یہ سوچ کر اسے جھٹک دیا ''یہ سفارت کاروں کی تکنیک ہے' یہ لوگ غیر ...سوال پوچھتے رہتے ہیں''۔ یہ سوال دسمبر کے دوسرے ہفتے تک غیر اہم رہا لیکن پھر سیاسی اور ...رتی حلقوں میں ہلکی پھلکی اطلاعات آنے لگیں' کسی نے خبر اڑائی بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب ...تعلقات خراب ہو گئے ہیں۔ چھوٹے صاحب افتخار محمد چودھری کی بحالی اور سترہویں ترمیم بالخصوص ...(2B) ختم کرنا چاہتے ہیں' وہ سرکاری کاموں میں بڑے صاحب اور ان کے دوستوں کی مداخلت کو ...پسند نہیں کر رہے' وہ اپنے پرنسپل سیکرٹری سراج شمس الدین کے رویے سے بھی غیر مطمئن تھے' ان کا ...تھا بے شمار احکامات ان کی اجازت کے بغیر جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ خبر بھی آئی وزیراعظم کی ...پر چھ ہزار لوگوں کو نوکریاں دینے کی فائل رکھی گئی تو انہوں نے فائل دیوار پر دے ماری۔ یہ اطلاع ...لیک ہوئی پیپلز پارٹی کے بعض اعلیٰ عہدیداروں کو چھوٹے صاحب کا لائف سٹائل پسند نہیں' ان

لوگوں کا کہنا تھا وہ جنازے پر بھی سرخ ٹائی لگا کر چلے جاتے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ یہ اطلاع بھی آئی وزیراعظم کے دوست نما دشمنوں نے ان کی کرپشن کی جعلی کہانیاں پھیلانا شروع کر دیں' وزیراعظم کی ہمشیرہ کے نام سے ایک لیٹر ہیڈ بھی انٹرنیٹ پر جاری کر دیا گیا' ملتان اور لاہور کے کیمپ آفس کے بارے میں بھی کہانیاں بنائی اور پھیلائی گئیں' وزیراعظم ان کہانیوں کے پیچھے چھپے ہاتھوں تک جلد ہی پہنچ گئے اور یوں ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس کے درمیان دوریاں مزید بڑھ گئیں۔ پھر اطلاع آئی متوقع وزرائے اعظم کی ایک فہرست بن چکی ہے' شروع میں وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی اس فہرست میں پہلے نمبر پر تھے جبکہ وزیر دفاع احمد مختار اور سپیکر قومی اسمبلی ڈاکٹر فہمیدہ مرزا دوسرے اور تیسرے نمبر پر تھیں لیکن پھر شاہ محمود قریشی کا نام اس فہرست سے خارج ہو گیا اور پیچھے احمد مختار اور ڈاکٹر فہمیدہ مرزا رہ گئیں۔ شاہ محمود قریشی کے بارے میں اطلاع آئی بڑے صاحب ان کے رویے سے مطمئن نہیں ہیں' وہ تمام سفارتی کامیابیوں کو اپنی کامیابی قرار دے دیتے ہیں اور ان کے ذکر کے دوران پارٹی تک کا نام نہیں لیتے۔ پھر اطلاع آئی پاکستان مسلم لیگ ن نے دونوں صاحبوں کے درمیان موجود سرد مہری کا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ اس نے وزیراعظم کو اپنی بھرپور مدد کا یقین دلا دیا۔ وزیراعظم کو یہ یقین دلایا جا رہا ہے اگر وہ 58(2B) کے خاتمے کا اعلان کر دیں تو اپوزیشن جماعتیں نہ صرف ان کا کھل کر ساتھ دیں گی بلکہ وہ ان کی حکومت بھی نہیں گرنے دیں گے۔ پھر اطلاع آئی میاں نواز شریف اور چودھری شجاعت حسین کے درمیان رابطے شروع ہو گئے ہیں اور دونوں رہنما عنقریب مسلم لیگوں کے اتحاد کا اعلان کر دیں گے۔ پھر اطلاع آئی مسلم لیگ ن' مسلم لیگ ق اور اے پی ڈی ایم کی جماعتوں کو کسی خفیہ ہاتھ نے اکٹھے ہونے کا اشارہ کر دیا ہے۔ پھر افواہ پھیلی حکومت کے ایک وزیر کی ایک اعلیٰ عسکری شخصیت کے ساتھ جھڑپ ہو گئی جس کے بعد دونوں اداروں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ پھر اطلاع آئی ممبئی کے واقعات کے بعد حکومت کے طرز عمل سے اداروں کے درمیان کشمکش اور کھینچا تانی میں اضافہ ہو گیا۔ پھر اطلاع آئی میاں نواز شریف نے غیر مقبول بیان دے کر امریکیوں کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر افواہ پھیلی چودھری شجاعت اور میاں نواز شریف کے درمیان رابطے ہیں جبکہ حکومت اور چودھری پرویز الٰہی نے ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو شروع کر دی ہے۔ پھر میاں نواز شریف نے انکشاف کر دیا کسی اعلیٰ شخصیت نے انہیں فرح حمید کے ایشو پر خاموش رہنے کے عوض نااہلیت کے کیس سے بری کرنے کی پیش کش کی تھی۔ پھر میاں صاحب نے میاں اجمل قصاب کے بارے میں بیان دے کر بھارت اور امریکہ کے دل میں اپنے لئے ہمدردی پیدا کر لی اور پھر پاکستان پیپلز پارٹی کے پنجاب اسمبلی کے ارکان کو

صدر میں دعوت دے دی گئی۔

یہ ساری اطلاعات' یہ ساری خبریں اور یہ ساری افواہیں نظام کی جڑوں کو ہلانے کیلئے کافی چنانچہ اسلام آباد پچھلے ایک ہفتے سے قومی حکومت کے بخار میں مبتلا ہے اور سماجی تقریبات میں کھلے یہ کہا جا رہا ہے پاکستان پیپلز پارٹی کے تمام مخالفین بڑی تیزی سے ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ کے الیکشن سے قبل قومی اسمبلی میں 58(2B) کے خاتمے کیلئے بل لائیں گے اور حکومت پر دباؤ یں گے وہ سینٹ کے الیکشنوں سے پہلے 58(2B) اور تیسری بار وزیراعظم بننے کی شق کا فیصلہ ے۔ اگر حکومت اس دباؤ میں آ گئی تو ٹھیک ورنہ پورے جمہوری نظام کو جڑوں سے ہلا دیا جائے گا۔ کھیل میں وہ لوگ بھی ان کا ساتھ دیں گے جو فاٹا سے فوجوں کی واپسی کے متمنی ہیں۔ سیاسی وں کا خیال ہے پاکستان کی سیاست اس بری طرح الجھ چکی ہے کہ اب اسے سلجھانے کی صرف ایک صورت ہے اور اس صورت کا نام قومی حکومت ہے۔ پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں مل کر حکومت قائم یں اور یہ حکومت دہشت گردی کے خلاف جنگ سے لے کر معیشت' عدلیہ اور احتساب تک ملک کے بڑے بڑے فیصلے کرے۔ اسلام آباد میں پچھلے دو ہفتوں سے بنگلہ دیش ماڈل بھی زیر بحث ہے' لوگ عام کہہ رہے ہیں اگر ملک میں دو اڑھائی سال کیلئے سیاست پر پابندی لگا دی جائے اور ٹیکنو کریٹس ایک ایسی حکومت بنا دی جائے جو ملک کو دوبارہ ٹریک پر لے آئے تو اس میں کیا حرج ہے؟ ان لوگوں کہنا ہے جب ملک کے حالات ٹھیک ہو جائیں تو دوبارہ الیکشن کرائے جائیں اور ملک ایک بار سیاستدانوں کے حوالے کر دیا جائے' یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا واقعی قومی حکومت بن جائے گی یا میں بنگلہ دیش ماڈل آئے گا یا پھر یہ نظام اسی طرح چلتا رہے گا اس کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل وقت ہو گا مگر ایک بات طے ہے آثار اچھے نہیں ہیں۔ ملک خرابی کی ایک ایسی سطح پر پہنچ گیا ہے جس کے سرے پر سمندر ہے اور دوسرے کنارے پر آگ اور عوام ان دونوں سروں کے درمیان کھڑے ہو کر بھی دائیں دیکھتے ہیں اور کبھی بائیں اور انہیں سمجھ نہیں آتی وہ آگ میں کود کر جان دے دیں یا پھر خود کو سمندر کی نذر کر دیں۔ عوام نے اللہ تعالیٰ کے حضور گڑ گڑا کر جمہوریت طلب کی تھی' عوام نے آٹھ سال آمریت سے لڑ لڑ کر جمہوریت حاصل کی تھی لیکن ہمارے جمہوری حکمرانوں کے سمجھوتوں' مفادات کنفیوژن نے عوام کا جمہوریت سے اعتماد اٹھا دیا اور عوام یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں اگر ہم نے اس لی کے لئے جدوجہد کی تھی تو صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز میں کیا برائی تھی؟ اگر یہ وہ جمہوریت ہے تو پھر آمریت میں کیا خرابی تھی؟ ہم لوگ ایک ایسی صورتحال کا شکار ہو گئے ہیں جس میں ہم

حبس کے دوران لو چلنے کی دعا کرتے ہیں اور جب لو سے جسم جلنے لگتا ہے تو ہمیں حبس اچھا لگنے لگتا ہے
۔کل کیا ہوتا ہے یہ تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے لیکن اتنا معلوم ہے اس کھیل کا انجام اچھا نہیں ہوگا کیونکہ
ہمارے سیاستدان ملکی سیاست کو ایک ایسے راستے پر لے جا رہے ہیں جس کے آخر میں ''دی اینڈ'' کا بورڈ
لگا ہے اور اگر سیاستدانوں نے یہ سفر ترک نہ کیا تو وہ وقت آتے دیر نہ لگے گی جب حکومت دوبئی میں
شفٹ ہو جائے اور اپوزیشن لندن میں بیٹھ کر احکامات جاری کرنے لگے گی اور ملک میں فرشتوں کی
حکومت ہوگی۔

کل کیا ہوتا ہے؟ یہ تو معلوم نہیں لیکن میرے ایک دوست کا دعویٰ ہے 2009ء ہی
میں سیاست کا حلیہ بدل جائے گا۔ یہ واپس پچھلے ٹریک پر چلی جائے گی یا پھر یہ ایک دو برسوں کیلئے کسی
ایسے ٹریک پر کھڑی ہو جائے گی جس کے آخر میں ''ڈیڈ اینڈ'' کا بورڈ لگا ہوگا۔

⊘ ⊘ ⊘

کہیں پاکستان بھی کینیا نہ بن جائے

عبدالسلام کا گاؤں ترکانا جھیل کے ساتھ تھا' ترکانا کینیا کی خوبصورت جھیل ہے اور پوری دنیا
ے لوگ یہ جھیل دیکھنے ترکانا آتے ہیں۔ عبدالسلام پانچ نسلوں سے مسلمان تھا' وہ سیاہ فام تھا اور اس کے
باؤ اجداد دو صدیوں پہلے روانڈا سے کینیا آئے تھے۔ 1990ء میں عبدالسلام کے والد نے کینیا کے
گارسن سے دوسری نقل مکانی کی اور وہ اپنے چھ بچوں کو ساتھ لے کر ترکانا آ گئے' یہ لوگ کافی کی پیکنگ
کام کرتے تھے' عبدالسلام کے والد عبدالرحمان منڈی سے تھوک میں کافی خریدتے تھے اور عبدالسلام
دران کے بہن' بھائی کافی کے ''بینز'' کو پیس کر دانے بناتے تھے اور اس کے بعد ان دانوں کو بوتلوں میں
کران پر لیبل لگا دیتے تھے اور یہ بوتلیں بعد ازاں کافی ایکسپورٹ کرنے والی کمپنی کے حوالے کر دی
تی تھیں۔ یہ خاندان کافی کے اس کاروبار سے باعزت گزارے کے مطابق رقم حاصل کر لیتا تھا لیکن
دسمبر 2007ء آیا اور اس خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔ 27 دسمبر 2007ء کو کینیا میں الیکشن ہوئے'
شنوں میں دھاندلی ہوئی اور اس دھاندلی کے بعد کینیا میں فسادات پھوٹ پڑے اور عبدالسلام کا
ندان بھی ان فسادات کا شکار ہو گیا۔ عبدالسلام کا ایک بھائی سرکاری ملازم تھا' وہ انتخابات کی ڈیوٹی پر
اس کے پولنگ اسٹیشن پر دھاندلی ہوئی تھی اور اس دھاندلی کے ردعمل میں متاثرہ امیدوار کے حامیوں
عبدالسلام کے گھر پر دھاوا بول دیا تھا' ان لوگوں نے عبدالسلام کے والد اور سرکاری ملازم بھائی کو گولی
دی اور ان کے گھر کو آگ لگا دی۔ عبدالسلام اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ گھر سے بھاگ گیا'
وگ ترکانا سے ممباسا آئے اور اب ہزاروں دوسرے بے گھر لوگوں کے ساتھ ممباسا کے سٹیڈیم میں
گزین ہیں۔ کینیا میں اس وقت تین لاکھ لوگ بے گھر ہیں' پندرہ سو لوگ مر چکے ہیں جبکہ پورے ملک کا
ام مفلوج ہو چکا ہے۔ یہ ساری خرابی الیکشن میں دھاندلی کے باعث ہوئی تھی' اس دھاندلی کی داستان
بہت دلچسپ تھی' کینیا معاشی لحاظ سے افریقہ کا مضبوط ترین ملک تھا' یہ ملک بڑی تیزی سے تیسری
سے پہلی دنیا کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن پھر 27 دسمبر 2007ء کو کینیا میں الیکشن ہوئے' اس الیکشن
کینیا کے صدر موائی کی باقی اور اپوزیشن لیڈر رائلہ اوڈنگا نے حصہ لیا' الیکشن کے دوران دھاندلی کی
ات سامنے آئیں لیکن اس وقت کیونکہ ''موائی کی باقی'' صدارت کے عہدے پر فائز تھے چنانچہ

الیکشن کمیشن نے دباؤ میں آکر انہیں دوسری مرتبہ صدر ڈکلیئر کر دیا' اپوزیشن لیڈر راوڈ نگا نے ان نتائج اوراس فیصلے کوتسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد کینیا میں فسادات پھوٹ پڑے' صدر'' کی باقی'' نے ٹیلی ویژن چینلوز ریڈیو اور اخبارات پر پابندی لگادی اور پولیس کو مظاہرین پر گولی چلانے کا حکم دے دیا' پولیس نے ان احکامات پر عملدرآمد کیا' کینیا کے مختلف شہروں میں گولی چلی اور اس کے نتیجے میں 600 لوگ ہلاک اور اڑھائی لاکھ لوگ بے گھر ہو گئے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کینیا کے بازار' منڈیاں' فیکٹریاں اور شہر بند ہیں' ٹرانسپورٹ معطل ہے' سکول' کالج اور یونیورسٹیوں پر تالے پڑے ہیں اور کینیا کی کرنسی بڑی تیزی سے بے توقیر ہو رہی ہے جبکہ کینیا کی معیشت کا گراف بھی بڑی تیزی سے نیچے آرہا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے اگر کینیا کی معیشت کو سہارا نہ ملا تو یہ ملک دیوالیہ ہو جائے گا۔

ہم اگر پاکستان کی موجودہ صورتحال کا جائزہ لیں تو ہمیں پاکستان اور کینیا میں زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔ آج پاکستان بھی کینیا کی طرح سیاست کے ایک بہت بڑے بحران پر کھڑا ہے' 2008ء کے انتخابات کو صرف تین دن باقی ہیں اور بے شمار عالمی مبصرین کا خیال ہے ہماری بقاء' ہماری سالمیت' ہمارے امن وامان اور ہماری خوشحالی کا انحصار ان الیکشنز پر ہے لیکن حکومت اس خطرے سے واقف ہونے کے باوجود اس کے تدارک پر سنجیدہ نظر نہیں آرہی۔ اس وقت پاکستان کی چھ بڑی سیاسی جماعتیں الیکشن لڑ رہی ہیں' ان پارٹیوں میں پاکستان پیپلز پارٹی' پاکستان مسلم لیگ ق' پاکستان مسلم لیگ ن' متحدہ مجلس عمل' اے این پی اور ایم کیو ایم شامل ہیں' ان میں سے چار جماعتیں بار بار اس خدشے کا اظہار کر رہی ہیں کہ 18 فروری کے انتخابات میں دھاندلی ہو گی حکومت کی حلیف جماعت ایم کیو ایم بھی دبے الفاظ میں اس کا اعتراف کر رہی ہے لیکن صرف پاکستان مسلم لیگ ق واحد جماعت ہے جو پچھلے تین ماہ سے الیکشن میں دھاندلی کے امکانات مسترد کرتی چلی آرہی ہے مگر جب ہم ذرا سی گہرائی میں جا کر دیکھتے ہیں تو بڑے دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں مثلاً آپ ڈاکٹر شیر افگن نیازی کو لیجئے ڈاکٹر شیر افگن مسلم لیگ ق کے ٹکٹ پر میانوالی سے الیکشن لڑ رہے ہیں لیکن وہ بھی ''دھاندلی دھاندلی'' کے نعرے لگا رہے ہیں' شیر افگن نیازی کا کہنا ہے ان کی پارٹی ان کے خلاف دھاندلی کرا رہی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے انہوں نے نگران وزیراعظم' پنجاب کے عبوری وزیراعلیٰ' چیف الیکشن کمشنر' انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈسٹرکٹ ریٹرننگ افسر کو تحریری درخواست دی ہے' ان کے ضلع میانوالی میں تمام افسر شاہی انہیں شکست دینے پر تلی ہوئی ہے مگر کسی نے ان کے خلاف بڑے پیمانے پر ہونے والے اس ہیر پھیر کو روکنے کیلئے کوئی اقدام نہیں کیا۔ ان کا دعویٰ ہے ان کے مرکزی حریف حمیر حیات روکھڑی مسلم لیگ ق کے صدر چودھری شجاعت حسین کے بھائی اور ناظم گجرات چودھری شفاعت حسین کے برادر نسبتی ہیں۔

یر افگن اس نشست پر مسلم لیگ ق کے سرکاری طور پر نامزد کردہ امیدوار ہیں اور انہیں پارٹی کا انتخابی
تان سائیکل الاٹ ہو چکا ہے مگر چودھری برادران نے اپنے رشتہ دار کو آزاد امیدوار کے طور پر اپنی ہی
ماعت کے مقابل لاکھڑا کر دیا ہے اور اس امیدوار کو انتظامیہ کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ شیر افگن کا کہنا
ہے کم ازکم میرے حلقہ میں انتخاب منصفانہ' آزادانہ اور شفاف نہیں ہوں گے کیونکہ انتظامی مشینری آزادانہ
ور پر میرے خلاف استعمال کی جا رہی ہے اور کوئی اس قانون شکنی کو روکنے کیلئے تیار نہیں۔ شیر افگن کا کہنا
ہے وہ مسلم لیگ ق کے لیڈر چودھری پرویز الٰہی سے بھی ملے تھے اور انہوں نے تمام صورتحال ان پر واضح
ی مگر بے سود رہا۔ ان کا کہنا ہے حمیر حیات کے والد گل حمید روکھڑی تا حال مسلم لیگ ق ضلع میانوالی کے
ندر ہیں۔ شیر افگن نے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس سرگودھا رینج' ڈسٹرکٹ پولیس افسر' ڈسٹرکٹ کوآرڈینیشن
سر' ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ' علاقہ پولیس اور ایس ایچ او کو انتخاب میں اپنے خلاف دھاندلی کے بڑے مجرم قرار
یتے ہوئے ان پر برہمی کا اظہار کیا۔ یہ مسلم لیگ ق کی اندرونی صورتحال ہے' ان کے اپنے امیدواروں
ے دلوں میں الیکشنوں کی شفافیت کے بارے میں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔

یہ بات صرف ڈاکٹر شیر افگن نیازی تک محدود نہیں بلکہ 18 فروری کے الیکشنوں میں دھاندلی
سب سے بڑا خدشہ ناظمین کی طرف سے ہے' پاکستان کے 111 اضلاع میں سے 50 سے زائد
ضلاع میں 150 ایسے امیدوار ہیں جن کا ناظمین سے خونی تعلق ہے۔ یہ امیدوار کسی ناظم کے بھائی'
ھتیجے' بھانجے' چچا' بیٹے یا داماد ہیں اور ضلع کے سارے انتظامی اختیارات اس وقت ناظمین کے قبضے میں
یں چنانچہ یہ ناظمین اپنے دامادوں' بیٹوں' چچاؤں' بھانجوں' بھتیجوں اور بھائیوں کو کامیاب کرانے کیلئے
ری سرکاری مشینری استعمال کر رہے ہیں اور اس پر ہمارا الیکشن کمیشن بھی خاموش بیٹھا ہے' ہمارے الیکشن
میشن میں اس وقت ''قبل از وقت الیکشن'' دھاندلیوں کی ایک ہزار 6 سو 2 درخواستیں جمع ہو چکی ہیں اور
ن میں سے صرف 2 سو درخواستوں پر کارروائی ہوئی اور اس کارروائی پر بھی فریقین مطمئن نہیں ہیں چنانچہ
ماری چیزیں اپوزیشن جماعتوں کے دلوں میں جمع ہوتی چلی جا رہی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے اگر
خدانخواستہ 18 فروری کو اپوزیشن جماعتوں بالخصوص پاکستان پیپلز پارٹی کو توقع کے مطابق نشستیں نہ ملیں تو
ھر پاکستان ایک ایسے دور میں داخل ہو جائے گا جس میں نفرت' آگ اور خون کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔
یں جب بھی اس صورتحال کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے حکمرانوں کی عقل پر رونا آجاتا ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے
عا کرتا ہوں یا باری تعالیٰ ہمارے ملک کو کینیا بننے سے بچانا کیونکہ اگر ہماری حکومت باز نہ آئی' اگر
1 فروری کے الیکشنوں میں پاکستان پیپلز پارٹی کو اتنی سیٹیں نہ ملیں جن کے ذریعے مضبوط حکومت بن
کے تو پاکستان ایک شدید سیاسی بحران کا شکار ہو جائے گا اور اس بحران کا منہ خون سے دھویا جائے گا۔

خاموشی

چارلس ڈیگال سیاست میں استاد کی حیثیت رکھتا تھا اور دنیا کے بے شمار حکمرانوں' سیاستدانوں اور سیاست کے طالب علموں نے ڈیگال کے خیالات سے استفادہ کیا تھا' وہ استفادہ کر رہے ہیں اور استفادہ کرتے رہیں گے' گزشتہ برس فرانس نے سو سال کی دس بہترین شخصیات کی فہرست بنائی تھی' یہ فہرست مرتب کرنے کیلئے عوامی رائے جمع کی گئی تھی اور عوام کی رائے سے جو فہرست مرتب ہوئی تھی چارلس ڈیگال کا نام اس لسٹ میں دوسرے نمبر پر تھا' پہلے نمبر پر فرانس کے بین الاقوامی شہرت یافتہ مصنف وکٹر ہیوگو کا نام تھا' چارلس ڈیگال فوجی تھا' اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران فرانسیسی فوج کی قیادت کی تھی' جنگ لڑی تھی اور فرانس کو اس جنگ میں فتح یاب کرایا تھا' وہ اس کے بعد سیاست میں آیا تھا اور اس نے فرانس کو دنیا کی چوتھی بڑی طاقت بنا دیا تھا' امریکی صدر رچرڈ نکسن چارلس ڈیگال سے بہت متاثر تھا' نکسن نے اپنی معرکتہ لآ راء کتاب ''لیڈرز'' میں چارلس ڈیگال کا بڑی محبت سے ذکر کیا' رچرڈ نکسن جب صدارتی الیکشن لڑ رہا تھا تو اس نے اس وقت چارلس ڈیگال سے رابطہ کیا اور اس سے عرض کیا ''کیا آپ مجھے سیاست میں کامیابی کا کوئی ایک فارمولہ بتا سکتے ہیں'' چارلس ڈیگال مسکرایا اور نرم آواز میں بولا ''سیاست میں کامیابی کے دس فارمولے ہیں'' رچرڈ نکسن نے فوراً عرض کیا ''نہیں جناب مجھے صرف ایک نسخہ درکار ہے'' چارلس ڈیگال نے چند لمحے سوچا اور پھر زور دے کر بولا ''خاموشی'' رچرڈ نکسن نے عرض کیا ''جناب مجھے سمجھ نہیں آیا'' ڈیگال بولا ''خاموشی سیاستدانوں کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے'' وہ رکا اور دوبارہ بولا ''دنیا میں ہر بات' ہر چیز کے دو ردعمل ہوتے ہیں' ہاں یا ناں' آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں یا مسترد کرتے ہیں لیکن ایک تیسرا ردعمل بھی ہوتا ہے اور وہ ردعمل خاموشی ہے' آپ بات سنیں اور اس بات پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کریں'' چارلس ڈیگال نے کہا ''اور ایک کامیاب' سمجھدار اور بڑے سیاستدان کو خاموشی کے آرٹ میں تاک ہونا چاہیے' اسے چاہیے وہ اپنے چہرے کو پتھر بنا لے اور آندھی آئے یا طوفان وہ اپنا منہ نہ کھولے'' چارلس ڈیگال کا کہنا تھا ''الفاظ سیاستدانوں کی موت ہوتے ہیں اور جو لوگ سیاست میں آ کر زیادہ بولتے ہیں وہ زبان سے اپنی سیاسی قبر کھودتے ہیں''۔

مجھے نہیں معلوم رچرڈ نکسن نے چارلس ڈیگال کی اس نصیحت پر کس حد تک عمل کیا لیکن مجھے ...تانی سیاست میں خاموشی کا فقدان نظر آ رہا ہے' ہمارے سیاستدان گفتگو' تقریر' خطاب' پریس کانفرنس ...لسے جلوسوں کو سیاست سمجھتے ہیں اور یہ کیمروں کے سامنے پہنچنے اور طویل اور لایعنی گفتگو کا کوئی موقع ...ع نہیں کرتے' ان کی کوشش ہوتی ہے یہ جہاں بھی جائیں ان کے پہنچنے سے پہلے وہاں کیمرے پہنچ ...یں' راسٹرم اور ڈائس لگ جائیں اور صحافی کاپیاں پکڑ کر ان کے سامنے کھڑے ہوں اور اس کے بعد ...سے دس پندرہ برس پرانے سوال پوچھے جائیں اور وہ ان کے پرانے جواب دینا شروع کر دیں' بسیار ...ی کے اس مقابلے کے دوران اکثر اوقات سیاستدانوں کے منہ سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جو بعد ...ل سیاسی قبروں کے کتبے بنتے ہیں' یہ الفاظ نہ صرف ان لوگوں کی سیاست کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں بلکہ ...سے سیاسی بدنامی کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو ان کے مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے' ...پ بھٹو صاحب کے چند فقرے ملاحظہ کیجئے' بھٹو صاحب نے لاہور میں کہا تھا ''ہاں میں شراب پیتا ...ں' عوام کا لہو نہیں پیتا'' ذوالفقار علی بھٹو کا وہ فقرہ جو بعد ازاں عباس اطہر صاحب کی مشہور و معروف ...ن بنا ''ادھر تم ادھر ہم'' اور ''میرے مرنے پر ہمالیہ بھی روئے گا'' اور ''یہ کرسی بہت مضبوط ہے'' یہ وہ ...رے تھے جنہوں نے بھٹو کی شہادت کے بعد بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا' اسی طرح جنرل ضیاء الحق نے ...ستدانوں کے بارے میں کہا تھا ''یہ دم ہلاتے ہوئے میرے پیچھے آئیں گے'' اور ''آئین کیا ہے کاغذ ...یک چیتھڑا'' بھٹو صاحب اور جنرل صاحب کے یہ فقرے ہماری تاریخ کا حصہ بن گئے اور آج تک ...ں کی زبان پر ہیں اور اسی طرح 12 مئی 2007ء کو صدر پرویز مشرف نے اسلام آباد میں ریلی سے ...ب کرتے ہوئے کراچی میں ہونے والی قتل و غارت گری کو ''عوامی طاقت کا مظاہرہ'' قرار دیا تھا' ...یقین ہے صدر پرویز مشرف کا یہ فقرہ بھی صدر کے جانے کے بعد ان کی جان نہیں چھوڑے گا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین آصف علی زرداری بھی ایسے تاریخی فقروں کی ٹھیک ...ک لیبارٹری ہیں' ان کے بعض فقروں میں اتنی جان ہوتی ہے کہ وہ بڑی آسانی سے محاورے یا ضرب ...ل کا مقام پا سکتے ہیں مثلاً انہوں نے ایک بار اعلان مری کو ''سیاسی بیان'' قرار دے دیا تھا' ان کے اس ...ن سے پاکستانی سیاست اور ادب میں ''سیاسی بیان'' کے نام سے ایک نئی اصطلاح نے جنم لیا اور اب ...ب بھی کوئی شخص اپنے معاہدے' وعدے اور سمجھوتے سے منحرف ہوتا ہے تو وہ اپنے ''یوٹرن'' کو سیاسی ...ن قرار دے دیتا ہے اور لوگ اس کی ساری ''مجبوریاں'' سمجھ جاتے ہیں' اسی طرح لوگ اب معاہدوں ...ے پیچھے ہٹنے والوں کو ''سیاستدان'' اور سیاستدانوں کے اعلانوں کو ''سیاسی بیان'' کہتے ہیں' آصف علی

زرداری نے پچھلے دنوں بھی دو بڑے شاندار بیان دیئے تھے اور مجھے یقین ہے یہ بیانات بھی آگے چل کر محاورے کا مقام پا جائیں گے' پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئر مین نے فرمایا ''محترمہ بے نظیر بھٹو افتخار محمد چودھری کو چیف جسٹس بنانے کیلئے شہید نہیں ہوئی تھیں'' گزشتہ روز آصف علی زرداری نے اس بیان کو ذرا مختلف انداز میں دوسری بار دہرایا' انہوں نے فرمایا ''عوام کے پیٹ سے افتخار چودھری کو بحال کرو کی نہیں بلکہ ہم بھوکے ہیں کی آوازیں آ رہی ہیں'' مجھے خطرہ ہے یہ دونوں بیان آگے چل کر آصف علی زرداری کیلئے ٹھیک ٹھاک مسائل پیدا کر دیں گے اور ہو سکتا ہے کسی لیول پر پاکستان پیپلز پارٹی کو ان کی تردید یا معذرت بھی کرنا پڑ جائے کیونکہ عوامی جذبات پارٹیوں کیلئے خون کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمیں ماننا پڑے گا افتخار محمد چودھری اور وکلاء تحریک کے ساتھ لوگوں کے جذبات وابستہ ہیں' مجھے یقین ہے آج اگر افتخار محمد چودھری گھر سے باہر آئیں اور عوام کو کال دیں تو لاکھوں لوگ ان کے ساتھ گھروں سے نکل آئیں گے لیکن اس کے باوجود ہم ایک لمحے کیلئے مان لیتے ہیں' محترمہ بے نظیر بھٹو نے افتخار محمد چودھری کو چیف جسٹس بنانے کیلئے جان نہیں دی تھی اور لوگ بھی افتخار محمد چودھری کی بجائے اپنے بھوکے پیٹوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے' محترمہ نے کس کیلئے جان دی تھی؟ یقیناً پاکستان پیپلز پارٹی (جدید) کا جواب ہوگا ''جمہوریت کیلئے'' یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے' کیا آزاد عدلیہ کے بغیر کسی ملک میں جمہوریت ممکن ہے؟ یقیناً نہیں کیونکہ عدلیہ اور جمہوریت خون کے سرخ اور سفید جرثوموں کی طرح ہوتی ہیں اور جب تک جمہوریت کو عدلیہ کی سپورٹ اور عدلیہ کو جمہوریت پسند سیاستدانوں کی معاونت حاصل نہیں ہوتی' اس وقت تک ملک آگے نہیں بڑھا کرتے اور اگر محترمہ نے جمہوریت کیلئے جان دی تھی تو اس وقت تک محترمہ کی روح کو سکون نہیں ملے گا جب تک اس ملک میں عدلیہ آزاد نہیں ہوتی اور یہ بھی حقیقت ہے فی الوقت معطل ججوں کی بحالی آزاد عدلیہ کی طرف پہلا قدم ہو گا اور ہم نے اگر یہ پہلا قدم نہ اٹھایا تو ہم جمہوری اور عادل معاشرے کی منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے' باقی رہ گئے بھوکے پیٹ تو یہ بھی حقیقت ہے انسان بھوکا رہ سکتا ہے' وہ پیاسا رہ سکتا ہے اور وہ کپڑوں اور چھت کے بغیر بھی زندگی گزار سکتا ہے لیکن وہ انصاف کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا' دنیا میں لوگ بھوک' پیاس اور کپڑوں کیلئے خودکشی نہیں کرتے لیکن اگر انہیں انصاف نہ ملے تو وہ پنکھوں کے ساتھ لٹک جاتے ہیں' اگر عدل معاشروں کیلئے زندگی نہ ہوتا تو اسلام کبھی عدل پر اتنا زور نہ دیتا' اسلامی معاشرہ عدل کی ناقابل تردید مثال تھا' جب نبی رسالتؐ نے مدینہ میں انصاف قائم کیا تھا تو اس وقت بھی لوگوں کے پاس روٹی' کپڑے اور مکان نہیں تھے لیکن جب عدل قائم ہوا تو اس معاشرے کی یہ تمام ضروریات پوری ہو گئیں اور

ینہ میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب غلام ابن غلام ہزاروں اشرفیاں لے کر بازاروں میں نکلتے تھے لیکن ں کوئی ضرورت مند نہیں ملتا تھا' ہمیں ماننا پڑے گا انسان کی دس ہزار سالہ تاریخ کا یہ اعلان ہے اشروں کی بھوک انصاف کے بغیر نہیں مٹائی جا سکتی اور جب تک ملک کو ایک آزاد عدلیہ نہیں ملتی اس ت تک معاشروں میں خوشحالی نہیں آتی لیکن ہم ایسے بدقسمت لوگ ہیں جو بانس سے گنے کا کام لینا اہتے ہیں اور گنے سے بانس کا چنانچہ ہم ادھر کے رہتے ہیں اور نہ ہی ادھر کے' کاش ہمارے لیڈر ایسے یانات دینے کی بجائے خاموشی اختیار کر لیں تو کم از کم لوگوں کے دل تو نہ ٹوٹیں' لوگوں کو تکلیف تو نہ پہنچے' کم از کم ہمارے سیاستدانوں کا بھرم تو رہ جائے۔

⊘ ⊘ ⊘

محمود اچکزئی اور عبدالحئی بلوچ کو پنجاب سے الیکشن لڑائیں

7 جولائی 2007ء کو لندن میں ''اے پی سی'' تھی' یہ کانفرنس میاں محمد نواز شریف نے بلائی تھی اور اس میں مسلم لیگ ق اور ایم کیو ایم کے سوا پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے شرکت کی تھی' اس کانفرنس سے شریک جماعتوں کی قیادت نے خطاب کیا لیکن تین لیڈروں نے کمال کر دیا' ان لیڈروں میں محمود اچکزئی' اسفند یار ولی اور ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ شامل تھے' ان تینوں لیڈروں کی تقریریں نہ صرف ٹھوس اور واضح تھیں بلکہ ان کے ایک ایک فقرے میں جرأت اور بہادری پائی جاتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اسفند یار ولی نے میاں نواز شریف کو مخاطب کر کے کہا تھا ''آپ لندن سے پشاور آئیں' ہم دیکھتے ہیں آپ کو وہاں سے کون واپس بھجواتا ہے'' اسی طرح محمود اچکزئی نے اے پی سی کی تمام پارٹیوں کو دعوت دی ''آپ صدر پرویز مشرف کے خلاف پہلا جلسہ کوئٹہ میں کریں'' محمود اچکزئی نے دعویٰ کیا ''میاں صاحب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں میں کوئٹہ شہر میں ایک لاکھ لوگوں کو جمع کروں گا'' اس تقریب میں جب ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ کی باری آئی تو ڈاکٹر صاحب نے کمال کر دیا' انہوں نے اے پی سی کے فورم پر نہ صرف بلوچوں کا موقف پیش کیا بلکہ انہوں نے اعلان کیا ''ہم اپنی محرومیوں کا مجرم پنجاب یا سندھ کو نہیں سمجھتے' ہم اسٹیبلشمنٹ کو اپنا مجرم سمجھتے ہیں اور ہماری آپ سے درخواست ہے آپ کا تعلق پنجاب سے ہو' سندھ سے' سرحد یا پھر بلوچستان سے' آپ تمام لوگ آگے بڑھ کر ہمارا ساتھ دیں' ہم بلوچ آپ سے انصاف اور محبت کے طلب گار ہیں'' مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ان لیڈروں کی تقریریں ختم ہوئی تھیں تو محفل میں موجود تمام لوگ ان لیڈروں کی طرف بڑھے اور سب نے ان کے ساتھ ہاتھ ملا کر ان کی تعریف کی۔

میرے ساتھ ملک کے نامور دانشور' شاعر اور کالم نگار عطاء الحق قاسمی تھے' قاسمی صاحب کا فرمانا تھا ''آج کا میلہ قوم پرست لیڈروں نے لوٹ لیا'' قاسمی صاحب کی بات درست تھی' ڈاکٹر عبدالحئی

ہوں' محمود اچکزئی یا اسفند یار ولی' ہماری اسٹیبلشمنٹ نے ہمیشہ ان لوگوں کو ''اینٹی پاکستان'' بنا کر کیا' اسٹیبلشمنٹ نے ان لوگوں کا تاثر خراب کرنے کیلئے پیسہ بھی خرچ کیا' اپنے جاسوس صحافیوں کو بھی ل کیا اور جلسے اور جلوسوں کی مدد بھی لی چنانچہ اسٹیبلشمنٹ کی ان کوششوں کے نتیجے میں یہ لوگ اٹک ل' جب کی سڑک اور فورٹ منرو کی پہاڑیوں کے بعد اینٹی وفاق اور اینٹی پاکستان مشہور ہو گئے اور ے جعلی اور کم فہم دانشور' صحافی اور لکھاری انہیں مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے لیکن ہم میں سے جب سی کو ان کے قریب بیٹھنے' ان کی گفتگو سننے اور ان کے مؤقف پر غور کرنے کا موقع ملا تو ہم خود کو ان متاثر ہونے سے نہ بچا سکے۔ محمود اچکزئی' اسفند یار ولی اور عبدالحئی بلوچ کے خیالات ہماری سوچ سے ف ہو سکتے ہیں لیکن ہمیں ماننا پڑے گا یہ لوگ منافق اور جھوٹے نہیں' یہ لوگ اپنے مؤقف میں کھرے ح اور شفاف ہیں اور جب بھی انہیں کوئی پلیٹ فارم ملتا ہے تو یہ ڈرے' جھجکے اور شرمائے بغیر کھل کر پنے مؤقف کا اظہار کرتے ہیں۔ لندن کی اس اے پی سی میں بھی ان لوگوں نے یہی کیا اور اس وقت ب مولانا فضل الرحمان اور مخدوم امین فہیم اسٹیبلشمنٹ کی زبان بول رہے تھے' اس وقت ان لوگوں نے ے ہال کی نبضیں اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ ان کے بعد عمران خان اس محفل کے دولہا ثابت ئے' عمران خان کا مؤقف اور استدلال بھی بڑا واضح اور صاف تھا۔ اے پی سی کے تیسرے دن اے ی ایم بنی اور تمام سیاسی جماعتوں نے صدر پرویز مشرف کے خلاف مشترکہ جدوجہد کا اعلان کر دیا۔

جولائی کے بعد اگست آیا اور اے پی ڈی ایم نے ملک میں سیاسی جدوجہد شروع کر دی' اس وجہد کے چار بڑے ہیرو تھے' محمود اچکزئی' قاضی حسین احمد' اسفند یار ولی اور عمران خان۔ یہ چاروں گے بڑھے اور ان سے جو ہو سکا ان لوگوں نے کیا۔ اسی دوران عدلیہ کے بحران نے شدت اختیار کر لی' ں نواز شریف ستمبر میں پاکستان آئے اور حکومت نے انہیں واپس سعودی عرب دھکیل دیا۔ محترمہ بے ر بھٹو پاکستان آئیں' حکومت نے الیکشن کا اعلان کیا اور اے پی ڈی ایم نے اس الیکشن کے بائیکاٹ کا لہ کیا' کاغذات جمع کرانے کی آخری تاریخ سے ایک دن پہلے میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف کستان آئے' اے پی ڈی ایم میں اختلافات پیدا ہوئے' اسفند یار ولی اور میاں نواز شریف نے الیکشن نے کا فیصلہ کیا لیکن محمود اچکزئی' قاضی حسین احمد اور عمران خان ڈٹے رہے۔ خلیج بڑھی اور اسی کھینچا تانی دوران محترمہ بے نظیر بھٹو شہید ہو گئیں۔ الیکشن 40 دن آگے چلا گیا' 18 فروری 2008ء کا دن آیا' شن ہوئے' 46 فیصد ووٹروں نے ووٹ ڈالے' پاکستان پیپلز پارٹی' مسلم لیگ ن اور اے این پی میاب ہوئیں اور اب یہ تینوں جماعتیں مل کر حکومت بناتی نظر آ رہی ہیں۔ یہاں پر ایک دلچسپ سوال

پیدا ہوتا ہے؟ سوال یہ ہے اے این پی' مسلم لیگ ن اور پاکستان پیپلز پارٹی کو کامیاب کس نے کرایا؟ ہمیں 18 فروری کے فری اینڈ فیئر الیکشن کا کریڈٹ تین طاقتوں کو دینا پڑے گا۔ اول معزول جج' دوم وکلاء کی تحریک اور سوم اے پی ڈی ایم۔ میں صدق دل سے سمجھتا ہوں اگر یہ تین طاقتیں صدر پرویز مشرف کو نہ للکارتیں تو آج الیکشن ہوتے اور نہ ہی جمہوری طاقتیں جیت کر اسمبلیوں میں پہنچتیں۔ ججوں اور وکلاء کا مسئلہ تو اب پارلیمنٹ کی طرف جاتا نظر آتا ہے اور مجھے یقین ہے ہماری سیاسی جماعتیں معزول ججوں کو بحال کرنے پر مجبور ہو جائیں گی کیونکہ اگر انہوں نے اس مسئلے پر ڈنڈی ماری تو عوام انہیں ڈنڈا ماریں گے اور ان لوگوں کا حشر بھی مسلم لیگ ق جیسا ہوگا لیکن جہاں تک اے پی ڈی ایم اور اس کے لیڈروں محمود اچکزئی' ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ اور عمران خان کا معاملہ ہے تو ان لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے اے پی ڈی ایم کی قیادت ٹریپ ہوئی' تحریک ان لوگوں نے چلائی اور اس تحریک کا فائدہ مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی نے اٹھایا اور یہ بلوچوں کے ساتھ مزید زیادتی ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان پیپلز پارٹی کی 90 فیصد قیادت کا تعلق سندھ اور پنجاب سے ہے جبکہ مسلم لیگ ن سو فیصد پنجابی جماعت ہے اور ان الیکشنوں میں سندھی اور پنجابی سیاستدانوں کو فوائد پہنچے ہیں چنانچہ اگر ان دونوں سیاسی جماعتوں نے فوری طور پر اپنی حکمت عملی تبدیل نہ کی تو بلوچستان ہم سے مزید دور چلا جائے گا لہٰذا میری خواہش ہے سندھ اور پنجاب بلوچستان کے ساتھ اپنا اخلاص اور محبت ثابت کریں اور میاں نواز شریف ضمنی انتخابات میں محمود اچکزئی' ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ اور عمران خان کو پنجاب سے الیکشن لڑائیں اور انہیں اپنی نشستوں پر کامیاب کرا کر اسمبلیوں میں لے کر آئیں۔ اسی طرح پاکستان پیپلز پارٹی جماعت اسلامی کے امیدواروں کو سندھ سے الیکشن لڑائے اور انہیں بھی حکومت میں شریک کرے۔ اس تھوڑی سی قربانی سے نہ صرف پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں سیاست کے مرکزی دھارے میں داخل ہو جائیں گی بلکہ حکومت بھی "سٹریٹ اپوزیشن" کے خطرے سے بچ جائے گی اور ایک ایسی قومی حکومت بھی تشکیل پا جائے گی جو مل کر وہ تمام مسائل حل کرا سکے گی جو 60 برس سے ہماری سالمیت کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔

پاکستان کی سیاست فروری کے آخری ہفتے میں پہنچ کر بری طرح الجھ چکی ہے' پاکستان پیپلز پارٹی ابھی تک وزارت عظمیٰ کیلئے اپنے امیدوار کا فیصلہ نہیں کر پائی' مخدوم امین فہیم پچھلے دو ماہ سے پیپلز پارٹی کے "وزیراعظم" چلے آ رہے تھے لیکن اب ان کی جگہ مخدوم شاہ محمود قریشی لے چکے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے مخدوم امین فہیم چوتھی بار بھی وزیراعظم نہیں بن پائیں گے اور شائد انہیں سندھ کی

رت اعلیٰ قبول کرنی پڑے۔ مخدوم امین فہیم کے بعد پیپلز پارٹی تین آپشنز پر کام کرے گی' پارٹی مخدوم محمود قریشی کو وزیراعظم بنا دے یا آصف علی زرداری تین ماہ کیلئے عارضی وزیراعظم منتخب کریں' الیکشن یں اور جیت کر خود وزیراعظم بن جائیں یا پھر پارٹی پنجاب سے وزیراعظم لے لے اور آصف علی داری پاکستان کے صدر کا حلف اٹھا لیں اور 58(2B) کے اختیارات اپنے پاس رکھیں' پاکستانی ست میں ایک مزید آپشن بھی کھل رہا ہے' اس آپشن کے مطابق شائد آصف علی زرداری وزیراعظم بن یں اور میاں نواز شریف صدر اور دونوں مل کر حکومت چلائیں۔ یہ پاکستان مسلم لیگ ن اور پاکستان ز پارٹی کے آپشن ہیں جبکہ یہاں ایک مثالی اور تاریخ ساز آپشن بھی موجود ہے' پاکستان پیپلز پارٹی' لم لیگ ن' اے این پی اور اے پی ڈی ایم مل کر عمران خان کو وزیراعظم اور آئین میں ترمیم کر کے زول چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کو صدر بنا دیں۔ ذرا تصور کیجئے اگر ہماری جماعتیں یہ آپشن استعمال لیں تو پاکستان کس قدر مثالی دور میں داخل ہو جائے گا' ہماری سیاست کس قدر بالغ اور شاندار ہو ئے گی۔

⦸ ⦸ ⦸

”سات کروڑ دس لاکھ روپے کی بے عزتی“

لاہور میں میرے ایک دوست رہتے ہیں' وہ بہت خوشحال ہیں' اللہ تعالیٰ نے انہیں دھن' دولت اور خوشحالی سے نواز رکھا ہے' وہ بلا کے مہمان نواز اور محفل ساز ہیں' وہ کھانا پکوانے اور کھلانے کے بھی ماہر ہیں' میں ایک بار ان سے ملاقات کیلئے لاہور گیا' اس دن ان کی بیگم بیمار تھیں اور خانساماں چھٹی پر تھا چنانچہ انہوں نے مجھے ساتھ لیا اور ایم ایم عالم روڈ کے ایک مشہور ریستوران میں لے گئے' اس دن ریستوران میں بہت رش تھا' ہم دونوں نے ایک میز پسند کی اور اس پر قابض ہو گئے' ہم بڑی دیر تک وہاں بیٹھے رہے لیکن آرڈر لینے کیلئے ویٹر نہ آیا' میرے دوست نے میز بجانا شروع کر دی مگر ریستوران کی انتظامیہ نے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا' ہم بڑی حیرت سے دائیں بائیں اور اوپر نیچے دیکھتے رہے لیکن ”کسی نے میری گل نہ سنی“ یہ صورتحال دیکھ کر میرا دوست اٹھا اور منیجر کے کمرے میں چلا گیا اور اس سے عرض کیا ”جناب کیا آپ دو منٹ کیلئے ہماری میز پر آ سکتے ہیں“ منیجر روایتی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ باہر آ گیا' میرے دوست نے اسے میز پر بٹھایا اور نہایت عاجزی سے بولا ”جناب اللہ کا بڑا کرم ہے میرا گھر بار ہے' گھر میں بیوی بھی ہے اور اسے بڑا زبردست کھانا بھی پکانا آتا ہے' اللہ کی مہربانی سے میں نے گھر میں کک بھی رکھا ہوا ہے اور وہ انڈین' چائنیز' لبنانی اور تھائی کھانے بنانے کا ماہر ہے' میرے گھر میں آپ کے ریستوران کے مقابلے میں کراکری بھی بہت اچھی ہے لیکن ہم یہ ساری سہولتیں چھوڑ کر آپ کے پاس آ گئے' ذرا بتایئے بھلا کیوں؟“ منیجر پریشان ہو گیا اور نیپکن سے ماتھا پونچھ کر بولا ”آئی ڈونٹ نو سر“ میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور نرم آواز میں بولا ”بٹ آئی نو سر“ ہم یہاں صرف اور صرف اس لئے آئے ہیں کہ گھر میں ہماری عزت نہیں ہے' میں وہاں سارا سارا دن پڑا رہتا ہوں لیکن میری بیوی مجھے لفٹ نہیں کراتی اور میرا خانساماں بھی کھانا پکانے میں بہت ٹائم لگا دیتا ہے چنانچہ میں نے سوچا آپ کے ریستوران میں آ جاتا ہوں' ہمیں یہاں عزت بھی ملے گی اور کھانا بھی لیکن یہاں آ کر محسوس ہوا آپ کے ریستوران اور میرے گھر میں کوئی فرق نہیں لہٰذا میں اپنے مہمان کو واپس گھر لے جا رہا ہوں“ منیجر مسکرا پڑا اور عاجزی سے بولا ”سر میں آپ سے معافی چاہتا ہوں“ میرے

ست نے بھی قہقہہ لگایا اور بولا ”لیکن میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گا کیونکہ میں نے سوچ لیا ہے اگر ہم نے بے عزت ہی ہونا ہے تو اس کیلئے دنیا میں میرے گھر سے بہتر کوئی جگہ نہیں“ میرا دوست اٹھا' اس نے منیجر کے ساتھ ہاتھ ملایا اور مجھے لے کر واقعی اپنے گھر آ گیا۔

ہمارے محترم وزیراعظم یوسف رضا گیلانی جب سے امریکہ کے دورے پر نکلے ہیں اور وہاں ن کی جس طرح ”آؤ بھگت“ ہو رہی ہے مجھے وہ دیکھ دیکھ کر اپنا یہ دوست اور ریستوران کا وہ ماحول یاد آ رہا ہے اور مجھے رہ رہ کر محسوس ہوتا ہے اگر ہمارے وزیراعظم نے یہی عزت افزائی کرانا تھی تو انہیں کستان سے باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی' وہ بس پروٹوکول اور سیکورٹی کے بغیر راولپنڈی پہنچ جاتے رائے کے بعد عوام کا ”والہانہ پن“ ملاحظہ فرما لیتے' یوں انکی آؤ بھگت بھی ہو جاتی' ان کا وقت بھی بچ جاتا ور قوم کا سرمایہ بھی محفوظ رہتا۔ وزیراعظم نے امریکہ کا دورہ فرما کر دو غلطیاں کیں' ایک وہ آؤ بھگت کیلئے مریکہ چلے گئے اور دوسرا وہ جناب رحمان ملک' شیری رحمان' راجہ پرویز اشرف اور شاہ محمود قریشی کو بھی ساتھ لے گئے' وزیراعظم کی اس زیادتی کے باعث قوم چار دن سے ان حضرات کی کمی بڑی شدت سے سوس کر رہی ہے۔ خود سوچئے اگر رحمان ملک وزیراعظم کی غیر موجودگی میں ملک میں ہوتے تو وہ اس وران کم از کم تین' چار ایسے نوٹیفکیشن جاری فرما چکے ہوتے جنہیں حکومت بعد ازاں واپس لیتی اور پوری نیا اس پر واہ واہ کرتی۔ اسی طرح اگر محترمہ شیری رحمان ملک میں ہوتیں تو وہ بھی اب تک چار' پانچ ایسی نفرنسیں فرما چکی ہوتیں جنکے آخر میں صحافی ایک دوسرے سے پوچھتے محترمہ کہنا کیا چاہتی تھیں' اگر اس وران راجہ پرویز اشرف ملک میں ہوتے تو وہ لوڈشیڈنگ کے تین' چار گھنٹوں میں اضافہ فرما چکے ہوتے یکن وزیراعظم ان حضرات اور خاتون کو بھی ساتھ لے گئے چنانچہ ان تین' چار دنوں میں ملک میں امن امان رہا جس سے پاکستان پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں بڑی شدید کمی واقع ہوئی۔ وزیراعظم نے ایک ور ستم بھی فرما دیا' وہ وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کو بھی ساتھ لے گئے چنانچہ عوام ان چار دنوں میں گیس کے رخوں میں 13 روپے اضافے سے بھی محروم رہے' جسکی وجہ سے پارٹی شدید خفت اور پریشانی کا شکار ہے لیکن کیونکہ یہ حضرات اور وزیراعظم واپس آ چکے ہیں لہٰذا مجھے یقین ہے کل سے عوام کی تفنن طبع کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جائیگا اور محترم رحمان ملک عنقریب کوئی نہ کوئی ایسا نوٹیفکیشن جاری کرانے میں کامیاب ہو جائینگے جسکے بعد پوری حکومت اور پارٹی زمین پر لیٹ کر معافی مانگے گی لیکن انکی جان نہیں چھوٹے گی اور یوں خوشحالی اور جمہوریت کا سلسلہ آگے بڑھتا رہے گا۔

ہماری حکومت کا دعویٰ ہے وزیراعظم کا دورہ تاریخی بھی تھا اور کامیاب بھی۔ میں حکومت کے اس دعوے سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ اگر دورے کے دوران ہونے والی بدنظمی' حماقتوں اور خفتوں کی

فہرست بنائی جائے تو اس لحاظ سے یہ دورہ کامیاب بھی تھا اور تاریخی بھی۔ وزیراعظم اور ان کا وفد جب لندن پہنچا تو ماشاء اللہ برطانوی حکومت نے وفد کو کسی قسم کی لفٹ نہیں کرائی تھی' وزیراعظم لندن سے واشنگٹن روانہ ہونے لگے تو برطانوی سول ایوی ایشن نے ان کے طیارے کو اڑنے کی اجازت نہیں دی تھی جس کی وجہ سے وفد کئی گھنٹے ہیتھرو ائرپورٹ پر خوار ہوتا رہا تھا' وزیراعظم واشنگٹن پہنچے تو ائرپورٹ پر سفارتی ضابطوں کے برخلاف ان کیلئے سرخ قالین نہیں بچھایا گیا اور وزیراعظم اور بیگم صاحبہ کو طیارے سے چلا کر چبوترے تک لے جایا گیا' اس دوران وفد کے باقی ارکان کو طیارے سے اترنے نہیں دیا گیا' وزیراعظم چلے گئے تو وفد کے باقی لوگ امیگریشن کیلئے آٹھ گھنٹے تک ائرپورٹ پر خوار ہوتے رہے تھے کیونکہ امیگریشن کا صرف ایک نمائندہ لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا تھا جو وفد کی انٹری کر رہا تھا اور وزیراعظم کو صرف اسسٹنٹ سیکرٹری رچرڈ باؤچر نے ریسیو کیا تھا' صدر بش کے ساتھ ملاقات کے بعد بھی میڈیا کو وزیراعظم سے سوال جواب کی اجازت نہیں دی گئی تھی' پاکستان ایمبسی کے عشائیے میں شرکت کیلئے بھی وفد کو گلی میں قطار میں کھڑا کر دیا گیا تھا اور تمام مندوبین کو اس وقت تک سفارتخانے میں داخلے کی اجازت نہیں دی گئی تھی جب تک کتے نے سونگھ کر ان کی روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی تصدیق نہیں کر دی۔ دورے کے دوران صدر جارج بش مناسب موقعوں پر آنکھ مار کر ہماری درخواستوں کا مذاق بھی اڑاتے رہے تھے اور کونڈا لیزا رائس نے بھی "ڈو مور" کا مطالبہ کر دیا تھا اور پیچھے رہ گئی ہمارے وزیراعظم کی انگریزی تو ماشاء اللہ پوری دنیا میں اس کی دھوم مچ چکی ہے چنانچہ اگر اس نظر سے دیکھا جائے تو یہ دورہ ہر لحاظ سے کامیاب تھا لیکن کیونکہ میں ایک منفی ذہن کا صحافی ہوں لہٰذا مجھے حکومت کی یہ کامیابی ہضم نہیں ہو رہی اور میں یہ سمجھتا ہوں اگر ہمارے محبوب وزیراعظم امریکہ کی بجائے راولپنڈی چلے جاتے تو ان کا وفد نہ صرف بے عزتی سے لطف اندوز ہو سکتا تھا بلکہ اس سے ملک کے وہ سات کروڑ دس لاکھ روپے بھی بچ سکتے تھے جو ہم نے 60 رکنی وفد کی بے عزتی کرانے پر خرچ کر دیئے ہیں۔ جی ہاں یہ پاکستان کی تاریخ کی مہنگی ترین بے عزتی تھی' ہم نے اس بے عزتی کیلئے ون ملین ڈالر خرچ کئے ہیں' یہ رقم پاکستانی کرنسی میں سات کروڑ دس لاکھ روپے بنتے ہیں اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ایک نہایت ہی کامیاب دورہ تھا۔

⦸ ⦸ ⦸

شی' شی آہستہ

وہ شاید برطانوی ہائی کمیشن کا پروٹوکول افسر تھا یا پھر سیکورٹی آفیسر' میرے لئے چند لمحوں میں
ندہ لگانا مشکل تھا لیکن اس نے خوش دلی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا "ہاؤ آر یو مسٹر شودری" میں نے
ت میں سر ہلا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے میں نے اس کے ساتھ ذرا سا "
ک" ہونے کی کوشش کی' میں نے اس کی توجہ بارش کی طرف مبذول کرائی' اس نے فوراً ہونٹوں پر
رکھ کر "شی' شی" کی آواز نکالی اور دھیمے لہجے میں بولا "آہستہ بولیں ہمارے وزیر خارجہ میٹنگ کر
ہے ہیں" میں گھبرا گیا' سیڑھیوں کے آخری سرے پر تین برطانوی آفیسر کھڑے تھے' ان کے ہونٹوں پر
ہانا مسکراہٹ تھی' میں ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے دھیمے لہجے میں استقبال کیا اور ڈائننگ روم کا
ازہ کھول دیا' اندر قطرینہ حسین اور حامد میر سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے تھے جبکہ نوائے وقت کے
یڈنٹ ایڈیٹر جاوید صدیق ان کی گفتگو کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے حامد میر کے
ھ بھی بے تکلفی کی کوشش کی تو انہوں نے بھی ہونٹوں پر انگلی رکھی اور شی' شی کی آواز نکال کر بولے "
ستہ اندر وزیر خارجہ میٹنگ کر رہے ہیں" اس شی شی کے بعد وہ دونوں سرگوشیوں میں گفتگو کرنے لگے
میں ڈرے ہوئے بچے کی طرح ان کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ ذرا دیر میں طلعت حسین شرلاک ہومز کا
ک کوٹ پہن کر تشریف لے آئے' ہم سب نے کھڑے ہو کر انہیں رچرڈ باؤچر جیسا پروٹوکول دیا اور
ں نے بھی رچرڈ باؤچر کی طرح مسکرا کر اور سر ہلا کر ہماری حوصلہ افزائی کی' ہم سب اب برطانوی وزیر
جہ ڈیوڈ ملی بینڈ کا انتظار کرنے لگے۔

یہ 16 جنوری کی بھیگی شام تھی' اسلام آباد پھوار' دھند اور اندھیرے میں لپٹا ہوا تھا' یہ اندھیرا'
ھند اور پھوار سیاسی اور سفارتی مطلع کو بھی اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی' ڈیوڈ ملی بینڈ دہلی کے دورے
کے بعد اسلام آباد پہنچے تھے جبکہ سعودی عرب کے خفیہ ادارے کے سربراہ شہزادہ مقرن بن عبدالعزیز
لام آباد سے دہلی پہنچ گئے تھے' وہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کا درجہ حرارت کم کرنے کی
ش کر رہے تھے' امریکہ نے ایک ماہ کی سفارتی جدوجہد کے بعد پاکستان کو جہادی رہنماؤں کے "

اوپن ٹرائل' پر قائل کر لیا تھا لیکن اب دو بڑے مسئلے درپیش تھے' پاکستانی حکومت کا خیال تھا حکومت جب جہادی رہنماؤں کے خلاف تفتیش اور مقدمہ شروع کرے گی تو اپوزیشن جماعتیں جہادی رہنماؤں کی حمایت کر کے حکومت پر سیاسی دباؤ ڈالیں گی۔ دوسرا بھارت ملزموں کو حوالے کرنے کے موقف سے پیچھے نہیں ہٹ رہا تھا اس مرحلے پر ڈیوڈ ملی بینڈ اور شہزادہ مقرن آگے بڑھے' پاکستان میں جماعت اسلامی ہو' مسلم لیگ ق' مسلم لیگ ن' تحریک انصاف یا پھر پاکستان پیپلز پارٹی تمام سیاسی جماعتوں اور سیاسی رہنماؤں کے سعودی شاہی خاندان کے ساتھ برادرانہ تعلقات ہیں چنانچہ اس مرحلے پر شہزادہ مقرن پاکستان آئے اور انہوں نے پاکستان کے تمام بڑے لیڈروں کو 13 جنوری کو سعودی عرب کے سفیر علی سعید عواد اسیری کے گھر کھانے کی دعوت دی' اس دعوت میں وزیراعظم یوسف رضا گیلانی' چیئرمین سینٹ محمد میاں سومرو' میاں نواز شریف' میاں شہباز شریف' قاضی حسین احمد' امین فہیم چوہدری شجاعت حسین' عمران خان' مولانا فضل الرحمن' مشیر داخلہ رحمن ملک اور ڈاکٹر فاروق ستار سمیت تمام اہم شخصیات نے شرکت کی' شہزادہ مقرن نے انہیں حالات کی نزاکت سمجھائی اور ان سے ممبئی حملوں پر شفاف تحقیقات اور کھلے مقدمے کے سلسلے میں حکومت سے تعاون کی درخواست کی اور ظاہر ہے تمام رہنماؤں نے یہ درخواست منظور کر لی جس کے بعد شہزادہ مقرن بھارتی زعماء کو اعتماد میں لینے کیلئے دہلی روانہ ہو گئے۔ اس دوران ڈیوڈ ملی بینڈ کے مذاکرات کے نتیجے میں 15 جنوری کو بھارتی وزیر خارجہ پرناب مکھر جی نے اعلان کر دیا ''اگر پاکستان دہشت گردوں کے خلاف شفاف تحقیقات اور مقدمات شروع کرتا ہے تو بھارت کو کوئی اعتراض نہیں'' جس کے بعد ڈیوڈ ملی بینڈ بھارت کا پیغام لے کر پاکستان آ گئے۔ 16 جنوری کو ڈیوڈ ملی بینڈ نے میاں نواز شریف سے ملاقات کی' اس ملاقات کے بعد میاں صاحب نے پریس کانفرنس بلائی اور اس میں مطالبہ کیا حکومت ممبئی کے مجرموں کے خلاف شفاف تحقیقات کرے اور اگر کوئی شخص مجرم پایا جائے تو اسے قانون کے مطابق سزا دی جائے' میاں صاحب کا یہ بیان شہزادہ مقرن اور ڈیوڈ ملی بینڈ کی کامیاب سفارت کاری کا نتیجہ تھا اور یہ اس حقیقت کی غمازی کرتا تھا کہ اگر مستقبل میں حافظ سعید احمد' مولانا مسعود اظہر' ذکی الرحمن لکھوی اور ان کے ساتھیوں کو عدالتوں میں پیش کیا جاتا ہے تو اپوزیشن حکومت کو پریشان نہیں کرے گی۔ ان حالات میں برطانوی ہائی کمیشن نے ہم پانچ لوگوں کو ڈیوڈ ملی بینڈ کے ساتھ ملاقات کی دعوت دی اور ہم ہائی کمیشن کی انیکسی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر برطانوی وزیر خارجہ کا انتظار کر رہے تھے۔

ڈیوڈ ملی بینڈ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے' انہوں نے

ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا اور گفتگو شروع کر دی۔ ان کا پہلا فقرہ تھا'' پاکستان کے مستقبل کا انحصار ممبئی حملوں کی شفاف تحقیقات پر ہے'' وہ اس کے بعد پاک بھارت ڈائیلاگ پر تفصیل سے روشنی ڈالنے لگے۔ ان کا کہنا تھا پاکستان کے دو ٹارگٹ ہونے چاہئیں' پاکستان فوری طور پر بھارت کو مطلوب تمام لوگ پکڑے' انہیں عدالت میں پیش کرے اور جرم کی نوعیت کے مطابق انہیں سزا دے اور دوم پاکستان ملک سے جہادی کلچر کے خاتمے کیلئے جامع لائحہ عمل شروع کرے' اگر پاکستان نے ایسا نہ کیا تو اس کی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ ڈیوڈ ملی بینڈ کا کہنا تھا بھارت نے پاکستان کو دہشت گردوں کے خلاف جو مواد دیا وہ ٹھوس اور مدلل ہے اور میرا خیال ہے اس مواد کی بنیاد پر ملزموں کے خلاف قانونی کارروائی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا بھارت پاکستان پر سرجیکل سٹرائیکس نہیں کرنا چاہتا لیکن ممبئی کے واقعات کے بعد بھارتی حکومت اور عوام شدید غصے میں ہیں چنانچہ انہیں مطمئن کرنا پاکستان کی ذمہ داری ہے۔ ڈیوڈ ملی بینڈ کا کہنا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ لشکر طیبہ ہی نے ممبئی حملے کئے تھے اور اسے اس جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ ہمارے ایک ساتھی نے انہیں بتایا جماعت الدعوۃ اور لشکر طیبہ سندھ' پنجاب اور آزاد کشمیر میں پھیلی ہوئی ہیں' ان کے پاس بیس ہزار تربیت یافتہ مجاہدین ہیں' لشکر طیبہ کے ایک اجتماع میں پانچ لاکھ لوگوں نے شرکت کی تھی اور ان میں مشاہد حسین سید سمیت بے شمار بڑے سیاستدان بھی شامل تھے لہٰذا ہماری ایجنسیاں جب لشکر طیبہ کی قیادت پر ہاتھ ڈالیں گی تو پنجاب' سندھ اور آزاد کشمیر میں بھی فاٹا جیسے حالات پیدا ہو جائیں گے' ملی بینڈ نے اس آبزرویشن پر جواب دیا ہم لشکر طیبہ کے تمام لوگوں کو دہشت گرد نہیں سمجھتے لیکن ہمیں دہشت گردوں اور عام کارکنوں میں فرق کرنا ہوگا' ڈیوڈ ملی بینڈ نے زبان سے تو یہ نہیں کہا لیکن ان کی باڈی لینگوئج بول رہی تھی'' یہ پاکستان کا مسئلہ ہے اور اسے پاکستان ہی کو حل کرنا ہے '' طلعت حسین نے ڈیوڈ ملی بینڈ کو بتایا وہ چند روز پہلے افغانستان گئے تھے' وہاں وہ نیٹو کے افغان ہیڈ کوارٹر میں تھے اور اس ہیڈ کوارٹر سے تین کلو میٹر کے فاصلے پر اس عمارت پر گولے داغے جا رہے تھے لہٰذا جب نیٹو اربوں ڈالرز اور جدید ترین ٹیکنالوجی کے باوجود نیٹو کے ہیڈ کوارٹر سے تین کلو میٹر دور امن قائم نہیں کر سکا تو پاکستان جیسا غریب ملک محدود وسائل کے ساتھ یہ مسئلہ کیسے حل کر سکے گا' ڈیوڈ ملی بینڈ نے اس سوال پر طلعت حسین کو سراہا اور جواب دیا'' لیکن اس کے باوجود پاکستان کو یہ مسئلہ حل کرنا ہوگا کیونکہ یہ پاکستان کے اپنے مفاد میں ہے'' ڈیوڈ ملی بینڈ کا کہنا تھا'' امریکہ' برطانیہ اور یورپین یونین کی پالیسی اس معاملے میں ایک ہے اور پاکستان جتنا جلد یہ مسئلہ حل کر لے گا اس کیلئے یہ اتنا ہی بہتر ہوگا''۔

بریفنگ ختم ہوئی' ڈیوڈ ملی بینڈ صوفے سے اٹھے' انہوں نے کوٹ کا بٹن بند کیا' بوٹ کی

ایڑھیاں بجائیں‘ گرم جوشی سے ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا اور ہمیں رخصت کر دیا‘ باہر اسی طرح دھند‘ پھوار اور اندھیرا تھا‘ ہم لوگ ہائی کمیشن کی عمارت سے نکل آئے‘ ہم سوچ رہے تھے مشکل حالات کا ایک اور ریلا ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور صوبہ سرحد کی بدامنی‘ لاقانونیت اور قتل و غارت گری کا عفریت تیزی سے پنجاب‘ سندھ اور آزاد کشمیر کی طرف بڑھ رہا ہے اور اگر حکومت نے اس معاملے کو دانشمندی سے ہینڈل نہ کیا تو پورے پاکستان کو فاٹا بنتے دیر نہیں لگے گی‘ ہم ایک ایسے مقام پر آ گئے ہیں جہاں ذرا سی بے احتیاطی ہمیں تاریخ کے بوسیدہ اوراق میں جذب کر دے گی لیکن یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کیا ہماری قیادت کو بھی حالات کی نزاکت کا اندازہ ہے؟ کیا ہماری قیادت ملک کو ان حالات سے بحفاظت نکالنے کی اہلیت رکھتی ہے‘ اس سوال پر پہنچ کر بے اختیار میرے منہ سے ’’شی‘ شی‘ آہستہ‘‘ کی آواز نکلتی ہے اور میں دائیں بائیں اور اوپر نیچے دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہوں۔

⊘ ⊘ ⊘

پینتالیس منٹ

23 مئی کو ہفتے کا دن تھا اور وزیراعظم یوسف رضا گیلانی شیخ زید بن سلطان النہیان ہسپتال ں میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج کا سنگ بنیاد رکھنے کیلئے لاہور تشریف لے گئے تھے‘ وزیراعظم جب ہسپتال ہنچے تو لاہور کی ٹریفک پولیس نے سید یوسف رضا گیلانی کی حفاظت کیلئے ٹریفک بند کر دی جس کے نتیجے یں فیروز پور روڈ‘ وحدت روڈ‘ نیو کیمپس‘ شاہراہ قائداعظم‘ کینال روڈ اور جیل روڈ پر گاڑیوں کی میلوں لمبی اریں لگ گئیں‘ اس دوران میاں نواز شریف بھی اپنی فیملی کے ساتھ رائے ونڈ سے نکلے‘ وہ اپنے کسی ست کے پاس ڈیفنس جا رہے تھے‘ میاں نواز شریف کا قافلہ نیو کیمپس پہنچا تو وہ بھی ٹریفک میں پھنس ئے‘ میاں نواز شریف پینتالیس منٹ تک ٹریفک میں پھنسے رہے‘ میاں صاحب کو ان پینتالیس منٹوں ں کوفت بھی ہوئی اور ٹینشن بھی لیکن مجھے یقین ہے میاں صاحب کی ٹینشن اس طالب علم کی ٹینشن سے ہیں کم ہوگی جس نے کمرہ امتحان میں پہنچنا تھا مگر وہ ٹریفک میں پھنس گیا اور وزیراعظم صاحب اور گورنر احب کے پروٹوکول کی وجہ سے وہ اس امتحان سے محروم رہ گیا جس کی فیس کی ادائیگی کیلئے اس کی ماں ے بے شمار گھروں میں برتن مانجھے تھے اور اس کے والد نے بیٹے کے اس امتحان کے ساتھ اپنی زندگی کی م امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ میاں صاحب کی ٹینشن ان لواحقین کی ٹینشن سے بھی کہیں کم ہوگی جن کا ‘ والدہ‘ بھائی یا بہن جناح ہسپتال کی اس ایمبولینس میں لیٹی ہوگی جو اس ٹریفک میں موجود تھی اور یہ بولینس پینتالیس منٹ تک مسلسل گریہ وزاری کرتی رہی تھی لیکن وزیراعظم کے پروٹوکول کا دل نہیں ا۔ میاں نواز شریف کی ٹینشن ان مسافروں کی پریشانی کے مقابلے میں بھی کہیں کم ہوگی جنہوں نے ر پورٹ پہنچنا تھا‘ جن کے ویزے ختم ہونے والے تھے یا جنہوں نے ایک طویل جدوجہد کے بعد جہاز سیٹیں حاصل کی تھیں یا جنہوں نے کسی بزنس ڈیل کیلئے اسلام آباد یا کراچی جانا تھا یا پھر جنہوں نے ے پیاروں کے جنازوں میں شرکت کیلئے جہاز پکڑنا تھا۔ میاں نواز شریف کی ٹینشن ان والدین کی یشانی سے بھی کم ہوگی جنہوں نے اپنی بیٹیوں کو کالج‘ یونیورسٹی یا ٹیوشن سنٹر سے لینا تھا اور وہ یہ سوچ کر بار گھڑی دیکھتے تھے کہ ان کی بیٹی سڑک پر کھڑی ہوگی اور ساتھ ہی ان کے منہ سے اس سسٹم کے خلاف ولد وزبد دعا نکلتی تھی۔ میاں صاحب کی ٹینشن ان لوگوں کی ٹینشن کے مقابلے میں بھی کم ہوگی جنہیں

ان کے گھر سے اطلاع ملی ان کی والدہ کو ہارٹ اٹیک ہو گیا یا ان کا بچہ سیڑھیوں سے پھسل گیا یا ان کی بیوی کو بجلی کا شاک لگ گیا یا ان کے گھر میں آگ لگ گئی یا پھر ان کے گھر چور گھس آئے ہیں اور اس نے اپنے اہل خانہ کی مدد کیلئے اپنی گاڑی دوڑا دی لیکن وہ وزیر اعظم کے پروٹوکول کے شکنجے میں پھنس گیا۔ میاں صاحب کی ٹینشن دائیں بائیں موجود سینکڑوں ہزاروں مسافروں کی ٹینشن سے بھی کم ہو گی کیونکہ میاں صاحب بم پروف جیپ میں' سولہ سینٹی گریڈ کے ٹھنڈے اور خوشبودار ماحول میں بیٹھے ہوں گے اور ان کی جیپ کا پٹرول ٹینک بھی فل ہو گا جبکہ دائیں بائیں کھڑی مخلوق 42 سینٹی گریڈ میں کھڑی ہو کر انتظار کر رہی تھی اور ان میں سے اکثر لوگوں کا فیول ٹینک اس دوران خالی ہو گیا ہو گا اور ان لوگوں نے یہ پینتالیس منٹ پٹرول کی ٹینشن میں گزار دیئے ہوں گے اور میاں صاحب کی ٹینشن ان لوگوں کی ٹینشن سے بھی کہیں کم ہو گی جنہوں نے سائیکل اور موٹر سائیکل پر کھلے آسمان تلے بیٹھ کر یہ پینتالیس منٹ گزار دیئے ہوں گے کیونکہ وقت لمبا یا مختصر نہیں ہوتا انسان کی پوزیشن اسے مختصر یا لمبا بناتی ہے' جنت میں بیٹھے شخص کیلئے دس صدیاں دس سیکنڈ ہوتی ہیں جبکہ جلتے ہوئے توے پر بیٹھے شخص کیلئے دس سیکنڈ دس صدیوں کے برابر ہوتے ہیں اور ان پینتالیس منٹوں کے دوران لاہور کی سات سڑکوں پر کھڑے 90 فیصد لوگ اس وقت جلتے ہوئے توے پر بیٹھے تھے اور ان کے ہونٹوں سے وزیر اعظم کیلئے زندہ باد کے جو نعرے نکل رہے تھے ہم ان کا صرف تصور کر سکتے ہیں انہیں دہرا نہیں سکتے۔

میاں نواز شریف کی پینتالیس منٹ کی یہ کوفت قدرت کی طرف سے ایک اشارہ تھا' قدرت اس کوفت کے ذریعے انہیں یہ بتانا چاہتی تھی جب کوئی شخص کسی وی وی آئی پی روٹ میں پھنستا ہے تو اس کی نفسیاتی' ذہنی' روحانی اور جسمانی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ اس کے دل میں وی وی آئی پی حضرات کا کتنا احترام باقی رہ جاتا ہے اور وہ ان تیس' چالیس یا پینتالیس منٹوں کے دوران اپنی وی وی آئی پی کلاس کے بارے میں کیا سوچتا ہے؟ قدرت ان پینتالیس منٹوں کے ذریعے میاں صاحب کو یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ وہ جب اقتدار میں آئیں تو وہ کسی شخص کو سڑک پر انتظار نہ کرائیں' وہ اپنی انا کی تسکین کیلئے خلق خدا کی بددعائیں نہ لیں اور وہ عوام کو پروٹوکول' ناکوں اور روٹس کی ذلت سے رہائی دے دیں۔ یہ پینتالیس منٹ میاں صاحب کو یہ سمجھانا چاہتے تھے وہ پروٹوکول اس ملک کے لوگوں پر کتنا بڑا ظلم ہے' جس کے 2 کروڑ 25 لاکھ بے روزگار نوجوان ڈگریاں لے کر سڑکوں پر دھکے کھا رہے ہیں' جس میں سوات کے 25 لاکھ مہمان کیمپوں میں انتہائی خوفناک زندگی گزار رہے ہیں' جو ملک غیروں کی بھیک پر چل رہا ہے' جو ملک کبھی بھارت اور چین سے آگے ہوتا تھا لیکن آج چین دنیا کے 8 بڑے ممالک اور بھارت جی 20 میں شامل ہو چکا ہے جبکہ ہمارے صدر افغانستان کے صدر حامد کرزئی اور ایران کے صدر محمود احمدی نژاد کے

چھ بغل گیر ہو رہے ہیں اور جس ملک کو آج افغانستان تک دھمکی دے دیتا ہے لیکن اس ملک کے یراعظم اور گورنر بیس بیس گاڑیوں کے قافلوں میں سفر کرتے ہیں اور ان کے اعزاز میں لاہور کی ٹریفک لیس منٹوں تک بند رہتی ہے۔ کیا یہ شاہانہ طرز عمل اس ملک کے حکمرانوں کو زیب دیتا ہے؟ کیا قوم کو قت اور اقتدار کے اس فحش اور ننگے استعمال پر خاموش رہنا چاہیے' یہ آج کا انتہائی اہم سوال ہے؟ رے صدر' ہمارے وزیراعظم' ہمارے گورنرز' ہمارے وزرائے اعلیٰ اور ہمارے وفاقی وزراء کو سرکاری انے سے پروٹوکول اور سیکورٹی کیوں فراہم کی جاتی ہے؟ کیا یہ ملک اس لئے بنا تھا کہ حکمرانوں کی ین اور ان کی انا کو گنے کا رس پلانے کیلئے سڑکوں پر روٹس لگا کر پینتالیس' پینتالیس منٹ ٹریفک ک دی جائے' یہ لوگ دس دس کروڑ کی گاڑیوں میں سفر کریں اور کوئی ان کی طرف انگلی تک نہ اٹھائے' ں؟ آخر ان لوگوں نے اس ملک کیلئے کیا کیا؟ ان لوگوں نے ترقی اور استحکام کا کون سا سیٹلائٹ خ پر چڑھا دیا؟ سیم اور تھور کی شکار کون سی زمینوں کو قابل کاشت بنا دیا؟ یہ کون لوگ ہیں؟ کیا ان کا ق ماضی کے ان حکمرانوں کے قبیلے سے نہیں جو آتے تھے' لوٹتے تھے' مزے لیتے تھے اور سلام کر کے جاتے تھے' کیا یہ لوگ بھی یہی نہیں کر رہے اور ان کے جانے سے ملک کو کیا نقصان ہو گا؟ ہماری تیں آزاد ہیں مگر یہ عدالتیں اس آزادی کے باوجود ہماری تاریخ سے این آر او جیسے سیاسی دھبے نہیں سکتیں' نہ دھوئیں' یہ سابق صدر پرویز مشرف کا احتساب بھی نہیں کر سکتیں' نہ کریں اور یہ ہمارے رانوں کا ہاتھ بھی نہیں پکڑ سکتیں' نہ پکڑیں لیکن ہماری عدالتیں کم از کم پروٹوکول پر پابندی تو لگا سکتی ہیں' کومتوں کو اتنا پابند تو کر سکتی ہیں کہ اس ملک میں کسی شخصیت کیلئے ٹریفک نہ روکی جائے' کسی کیلئے روٹ یا جائے اور کسی کیلئے سگنل بند نہ کئے جائیں' اگر کسی حکمران کو جلدی ہے یا اس کی جان کو خطرہ ہے تو وہ ڑی کی بجائے ہیلی کاپٹر استعمال کر لے لیکن اس کے باوجود بھی اگر اس کی تسلی نہیں ہوتی تو وہ صدارت' ارت عظمیٰ' گورنرشپ' وزارت اعلیٰ اور وزارت سے استعفیٰ دے دے کیونکہ قوم کی خدمت اس کا اپنا لہ تھا لہٰذا پھر قوم خادموں کے فیصلوں کا بل کیوں ادا کرے؟ حکمرانوں کی سیکورٹی ریاست کا مسئلہ نہیں' ان لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے' جو اسے ذاتی معاملہ سمجھتا ہے صرف اسے پبلک آفس ہولڈ کرنے کی زت دی جائے اور جسے یہ شرط قبول نہیں وہ کوئی دوسرا کام کر لے' وہ کسی محفوظ ملک کی شہریت لے لے' رانوں کی انا کی تسکین کیلئے عوام تکلیف کیوں اٹھائیں؟

قدرت نے میاں نواز شریف کو یہ سمجھانے کیلئے 45 منٹ ٹریفک میں پھنسائے رکھا تاکہ ب میاں صاحب صدر یا وزیر اعظم بنیں تو یہ کم از کم اس پروٹوکول پر پابندی ضرور لگا دیں' یا کم از کم یہ شی ضرور ترک کر دیں۔

آج ہمالیہ رو رہا ہے

دنیا کی کوئی قوم اور کوئی انسان اس وقت تک پختہ ہوتا ہے اور نہ ہی بالغ جب تک وہ اپنی غلطیوں سے سبق نہیں سیکھتا۔ آپ کو دنیا کی نوے فیصد ترقی یافتہ قوموں اور 95 فیصد کامیاب لوگوں میں عاجزی نظر آئے گی۔ آپ دنیا بھر کی اخلاقیات کی شرح نکال لیں آپ یہ جان کر حیران رہ جائیں گے وہ قوم جس کے شہری غفلت پر معذرت اور غلطی پر معافی مانگنے کے عادی ہیں وہ قومیں ترقی کے سٹینڈ پر سب سے آگے ہیں اور ہر وہ قوم جو غلطی پر ''ڈٹ'' جاتی ہے یا جو معافی مانگنے' اپنی اصلاح کرنے اور شرمندہ ہونے میں کنجوسی سے کام لیتی ہے وہ ترقی کے عمل میں دوسری قوموں سے بہت پیچھے ہے۔ آپ روزمرہ کی زندگی میں بھی ہر اس شخص کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مطمئن' مسرور اور ترقی یافتہ پائیں گے جو آئی ایم سوری' میں معافی چاہتا ہوں یا میں آپ سے معذرت خواہ ہوں جیسے الفاظ کو معمول بنا لیتا ہے' جو تھینک یو' شکریہ اور مہربانی کہتے ہوئے نہیں تھکتا اور آپ ہر اس شخص کو بیزار' محروم' چڑچڑا اور تنگدست پائیں گے جو دوسروں کا شکریہ ادا کرنے یا غلطی پر معذرت کرنے میں بخل سے کام لیتا ہے۔ آپ کو اگر کبھی فرصت ملے تو آپ اسلام کی روزمرہ اخلاقیات کا مطالعہ کیجئے گا' آپ یہ جان کر حیران رہ جائیں گے اسلام نے شکریہ اور معذرت پر اتنا زور دیا ہے کہ یہ دو لفظ اسلامی اخلاقیات میں قانون کا درجہ پاتے نظر آتے ہیں۔ اسلام میں یہ فرمایا گیا تھا جو شخص اپنے محسن کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا اور وہ شخص اللہ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے جس سے اس کا مسلمان بھائی ناراض ہو اور وہ اسے راضی نہ کرے۔ مؤرخین کا متفقہ فیصلہ ہے وہ قومیں بہت جلد تاریخ کے قبرستان تک پہنچ جاتی ہیں جو اپنی غلطیوں کی اصلاح نہیں کرتیں' جو اپنی غلطی پر شرمندہ نہیں ہوتیں اور جو ہسٹری کو آئی ایم سوری نہیں بولتیں۔ یہ دس ہزار سال کی تاریخ کا پہلا سبق ہے جبکہ دوسرا سبق بھوک ہے' آج تک دنیا میں کسی قوم نے ترقی نہیں کی جس نے پیٹ پر پتھر نہ باندھے ہوں اور جس نے بھوک کا امتحان پاس نہ کیا ہو۔ ترقی اور خوشحالی ایسی فصلیں ہیں جو ہمیشہ خود انحصاری کے کھیتوں میں پروان چڑھتی ہیں اور خود انحصاری قوموں کے بھوکے پیٹوں میں پیدا ہوتی ہے۔ عام زندگی بھی اسی اصول پر استوار ہے۔ دنیا میں صرف وہی شخص

نے چاندی کی پلیٹ میں کھانا کھاتا ہے جس نے مٹی کے ٹوٹے پیالوں میں رات کی بچی دال کھائی ہو اطلس اور کمخواب کی رضائیوں تک بھی وہی شخص پہنچتا ہے جس نے ننگے وجود پر یخ راتوں کی ٹھنڈ سہی دنیا ایک ایسا بازار ہے جس میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہونیوالوں کے منہ تک بک جاتے ہیں اور س زادے کو کفن تک خیرات کے نصیب ہوتے ہیں اور جن شہزادوں کو پیدائش پر ہاتھیوں کی سلامی ملتی وہ بعد ازاں زندگی کے پاؤں تلے کچلے جاتے ہیں چنانچہ بھوک اور ترقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

میں معافی چاہتا ہوں' میرا فلسفہ ذرا سا طویل ہو گیا لیکن جب کل ارکان پارلیمنٹ کو بند مرے میں بریفنگ دی جا رہی تھی تو میں سوچ رہا تھا ہم نے آج تک تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا' ہم آج ی اپنے ماضی پر شرمندہ نہیں ہیں' ہم آج بھی اپنی غلطیوں کی اصلاح کیلئے تیار نہیں' ہم آج بھی اپنی تاہیوں کو گلوکوز لگا رہے ہیں' ہم آج بھی آگ کے جلے پر برف رکھ رہے ہیں اور ہم آج بھی گندے ٹروں پر پرفیوم چھڑک کر خود کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ میں نے پچھلی سطروں میں عرض کیا تھا قومیں جب اپنی غلطیوں اور اپنے ماضی پر شرمندہ نہیں ہوتیں' یا جب تک خود سے معافی نہیں مانگتیں اس وقت تک ن کی پختگی اور بلوغت کی عمر شروع نہیں ہوتی لہٰذا ہمیں ''ان کیمرہ بریفنگ'' کے ساتھ ساتھ آج تسلیم کرنا ے گا ہماری ماضی کی پالیسیاں غلط تھیں' ہم نے فوج کو سیاست میں دھکیل کر غلطی کی تھی' جرنیلوں کی ردیاں استری کرنے والے تمام سیاستدان غلط تھے' وہ تمام قانون دان' وکیل اور جج بھی غلط تھے نہوں نے فوجی آمروں کو آئین کی چھتری فراہم کی تھی' وہ فوجی آمر جو اقتدار کی چند سانسوں کیلئے اس ک کو غیروں کے پاس گروی رکھتے رہے وہ بھی غلط تھے اور جس شخص نے پہلی بار امداد کا کشکول دنیا کے دروازے پر رکھا تھا وہ بھی ہمارا دشمن تھا۔ ہمیں ماننا چاہیے ہم نے امریکہ کی جھولی میں بیٹھ کر غلطی کی تھی' م نے اپنی غیر جانبداری کی قیمت وصول کر کے غلطی کی تھی اور ہم نے بھیک کی عادت ڈال کر غلطی کی۔ م قوم کو غلط وعدوں' جھوٹے نعروں کا دودھ پلاتے رہے' ہم نے عوام کو جمہوریت کا غلط رخ دکھایا تھا' مارے سیاستدان' ہمارے حکمران ملک کو لوٹتے رہے اور اس لوٹ کھسوٹ سے انہوں نے بیرون ملک ربوں ڈالر کے اثاثے بنائے۔ ہم نے عدلیہ کے ساتھ غداری کی' ہم نے قانون اور آئین کے ساتھ ھوکہ کیا' ہم نے سیاسی معاہدے توڑے' ہم نے بھارت پر یقین کئے رکھا اور ہم خود کو دھوکہ دیتے رہے۔ م نے اس ملک کا سودا کیا اور ہم نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے۔ ہمیں ماننا پڑے گا چپڑاسی سے لے کر مدر تک اور سیلز مین سے لے کر صنعت کار تک ہر شخص نے اس ملک کو لوٹا' کلرک سے لے کر سیکرٹری تک ور ویٹر سے لے کر کرکٹر تک اس ملک کے ساتھ ہر شخص نے دھوکہ کیا' ہماری ایجنسیوں نے اس ملک میں

نماز' داڑھی اور روزے کو جرم بنا دیا' ہم 1980ء میں ذاتی مفاد کیلئے افغانستان میں خون اور بارود کا کھیل کھیلتے رہے' ہم نے 2001ء میں ایک بار پھر ذاتی مفاد کیلئے برادر فروشی کا بازار گرم کیا اور ہم کشمیر پر 61 برس تک قوم کو دھوکہ دیتے رہے۔ ہمیں ماننا پڑے گا ہم لوگوں نے آج تک اس ملک میں کوئی مستقل پالیسی نہیں بننے دی' ہم ہر دور میں اپنے دوستوں' عزیزوں اور رشتے داروں کو نوازتے رہے' ہم نے اس ملک میں میرٹ قائم نہیں ہونے دیا' ہم نے اس ملک کے لوگوں سے بجلی' گیس اور پانی چھین لیا اور ہم نے عوام کو روٹی' روٹی کا محتاج بنا دیا۔ ہمیں ماننا چاہیے ہم آج بھی نعشوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر مفاد کا کھیل کھیل رہے ہیں' پاکستان پیپلز پارٹی مسلم لیگ ن کو دھوکہ دے رہی ہے اور پاکستان مسلم لیگ ن کی قیادت پاکستان پیپلز پارٹی کی ناکامی کا انتظار کر رہی ہے۔ پاکستان مسلم لیگ ق جنرل اشفاق پرویز کیانی کی طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہی ہے' اے این پی نے صوبہ سرحد میں اقتدار کے عوض اپنی زبان' اپنے الفاظ اور اپنی اقدار بیچ دی ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام اس سیاسی بحران سے زیادہ سے زیادہ تیل نکالنے میں مصروف ہے اور ایم کیو ایم سیاسی فائدوں کی فصل کٹنے کی منتظر ہے۔ ہمیں ماننا پڑے گا پاکستان کی کوئی سیاسی جماعت اس ملک اور اس ملک کے عوام سے مخلص نہیں اور ہمیں ماننا پڑے گا یہ ملک اس وقت ایسے تماشائیوں میں گھر چکا ہے جو اپنا ہی گھر جلا کر تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ یقین کیجئے جب تک ہم سب اپنی غلطیاں تسلیم نہیں کریں گے' ہم ان غلطیوں پر شرمندہ نہیں ہوں گے اور ہم گڑگڑا کر قوم اور اللہ سے معافی نہیں مانگیں گے اس وقت تک اصلاح احوال کی دہلیز پر ہمارا قدم نہیں پڑے گا۔ یقین کیجئے اس ملک کو ایسی ''آن کیمرہ'' بریفنگ کی ضرورت ہے جس میں پوری قوم سیاستدانوں کے سامنے اور سیاستدان پوری قوم کے سامنے کھڑے ہو کر سچ کا سامنا کریں' معافی مانگیں اور اس معافی کے بعد پیٹ پر پتھر باندھنے کیلئے تیار ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے ہم جب امریکہ کو ''نو'' کہیں گے تو ہماری زندگیاں مشکل ہو جائیں گی' ہماری امداد بند ہو جائے گی اور ہم ایک بار ڈیفالٹ کر جائیں گے لیکن یہ وہ مرحلہ ہے جس سے آج تک دنیا کی ہر قوم گزری ہے' ہم کو بھی اس مرحلے سے کبھی نہ کبھی گزرنا پڑے گا' اگر ہم نے بھوک اور دیوالیہ پن کا سامنا نہ کیا تو ہم بہت جلد تاریخ کے قبرستان میں جا سوئیں گے اور ہماری ہڈیاں تک کیڑے کھا جائیں گے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے جیل میں کہا تھا ''اگر مجھے قتل کیا گیا تو ہمالیہ روئے گا'' جنرل ضیاء الحق نے بھٹو صاحب کی اس فریاد کو مذاق سمجھا اور انہوں نے بھٹو کو پھانسی چڑھا دیا' تاریخ نے اس وقت ہمالیہ کی طرف دیکھا تو ہمالیہ کی آنکھیں خشک تھیں لیکن آج پاکستان کی ساری پہاڑیاں خون کے آنسو رو رہی

یخ کو آج بھٹو صاحب کے الفاظ کا مفہوم سمجھ آیا' بھٹو مرحوم دیکھ رہے تھے ہمالیہ عالمی طاقتوں
ح کی آخری رکاوٹ ہے' وہ جانتے تھے ان کے قتل کے بعد اس خطے میں ایک ایسی جنگ لڑی
ی جس کے آخر میں ہمالیہ کی ہر چوٹی' ہر ڈھلوان اور ہر وادی آنکھ بن جائے گی اور اس آنکھ سے
ے آنسو ٹپکیں گے۔ آج مارگلہ سے لے کر کوہ سفید تک اور کوہ سلیمان سے لے کر سست کے برف
تک پاکستان کا ہر پہاڑ رو رہا ہے۔ آج گڑھی خدا بخش سے لے کر اوجڑی کیمپ تک نعشیں بچھی
اس ملک کا ہر شہری اندر سے زخمی ہے۔ اگر ہم نے اب بھی بھٹو کا پیغام نہ سمجھا' بھٹو کی پارٹی نے
ہید قائد کے فلسفے پر عمل نہ کیا تو پورا ہمالیہ خون کے سمندر میں ڈوب جائے گا' یہ پورا ملک قبرستان
ئے گا۔ میری اس ملک کے حکمرانوں سے درخواست ہے وہ روتے ہوئے ہمالیہ کی طرف دیکھیں'
ے بعد اپنے گریبان میں جھانکیں اور ایک آن کیمرہ بریفنگ کیلئے ایوانوں سے باہر آئیں کیونکہ
نے اگر اس بار بھی وقت کی آواز نہ سنی تو وقت انہیں روند کر گزر جائے گا اور ان کی داستان تک
وں سے مٹ جائے گی۔

⊘ ⊘ ⊘

اللہ کو دھوکہ دینے والے

ہماری باتیں جاری تھیں' فون بھی آ رہے تھے اور سیکرٹری صاحب فائلوں پر دستخط بھی کر رہے تھے' اس افراتفری کے دوران اذان کی آواز گونجی' ہم سب خاموش ہوگئے' اذان ختم ہوئی تو سیکرٹری صاحب نے کافی کا لمبا سا گھونٹ بھرا' جوتے اور موزے اتارے' شرٹ کے کف اوپر چڑھائے اور ہماری طرف دیکھ کر بولے" آپ لوگ گپ لگائیں میں وضو کر کے آتا ہوں" ہم دونوں نے بھی آخری گھونٹ لئے اور عرض کیا" ہم بھی وضو کرنا چاہتے ہیں" ہم تینوں باری باری سیکرٹری کے غسل خانے میں گئے' وضو کیا اور نماز کیلئے باہر آ گئے۔

سیکرٹری صاحب کے دفتر کے سامنے صفیں بچھی تھیں' ہم آخری صف میں نمازیوں کے جوتوں کے پاس بیٹھ گئے' امامت کی جگہ پر سیکرٹری کا باریش چپڑاسی بیٹھا تھا' پہلی صف میں دوسرے چپڑاسی' ڈرائیور' بیرے' کلرک اور ڈی آر بیٹھے تھے' دوسری اور تیسری صف میں جونیئر اور سینئر آفیسر تھے جبکہ چوتھی صف میں ہم تینوں بیٹھے تھے' سیکرٹری کے دائیں بازو پر ایک مفلوک الحال بوڑھا بیٹھا تھا اس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے اور اس کے بدن سے پسینے کی ہلکی ہلکی بو اٹھ رہی تھی' تکبیر کی آواز آئی اور ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے' ہمارا اور سیکرٹری صاحب کا امام دوسرے گریڈ کا ایک چپڑاسی تھا جبکہ تین' چار' پانچ اور گیارہ گریڈ کے بیسیوں کلرک' بیرے' ڈرائیور اور نائب قاصد ہمارے آگے کھڑے تھے اس وقت ہم سب ایک تھے' ایک سے محتاج' ایک سے منگتے اور ایک سے مجبور۔ سیکرٹری صاحب کی گردن بھی جھکی ہوئی تھی' ایڈیشنل سیکرٹری' جوائنٹ سیکرٹریوں' ڈپٹی سیکرٹریوں' اسسٹنٹ سیکرٹریوں اور سیکشن افسروں کا سینہ بھی اندر کو دبا اور گردنیں نیچے گری ہوئی تھیں' چپڑاسی اور صاحب' سیکرٹری اور وہ مفلوک الحال بوڑھا جس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے اور جس کے بدن سے پسینے کی ہلکی ہلکی بو اٹھ رہی تھی ہم سب ایک دکھائی دیتے تھے' بڑے اور چھوٹے' امیر اور غریب محتاج اور غنی کی تفریق ختم ہو چکی تھی' نماز ہوتی رہی' ہم سب اللہ اکبر کی آواز پر ہاتھ باندھتے اور کھولتے رہے' رکوع سے سجدے اور سجدے سے واپس قیام میں آتے رہے' اس دوران کسی صاحب نے ایک لمحے کیلئے نہ سوچا وہ یہ سب کچھ

کس کی امامت میں کر رہے ہیں' ان کا چپڑاسی انہیں جھکنے' زمین پر ماتھا ٹیکنے اور دوبارہ کھڑا ہو جانے کا حکم دے رہا ہے اور وہ اس کی ہر آواز پر عملدرآمد کر رہے ہیں اور پھر سلام پھیرنے کا وقت آ گیا اور جونہی دوسری بار السلام علیکم ورحمۃ اللہ کی آواز آئی' مقتدیوں نے بائیں جانب سر پھیرا اور سارا مجمع اس ڈسپلن سے آزاد ہو گیا' امام چند سیکنڈ میں چپڑاسی بن گیا' کلرک' کلرک' ڈی آر' ڈی آر' ڈرائیور' ڈرائیور' ایڈیشنل ایڈیشنل' جوائنٹ' جوائنٹ' ڈپٹی' ڈپٹی' اسسٹنٹ سیکرٹری اسسٹنٹ سیکرٹری' سیکشن آفیسر' سیکشن آفیسر اور ہیڈ کلرک ہیڈ کلرک ہو گیا' عہدوں اور گریڈوں کی گری ہوئی دیواریں یک لخت پورے قد کے ساتھ کھڑی ہو گئیں' بجھی ہوئی' مری ہوئی تقسیم دوبارہ زندہ ہو گئی محتاج محتاج اور غنی' غنی ہو گیا' غلام' غلام اور صاحب' صاحب ہو گیا' سیکرٹری صاحب نے میرے کان میں سرگوشی کی" ہم باقی نماز اندر کمرے میں پڑھیں گے"۔

ہم لوگوں نے جوتے پہنے اور واپس 22 دیں گریڈ میں آ گئے' ٹھیک آدھ گھنٹے بعد سیکرٹری صاحب نے گھنٹی بجائی اور چند لمحے پہلے جو شخص ہمارا امام تھا وہ ہماری میز سے کپ اور پرچیں اٹھا رہا تھا' پی اے جو ہم سے دو صفیں آگے کھڑا تھا وہ صاحب سے ڈانٹ کھا رہا تھا اور اذان دینے والا ڈرائیور گاڑی کا دروازہ کھول کر کھڑا تھا' رہا وہ مفلوک الحال بوڑھا جس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے اور جس کے بدن سے پسینے کی ہلکی ہلکی بو اٹھ رہی تھی وہ ہاتھ میں درخواست پکڑے باہر سڑک پر کھڑا تھا' صرف چند لمحوں میں اتنی بڑی تبدیلی! میرا دماغ اس تبدیلی کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔

ہم باہر نکلے تو میں نے اپنے دوست سے کہا" یار اللہ تعالیٰ ہر روز پانچ بار ہمیں یاد دلاتا ہے تم سب ایک ہو' چپڑاسی اور سیکرٹری میں وہ افضل ہے جس کے اعمال اچھے ہیں' اللہ کی بارگاہ میں وہ زیادہ معتبر' وہ زیادہ بلند ہے جس کی جبین پر زیادہ سجدے' جس کی گردن میں زیادہ عاجزی اور جس کے دامن میں زیادہ نیکیاں ہوں گی' ہم دن میں پانچ بار چپڑاسیوں' کلرکوں اور ڈرائیوروں کے ساتھ اس اللہ کی بارگاہ میں کھڑے بھی ہوتے ہیں' ہم دو چار سجدوں تک اللہ کا یہ حکم بھی مانتے ہیں لیکن جونہی نیت کی مدت ختم ہوتی ہے اور ہمیں آنکھیں گھمانے' چلنے پھرنے اور بولنے چالنے کی آزادی ملتی ہے تو ہم فوراً اللہ کا یہ حکم فراموش کر دیتے ہیں' ہم صاحبوں اور محتاجوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور ہم افسروں اور ماتحتوں میں بٹ جاتے ہیں' دنیا میں اس سے بڑی فکری اور عملی منافقت کیا ہو گی' ہم دن میں پانچ بار مساوات کا عہد کریں' اللہ تعالیٰ کو مساوات کی پریکٹس بھی کر کے دکھائیں لیکن سلام پھیرتے ہی ہماری گردنوں کا سریا واپس آ جائے' ہم اس عہد سے پھر جائیں" میرے دوست نے ہاں میں گردن ہلا دی' میں نے عرض کیا

'میں سمجھتا ہوں جو قوم دن میں پانچ بار اللہ سے وعدہ کرتی ہو اور پھر پانچ بار ہی یہ وعدہ توڑ دیتی ہو وہ قوم اللہ کی زمین پر ذلیل و خوار نہیں ہو گی تو کیا ہو گی؟ ذرا سوچو بنی اسرائیل نے ایک وعدہ توڑا تھا انہیں اللہ کی زمین پر آج تک پناہ نہیں ملی اور ہم روز پانچ بار (نعوذ باللہ) اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں' ہم اس سے عہد شکنی کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس سے یہ توقع کرتے ہیں ہمارے لئے آسمان سے فرشتے اتریں گے اور ہم پورے کرۂ ارض پر غالب آ جائیں گے' اس سے بڑی بے وقوفی کیا ہو گی؟"۔

⦸ ⦸ ⦸

انجام

میرے منہ سے خوشی سے "زندہ باد خان صاحب" نکلا اور میں نے اخبار لپیٹ کر میز پر رکھ دیئے' میں نے ابھی پوری طرح ٹانگیں سیدھی نہیں کی تھیں کہ پروفیسر عبدالقلیل تشریف لے آئے اور میرے پاس بیٹھ گئے' میں پروفیسر عبدالقلیل کا تعارف چند سطریں بعد کراؤں گا' سردست میں آپ کو اس کی ابتدائی گفتگو میں شامل کرنا چاہتا ہوں' پروفیسر عبدالقلیل نے بیٹھتے ہی مجھ سے خوشی کی وجہ پوچھی' میں نے مسرت سے تمتماتی آواز میں بتایا "کل امریکہ کے نائب وزیر خارجہ جان نیگرو پونٹے اور ان کے اسسٹنٹ سیکرٹری رچرڈ باؤچر پشاور کے دورے پر تھے' ان دونوں نے پشاور کے شاہی مہمان خانے میں اے این پی کے راہنما اسفندیار ولی اور متوقع وزیراعلیٰ امیر حیدر ہوتی سے ملاقات کرنا تھی' امیر حیدر ہوتی اور اسفندیار ولی وقت مقررہ پر شاہی مہمان خانے پہنچ گئے لیکن مہمانوں سے قبل امریکی قونصل خانے کا سیکورٹی عملہ وہاں پہنچا' اس نے جگہ کا جائزہ لیا اور شاہی مہمان خانے کو غیر محفوظ قرار دے دیا جس کے بعد قونصل خانے کے عملے نے امیر حیدر ہوتی اور اسفندیار ولی سے درخواست کی وہ جان نیگرو پونٹے اور رچرڈ باؤچر سے ملاقات کیلئے قونصل خانے تشریف لے آئیں لیکن اسفندیار ولی نے قونصل خانے جا کر امریکی نائب وزیر خارجہ سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا' وہ شاہی مہمان خانے سے نکلے' گاڑی میں بیٹھے اور گھر چلے گئے" میں نے عبدالقلیل کو بتایا "میں اسفندیار ولی اور امیر حیدر ہوتی کی اس جرأت مندانہ پر خوش ہو رہا ہوں' اللہ کا کرم ہے پاکستان میں بھی کوئی ایسا سیاستدان موجود ہے جو امریکیوں کو ناں کہہ سکتا ہے' ہماری تاریخ میں تو ایسے ایسے واقعات بھی موجود ہیں جب امریکی آقاؤں نے پاکستانی حکمرانوں کو نہر کے پل پر بلایا اور بلا کر بھول گئے لیکن ہمارے سیاستدان آخری سانس تک پل پر بیٹھے رہے ہے۔ مثلاً صدر بش 4 مارچ 2006ء کو پاکستان کے دورے پر آیا تو اس نے ہمارے ائرپورٹ پر ہمارے صدر اور وزیراعظم سے ملاقات سے انکار کر دیا' ہمارے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری بش کے استقبال کیلئے اسلام آباد ائرپورٹ پر پہنچے تو پہلے ان کی جامہ تلاشی لی گئی' پھر انہیں کتوں کے سامنے پیش کیا گیا' کتوں نے انہیں اچھی طرح سونگھ کر کلیئر کر دیا لیکن اس کے باوجود امریکی سیکورٹی نے انہیں صدر بش

تک جانے‘ ان سے ہاتھ ملانے اور انہیں پاکستان میں ویل کم کہنے کی اجازت نہ دی‘ صدر بش پاکستان تشریف لائے لیکن انہوں نے قیام امریکی سفارتخانے میں کیا اور اگلے دن اسلام آباد کے چند بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیل کر واپس چلے گئے۔ بل کلنٹن 18 فروری 2006ء کو پاکستان کے دورے پر آئے تھے‘ ان کی تشریف آوری سے پہلے امریکی سیکورٹی ایجنسیوں نے پورا اسلام آباد اپنے قبضے میں لے لیا تھا‘ امریکیوں نے سڑکوں کا نظام تک بدل دیا تھا‘ صدر کلنٹن کی تشریف آوری کی وجہ سے ہماری سڑکوں کی دائیں جانب بائیں ہوگئی تھی اور بائیں دائیں۔ صدر کلنٹن نے بھی اپنے پاکستانی ملاقاتیوں کی فہرست خود تیار کی تھی اور وہ پاکستانی ٹیلی ویژن کے ذریعے پاکستانی قوم سے خطاب کر کے واپس چلے گئے تھے جبکہ پچھلے 60 برسوں میں بالعموم اور ''وار آن ٹیرر'' کے سات برسوں میں بالخصوص امریکہ کے سفیروں‘ نائب وزیروں اور اسسٹنٹ سیکرٹریوں نے پاکستان کی جس مقتدر ہستی سے چاہا اپنی ٹرم اینڈ کنڈیشن پر ملاقات کی اور مطالبات کی فہرست اس کے ہاتھ میں تھما کر چلے گئے چنانچہ اس ماحول‘ روایت اور کلچر میں کسی سیاستدان کا قونصل خانے میں جانے سے انکار اور نائب وزیر خارجہ سے ملاقات نہ کرنے کی گستاخی بڑی بات ہے اور میں اسفند یار ولی کی اس جرأت پر خوش ہوں''۔

میں جب اسفند یار ولی کی تعریف کر رہا تھا تو پروفیسر عبدالقلیل بوریت سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا‘ میں جوں ہی چپ ہوا وہ قہقہہ لگا کر بولا ''تم اسفند یار ولی کو چھوڑو اور فوری طور پر میری بات سنو‘ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا‘ وہ ذرا سا آگے جھکا اور رازدارانہ لہجے میں بولا ''کیا تم مہربانی کر کے یوسف رضا گیلانی کے حق میں ایک کالم لکھ سکتے ہو'' مجھے جھٹکا لگا اور میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا‘ پروفیسر عبدالقلیل پچاس‘ پچپن سال کا ایک ''میڈیا ایڈوائزر'' ہے اور اس کا کام حکومت کی حمایت میں کالم لکھنا اور لکھوانا ہے‘ وہ وزارت اطلاعات کا ''خادم'' ہے‘ وہ آج سے بارہ برس قبل میاں نواز شریف کے قریب تھا اور ان کی حمایت میں اخبارات میں فرضی ناموں اور کبھی اصلی نام سے مضامین لکھا کرتا تھا‘ وہ کالم نگاروں سے رابطے کر کے انہیں میاں صاحب کی حمایت میں کالم لکھنے کی ترغیب بھی دیتا تھا‘ میاں نواز شریف کے بعد پروفیسر صاحب مسلم لیگ ق کی جیب میں چلے گئے‘ وہ وہاں سے میر ظفر اللہ جمالی کے پاس گئے اور ان کیلئے یہ خدمات سرانجام دیتے رہے‘ میر ظفر اللہ جمالی کے بعد شوکت عزیز کی باری آئی اور پروفیسر صاحب ان کی خدمت میں جت گئے‘ اس دور میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب شوکت عزیز اور چودھریوں میں اختلافات پیدا ہو گئے‘ اس وقت پروفیسر صاحب دونوں کی خدمت کر رہے تھے‘ وہ ایک ہاتھ سے شوکت عزیز کی حمایت میں مضمون لکھتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے اس خوبصورتی سے

ری پرویز الٰہی اور چودھری شجاعت حسین کی خدمت کرتے تھے کہ ایک ہاتھ کی دوسرے ہاتھ کو خبر تک ہوتی تھی‘ پروفیسر صاحب کیونکہ سدا کے بھوکے ننگے تھے اور کروڑوں روپوں کی جائیداد اور س کے باوجود ان کے منہ پر ہمیشہ مر گئے‘ لٹ گئے اور خرچ پورے نہیں ہوتے قسم کے شکوے تے تھے چنانچہ لوگوں نے ان کا نام ہی پروفیسر عبدالقلیل رکھ دیا ہے‘ الیکشن سے قبل وہ مسلم لیگ ق خدمات سرانجام دے رہے تھے اور ان کے ہاتھ سے لکھے اکثر مضامین اخبارات میں شائع ہوتے تے تھے لیکن کل صبح وہ میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کیلئے یزری کا اعلان کر دیا تو میں حیران ہو گیا‘ میں نے اس کایا کلپ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اف کیا وہ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے پاکستان پیپلز پارٹی اور آصف علی زرداری کی میڈیا ایڈوائزری کر رہے میرے لئے یہ انکشاف بجلی کے گیارہ ہزار وولٹ کے جھٹکے کے برابر تھا اور میں حیرت کے اس مقام پہنچ گیا جہاں انسان افسوس تک کے قابل نہیں رہتا‘ اسی دوران پروفیسر نے بغل سے اخبارات کی فائل نکالی اور وہ تمام مضامین میرے سامنے رکھ دیئے جو انہوں نے تین دنوں میں وزیراعظم یوسف گیلانی کی حمایت میں لکھے اور لکھوائے تھے اور وہ تمام مضامین باقاعدہ اخبارات میں شائع ہوئے میں بے بسی کے عالم میں پروفیسر عبدالقلیل کو دیکھنے لگا جبکہ پروفیسر میرے سامنے بیٹھ کر شیطانی ز میں قہقہے لگا رہا تھا۔

مجھے نہیں معلوم یہ کیا گورکھ دھندہ ہے لیکن ایک بات طے ہے انسان اپنی صحبت‘ بندہ اپنے ستوں اور حکمران اپنے ماتحت افسروں اور ایڈوائزر سے پہچانا جاتا ہے‘ 11 فروری 1990ء میں نیلسن منڈیلا آزاد ہوا اور اس نے ساؤتھ افریقہ کی عنان اقتدار سنبھالی تھی تو اس وقت کسی نے انیہ کی سابق وزیراعظم مارگریٹ تھیچر سے اس تبدیلی کے بارے میں پوچھا تھا‘ مارگریٹ تھیچر نے کہا تھا ہمیں ابھی چند ماہ انتظار کرنا چاہیے‘ ہمیں دیکھنا چاہیے نیلسن منڈیلا کس کس کو اپنا وزیر‘ ایڈوائزر اور ٹری بناتے ہیں'' مارگریٹ تھیچر نے کہا تھا ''کسی حکمران کا عملہ بنیادی طور پر اس کی ذہنیت‘ اس کے دار اور اس کے کیلیبر کا اظہار ہوتا ہے‘ اگر کسی حکمران کے گرد جواری جمع ہو جائیں تو اس کا مطلب ہوگا کمران جواری ہے اور اگر کسی حکمران کے ساتھ کرپٹ اور بے ایمان لوگ نظر آئیں تو اس کے معانی ں گے وہ حکمران بے ایمان ہے اور اس کی حکومت کا اختتام بے ایمانی پر ہوگا'' مارگریٹ تھیچر کی بات بڑا وزن تھا‘ یہ حقیقت ہے اہل لوگوں کے ماتحت اہل اور بے ایمان حکمرانوں کے ایڈوائزر بے ایمان تے ہیں‘ محمد شاہ رنگیلا کی مثال لے لیجئے‘ اس کے دور میں سات ممالک کی طوائفیں‘ نائکیں اور

سازندے دہلی میں جمع ہو گئے تھے اور یہ لوگ اس وقت تک دربار میں "ان" رہے تھے جب تک محمد شاہ رنگیلا بادشاہ رہا تھا' اس زمانے میں بادشاہ کا چیف ایڈوائزر ایک خواجہ سرا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں جلال الدین محمد اکبر کے ایڈوائزر نورتن کہلاتے تھے اور تاریخ آج تک ان کی ذہانت اور فطانت کی گواہی دیتی ہے۔ یوسف رضا گیلانی آٹھ برس کی طویل اور صبر آزما آمریت کے بعد ایوان اقتدار میں داخل ہوئے ہیں' انہوں نے ایک نئے اور جمہوری پاکستان کے نمائندے بن کر وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھایا ہے چنانچہ اس وقت ان پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہے کیا وہ یہ ذمہ داریاں نبھا سکیں گے؟ اس بات کا فیصلہ ان کے ایڈوائزر اور ماتحت افسروں کو دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اگر انہوں نے اپنے لئے پاکستان کے ایماندار ترین اور قابل ترین افسروں کا انتخاب کیا تو یہ حکومت مستقبل کے تمام چیلنجز پر پوری اترے گی بصورت دیگر چھ ماہ بعد لوگ صدر مشرف کو یاد کرنا شروع کر دیں گے۔ آج یوسف رضا گیلانی کی وزارت عظمیٰ کا چوتھا دن ہے لیکن بدقسمتی سے انہوں نے پچھلے تین دنوں میں جن افسروں اور ایڈوائزروں کا انتخاب کیا' بیوروکریسی اور معاشرے میں ان کی شہرت اچھی نہیں چنانچہ اگر وزیراعظم ہاؤس میں ان جیسے لوگوں کی آمد کا یہ سلسلہ جاری رہا تو ہم آج کے روز ہی اس حکومت کے انجام کا اعلان کر سکتے ہیں اور یہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔

⊘ ⊘ ⊘

بس قومی مفاد نکال دیں

آپ کو یاد ہوگا جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف اپنے دور میں ایک بار بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کے گھٹنوں پر جھک گئے تھے اور انہوں نے مذاکرات' تعلقات اور ورکنگ ریلیشن شپ کیلئے بھارت کی تمام شرائط مان لی تھیں۔ اس دور میں بھی وزارت اطلاعات نے حکومت کے تمام جائز اور ناجائز کاموں کی جسٹی فکیشن کیلئے مضامین نگاروں اور کالم نویسوں کا ایک خفیہ سکواڈ بنا رکھا تھا۔ یہ سکواڈ جنرل صاحب کی ہر سیاسی حماقت کو "اسلامی" شکل دینے کی کوشش کرتا تھا' جنرل صاحب کی بھارت کے سامنے اس فکری پسپائی کو اس خفیہ سکواڈ نے "صلح حدیبیہ" قرار دینا شروع کر دیا تھا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف سید زادے ہیں چنانچہ انہوں نے بھارت کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھا کر حدیبیہ کے معاہدے کی یاد تازہ کر دی۔ ان حضرات کا کہنا تھا پاکستان آج اسی صورتحال سے گزر رہا ہے جس میں چودہ سو سال پہلے مدینہ منورہ کی ریاست مبتلا تھی چنانچہ جنرل پرویز مشرف نے بھارت کو مذاکرات کی دعوت دے کر وقت حاصل کر لیا۔ ہم اب رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے تیاری کریں گے' اپنے آپ کو مضبوط بنائیں گے اور پھر فتح مکہ کی طرف بڑھیں گے' وغیرہ' وغیرہ۔ جنرل مشرف کے قلمی سپاہی جب اس قسم کے مضامین لکھ رہے تھے تو میں نے جنرل صاحب کے ایک مشیر سے عرض کیا "مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آیا حکمرانوں کا اسلام صرف صلح حدیبیہ سے کیوں شروع ہوتا ہے اور اسی پر آ کر کیوں ختم ہو جاتا ہے" انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا' میں نے عرض کیا "جناب ہم کیوں بھول جاتے ہیں' حدیبیہ سے پہلے غزوہ خندق بھی تھا' احد اور بدر کے میدان بھی تھے۔ بے سروسامانی' پیٹ پر دو دو پتھر' ایک ایک خچر اور چار چار مسافر' دودھ کا ایک پیالہ' دو کھجوریں اور اڑتالیس' اڑتالیس گھنٹوں کا دن بھی تھا' صحرا کی تپتی ریت اور احد احد کی آوازیں بھی تھیں' اونٹ کی اوجڑی میں گم سجدے اور سر پر کافروں کی پھینکی گندگی بھی تھی' راستے میں بچھے کانٹے بھی تھے اور اپنوں کے برسائے کوڑے بھی تھے۔ کیا یہ اسلام نہیں تھا؟ کیا یہ سنت نہیں تھی اور حکمرانوں کو یہ سنت اور یہ اسلام کیوں دکھائی نہیں دیتا؟" جنرل صاحب کے مشیر خاموش رہے' میں نے عرض کیا" جناب یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اسلام کے وسیع دسترخوان سے

اپنی اپنی مرضی کا لقمہ اٹھا لیتے ہیں اور اسے پورا اسلام بنا کر پیش کر دیتے ہیں' ہم جب یہودیوں سے قرضہ لیتے ہیں یا ہمارا دل اسرائیل کو تسلیم کرنے کیلئے مچلتا ہے تو ہم فوراً یہ دلیل دے دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کیا تھا' ہم جب بھارت کی بالادستی تسلیم کرنے لگتے ہیں تو ہم اپنی کمزوری کو فوراً حدیبیہ کی سنت قرار دے دیتے ہیں اور ہم جب جمہوریت کی بساط لپیٹنے لگتے ہیں تو ہم فوراً پارلیمانی نظام کو خلاف اسلام قرار دے دیتے ہیں اور یہ فرمانا شروع کر دیتے ہیں اسلام میں الیکشن کمیشن' ووٹ اور ووٹر کی لسٹیں کہاں تھیں۔ ہماری حالت یہ ہے اس ملک میں جب بھی کوئی زور آور' دولت مند یا بااختیار شخص دوسری شادی کرنے لگتا ہے تو وہ اسے سنت رسول ﷺ ڈکلیئر کر دیتا ہے اور کوئی اس سے نہیں پوچھتا جناب یہ درست ہے اسلام میں دوسری' تیسری اور چوتھی شادی کی گنجائش موجود ہے' یہ بھی ٹھیک ہے اسلام میں الیکشن کمیشن نہیں تھا اور نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ معاہدہ بھی کیا تھا اور آپ ﷺ نے صلح نامہ حدیبیہ بھی فرمایا تھا لیکن نعوذ باللہ کیا سنت کا سلسلہ یہاں پر آ کر رک گیا تھا اور نعوذ باللہ' نعوذ باللہ کیا اسلام دوسری' تیسری اور چوتھی شادی کے بعد ختم ہو جاتا ہے؟ نہیں ہوتا! یہ تو اسلام کا اعشاریہ صفر' صفر' صفر اور صفر ایک بھی نہیں ہیں۔ اسلام اور سنت ان کے علاوہ ہیں لیکن ہم صرف اپنی مرضی کا اسلام پسند کر لیتے ہیں" جنرل صاحب کے مشیر نے قہقہہ لگایا اور سگریٹ کا کش لے کر بولے "میں صدر کو اچھی طرح جانتا ہوں' وہ ان چیزوں پر یقین نہیں کرتے' یہ تو آپ کے بھائی بند ہیں جو جنرل صاحب کے لبرل خیالات کو اسلام کے سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں' جنرل صاحب تو یہ بھی بھول چکے تھے کہ یہ سید ہیں' یہ تو شیخ رشید اور آپ کے صحافی دوست ہیں جنہوں نے انہیں بڑی مشکل سے یاد کرایا کہ یہ ہمارے سید زادے ہیں اور اسلام میں ان کا بڑا مقام ہے" اس کے ساتھ ہی انہوں نے قہقہہ لگایا اور ہماری ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔

یہ صرف جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف کی تکنیک نہیں تھی بلکہ پاکستان کی تمام حکومتیں اور حکمران اپنے ہر فیصلے کو اسلام کے ذریعے جسٹی فائی کرتے ہیں یا پھر نظریہ پاکستان' ملکی مفاد' آئین اور عوامی مطالبے کے ذریعے۔ یہ کھیل پاکستان میں اتنی بار کھیلا اور دہرایا گیا ہے کہ اب جب بھی کوئی سیاستدان یا حکمران اسلام' قرآن' حدیث یا سنت کا نام لیتا ہے یا وہ نظریہ پاکستان' ملکی مفاد' آئین اور عوامی مطالبے کا ذکر کرتا ہے تو لوگوں کی ہنسی نکل جاتی ہے۔ قوم آج تک جس طرح حکمرانوں کے اسلام کا تعین نہیں کر سکی بالکل اسی طرح یہ وسیع تر ملکی مفاد' آئینی ذمہ داری اور عوامی مطالبے کا فیصلہ بھی نہیں کر سکی لیکن قوم اس فیصلے پر پہنچ چکی ہے کہ حکمران کلاس کا ہر وہ فیصلہ جس کا براہ راست فائدہ ان لوگوں کو پہنچتا ہے وہ

...ذاں ملکی مفاد' آئینی ذمہ داری اور عوام کا پرزور مطالبہ ثابت ہوتا ہے۔ یہ حقیقت اس قدر ٹھوس شکل
...یار کر چکی ہے کہ جوں ہی کسی وزیر' مشیر یا سفیر کی زبان سے عوامی مفاد کا لفظ نکلتا ہے تو لوگ فوراً سمجھ
...تے ہیں اس کا مطلب سفیر' مشیر یا وزیر کا ذاتی مفاد ہے۔ آپ حکومت کے تازہ ترین فیصلے ہی کو لے
...' وفاقی کابینہ نے گزشتہ روز 15 اپریل کو گھڑیاں ایک گھنٹہ آگے کرنے کا فیصلہ کیا' یہ فیصلہ متوقع تھا
...نکہ جب سردیوں میں گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے کی گئی تھیں تو ظاہر ہے اب ان گھڑیوں نے آگے بھی
...تا تھا۔ گھڑیاں آگے پیچھے کرنے میں حرج بھی نہیں کیونکہ دنیا کے 245 ممالک میں سے 91 بڑے
...الک ہر سال یہ حرکت کرتے ہیں' یہ سلسلہ کئی دہائیوں سے جاری ہے اور اگر یہ پریکٹس غلط ہوتی تو
...رپ اس کو اب تک ترک کر چکا ہوتا چنانچہ مجھے گھڑیوں کی سوئیاں آگے پیچھے کرنے پر ہرگز کوئی اعتراض
...یں' مجھے اعتراض اس کی جسٹی فکیشن پر ہے۔ حکومت جب بھی گھڑیاں آگے پیچھے کرتی ہے تو یہ ساتھ ہی
...لان کرتی ہے اس اقدام سے چار سے پانچ سو میگا واٹ بجلی کی بچت ہو گی۔ مجھے اس فلسفے پر اعتراض
...' حکومت نے کل بھی یہ اعلان فرمایا کہ 15 اپریل کے بعد روزانہ اڑھائی سو سے تین سو میگا واٹ بجلی
...ی بچت ہو گی۔ مجھے یہ فلسفہ ہضم نہیں ہو رہا کیونکہ اگر حکومت کی دلیل مان لی جائے تو گھڑی کی سوئیاں
...ی بچانے بلکہ بجلی پیدا کرنے کا مفت ترین ذریعہ ثابت ہو جائیں گی۔ آپ ایک گھنٹہ آگے کر لیں تین سو
...واٹ بجلی بچ جائے گی۔ آپ دو گھنٹے آگے کر دیں' بچت چھ سو میگا واٹ ہو جائے گی' گھڑیاں تین گھنٹے
...گے کر دیں بچت 9 سو میگا واٹ تک چلی جائے گی اور آپ گھڑیاں چار گھنٹے آگے کر دیں بجلی کی بچت
...1 سو میگا واٹ کو چھو لے گی یوں ہم صرف سوئیاں آگے کرتے رہیں اور بجلی بچاتے رہیں یہاں تک کہ
...اپنی گھڑیوں کو دنیا سے تین دن آگے کر کے بجلی کے سارے بحران پر قابو پا لیں لیکن حکومت اس نسخے کو
...ن دن تک نہیں پھیلائے گی کیونکہ اگر بجلی کا بحران ختم ہو گیا تو ہمارے مہربان دوست راجہ پرویز اشرف
...ے روزگار ہو جائیں گے اور پاکستان پیپلز پارٹی آج کل یہ افورڈ نہیں کر سکتی چنانچہ صرف راجہ صاحب کی
...ارت بچانے کیلئے گھڑیاں صرف ایک گھنٹہ آگے کی جا رہی ہیں۔

خدا کے بندو یہ کیا ہے؟ بجلی کا بحران پیداوار بڑھانے سے ختم ہو گا' گھڑیاں آگے یا پیچھے
...رنے سے نہیں۔ یہ ڈبل سواری اور ریڈ زون کی سوچ جو حکومت کے تمام شعبوں میں "پینی ٹریٹ"
...رتی چلی جا رہی ہے' جب بھی فرقہ واریت کی واردات ہوتی ہے تو حکومت فوراً موٹر سائیکل کی ڈبل
...اری پر پابندی لگا کر اس مسئلے کا حل تلاش کر لیتی ہے اور اسی طرح خودکش حملوں سے بچنے کیلئے ریڈ
...ن تخلیق کر لئے جاتے ہیں لیکن جس طرح ڈبل سواری فرقہ واریت کا حل نہیں اور ریڈ زون سے

دہشت گردی ختم نہیں ہوتی بالکل اسی طرح صرف گھڑیاں آگے پیچھے کرنے سے لوڈ شیڈنگ ختم نہیں ہوگی۔ آپ سال میں دو کی بجائے چار بار گھڑیاں آگے پیچھے کریں' ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن خدا کیلئے اس کی اتنی بھونڈی جسٹی فکیشن نہ دیں۔ اس پر ملکی مفاد' عوامی مطالبہ اور آئینی ذمہ داری کا تڑکا نہ لگائیں۔ اسلام کو اسلام رہنے دیں اور قومی مفاد کو قومی مفاد۔ آپ بس گھڑیوں کے ساتھ کھیلتے رہیں' آپ سے کوئی نہیں پوچھے گا کیونکہ جس ملک میں جنرل پرویز مشرف پانچ دس ہزار لوگ مروا کر دندناتا پھر رہا ہے اس میں آپ کو گھڑیوں کو آگے پیچھے کرنے سے کون روک سکتا ہے۔ بس اس سے قومی مفاد کو نکال دیں' باقی سب خیریت ہے۔

⊘ ⊘ ⊘

دو فٹ کا شیشہ

شہر سے نکلتے ہی منظر بدل گیا' دور دور تک ہریالی تھی' سیدھے' نوکیلے پودے اساطیری
ںوں کی طرح سینہ تان کر کھڑے تھے' ہوا کی رومی کنیزیں ان کے در نیاز پر دستک دیتیں تو خوشی کی
لہری دور تک بہتی چلی جاتی' ان اساطیری سرداروں اور ان رومی کنیزوں سے ذرا پرے سونے کا
ا اڑ رہا تھا' سبک سنہری ذرے اڑتے اور پورے ماحول کو اپنی آغوش میں لے لیتے تھے' چند لمحوں کیلئے
ی سردار سنہرے ہو جاتے' پھر رومی کنیزیں آگے بڑھتیں' سرداروں کے بدن سے ہولے ہولے
ہ آہستہ سنہرا پن اتارتیں اور یوں ہرا ایک بار پھر ہرا ہو جاتا اور وہاں ایک آب جو بھی تھی' ایک آہستہ
ستہ دھیرے دھیرے بہتی آب جو' جس میں سورج کی شوخ کرنیں اور درختوں کی نرم شاخیں دونوں
وقت اپنا آپ تلاش کرتی تھیں' میں نے ڈرائیور کو ''اے سی'' تیز کرنے کی ہدایت کی' اس نے ڈیش
پر انگلی رکھی اور ٹھنڈی یخ ہوا کے جھونکوں میں اضافہ ہو گیا' باہر کا ماحول مزید خوبصورت ہو گیا' میں نے
ے کے سیاہ شیشوں سے باہر جھانکتے ہوئے سوچا' میں کتنا خوش نصیب ہوں' میں ایسی جنت میں رہ رہا
' جس میں حسن ہی حسن ہے' امن ہی امن اور خوشی ہی خوشی ہے' میں نے گہرے اطمینان سے
جھری لی اور اپنے ساتھی کو کہنی مار کر جگایا' اس نے بھی باہر جھانک کر دیکھا' جہاں زمین اور آسمان کے
ے ملتے تھے وہاں لالی کی ایک طویل لکیر بچھی تھی' یوں محسوس ہوتا تھا شدت جذبات نے' وصل کی ایک
خواہش نے زمین اور آسمان کے درمیان آگ بھر دی ہے اور ان دونوں میں سے ابھی کوئی چند ملی
آگے بڑھے گا اور ایک دھماکہ ہو گا' آگ کا ایک شعلہ مشرق سے مغرب تک دوڑے گا اور پھر گلاب
ر پورے کرۂ ارض پر ٹوٹ برسے گا' میرے ساتھی کے منہ سے بے اختیاری میں ''ہاؤ'' نکلا اور وہ
ی کے خنک شیشے پر جھک گیا' میں نے بھی آگے جھک کر اپنی ناک شیشے سے چپکا دی۔

ہم باہر کے نظاروں میں محو تھے کہ اچانک ٹھک کی آواز آئی اور گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی''
ہوا؟'' میں اور میرا ساتھی چلایا' گاڑی نے دو تین جھٹکے کھائے' اے سی بند ہوا اور گاڑی سڑک کے
ے کھڑی ہو گئی'' سر انجن میں کوئی گڑبڑ ہے' آپ بیٹھیں میں دیکھتا ہوں'' ڈرائیور نیچے اترا' بونٹ

کھولا اور اس کے پیچھے آدھے سے زیادہ گم ہو گیا' مجھے اندر سے اس کے بوٹ اور نیلی پتلون نظر آ رہی تھی' میرے ساتھی نے ٹائی اور قمیض کے بٹن کھولے اور ڈائری کو پنکھا بنا کر بولا ''یار آج گرمی کچھ زیادہ نہیں'' میں نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے اس کے مشاہدے کی داد دی' اندر صرف گرمی نہیں تھی بلکہ حبس بھی تھا' ڈرائیور اسی طرح بونٹ کے پیچھے گم تھا' میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا' ہوا کا ایک گرم سلگتا ہوا بدبودار تھپیڑا آیا' ہم دونوں کے منہ پر برسا اور گاڑی کے اندر چکرانے لگا' میں نے چیخ مار کر کھڑکی بند کر دی' اندر کے حبس میں اضافہ ہو گیا' ہم دونوں ہاتھوں سے پنکھا جھلنے لگے' میرے ہاتھوں میں اخبار تھا اور میرے ساتھی کے ہاتھوں میں ڈائری' ہم پنکھا جھلتے رہے' جھلتے رہے لیکن جوں جوں ہمارے ہاتھ چلتے گاڑی کے حبس میں اضافہ ہوتا جاتا' میں نے اپنے ساتھی سے کہا ''لُو حبس سے بہتر ہوتی ہے' آؤ وہاں باہر درخت کے نیچے بیٹھ جاتے ہیں'' میرا ساتھی بھی شاید یہی سوچ رہا تھا' اس نے فوراً دروازہ کھولا اور نیچے کود گیا' میں بھی اس کی تقلید میں باہر آ گیا' باہر شدید گرمی تھی اور چہار سو شمشان گھاٹ جیسی بدبو پھیلی تھی' ڈرائیور نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا ''سر گاڑی گرم ہے' ہمیں کچھ دیر رکنا پڑے گا'' ہمارے پاس ڈرائیور کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا' ہم نے اپنی اپنی ٹائیاں اور کوٹ گاڑی میں پھینکے اور بھاگ کر درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے' ہم نے آگے پیچھے دیکھا' ماحول بدل چکا تھا' ہم کالا شاہ کاکو کے مضافات میں تھے' کیمیکل فیکٹریوں کے بدبودار دھوئیں نے پوری فضا کو یرغمال بنا رکھا تھا' ہم چلتی گاڑی سے جنہیں اساطیری سردار سمجھ رہے تھے وہ بدبودار پانیوں کے سرکنڈے تھے' ہم جن کو رومی کنیزیں خیال کر رہے تھے' وہ فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلتا دھواں تھا اور رہا سونے کا برادہ تو وہ گرم دھول تھی جو دور بے آب و گیاہ کھیتوں سے اڑتی' بگولے بنتی اور ساٹھ ستر کلومیٹر کی رفتار سے راستے میں کھڑی ہر چیز سے الجھتی اور لڑتی اور مارتی دھاڑتی دور کہیں افق میں گم ہو جاتی تھی اور رہاں وہ آب جو' میں نے جھک کر دیکھا اور گھبرا کر ناک پر رومال رکھ لیا' وہ آب گندہ نالا تھا جو دو تین شہروں کی گندگی لے کر راوی کی طرف بہہ رہا تھا' میں نے اوپر دیکھا' وہاں جہاں زمین اور آسمان ہم آغوش ہو رہے تھے' وہاں دور دور تک آگ بچھی تھی' مجھے محسوس ہوا' میں جسے جنت سمجھ رہا تھا' وہ دراصل دوزخ تھا۔

ہم ایک گھنٹے بعد روانہ ہوئے' گاڑی ٹھیک ہو چکی تھی' میں نے ڈرائیور کو ''اے سی'' تیز کرنے کا کہا' کالر سیدھا کر کے ٹائی لگائی' کوٹ میں بازو پھنسائے اور ٹھنڈی یخ ہوا کا لمبا سانس لے کر کھڑکی پر جھک گیا' باہر ایک بار پھر ہوا کی رومی کنیزیں اساطیری سرداروں کا سنہرا پن دھو رہی تھیں' سورج کی کرنیں اور درختوں کی نرم شاخیں آب جو میں اپنا وجود تلاش کر رہی تھیں' جذبات کی شدت نے زمین اور آسمان

کے پیوست ہونٹوں میں گلاب بھر دیئے تھے اور دور دور تک تا حد نظر ہریالی ہی ہریالی تھی' شیشے سے باہر ایک بار پھر جنت سج چکی تھی' میں نے اطمینان سے لبریز جھرجھری لی اور سوچا ''اللہ کا میرے اوپر کتنا احسان ہے میں اس جنت میں رہ رہا ہوں'' میں نے ٹائی کی ناٹ کسی اور ان تمام لوگوں پر سو سو حرف بھیجنے لگا جو دن رات حالات کا رونا روتے رہتے ہیں' جو گرمی' بدبو' خشک سالی' دھول' بدامنی اور سہولتوں کی کم یابی کا شکوہ کرتے رہتے ہیں' میں نے اپنے ساتھی کو ٹھوکا دیا ''یار ان تمام لوگوں کو جمع کر کے جوتے نہیں مارنے چاہئیں جنہیں یہ ہریالی نظر نہیں آتی' وہ دیکھو باہر حسن ہی حسن ہے' امن ہی امن ہے' مجھے تو یہاں کوئی خرابی' کوئی پریشانی دکھائی نہیں دیتی'' میرے ساتھی نے کسمسا کر پہلو بدلا اور آہستہ سے بولا ''ہاں جب تک اے سی کام کر رہا ہے'' میں نے قہقہہ لگایا اور سر سیٹ کے ساتھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ہم ملتان روڈ سے ہوتے ہوئے نہر پر اتر آئے' وہاں پہنچ کر میرے ساتھی نے مجھ سے کہا ''تم نے فرق دیکھا تھا'' میں نے اونگھتے اونگھتے آنکھیں کھولیں اور اس کی طرف دیکھ کر بولا ''کیا؟'' وہ جذباتی لہجے میں بولا ''صرف ایک شیشہ حقیقت کو کس طرح بدل دیتا ہے' ایک اے سی حالات کو کس طرح تبدیل کر دیتا ہے'' میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا' وہ بولا ''گاڑی کے اندر 16 ڈگری سینٹی گریڈ ٹمپریچر ہے جبکہ باہر 42' اس 16 اور 42 ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان صرف تین ایم ایم کا دو فٹ شیشہ حائل ہے' ہم جب شیشے کی اس سائیڈ سے زندگی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں 42 ڈگری کی زندگی خوبصورت بھی دکھائی دیتی ہے' ہری بھی اور سنہری بھی' ہم جب اس شیشے کے پیچھے بیٹھ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں ننگے' گندے اور بھوکے لوگ کتنے خوبصورت' مطمئن اور خوش دکھائی دیتے ہیں' ہمیں 16 ڈگری سینٹی گریڈ میں بیٹھ کر یہ ملک جنت کا کتنا بڑا ٹکڑا لگتا ہے لیکن اگر یہ دو فٹ کا شیشہ درمیان سے ہٹ جائے تو؟'' وہ خاموش ہو گیا' میں نے پوچھا ''تو؟'' وہ بولا ''تو زندگی کے اصل رنگ' اصل بدصورتیاں اور اصل سچائیاں دو منٹ میں اندر آ جائیں گی' ہمیں 42 سینٹی گریڈ کی گرم ہوا جھلسائے گی اور ہمیں معلوم ہو گا مئی کے آخری دنوں میں کوٹ پہن کر باہر نکلنا کتنا مشکل ہوتا ہے' ہمیں اس وقت پتہ چلے گا جب دن کے دو بجے زندگی سر سے پگھل کر ایڑیوں تک پہنچتی ہے تو انسان پر کیا گزرتی ہے'' وہ خاموش ہو گیا' میں نے اس سے پوچھا ''تم کہنا چاہتے ہو' مجھے تمہاری بات سمجھ نہیں آئی'' اس نے قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے بولا ''صدر پرویز مشرف ہوں' شوکت عزیز' یوسف رضا گیلانی یا پھر آصف علی زرداری اس ملک کے تمام حکمران عوام کو دو فٹ کے شیشے کے پیچھے سے دیکھتے ہیں' یہ تمام لوگ 16 ڈگری سینٹی گریڈ میں بیٹھ کر 42 ڈگری سینٹی گریڈ میں پگھلتے لوگوں کیلئے پالیسیاں بناتے ہیں چنانچہ ان لوگوں کو عوام ناشکرے' احسان فراموش اور بے

صبرے محسوس ہوتے ہیں' یہ دوفٹ کا شیشہ ہے جو عوام کو کہتا ہے اگر تمہیں آٹا نہیں ملتا تو تم کیک کھا لو' تم پانی کی جگہ منرل واٹر کیوں نہیں پیتے اور تم گھروں میں جنریٹر کیوں نہیں لگا لیتے؟'' وہ رکا' اس نے سانس لیا اور روتی ہوئی آواز میں بولا ''اور جب تک حکمران 42 ڈگری سینٹی گریڈ میں بیٹھ کر پالیسیاں نہیں بنائیں گے' جب تک یہ لوگ دوفٹ شیشے کی یہ دیوار نہیں ہٹائیں گے اس وقت تک اس ملک کے مسئلے حل نہیں ہوں گے' اس وقت تک یہ ملک ترقی نہیں کرے گا'' وہ خاموش ہو گیا' میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بڑے پیار سے اسے مشورہ دیا ''تم ٹائی لگاؤ اور کوٹ پہن لو تمہارے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے'' اس نے نفرت سے میری طرف دیکھا' رخ پھیرا اور باہر دیکھنے لگا۔

⊘ ⊘ ⊘

دو لائف لائنیں بچی ہیں

آرتھر کا تعلق ہاورڈ یونیورسٹی کے ساتھ ہے' وہ اکیسویں صدی کی زوال پذیر معیشتوں پر ریسرچ کر رہا ہے' وہ چند دن قبل پاکستان آیا اور دو ہفتے کراچی' لاہور اور اسلام آباد گزار کر واپس امریکہ چلا گیا' اسلام آباد میں میرے ایک دوست نے اس کے ساتھ میری ملاقات کرائی' میں نے آرتھر سے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں پوچھا' اس کا جواب تھا ''پاکستان کے لوگ بہت شاندار ہیں لیکن ان کے حالات بہت برے ہیں'' میں نے پوچھا ''حالات سے تمہاری کیا مراد ہے'' وہ بولا ''حالات عمومی رائے کو کہتے ہیں' بدقسمتی سے پاکستان کی سرحدوں کے اندر اور باہر اس ملک کے بارے میں رائے منفی ہو گئی ہے اور میرے مطالعے کے مطابق یہ قوموں کے زوال کی نشانی ہے'' میں نے دکھی لہجے میں پوچھا ''کیا ہم زوال کے دہانے پر پہنچ چکے ہیں'' اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا اور بولا ''نہیں ابھی دو چانس باقی ہیں' ایک سیاستدان اور دوسرے عوام''۔ میں خاموشی سے سنتا رہا' وہ بولا ''میری ریسرچ کے مطابق قدرت کسی قوم کو تباہ کرنے سے قبل اس کے سیاستدانوں کو اپنے اختلافات ختم کرنے' مل بیٹھنے اور اخلاص کے ساتھ کوشش کا آخری موقع ضرور دیتی ہے' اگر سیاستدان یہ موقع ضائع کر دیں تو قدرت اس کے بعد عوام کے سرہانے ڈھول بجاتی ہے تاکہ عوام اٹھیں اور ملک کو بچانے کی کوشش کریں' اگر عوام بھی قدرت کو مایوس کر دیں تو پھر وہ ملک تباہ ہو جاتا ہے چنانچہ آپ لوگوں کے پاس ابھی دو لائف لائنیں موجود ہیں'' میں نے آرتھر سے پوچھا ''قدرت ایسا کیوں کرتی ہے'' اس نے تھوڑی دیر سوچا اور اس کے بعد بولا ''مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں لیکن میں نے دس ہزار سال کی تاریخ میں قدرت کو دنیا کی تمام قوموں کو یہ چانس دیتے دیکھا' آئی ڈونٹ نو' قدرت ایسا کیوں کرتی ہے؟ لیکن کرتی ضرور ہے؟''

آرتھر کے پاس اس ''کیوں'' کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن اسلام میں اس کا جواب موجود ہے اور میں اس جواب پر آنے سے پہلے آپ کو ایک چھوٹا سا واقعہ سناؤں گا۔ کسی شہر میں سیلاب آیا اور ایک صاحب سیلاب میں پھنس گئے' ریسکیو کا ایک ورکر کشتی لے کر ان کی مدد کیلئے پہنچا لیکن صاحب نے یہ کہہ کر کشتی میں سوار ہونے سے انکار کر دیا کہ میرا وارث اللہ ہے وہ میری مدد فرمائے گا' تم واپس چلے جاؤ۔

کشتی والے نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانے۔ دوسرے دن پانی ان کے سینے تک پہنچ گیا' ریسکیو کی ایک اور کشتی ان کی مدد کیلئے پہنچی لیکن انہوں نے اسے بھی واپس بھجوا دیا۔ تیسرے دن وہ گردن تک پانی میں ڈوب گئے' ریسکیو کا ایک ہیلی کاپٹر ان کی مدد کیلئے پہنچا' پائلٹ نے رسہ نیچے پھینکا اور ان سے کہا آپ رسہ پکڑ لیں' میں آپ کو اوپر کھینچ لوں گا لیکن ان صاحب نے جواب دیا ''میرا وارث اللہ ہے' وہ مجھے بچا لے گا' آپ اپنا پٹرول ضائع نہ کریں'' پائلٹ نے انہیں بہت سمجھایا لیکن وہ صاحب نہ مانے لہٰذا مجبوراً ہیلی کاپٹر واپس چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیلاب کا ایک اور ریلا آیا اور وہ صاحب پانی میں ڈوب گئے' وہ مرنے کے بعد اللہ کے پاس حاضر ہوئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا ''یا پروردگار میں تم پر ایمان رکھتا تھا' میں تمہیں ماننے والا تھا اور مجھے یقین تھا' تم مجھے بچا لو گے لہٰذا میں نے کوئی دنیاوی وسیلہ قبول نہیں کیا لیکن تم نے مجھے سیلاب کے حوالے کر دیا' تم نے میری مدد نہیں کی'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اے نادان شخص میں نے تمہارے پاس دو مرتبہ کشتی اور ایک بار ہیلی کاپٹر بھجوایا تھا لیکن تم نے ضد ترک نہ کی' میں اپنے بندوں کو بچانے کیلئے دنیا میں خود نہیں آیا کرتا' میں وسیلے بھجوایا کرتا ہوں' میں نے تمہارے پاس بھی وسیلے بھجوائے تھے لیکن تم نے میری بھجوائی مدد قبول نہ کی' اے نادان انسان تم سیلاب سے نہیں بے وقوفی' ضد اور ہٹ دھرمی سے مرے ہو'' میں اب آرتھر کے ''کیوں'' کی طرف آتا ہوں' اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھجوائی جانے والی کشتی اور ہیلی کاپٹر کو اردو اور شائد عربی میں اتمام حجت کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا کے تمام انسانوں کو ان کے جرائم اور ان کے گناہوں کی سزا دینے سے قبل انہیں سنبھلنے' معافی مانگنے' توبہ کرنے اور اپنی اصلاح کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے تاکہ وہ لوگ کل کو یہ شکوہ نہ کر سکیں کہ یا اللہ تم نے ہمیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا' اللہ تعالیٰ لوگوں کو ترقی کرنے کے موقع بھی دیتا ہے تاکہ وہ بھی کل کو یہ نہ کہہ سکیں کہ یا پروردگار تم نے ہمیں خوشحال ہونے' ترقی کرنے اور امیر بننے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ دنیا کے ہر انسان کو صحت' رزق' سکون' اطمینان' انصاف' علم' ٹیکنالوجی اور کام کرنے کا بھی پورا پورا موقع دیتا ہے تاکہ یہ لوگ بھی اللہ سے شکوہ نہ کر سکیں کہ تم نے ہمیں دنیا میں محروم رکھا تھا' ہم تیرے احکامات پر کیسے عمل کرتے۔ اللہ تعالیٰ پوری زندگی انسان کو راہ راست پر آنے' اللہ پر ایمان لانے اور نیکی کرنے کے چانس بھی دیتا ہے' جب انسان یہ سارے موقع ضائع کر دیتا ہے تو قدرت کی اتمام حجت ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اللہ انسانوں کا محاسبہ شروع کر دیتا ہے' پھر اللہ کی پکڑ شروع ہو جاتی ہے۔ یہ اصول انسانوں کے ساتھ ساتھ قوموں پر بھی اپلائی ہوتا ہے' دنیا میں کوئی ایسا خطہ نہیں' کوئی ایسا علاقہ' ملک اور معاشرہ نہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام نہ بھیجا ہو' تاکہ یہ اتمام حجت بھی ہو جائے اور قیامت کے دن یہ لوگ بھی یہ

یں کہ ہم تم پر کیسے ایمان لاتے' ہم تک تمہارا پیغام ہی نہیں پہنچا تھا۔ آپ اسی طرح پوری دنیا کا سامنے پھیلا کر دیکھ لیں' آپ کو اس وقت پورے کرۂ ارض پر کوئی اسلامی ملک غلام نہیں ملے گا' دنیا ج ڈیڑھ ارب مسلمان ہیں اور ان کے پاس دنیا کے دو تہائی وسائل ہیں' یہ بھی قدرت کا اتمام حجت کہ مسلمان قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم تو غلام تھے' ہم تعداد میں کم تھے اور ے پاس وسائل نہیں تھے چنانچہ ہم تمہارے احکامات پر کیسے عمل کرتے؟

آپ اتمام حجت کی اس تھیوری کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان کو دیکھئے' اللہ نے ہمیں ایک ک دیا تھا دنیا میں جس جیسے صرف دس ملک ہیں' اللہ نے ہمیں دنیا کی ساتویں بڑی آبادی دی' اللہ نے ہمیں سونے' چاندی' تیل' کوئلے اور تانبے کے ذخائر دیئے' اللہ نے ہمیں دنیا کی بہترین فوج للہ نے ہمیں ٹیلنٹ سے بھرپور لوگ دیئے' اللہ نے ہمیں پانی' زمین اور چاروں موسم دیئے' اللہ نے سمندر' دریا' صحرا' میدان' پہاڑ اور گلیشئر زدیئے اور سب سے بڑھ کر قدرت نے ہمیں نیوکلیئر پاور کیوں؟ تاکہ ہم کل اللہ تعالیٰ کو یہ نہ کہہ سکیں کہ یا پروردگار تم نے ہمیں کمزور' بے وسیلہ اور غریب بنایا ذا ہم اپنے معاملات کیسے درست کرتے؟ ہم تمہارے دشمنوں کا کیسے مقابلہ کرتے؟ ان کے پاس بم تھے اور ہم بے بس اور نہتے تھے چنانچہ قدرت نے ہمیں ایٹم بم دے کر یہ حجت بھی پوری کر دی اور ہمارے پاس صرف دو لائف لائنیں بچی ہیں' سیاستدان اور عوام۔ قدرت نے سیاست کی اتمام بھی کر دی ہے' اللہ نے فوج کو سیاست سے الگ کر دیا' پاکستان کی 60 برس کی تاریخ میں پہلی بار سیاستدانوں کے پیچھے کھڑی ہے' جنرل احمد شجاع پاشا نے پارلیمنٹ میں بریفنگ کے دوران اعلان ''سیاستدان جو فیصلہ کریں گے فوج اس پر عمل کرے گی'' قدرت نے سیاستدانوں کو بھی مل بیٹھنے کا پورا موقع دے دیا' پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار پارلیمنٹ کا اتنا بھرپور جوائنٹ سیشن ہوا اور عوام ھیاں اٹھا اٹھا کر اس سیشن کی طرف دیکھ رہے ہیں' قدرت نے سیاستدانوں کو ایک دوسرے کی رٹ کرنے کا چانس بھی دے دیا' سیاستدانوں کو ملک بچانے کیلئے اکٹھا ہونے کا موقع بھی دے دیا اللہ تعالیٰ نے عدلیہ کی آزادی کی اتمام حجت بھی کر دی ہے' گویا قدرت نے ہمیں سارے مواقع دے یے اور اگر اب بھی سیاستدان ملک بچانے کیلئے اکٹھے نہیں ہوتے تو ہماری ایک آخری لائف لائین بھی م ہو جائے گی اور اس کے بعد عوام کی لائف لائین بچے گی' اگر عوام نے بھی قدرت کو مایوس کر دیا تو پھر ملک کا اللہ ہی حافظ۔

ہم تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا دنیا میں انسان اور قوموں کا سب سے بڑا دشمن وہ

خود ہوتے ہیں' ایک انسان جتنا نقصان اپنے آپ کو پہنچا سکتا ہے اتنا نقصان اسے دنیا کا کوئی دوسرا انسان نہیں دے سکتا اور قومیں جتنا اپنے آپ کو برباد کر سکتی ہیں اتنا انہیں کوئی دوسرا ملک' کوئی دوسری قوم نہیں کر سکتی اور آج ہم مسائل کے جن ڈھیروں پر بیٹھے ہیں یہ سارے کے سارے ہم نے خود اکٹھے کئے تھے' ہم نے اب ان ڈھیروں کو صاف بھی خود کرنا ہے' ایک چینی کہاوت ہے ''مچھلی ہمیشہ اپنے سر سے گلنا شروع ہوتی ہے'' اور سیاستدان قوموں کا سر ہوتے ہیں چنانچہ معاشرے اپنے حکمرانوں' اپنے لیڈروں اور اپنے سیاستدانوں کے ہاتھوں گلنا شروع ہوتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے ملک بنانے کیلئے تو شائد بے شمار لیڈروں کی ضرورت ہوتی ہو لیکن اسے بچانے کیلئے صرف ایک لیڈر چاہئے ہوتا ہے اور ہم ایک ایسی بدقسمت قوم ہیں جس کے پاس حکمران تو بے شمار ہیں لیکن لیڈر کوئی نہیں' ہم ایسے بدقسمت لوگ ہیں جن کا سر گل چکا ہے لیکن ان کے دھڑ کو اس خرابی کا علم تک نہیں اور ہم ایسے بدنصیب لوگ ہیں حکمران جن کے سروں کے سودے کر رہے ہیں اور ہم خواب غفلت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

ریڈ سگنل

یہ 25 فروری کا دن تھا' سہ پہر کے پونے تین بجے تھے اور راولپنڈی کا مال روڈ تھا' پاک فوج
ے شعبہ طب کے سربراہ اپنے گن مین کے ساتھ دفتر سے نکلے' وہ چھٹی کے بعد گھر جا رہے تھے' ان کی گاڑی
ل روڈ پر نادرا سوئفٹ سنٹر کے قریب پہنچی تو سگنل بند ہو گیا' گاڑی سگنل پر رک گئی' سگنل کی روایات کے
طابق بے شمار بھکاریوں نے گاڑیوں کا گھیراؤ کر لیا' ان میں سے ایک بھکاری ان کی گاڑی کی طرف بڑھا'
ن کی گاڑی کے قریب آیا' اس نے دونوں ہاتھ بلند کئے' زوردار نعرہ لگایا اور خود کو دھماکے سے اڑا دیا' دھماکے
ے نتیجے میں پاک فوج کے سرجن جنرل موقع پر شہید ہو گئے جبکہ ان کے ساتھ 8 دیگر افراد بھی لقمہ اجل بن
گئے۔ 25 فروری کے اس خودکش حملے میں شہید ہونے والے اس جنرل کا نام میجر جنرل مشتاق بیگ تھا۔
جنرل مشتاق بیگ سرجن جنرل آف پاکستان تھے' وہ ماہر امراض چشم تھے' وہ اب تک 16 ہزار کے قریب
لوگوں کو بینائی کی نعمت لوٹا چکے تھے' وہ حافظ قرآن تھے' باریش تھے' صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور ذاتی زندگی
میں انتہائی سادہ' مہربان اور خلیق تھے' ان کے دوست انہیں فرشتہ سمجھتے اور کہتے تھے' وہ ہمیشہ مسکراتے رہتے
تھے اور کبھی کسی نے انہیں ناراض ہوتے یا کسی کو ڈانٹتے نہیں دیکھا تھا۔ دنیا میں بے شمار ڈاکٹروں کو مسیحا کہا اور
لکھا گیا لیکن مسیحائی کی اصل تعریف پر جنرل مشتاق بیگ جیسے لوگ ہی پورے اترتے ہیں۔ جنرل مشتاق
بیگ کی شہادت پر ایک ریٹائرڈ آرمی افسر نے بڑا خوبصورت تبصرہ کیا تھا' اس نے کہا تھا ہماری فوج میں جنرل
یحیٰی جیسے جرنیل زیادہ ہیں لیکن جنرل مشتاق جیسے کم۔ اس نے کہا تھا جنرل یحیٰی جیسے جرنیلوں نے
جہاں پاکستانی فوج کے امیج کو شدید نقصان پہنچایا وہاں جنرل مشتاق جیسے لوگ اس امیج کو ٹھیک کرنے کی سعی
کرتے رہتے تھے مگر افسوس اب فوج میں جنرل مشتاق بھی موجود نہیں' اب ہمارے امیج کو کون سہارا دے گا؟
میں نے جب جنرل مشتاق بیگ کے بارے میں یہ سارے حقائق پڑھے' میں نے ان کے
ذاتی دوستوں سے رابطہ کیا اور ان سے جنرل مشتاق کے بارے میں پوچھا اور جب مجھے معلوم ہوا وہ حقیقتاً
ایک فرشتہ صفت انسان تھے اور وہ دفتر میں کام کے ساتھ ساتھ آہستہ آواز میں تلاوت کرتے رہتے تھے تو
میں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا ''آخر اتنے شاندار انسان کا کیا قصور تھا' قدرت جنرل پرویز
مشرف کی غلطیوں کی سزا جنرل مشتاق بیگ جیسے لوگوں کو کیوں دے رہی ہے؟'' میرے دوست فکری اور

روحانی طور پر ایک مضبوط شخص ہیں اوران کی رائے میں ہمیشہ وزن ہوتا ہے۔انہوں نے ذرا سا سوچ کر جواب دیا ”جنرل مشتاق بیگ کی شہادت بنیادی طور پر قدرت کی ناراضی کا اظہار ہے‘ یہ قدرت کا ریڈ سگنل ہے“ میں نے حیران ہو کر پوچھا ”یہ قدرت کا ریڈ سگنل کیا ہوتا ہے“ میرے دوست بولے ”مجھے اس کی وضاحت کیلئے تاریخ میں جانا پڑے گا‘ تم فرعون کی مثال لے لو‘ رامیسیس دوم وہ فرعون تھا جس نے حضرت موسیٰؑ کی موجودگی میں خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور بعدازاں حضرت موسیٰؑ کا پیچھا کرتے ہوئے دریائے نیل میں ڈوب مرا تھا‘ یہ فرعون بڑا زیرک‘ سمجھدار‘ وژنری اور مضبوط تھا‘ اس کی اصلاحات نے مصری سلطنت کا نقشہ بدل دیا تھا‘ تاریخ آج تک اس فرعون کی عقل مندی اور وژن کی تعریف کرتی ہے۔ہم جب قدیم تاریخ اور آسمانی صحائف کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے اس فرعون کی عقل مندی اس کے مشیروں میں پوشیدہ تھی‘ اس نے دنیا بھر سے چن چن کر ذہین اور بردبار لوگ اپنے گرد جمع کر رکھے تھے لیکن پھر یہ فرعون تکبر کا شکار ہوا اور اس تکبر کی وجہ سے قدرت اس سے ناراض ہوگئی اور اس نے ایک ایک کر کے اس کے مشیر واپس بلانا شروع کر دیئے‘ یہاں تک کہ جب حضرت موسیٰؑ کے ساتھ فرعون کا مقابلہ شروع ہوا تو فرعون کے تمام مشیر ختم ہو چکے تھے اور ان کی جگہ موقع پرست‘ حریص اور کم فہم لوگ لے چکے تھے‘ اسکا نتیجہ یہ نکلا جب فرعون تکبر کے عالم میں بنی اسرائیل کے پیچھے بھاگا تو اسے روکنے‘ سمجھانے اور ٹھنڈا کرنے والا کوئی شخص نہیں تھا اور یوں فرعون نیل میں ڈوب کر مر گیا“ میں خاموشی سے سنتا رہا‘ میرے دوست بولے ”قدرت کا نظام بڑا دلچسپ ہے‘ وہ جب کسی سے خوش ہوتی ہے تو اسکے اردگرد اچھے‘ نیک اور سمجھدار لوگوں کی تعداد بڑھا دیتی ہے اور جب وہ کسی سے خفا ہوتی ہے تو وہ نیک‘ سمجھدار اور ذہین لوگوں کو اس سے دور ہٹانے لگتی ہے اور یوں وہ شخص برے اور کم فہم لوگوں میں گھیرتا چلا جاتا ہے اور یہ کم فہم لوگ اسے فرعون کے انجام سے دوچار کر دیتے ہیں“ میں خاموشی سے سنتا رہا۔

میرے وہ دوست بولے ”قدرت کا یہ اصول صرف بادشاہوں تک محدود نہیں بلکہ ادارے اور ملک بھی اس اصول کے تحت چل رہے ہیں‘ اللہ تعالیٰ جن اداروں اور ملکوں کو پسند کرتا ہے وہ ان میں اچھے لوگوں کی تعداد بڑھا دیتا ہے لیکن وہ جن ملکوں اور اداروں سے ناراض ہوتا ہے وہ ان سے جنرل مشتاق بیگ جیسے لوگوں کو واپس بلانا شروع کر دیتا ہے“ وہ رکے اور رک کر بولے ”تم امریکہ کو دیکھ لو اس وقت دنیا میں چیریٹی کے سب سے زیادہ ادارے امریکہ میں ہیں‘ امریکی ادارے ہر سال 350 بلین ڈالر کی چیریٹی کرتے ہیں‘ دنیا کی سب سے بڑی چیریٹی آرگنائزیشن امریکہ میں ہے اور دنیا کے سب سے بڑے مخیر بزنس مین بل گیٹس اور وارن بفٹ بھی امریکی ہیں‘ دنیا میں سب سے زیادہ سائنسدان‘ پروفیسرز اور ذہین لوگ بھی امریکہ میں ہیں‘ دنیا کی تیس بڑی یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے بھی امریکہ میں

اور دنیا کی دو ہزار پانچ سو ملٹی نیشنل کمپنیوں کا تعلق بھی امریکہ سے ہے۔ یہ حقائق کیا ثابت کرتے ؟ یہ ثابت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے لہٰذا دنیا کے ذہین ترین‘ ہمدرد ترین اور مہربان ترین امریکہ میں جمع ہیں اور یہ لوگ امریکہ کی ترقی اور استحکام کیلئے کام کر رہے ہیں جبکہ اس کے مقابلے تم افریقہ کو دیکھو‘ اسلامی دنیا کو دیکھو اور ہمارے جیسے ملکوں کو دیکھو‘ ہم لوگ ٹیلنٹ‘ ایمانداری اور ت میں امریکہ کے بالکل برعکس ہیں اور یہ چیز ثابت کرتی ہے قدرت ہمیں ریڈ سگنل دے رہی ہے۔ رت جب بھی کسی ملک کو ریڈ سگنل دیتی ہے تو وہ اس سے اچھے‘ معصوم اور صاف ستھرے لوگوں کو اٹھانا وع کر دیتی ہے اور یوں وہ ادارہ‘ معاشرہ اور ملک ”اچھائی کے بحران“ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کا تباہی کی شکل میں نکلتا ہے“ میرے وہ دوست رکے اور ذرا سا ٹھہر کر بولے ”پاکستان میں چار برس خودکش حملے ہو رہے ہیں‘ تم ان خودکش حملوں میں مرنے والوں کے پروفائل نکال کر دیکھ لو؟ تمہیں حملوں میں کوئی برا‘ خطرناک اور بددیانت شخص مرتا ہوا نظر نہیں آئے گا‘ ان حملوں میں ہمیشہ نیک‘ متدار‘ بے گناہ اور معصوم لوگ مارے گئے‘ ان میں جنرل مشتاق بیگ جیسے لوگ کام آئے یا پھر محترمہ نظیر بھٹو جیسی بین الاقوامی لیڈر! یہ کون لوگ تھے‘ یہ وہ لوگ تھے جو ملک کو فائدہ پہنچا سکتے تھے‘ جنرل تاق بیگ پاکستانی فوج کا اچھا امیج تھے جبکہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے چاروں صوبوں کو آپس میں جوڑ رکھا وہ پورے ملک کی لیڈر تھیں اور اگر وہ زندہ رہتیں تو شائد آج سیاسی بحران اتنی شدت اختیار نہ کرتا لیکن درت نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟ اس نے محترمہ کو اٹھا لیا اور ہم سیاست کے ایک خوفناک بحران پر ے ہو گئے‘ میاں نواز شریف‘ آصف علی زرداری اور اسفند یار ولی اس بحران کو ٹالنے کی کوشش کر ہے ہیں لیکن مجھے خطرہ ہے یہ لوگ زیادہ دیر تک بند نہیں باندھ سکیں گے“ وہ خاموش ہو گئے۔

میں نے ان سے پوچھا ”قدرت ہمیں کیا پیغام دینا چاہتی ہے!“ وہ فوراً بولے ”قدرت ں یہ بتانا چاہتی ہے اگر تم لوگ ٹھیک نہ ہوئے‘ اگر تم لوگوں نے اپنی غلطیوں کی تلافی نہ کی اور تم نے ناہوں کی معافی نہ مانگی تو میں تمہارے معاشرے کے تمام اچھے لوگ واپس لے لوں گی‘ قدرت اس قسم کے واقعات سے ہماری فوج کو بھی یہ بتانا چاہتی ہے اگر تم نے اپنی پالیسیاں ”ری ڈیزائن“ نہ کیں تو تم ں جنرل مشتاق بیگ جیسا کوئی شخص نہیں بچے گا“ میں خاموشی سے سنتا رہا‘ میرے دوست بولے قدرت کسی ملک‘ کسی معاشرے کو تباہ کرنے سے پہلے اسی قسم کے ریڈ سگنل دکھاتی ہے اگر معاشرے اور ک اس ریڈ سگنل پر رک جائیں‘ اگر وہ معافی مانگ لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو قدرت اسے ایک ر موقع فراہم کر دیتی ہے لیکن اگر ملک اور معاشرے اس ریڈ سگنل کو سنجیدہ نہ لیں تو پھر قدرت حکمرانوں کو رعون اور ملکوں کو فرعونوں کا مصر بنا دیتی ہے‘ وہ معاشروں کو مٹی کا ڈھیر بنا دیتی ہے“۔

ری سٹرکچرنگ

محمد اظہار الحق ملک کے نامور بیوروکریٹ' شاعر' ادیب اور کالم نگار ہیں' وہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور اب بڑی حد تک شریفانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے برسوں پہلے کسی فیڈرل سیکرٹری کا سچا واقعہ سنایا تھا' ملک میں مارشل لاء لگا تھا اور ایک وزارت ''مال غنیمت'' میں کسی حاضر سروس جرنیل کو مل گئی تھی' جنرل صاحب نے سیکرٹری کو کوئی کام کہا' سیکرٹری نے اس کے جواب میں چھ صفحوں کی سمری بھجوا دی' جنرل صاحب سیکرٹری کی انگریزی سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے سیکرٹری کو بلا کر کہا ''جناب آپ نے سمری کی شکل میں ایک اعلیٰ ادبی شہ پارہ تخلیق کیا ہے لیکن مجھے اس کی سمجھ بالکل نہیں آئی' میں نے اسے تین بار پڑھا مگر مجھے ہرگز پتہ نہیں چلا آپ اس میں کہنا کیا چاہتے ہیں' آپ کی سمری بیک وقت ہاں بھی ہے اور ناں بھی' آخر آپ اس میں کہنا کیا چاہتے ہیں'' سیکرٹری یہ سن کر مسکرایا اور عاجزی سے بولا ''جناب میں اسی بات کی تنخواہ لیتا ہوں' مجھے میری سروس نے چالیس سال میں یہی سکھایا ہے کہ انگریزی شاندار لکھو لیکن مفہوم گول کر دو' تمہاری بات کی سمجھ کسی کو نہیں آنی چاہئے''۔ میں اکثر سوچتا ہوں ہمارا بیوروکریٹ سسٹم کامیڈی ہے یا ٹریجڈی! میں نے بارہا سنیئر بیوروکریٹس سے معلوم کرنے کی کوشش کی مگر مجھے آج تک کوئی اس کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا۔ ہمارے ملک میں جب ایک درخواست سیکرٹری تک پہنچتے پہنچتے دس کلوگرام کی فائل بن جاتی ہے اور فائل کے ہر صفحے پر خوبصورت انگریزی میں لمبے چوڑے ریمارکس لکھے جاتے ہیں لیکن یہ فائل آخری دربار تک پہنچ کر بھی منظوری سے محروم رہتی ہے تو اس وقت یہ نظام کامیڈی لگتا ہے لیکن جب اس تاخیر کے نتائج پر غور کرتے ہیں تو یہ ملک دنیا میں مینجمنٹ کی ناکامی کی سب سے بڑی مثال دکھائی دیتا ہے اور اس ٹریجڈی پر آنسو نکل آتے ہیں۔ میرے ایک دوست سیکرٹری ہیں' میں نے کبھی انہیں کام کرتے نہیں دیکھا' مجھے ان کی میز پر کبھی کوئی فائل بھی دکھائی نہیں دی۔ میں نے ان سے ایک بار اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے مسکرا کر جواب دیا' میں اپنے پاس آنے والی ہر فائل کو فنانس ڈیپارٹمنٹ بھجوا دیتا ہوں' فنانس کے لوگ فائل کی نوعیت دیکھے بغیر اس پر کارروائی شروع کر دیتے ہیں اور چھ ماہ بعد انہیں معلوم ہوتا ہے یہ فائل ان سے

علق نہیں اور غلطی سے انہیں بھجوا دی گئی تھی۔ میں نے پوچھا ''اور چھ ماہ بعد جب وہ دوبارہ آپ کے س آتی ہے تو آپ کیا کرتے ہیں'' وہ ہنس کر بولے ''میں اسے لاء منسٹری بھجوا دیتا ہوں اور وہاں سے وہ بھی واپس نہیں آتی''۔

ہم اپنے دفتری نظام کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس میں چند بڑے فارمولے دکھائی دیں گے شلاً ملک میں جب بھی کوئی حکومت آتی ہے تو ہمارے بیوروکریٹس حکومت کو ''ری سٹرکچرنگ'' کا مشورہ یتے ہیں' حکومت اس مشورے کے پھندے میں آ جاتی ہے جس کے بعد پرانی وزارتوں کو چھوٹے ھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کیا جاتا ہے' مختلف ڈیپارٹمنٹس کے اندر موجود محکموں کے نام بدلے جاتے ہیں' یک محکمے کو دوسرے محکمے میں ضم کر دیا جاتا ہے' وزارت کو ڈویژن' ڈویژن کو کارپوریشن' کارپوریشن کو تھارٹی اور اتھارٹی کو بورڈ کی شکل دے دی جاتی ہے' اکھاڑ پچھاڑ کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہوتا ہے کہ حکومت تم ہو جاتی ہے' نئی حکومت آتی ہے تو بیوروکریٹس اس حکومت کو بھی ''ری سٹرکچرنگ'' کا مشورہ دے دیتے یں چنانچہ نئی حکومت پہیے کو الٹا گھمانا شروع کر دیتی ہے' بورڈ اتھارٹی بنتے ہیں' اتھارٹی کارپوریشن' ارپوریشن ڈویژن اور ڈویژن دوبارہ وزارت بن جاتی ہے اور اکثر اوقات پانچ چھ وزارتیں ایک وسرے میں ضم ہو کر ایک نئی وزارت بھی بن جاتی ہے اور یہ کھیل پچھلے ساٹھ برس سے جاری ہے چنانچہ م سفر تو بے تحاشا کر رہے ہیں لیکن منزل سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ اس اکھاڑ پچھاڑ کا تازہ رین واقعہ دیکھ لیجئے' 1981ء تک سیلز ٹیکس انکم ٹیکس کے محکمے کے پاس تھا' سیلز ٹیکس کی کارکردگی ٹھیک نہیں ی' حکومت نے ریسرچ کرائی تو پتہ چلا ملائشیا اور بھارت میں بھی یہی صورتحال تھی چنانچہ انہوں نے یلز ٹیکس کے محکمے کو کسٹم کے ساتھ منسلک کر دیا جس کے نتیجے میں وہاں حالات بہتر ہو گئے لہٰذا حکومت نے ''ری سٹرکچرنگ'' کی اور سیلز ٹیکس کا محکمہ کسٹم ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کر دیا' یہ تجربہ کامیاب ہو گیا چنانچہ کومت کو کھربوں روپے کا فائدہ ہوا لیکن اب 2009ء میں اچانک شوکت ترین صاحب نے ایک بار ری سٹرکچرنگ کا فیصلہ کیا اور انہوں نے فیڈرل بیورو آف ریونیو کو سیلز ٹیکس کا محکمہ دوبارہ انکم ٹیکس کے والے کرنے کا حکم دے دیا۔ اس حکم کے بعد اب ایک نیا ڈیپارٹمنٹ بنایا جائے گا جس کا نام آئی آر یس یعنی انٹرل ریونیو سروس ہو گا اور سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس دونوں محکمے اس سروس کے تحت کام کریں گے۔ ''خفیہ'' معلومات کے مطابق اس حکم کی وجہ آئی ایم ایف بنا۔ شوکت ترین صاحب کا خیال ہے آسٹریلیا ر نیوزی لینڈ میں سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس کے محکمے اکٹھا کام کرتے ہیں لہٰذا ہمیں اس معاملے میں آسٹریلین ڈل کو فالو کرنا چاہئے لیکن یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کیا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ دنیا میں ترقی کرنے

والی معیشتوں میں شمار ہوتے ہیں؟ اس کا جواب ''ناں'' ہے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ معاشی طور پر قناعت پسند ملک ہیں' آپ کو دنیا کی کسی مارکیٹ میں میڈ ان آسٹریلیا یا میڈ ان نیوزی لینڈ دکھائی نہیں دیتا جبکہ اس کے مقابلے میں بھارت اور ملائشیا ''گروئنگ اکانومیز'' ہیں' یہ دونوں ممالک نئی منڈیوں اور مارکیٹوں کی طرف بڑھ رہے ہیں چنانچہ سوال یہ ہے ہمیں ترقی کرنے والے ممالک کی تقلید کرنی چاہیے یا پھر معاشی طور پر منجمد ممالک کی پیروی؟ یہ وہ سوال ہے جس کے جواب میں سارے جواب چھپے ہیں۔

ہماری ری سٹرکچرنگ صرف سیلز ٹیکس تک محدود نہیں بلکہ حکومت نے وزارتوں' ڈویژنوں اور اتھارٹیز کے بجٹ روک دیئے ہیں جس کے نتیجے میں تمام سرکاری محکموں کے کام رک چکے ہیں اور سرکاری ملازمین سارا سارا دن دفتروں میں کھیاں مارتے رہتے ہیں' پاکستان کی کسی وزارت میں اس وقت کوئی کام نہیں ہو رہا' صدر پرویز مشرف کے دور میں حکومت نے ہائر ایجوکیشن کمیشن بنایا تھا' یہ ایک اچھا تجربہ تھا اس سے ملک میں اعلیٰ تعلیم کا گراف بلند ہو رہا تھا' ہمارے سینکڑوں طالب علم دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور دنیا کی مشہور یونیورسٹیاں پاکستان میں کیمپس کھول رہی تھیں لیکن حکومت نے اس کمیشن کے فنڈز روک دیئے چنانچہ گزشتہ روز کمیشن نے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا اور تمام یونیورسٹیوں کو لکھ کر بھیج دیا وہ اپنے پراجیکٹس چلانے کیلئے مخیر حضرات سے رابطہ کریں اور صدقے اور خیرات کا بندوبست کریں۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے فنڈز رکنے سے ہمارے سینکڑوں بلکہ ہزاروں طالب علموں کی پی ایچ ڈی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ این سی ایچ ڈی (نیشنل کمیشن فار ہیومین ڈویلپمنٹ) بھی پرویز مشرف کے دور میں بنا تھا' اس ادارے میں ایک لاکھ کے قریب لوگ ملازم تھے اور یہ ادارہ تحصیل سطح پر فلاح و بہبود کے کام کر رہا تھا' یہ ادارہ بھی ''ری سٹرکچرنگ'' کی نظر ہو گیا' اس کے منصوبے بند ہو گئے' ساٹھ' ستر ہزار لوگ بے روزگار ہوئے اور آج اس ادارے کے سینٹرز میں لوگوں نے گدھے اور بھینسیں باندھ رکھی ہیں۔ پرویز مشرف کے دور میں اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی کا سلسلہ شروع ہوا تھا' حکومت نے اس کام کیلئے نیشنل ری کنسٹرکشن بیورو کے نام سے ایک ادارہ بنایا تھا' اس ادارے نے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کا انسٹیٹیوٹ توڑا' ناظمین آئے اور حکومتی اختیارات اور فنڈز ناظمین کو منتقل ہو گئے لیکن موجودہ حکومت نے اس کی دوبارہ ری سٹرکچرنگ شروع کر دی' پنجاب حکومت کی مہربانی سے کمشنر حضرات واپس آ گئے ہیں اور ناظمین عضو معطل ہو کر رہ گئے' آج یہ ناظمین پنجاب میں جلوس نکال رہے ہیں۔ اسی قسم کی صورتحال پولیس ریفارمز کے ساتھ پیش آ رہی ہے۔ صدر مشرف کے دور میں پولیس ایکٹ 2002ء آیا جس کے ذریعے جیسے تیسے پولیس کا ایک نیا سسٹم سامنے آیا لیکن آج

وہ نظام بھی ''ریورس'' ہو رہا ہے۔

میں قطعاً یہ نہیں کہتا پرویز مشرف کے یہ تمام اقدامات نیک نیتی پر مبنی تھے اور ان کو نیوٹن کے چوتھے قانون کا درجہ دے دینا چاہیے' اس میں کوئی شک نہیں جنرل (ر) پرویز مشرف نے خود کو نظام کا ''اٹوٹ انگ'' بنانے کیلئے یہ تمام اصلاحات کی تھیں لیکن نانی کا خصم سے طلاق لے لینا بھی کوئی مستحسن اقدام نہیں ہو گا۔ حکومت کو چاہیے وہ ان نظاموں کو تبدیل کرنے کی بجائے انہیں بہتر بنائے' ان میں میرٹ' صلاحیت اور احتساب لائے' انہیں پوری طرح مانیٹر کرے اور وہ تمام کمزوریاں جو پرویز مشرف نے ان میں چھوڑ دی تھیں انہیں درست کرے کیونکہ ہم لوگ ہر بار پرانی عمارتیں گرا کر ان کی جگہ نئی تعمیر کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ حکومتوں کو اب ایشوز کے سوئے ہوئے شیروں کی دموں پر چوہے نچانے کا سلسلہ بند کر دینا چاہیے کیونکہ قومیں پرانی گاڑیوں کو ری سٹرکچرنگ کا نیا رنگ دینے سے منزلوں تک نہیں پہنچا کرتیں' آگے بڑھنے سے منزلوں تک آتی ہیں' ہم لوگوں نے ڈرائیوروں کی سیٹوں پر چھوٹے سروں والے بندر بٹھا رکھے ہیں مگر ہم ہر ایک آدھ سال بعد گاڑی کا رنگ بدل دیتے ہیں اور اس کے بعد شکوہ کرتے ہیں منزل کیوں نہیں آ رہی۔ ہم جب تک چھوٹے سروں والے بندر نہیں بدلیں گے اس وقت تک گاڑی آگے نہیں بڑھے گی۔

⊘ ⊘ ⊘

ٹریکل ڈاؤن

پنڈی بھٹیاں کا سکندر بھیک مانگنے کا ''کاروبار'' کرتا تھا' وہ پیدائشی معذور تھا' وہ ریڑھی پر لیٹ جاتا تھا' اپنے ہاتھوں سے ریڑھی گھسیٹتا تھا اور صدا لگاتا جاتا تھا اور شام تک اپنے اہل خانہ کیلئے نان نفقہ جمع کر لیتا تھا' یہ سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا یہاں تک کہ 2007ء کا اکتوبر آ گیا اور حکومت ختم ہونے سے پہلے وزیراعظم شوکت عزیز کی معاشی اصلاحات ٹریکل ڈاؤن ہوتے ہوتے سکندر تک پہنچ گئیں اور اس نے اپنے لئے ملازم رکھ لیا' یہ ملازم صبح سے شام تک سکندر فقیر کی ریڑھی کھینچتا ہے اور سکندر اس خدمت کے عوض اسے اپنی کمائی سے سو روپے دے دیتا ہے' اس نئے ''معاشی ارینجمنٹ'' کے بعد سکندر اور اس کا ملازم دونوں خوش ہیں' سکندر اب اپنے کاروبار کو آگے بڑھانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے' اس کا خیال ہے اگر اسے دس بیس معذور مل جائیں تو وہ ان سب کو ریڑھیوں میں بٹھائے گا' ان ریڑھیوں کو گھسیٹنے کیلئے اتنے ہی نوجوان بھرتی کرے گا اور یوں اس کی پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی تیس چالیس لوگوں کے باعزت روزگار کا ذریعہ بن جائے گی' سکندر آج کل اس منصوبے پر ''ورکنگ'' کر رہا ہے مجھے یقین ہے اگر وہ اس منصوبے پر اسی محنت اور جانفشانی سے کام کرتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب اس کی کمپنی ملک کے معاشی افق پر جلوہ گر ہو جائے گی اور وہ پاکستان کی معیشت میں بڑا اہم کردار ادا کرے گا۔

پنڈی بھٹیاں کا سکندر اور اس کا ملازم ہمارے سابق وزیراعظم جناب شوکت عزیز کی معاشی اصلاحات کی شاندار مثال ہیں' شوکت عزیز آٹھ برس تک اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک رہے ہیں' ان آٹھ برسوں میں جب بھی ملک میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری' مہنگائی اور کساد بازاری کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی جاتی تھی تو وہ فرماتے تھے' ہم جب اقتدار میں آئے تھے تو پاکستان ڈیفالٹ کے قریب تھا لیکن آج پاکستان کے تمام بازاروں' منڈیوں اور کارخانوں میں رونق لگی ہے' ہماری یہ معاشی سرگرمیاں بہت جلد ''ٹریکل ڈاؤن'' ہوں گی اور ان کے ثمرات عام آدمی تک پہنچیں گے' جناب شوکت عزیز وعدے کے پکے نکلے چنانچہ انہوں نے حکومت کے خاتمے سے پہلے اکانومی ٹریکل ڈاؤن کر دی۔ ان کی معیشت کے ثمرات پنڈی بھٹیاں تک پہنچے اور سکندر نے بھیک مانگنے کیلئے سو روپے

انہ پر ایک ''ہیلپر'' رکھ لیا چنانچہ آج سکندر اور اس کا ہیلپر دونوں خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں لیکن مت کی اس کامیابی کے باوجود ابھی جناب شوکت عزیز کا خواب مکمل نہیں ہوا ہے' شوکت عزیز کا اب اس وقت پورا ہوگا جب سکندر بھکاریوں کی نیشنل اور ملٹی نیشنل کمپنی بنا لے گا چنانچہ ہمارے سابق یراعظم کی خواہش ہے جلد سے جلد الیکشن ہوں' نئی اسمبلیاں بنیں اور وہ ایک بار پھر ٹریکل ڈاؤن کے وبار میں مصروف ہو جائیں۔ میرا خیال ہے اگر محترم شوکت عزیز کی یہ خواہش پوری ہو گئی' وہ دوبارہ دار میں آ گئے تو یہ پاکستان کو سکندر جیسے وژنری' محنتی اور کامیاب بزنس مینوں کی پوری کھیپ دے کر یں گے' اگر خدانخواستہ الیکشن نہ ہوئے تو بھی کوئی مسئلہ نہیں' اگلے چند دنوں میں صدارت کی کرسی خالی نے والی ہے اور ہمارے محترم سابق وزیراعظم کونڈولیزا رائس اور جان نیگرو پونٹے کی مدد سے پاکستان طاقتور ترین صدر بن سکتے ہیں جس کے بعد پاکستان امریکہ کیلئے ایک شاندار ملک ہوگا' صدر جناب کت عزیز ہوں گے اور محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم اور یہ دونوں اعتدال پسند اور روشن خیال لیڈر مل کر کستان کی تعمیر و ترقی کو ٹریکل ڈاؤن کریں گے جس کے بعد پاکستان صحیح معنوں میں ایک روشن خیال اور ن ملک بن جائے گا' ذرا تصور کیجئے اس دور میں پاکستان ایک غیر ایٹمی ملک ہوگا' ہمارے ایٹمی ئنس دان ''علاج'' کیلئے امریکہ کے ہسپتالوں میں داخل ہونگے' ملک میں فوج سے پولیس کا کام لیا ہا ہوگا' مدرسے بند ہو چکے ہوں گے' صوبہ سرحد کا پچاس فیصد رقبہ بمباری کے ذریعے پلاٹ بن چکا اور وہاں ترقیاتی اور معاشی سرگرمیاں زور و شور سے جاری ہوں گی' مذہب اجتماعی کی بجائے انفرادی سئلہ بن چکا ہوگا' لوگوں کو مسجدوں کی بجائے گھروں میں نماز ادا کرنے کی تلقین کی جا رہی ہوگی' تمام شہری ھروں' گاڑیوں' پلازمہ ٹی وی اور کنگ سائز فریجوں کے نام پر بینکوں کے مقروض ہوں گے' عوام ہر صبح اپنی ریڑھی لے کر پنڈی بھٹیاں کی گلیوں میں ''مولا کے نام پر دے دو'' کی صدائیں لگا رہے ہوں بھارت اور پاکستان کی سرحدیں کھل چکی ہوں گی اور پنجاب کی 95 فیصد آبادی چنڈی گڑھ کے پیاز لدھیانے کے آلو کھا رہی ہوگی اور پورا ملک بسنت منا رہا ہوگا اور بھارتی فلمیں دیکھ رہا ہوگا' ذرا تصور وہ کتنا خوبصورت وقت ہوگا جب پورے ملک میں شوکت عزیز اکانومی ''ٹریکل ڈاؤن'' ہو چکی ہوگی' سب کی جیب میں دس دس کریڈٹ کارڈز ہوں گے اور ہاتھوں میں بیس بیس بینکوں کے نوٹس اور ہم خود ں کیلئے کوئی مناسب مقام تلاش کر رہے ہوں گے۔

جناب شوکت عزیز ذہانت اور وجاہت کا ایک عظیم معجزہ ہیں' اللہ تعالیٰ نے انہیں ہندسوں کو گے پیچھے کرنے کی عظیم صلاحیت سے نوازا تھا لہٰذا جناب شوکت عزیز کے دور میں پاکستان میں امراء کی

ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی جس نے سرمایہ کاری کے بغیر اربوں روپے کمائے' یہ ارب پتی دنیا کے انتہائی دلچسپ لوگ تھے' ان لوگوں کے گھر اور بچے دوبئی' لندن اور نیویارک میں تھے' یہ لوگ سعودی عرب' متحدہ عرب امارات اور یورپ کے فرضی تاجروں کو اپنے ساتھ ملاتے تھے' کمپنی رجسٹرڈ کراتے تھے' پاکستان میں کرائے پر دفتر لیتے تھے' کرائے کا سٹاف رکھتے تھے' تمام اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز پر بڑے بڑے اشتہارات دیتے تھے اور کروڑوں اربوں روپے سمیٹ کر واپس چلے جاتے تھے' یہ ارب پتی پاکستانی بینکوں سے اربوں روپے قرض بھی لیتے تھے' نج کاری کے نام پر پاکستان کے "ڈیڈ منصوبے" بھی خریدتے تھے اور اس ہیر پھیر میں اربوں روپے کما کر واپس چلے جاتے تھے' آپ پاکستان کے تمام تازہ ترین ارب پتیوں کے پروفائل نکال کر دیکھ لیں آپ کو ان ارب پتیوں کا کوئی بچہ اس وقت پاکستان میں نہیں ملے گا' یہ سب لوگ اور ان کے خاندان دوبئی اور یورپ میں مزے لوٹ رہے ہیں اور پاکستان میں ان کے صرف دفتر ہیں اور وہ بھی کرائے کے' ہمارے محبوب وزیراعظم اپنی وزارت عظمیٰ کے آخری دور میں وزیراعظم سیکرٹریٹ کے لانوں میں مختلف ترقیاتی منصوبوں کا افتتاح بھی کرتے تھے' گیس بھارہ کہو میں لگتی تھی لیکن اس کی تختی کی نقاب کشائی وزیراعظم سیکرٹریٹ میں ہوتی تھی اور پل جھنگ میں بنتا تھا لیکن اس کا سنگ بنیاد وزیراعظم ہاؤس میں رکھا جاتا تھا' آپ اس وقت وزیراعظم ہاؤس یا وزیراعظم سیکرٹریٹ میں جا کر دیکھ لیں آپ کو اس کے لان تختیوں کے قبرستان نظر آئیں گے' افسوس ہمارے وزیراعظم اپنی معاشی اصلاحات کی یہ نشانیاں پیچھے چھوڑ کر چلے گئے' کاش وہ انہیں بھی ساتھ لے جاتے تا کہ کل کلاں وہ تختیوں کو بطور سند پیش کر سکتے۔

ہمارے محبوب وزیراعظم کا پس منظر بنکاری تھا' وہ پوری زندگی بینکوں میں کام کرتے رہے چنانچہ انہوں نے اس ملک کو وہی کچھ ٹریکل ڈاؤن کیا جو ایک بینکار کر سکتا تھا' ایک بینکار اور معیشت دان میں بڑا فرق ہوتا ہے' بینکار اکاؤنٹ پر توجہ دیتا ہے جبکہ معیشت دان معیشت پر' ایک سچا معیشت دان جانتا ہے دنیا میں لاء اینڈ آرڈر اور انصاف معیشت کی بنیاد ہوتا ہے اور جس ملک میں عدالتی نظام مضبوط نہ ہو اور جس میں لاء اینڈ آرڈر نہ ہو اس ملک میں سونے کے پہاڑ بھی لوگوں کو خوشحالی نہیں دے سکتے' سچے معیشت دان جانتے ہیں اگر ملک میں امن ہو تو لوگ پیاز کے ساتھ سوکھی روٹی کھا کر بھی خوش رہ سکتے ہیں' وہ جانتے ہیں جس ملک میں حکومت باضمیر اور ایماندار ججوں کے دروازے پر پولیس بٹھا دے اس ملک میں ترقی اور خوشحالی نہیں آ سکتی جبکہ اس کے مقابلے میں بینکار کو اپنے منافع سے غرض ہوتی ہے' وہ منافع سمیٹتا ہے اور چلا جاتا ہے' ہمارے محبوب وزیراعظم دنیا کے پہلے لیڈر تھے جنہوں نے ملک کا لاء اینڈ

ڈر برباد کر دیا' جنہوں نے ڈاکے اور اغواء کو باقاعدہ روزگار کی شکل دے دی' جو یہ بھول گئے معیشت ے جس درخت کو لاء اینڈ آرڈر کی کھاد نہ ملے اس کی شاخوں پر پھل نہیں لگتے لہٰذا آج پاکستان میں یشت کے درختوں کے سارے پتے جھڑ چکے ہیں' ساری شاخیں ٹنڈ منڈ ہو چکی ہیں اور اس درخت پر ے تک گھونسلے بنانے کیلئے تیار نہیں ہیں' ہمارے محبوب وزیراعظم بھول گئے تھے جس معیشت کی ادوں میں انصاف کا سیمنٹ اور امن وامان کی اینٹیں نہیں ہوتیں وہ معیشت ہواؤں کی گدگدی اور یوں کا بوجھ تک برداشت نہیں کرتی' وہ معیشت سکندر جیسے فقیروں کو ریڑھیاں کھینچنے کیلئے ہیلپر تو دے ی ہے لیکن وہ ساڑھے سولہ کروڑ انسانوں کو عزت نفس اور سکون فراہم نہیں کر سکتی' وہ بھول گئے قوم کے ے لیڈروں اور کھرے محسنوں کو ریٹائرمنٹ کے بعد بلٹ پروف گاڑیوں اور سیکورٹی کی ضرورت نہیں ں' لوگوں کی دعائیں ان لیڈروں کی ڈھال اور عوام کی محبت ان کا قلعہ ہوتی ہیں لہٰذا آج ہمارے بق وزیراعظم محترم شوکت عزیز کا فلسفہ تو عوام تک ٹریکل ڈاؤن ہو گیا لیکن عوام کی محبت ہمارے محبوب یراعظم تک ٹریکل اپ نہ ہو سکی' وہ آج وزارتی کالونی میں بیٹھ کر آنے والے کل کی منصوبہ بندی کر ہے ہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

ٹرانسپورٹ سسٹم

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سارے سکے نکال کر سامنے رکھ دیئے' میاں شہباز شریف نے دو پاؤنڈ کا سکہ اٹھایا' مشین میں سکہ ڈالا' مشین سے ٹکٹ نکلا اور ہم بس میں سوار ہو گئے' یہ لندن کی آکسفورڈ سٹریٹ تھی اور ہم کھانا کھانے کیلئے ایجویر سٹریٹ جا رہے تھے' یہ بس انتہائی کشادہ' آرام دہ اور صاف ستھری تھی' میں نے شہباز شریف سے پوچھا "میاں صاحب کیا پاکستان میں ایسی بسیں نہیں شروع ہوسکتیں" انہوں نے تڑپ کر جواب دیا "اگر 12 اکتوبر نہ آتا تو اب تک چل چکی ہوتیں" میں نے اگلے سوال کیلئے منہ کھولا لیکن ہمارا اسٹاپ آ گیا۔

لندن کی سرکاری ٹرانسپورٹ دو حصوں پر مشتمل ہے' پہلا حصہ انڈر گراؤنڈ یا زیر زمین ریلوے سسٹم کہلاتا ہے' لندن کے لوگ اسے "ٹیوب" بھی کہتے ہیں' یہ ٹیوب سسٹم زمین کے اندر قائم ہے اور سارا شہر اس کے اوپر آباد ہے' یہ سسٹم بھی ایک انتہائی دلچسپ کہانی ہے' انیسویں صدی میں برطانیہ کے ایک کاروباری خاندان نے کوئلے کی کانیں خریدیں اور کوئلے کی سپلائی شروع کر دی' ان لوگوں نے ایک کان خالی کی تو پہاڑ کے اندر مہیب سرنگ بن گئی' اس دوران ایک نئی کان دریافت ہو گئی' یہ کان اس خالی کان کی بغل میں تھی' گوروں نے سوچا دوسری کان کو نئے سرے سے کھودنے کی بجائے کیوں نہ ہم خالی کان کے اندر سے ایک سرنگ بنائیں اور اس نئی کان کا کوئلہ پرانی کان کے ذریعے باہر نکال لیں' ان لوگوں نے خالی کان کے اندر ریل کی پٹڑی بچھائی' اس پٹڑی پر ڈبے لگائے اور کان کے اندر نئی سرنگ بنا کر کوئلہ نکالنا شروع کر دیا' اس سارے عمل کے دوران کسی گورے کے دماغ میں آیا اگر کان کے اندر ریل کا نظام چل سکتا ہے تو یہ سسٹم شہروں کے نیچے کیوں کام نہیں کر سکتا' یہ آئیڈیا حکومت تک پہنچا' حکومت نے لندن شہر کے نیچے سرنگیں بنائیں اور ان سرنگوں میں ریل کا سسٹم شروع کر دیا یوں لندن کا انڈر گراؤنڈ سسٹم شروع ہو گیا' یہ سسٹم 1863ء میں شروع ہوا تھا اور آج تک چل رہا ہے' لندن شہر کے نیچے اس وقت ریل کی 408 کلو میٹر لمبی پٹڑی بچھی ہے اور یہ پٹڑی 275 ریلوے سٹیشنوں کے ساتھ منسلک ہے' اس انڈر گراؤنڈ کے افتتاح کے دن 40 ہزار مسافروں نے اس پر سفر کیا تھا لیکن آج روزانہ

34 ... مسافر لندن کے انڈر گراؤنڈ سسٹم میں سفر کرتے ہیں جبکہ ویک اینڈ پر ان مسافروں کی تعداد ... جاتی ہے' حکومت اس سسٹم کے ذریعے 5 بلین پاؤنڈ سالانہ کماتی ہے' حکومت نے 2003ء میں ... ؤنڈ کو بسوں کے نظام سے منسلک کر دیا اور اسے "ٹرانسپورٹ فار لندن" یعنی ٹی ایف ایل کا نام ... اس نئے نظام کے تحت اب لندن کے مسافر چار سے پانچ پاؤنڈ کا ٹکٹ لے کر چوبیس گھنٹے تک ... ور مسافر بسوں کی سہولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں' ان کو اس ٹکٹ کے بعد کسی دوسرے ٹکٹ کی ... نہیں رہتی اور وہ ٹیوب کے کسی بھی روٹ اور لندن کی کسی بھی بس میں سوار ہو سکتے ہیں' انڈر ... سسٹم رات بارہ بجے بند ہو جاتا ہے لیکن بسیں 24 گھنٹے چلتی رہتی ہیں چنانچہ لندن میں کسی مسافر ... میں دقت نہیں ہوتی' یہ ٹرانسپورٹ سسٹم اتنا خوبصورت' آرام دہ اور وقت کا پابند ہے کہ لندن کے ... لوگ اسے ذاتی سواری پر فوقیت دیتے ہیں' لندن کے لوگوں کا خیال ہے اگر آپ نے وقت پر ... ہے تو آپ کو دو لاکھ پاؤنڈ کی ذاتی گاڑی کی بجائے چار پاؤنڈ کے ٹکٹ پر انحصار کرنا چاہیے' پیرس ... سسٹم "میٹرو" کہلاتا ہے اور یہ لندن کے انڈر گراؤنڈ کے مقابلے میں کئی گنا خوبصورت' آرام دہ اور ... رفتار ہے' پیرس کا میٹرو سسٹم 1900ء میں بنا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران اس میں بڑے ... پر توسیع ہوئی تھی' پیرس کا میٹرو سسٹم 16 لائنوں' 298 سٹیشنوں اور 382 سٹاپس پر مشتمل ہے' ... لمبائی 213 کلو میٹر ہے اور اس پر 45 لاکھ لوگ روزانہ جبکہ ایک ارب 3 کروڑ 65 لاکھ مسافر ... سفر کرتے ہیں' دنیا کا سب سے بڑا انڈر گراؤنڈ سٹیشن بھی پیرس میں ہے' فرانس کی حکومت نے ... سال میٹرو کی لائین نمبر 14 پر آٹو میٹک ٹرین شروع کی' یہ ٹرین ڈرائیور کے بغیر چلتی ہے اور مکمل طور ... ٹیک ہے' حکومت اگلے سال تک سارے میٹرو سسٹم کو آٹو میٹک کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے' یہ نظام ... میں بھی موجود ہے' امریکہ میں اسے "سب وے" کہا جاتا ہے اور یہ سب وے امریکہ کے 12 ... شہروں میں قائم ہے جبکہ ان میں نیو یارک' فلاڈلفیا اور بوسٹن کے سب وے زیادہ مشہور ہیں' امریکہ ... اور یورپ کے علاوہ ٹرانسپورٹ کا یہ نظام جاپان' چین اور روس میں بھی موجود ہے اور کروڑوں ... روزانہ اس سے استفادہ کرتے ہیں' بھارت بھی بڑی تیزی سے انڈر گراؤنڈ سسٹم کی طرف بڑھ رہا ... پ کو یہ جان کر حیرت ہو گی بھارت نے 1950ء میں میٹرو پر کام شروع کر دیا تھا' بھارت کی پہلی ... 1972ء میں کلکتہ میں شروع ہوئی اور 1995 میں مکمل ہو گئی' اس وقت دہلی' بنگلور اور چنائی میں ... ٹرو پر کام جاری ہے جبکہ دہلی کی میٹرو کے چند سیکشن مسافروں کیلئے کھول دیئے گئے ہیں۔

پاکستان کے شہری جب ملک سے باہر جاتے ہیں اور وہاں کے میٹرو' انڈر گراؤنڈ یا سب

دے سسٹم میں سفر کرتے ہیں یا یہ لوگ ان کی بسوں اور ٹیکسیوں میں بیٹھتے ہیں تو انہیں اپنی پسماندگی اور حکومتی وژن پر افسوس ہوتا ہے' آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہوگی اسلام آباد دنیا کا چوتھا دارالحکومت ہے جس میں پبلک ٹرانسپورٹ سسٹم موجود نہیں جبکہ پاکستان کے کسی بھی شہر میں یورپ جیسی ٹرانسپورٹ دستیاب نہیں' آج سے بیس برس پہلے پاکستان کے تین بڑے شہروں میں ''والو'' بسیں چلتی تھیں اور اضلاعی اور صوبائی سطحوں پر گورنمنٹ کی بس سروس موجود تھی اسے عرف عام میں ''جی ٹی ایس'' کہا جاتا تھا لیکن بدقسمتی سے یہ نظام بھی دم توڑ گیا اور سرکاری اہلکاروں نے ان بسوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کباڑیوں کے ہاتھوں بیچ دیا' راولپنڈی میں 2000ء میں ''واران کے نام سے ایک پرائیویٹ بس سروس شروع ہوئی تھی لیکن اسے بھی سیاست کھا گئی اور یوں راولپنڈی اسلام آباد کے لاکھوں مسافر ویگنوں تک محدود ہو کر رہ گئے' اگر ہم ٹرانسپورٹ کے مسئلے کو قومی سطح پر دیکھیں تو ہمیں پورا ملک پبلک ٹرانسپورٹ کے شدید بحران کا شکار نظر آئے گا' پاکستان میں ایک اندازے کے مطابق روزانہ اڑھائی کروڑ لوگ اندرون اور بیرون شہر سفر کرتے ہیں اور ان میں سے صرف دس فیصد لوگ ذاتی سواری کے مالک ہیں لہٰذا آپ ذرا تصور کیجئے باقی لوگ کیسے سفر کرتے ہوں گے اور دوران سفر ان کی کیا حالت ہوتی ہوگی' پاکستان کی بسیں' ویگنیں اور ٹیکسیاں بھی سفر کے قابل نہیں ہیں' ان کی نشستیں انتہائی خستہ ہیں' شیشے ٹوٹے ہوتے ہیں اور پوری بس' پوری ویگن میں خاک اڑ رہی ہوتی ہے' اس کے علاوہ مسافر بھی اوپر تلے ٹھونس دیئے جاتے ہیں چنانچہ جب مسافر پرائیویٹ ٹرانسپورٹ سے باہر نکلتے ہیں تو ان کے کپڑے پھٹ چکے ہوتے ہیں اور بال بکھرے ہوتے ہیں لہٰذا وہ اس حلیے میں دفتر نہیں جا سکتے' یہ ٹرانسپورٹ سسٹم وقت کا پابند بھی نہیں' ٹرانسپورٹ کے مالکان کسی ضابطہ اخلاق کے پابند نہیں ہیں' ان کی اپنی ہی ٹائمنگ ہوتی ہے اور جب تک ان کی بس یا ویگن پائیدان تک بھر نہیں جاتی یہ لوگ گاڑی کو حرکت نہیں دیتے اور اگر بس چل پڑے تو بھی یہ لوگ دس قدم پر نئے مسافر کیلئے گاڑی روک دیتے ہیں چنانچہ وقت کا پابند شخص یا ایمرجنسی میں سفر کرنے والا کوئی مسافر بسوں اور ویگنوں پر سفر نہیں کرتا لہٰذا پبلک ٹرانسپورٹ سسٹم ملکوں کی ترقی اور شہریوں کی عزت نفس کیلئے انتہائی ضروری ہوتا ہے' یہ پبلک ٹرانسپورٹ' بس سروس' انڈر گراؤنڈ ریل سسٹم یا مانو ریل صرف عام شہریوں کیلئے سہولت نہیں ہوتی' یہ ملک کا پٹرول اور ڈیزل کا خرچ بھی بچاتی ہے' اس کی وجہ سے ملک پلوشن سے بھی بچ جاتا ہے اور لوگوں کی نفسیات پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے چنانچہ تمام ممالک اس پر نہ صرف سوچ بچار کر رہے ہیں بلکہ عملی اقدامات بھی کر رہے ہیں' ہم لوگ اس معاملے میں برطانیہ سے ڈیڑھ سو سال جبکہ فرانس سے 107 سال پیچھے ہیں لیکن اس کے باوجود ابھی وقت ہمارے ہاتھ سے

[illegible] لا' ہم اب بھی ذرا سی کوشش سے اقوام عالم کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں لیکن اس کیلئے ضروری ہے [illegible] عوامی ٹرانسپورٹ کو بھی اپنی ترجیحات میں شامل کر لے۔

میں نے بس سے اترتے ہوئے میاں شہباز شریف سے پوچھا ''اگر آپ کو دوبارہ اقتدار کا [illegible] ملا تو آپ پاکستان میں یہ نظام شروع کریں گے'' میاں صاحب نے مسکرا کر جواب دیا ''میں جب [illegible] ن آیا ہوں میں نے ہمیشہ ٹیوب اور بس میں سفر کیا' میں روزانہ اس سسٹم کا مطالعہ کرتا ہوں چنانچہ [illegible] لیں اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دوبارہ موقع دیا تو میں تمام بڑے شہروں میں ٹرانسپورٹ کا یہ نظام [illegible] کرا دوں گا' میں لوگوں کو سفر کا ایک باعزت ذریعہ فراہم کروں گا۔''

⊘ ⊘ ⊘

واہ شوکت عزیز صاحب واہ

یہ سردیوں اور گرمیوں کے درمیان کا موسم اور 2007ء کا سال تھا' وزیراعظم شوکت عزیز نے چار صحافیوں کو وزیراعظم ہاؤس میں گپ شپ کی دعوت دی' میں بھی ان صحافیوں میں شامل تھا' ہم لوگ وزیراعظم ہاؤس کی خوبصورت اور آرام دہ سٹڈی میں بیٹھ گئے اور وزیراعظم شوکت عزیز اپنے خوبصورت اور دھیمے انداز سے اپنی ''فتوحات'' گنوانے لگے' یہ میری ان کے ساتھ چوتھی ملاقات تھی' ان چار ملاقاتوں میں مجھے ان کی چار خوبیوں کا اندازا ہوا' اول' شوکت عزیز کی یادداشت بڑی شاندار تھی' وہ بالخصوص صحافیوں کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے تھے اور ملاقات کے دوران ''معلومات'' کا حوالہ دیتے تھے' میں ان کے ساتھ پہلی مرتبہ یار محمد رند کے ساتھ ملا تھا اور اس کے بعد جب میری ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے یار محمد رند کا ذکر بھی کیا' دوسرا' وہ پاکستان میں اقتدار کے اصل ماخذ سے واقف تھے' وہ فوج کو سیلوٹ کرتے تھے' صحافیوں کو تھپکی دیتے تھے' سیکرٹریوں کو خوش رکھتے تھے' بزنس مینوں کو کھل کر کمانے کا موقع دیتے تھے' غیر ملکی سرمایہ کاروں کو گلے ملتے تھے اور لوگوں کو حیران کرنے کیلئے الفاظ کی جادوگری کرتے تھے چنانچہ وہ کامیاب جا رہے تھے۔ ان کی تیسری خوبی ان کی ''عاجزی اور انکساری'' تھی' وہ کسی مضبوط اور طاقتور شخص کو ''ناں'' نہیں کرتے تھے' ان کی عاجزی اور انکساری کا یہ عالم تھا' انہوں نے وزیراعظم کا لیٹر ہیڈ پیڈ اور دستخط تک دوسروں کو دے رکھے تھے' بعض اوقات ان کے نام سے بڑے بڑے حکم جاری ہو جاتے تھے اور انہیں ان احکامات کے بارے میں دوسرے دن اخبارات سے معلوم ہوتا تھا لیکن انہوں نے کبھی اختیارات کے اس تجاوز پر احتجاج نہیں کیا تھا اور ان کی چوتھی خوبی ان کا ''یقین'' تھا' وہ اپنے غلط کے صحیح ہونے کے یقین سے لبالب بھرے تھے اور جس وقت پوری دنیا ان کی معاشی پالیسیوں پر انگلیاں اٹھا رہی تھی محترم وزیراعظم شوکت عزیز اس وقت بھی اپنے موقف پر ''ڈٹے'' رہے تھے' مجھے ان کی اس خوبی کا اندازا چوتھی ملاقات میں ہوا تھا' شوکت عزیز نے اس ملاقات میں بڑی دل پذیر باتیں کیں اور ان باتوں کے دوران ہمارے ہر دل عزیز وزیراعظم نے بڑے دعوے سے فرمایا ''میں نے ملکی معیشت کو اس سطح تک پہنچا دیا ہے' میرے بعد لوگ مجھے یاد کریں گے''

...نے عاجزی سے پوچھا ''جناب وہ وقت کب آئے گا'' انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بڑی ...ت سے بولے ''ہمارے اقدامات چند ماہ میں ٹریکل ڈاؤن ہو جائیں گے اور اس کے بعد عوام کو ...ی باتوں پر یقین آ جائے گا'' وہ رکے اور بڑے یقین سے دوبارہ بولے ''جاوید صاحب! آپ لوگ ...گے جو ہمارے جانے کے بعد ہمارے حق میں لکھیں گے' جو ہمارے دور کو پاکستان کا شاندار ترین ...ھیں گے'' میں نے فوراً کلمہ حق کہنے کی ٹھانی لیکن اس وقت جابر سلطان سامنے بیٹھا تھا اور اس کے ...مے پروردی کا ہاتھ تھا چنانچہ میں نے بھی اپنے ایمان کو ''ٹریکل ڈاؤن'' کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے کل کے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھی اور مجھے اس ملاقات کی ساری جزئیات یاد ...یں۔ خبر میں انکشاف تھا محترم شوکت عزیز ایک لمبے عرصے کیلئے ملک سے باہر چلے گئے ہیں اور منسٹر ...نی میں موجود ان کا گھر نگران وزیراعظم محمد میاں سومرو کے حوالے کر دیا گیا ہے' مجھے نہیں معلوم یہ خبر ...ں حد تک درست ہے اور کیا واقعی شوکت عزیز مکمل طور پر مایوس ہو کر باہر چلے گئے ہیں یا وہ کمک لینے ...ے برطانیہ اور امریکہ گئے ہیں اور واپسی پر ان کی جیب میں نیا تقرر نامہ ہو گا اور وہ اپنے فلسفے اور ...ٹ کو مزید ٹریکل ڈاؤن کرنے کیلئے واپس آئیں گے لیکن جہاں تک ان کی آٹھ برس کی کارکردگی کا ...ں ہے' ہمیں یہ ماننا پڑے گا' ان کی معاشی اصلاحات کا پھل اب عوام کے سامنے آ چکا ہے اور عوام اس ...س کو دیکھ دیکھ کر دھاڑیں مار رہے ہیں۔ آپ زیادہ دور نہ جائیں' آپ صرف آٹے' بجلی' پٹرول اور ...ت گردی کو لے لیجئے' محترم شوکت عزیز نے آٹے' بجلی' پٹرول اور دہشت گردی کو جس طرح ''ٹریکل ...ن'' کیا تھا' وہ آج پاکستان کے ایک ایک بچے کے چہرے پر لکھا ہے۔ آپ صرف آٹے کو ہی لے ...' پاکستان میں پنجاب اور سندھ دو صوبوں میں گندم کاشت ہوتی ہے اور ہر سال سندھ اور پنجاب ...ٹ بینک سے قرض لے کر کسانوں سے گندم خریدتا ہے' یہ گندم بعد ازاں فلور ملوں کو فروخت کی جاتی ...اور ان سے حاصل ہونے والی رقم بینکوں کو واپس کر دی جاتی ہے۔ حکومت نے 2006ء میں ...انوں سے دو سو ڈالر فی ٹن گندم خریدی اور گوداموں میں محفوظ کر دی' جنوری 2007ء میں وزیراعظم ...اعلان کیا' مارچ' اپریل میں ''بمپر کراپ'' آئے گی اور پاکستان کے پاس اس سال 23 ملین ٹن گندم ...' وزیراعظم کے اس اعلان کے چند دن بعد پنجاب حکومت کی طرف سے اسلام آباد میں ایک سمری ...اور اس سمری میں وزیراعلیٰ نے وفاقی حکومت سے درخواست کی ''ہمارے پاس گودام محدود ہیں اور ...ماہ بعد بمپر کراپ آنے والی ہے چنانچہ ہمیں گوداموں میں موجود گندم فروخت کرنے کی اجازت ...ے دی جائے'' وفاقی حکومت نے اس سمری پر کام شروع کر دیا' اس دوران عالمی منڈی میں گندم کی

قیمت چار' سوا چار سو ڈالر فی ٹن ہو گئی اور پنجاب کے بعض کاریگر محسوس کرنے لگے اگر انہوں نے تاخیر سے کام لیا تو دوست بنانے کا یہ سنہری موقع ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ان کاریگروں نے وزیراعلیٰ پنجاب سے رابطہ کیا اور چودھری پرویز الٰہی یہ فائل لے کر اسلام آباد پہنچ گئے' حکومت نے یہ معاملہ اقتصادی کمیٹی کے سامنے رکھا اور اس کی اجازت سے گندم برآمد کرنے کا سگنل دے دیا' حکومت نے پرائیویٹ کمپنیوں سے ٹینڈر طلب کئے' کمپنیاں شارٹ لسٹ تھیں اور ان کمپنیوں کو گندم ایکسپورٹ کرنے کی اجازت دے دی چنانچہ ان کمپنیوں نے گندم بھارت' کینیا' متحدہ عرب امارات اور روانڈا کو فروخت کر دی' حکومت ان کمپنیوں کے ذریعے پانچ لاکھ ٹن گندم بیچنا چاہتی تھی لیکن چار لاکھ ٹن کی ایکسپورٹ کے بعد ملک میں آٹے کا بحران پیدا ہو گیا اور حکومت پریشان ہو گئی' اسی دوران فصل کٹی تو پتہ چلا' پاکستان میں اس سال بمشکل ساڑھے 21 ملین ٹن گندم پیدا ہوئی ہے اور ''بمپر کراپ'' کا تخمینہ غلط تھا' حکومت کی یہ پالیسی آنے والے چند ماہ میں ''ٹریکل ڈاؤن'' ہوئی' وزیراعظم شوکت عزیز گارڈ آف آنر لے کر اقتدار سے فارغ ہوئے' سردیاں شروع ہوئیں اور پورا ملک ''آٹا آٹا'' پکارنے لگا' آج پاکستان میں آٹے کی قیمت 50 روپے فی کلو تک پہنچ چکی ہے جبکہ ملک کے چھوٹے' بڑے 116 شہروں میں آٹے کیلئے قطاریں لگی ہیں اور لوگ مٹھی بھر آٹے کیلئے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے ہیں' اس وقت تک 22 مقامات پر آٹے کیلئے لاٹھی چارج ہو چکا ہے جبکہ 18 لوگ ''شہید آٹا'' ہو چکے ہیں۔ حکومت نے پچھلے دنوں گندم کے اس بحران سے فائدہ اٹھانے والے لوگوں کی فہرست بنائی تو پتہ چلا' دولت کی اس گنگا سے منہ دھونے والوں میں مسلم لیگ ق کے پچاس ارکان بھی شامل ہیں جبکہ اس وقت تک ذخیرہ اندوزوں کے گوداموں میں پندرہ لاکھ ٹن گندم موجود ہے اور ان ذخیرہ اندوزوں نے بینکوں سے باقاعدہ قرضہ لے کر گندم خریدی تھی' یہ تمام کے تمام لوگ بڑی مچھلیاں ہیں اور نگران حکومت کے پاس ان کے سائز کا کوئی جال موجود نہیں۔ حکومت گندم کے بحران سے نکلنے کیلئے 10 لاکھ ٹن گندم درآمد کر رہی ہے' حکومت نے یہ گندم عالمی مارکیٹ سے ساڑھے پانچ سو ڈالر فی ٹن میں خریدی اور اسے آٹے کے اس بحران سے نکلنے کیلئے عوام کو 18 سے 20 ارب روپے کی سبسڈی دینا پڑے گی جبکہ محترم شوکت عزیز کے ''ٹریکل ڈاؤن'' کی وجہ سے ملک کے 70 بزنس مینوں نے دو ماہ میں 25 ارب روپے کما لئے۔

یہ آٹے کی صورتحال تھی جبکہ اس وقت پورا ملک اندھیرے میں ڈوبا ہے' لوڈ شیڈنگ سے 42 ہزار چھوٹی بڑی فیکٹریاں بند ہو چکی ہیں جس کے نتیجے میں 30 لاکھ دیہاڑی دار مزدور بے روزگار ہو چکے ہیں' ملک میں سات دنوں کیلئے مٹی کا تیل' 13 دن کا پٹرول اور 20 دن کا ڈیزل بچا ہے جبکہ

20ء میں دہشت گردی کے ایک ہزار 5 سو تین واقعات ٹریکل ڈاؤن ہوئے اور ان میں 3 ہزار
48 لوگ جاں بحق اور 5 ہزار 4 سو 54 زخمی ہوئے۔ ملک میں 9 مارچ 2007ء سے عدالتی نظام
ج ہے' گیس کی قیمتوں میں اضافہ ہو چکا ہے' محترمہ بے نظیر بھٹو جیسی عالمی لیڈر شہید ہو چکی ہیں'
میں پنجاب کے خلاف نفرت آسمان کو چھو رہی ہے' الیکشن ملتوی ہوتے نظر آ رہے ہیں اور امریکہ کی
فورسز کسی بھی وقت پاکستان میں داخل ہو سکتی ہیں لہٰذا میں جب بھی ملک کے حالات دیکھتا ہوں تو
بے اختیار شوکت عزیز کا دعویٰ یاد آ جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں' انہوں نے واقعی درست فرمایا تھا
ے بعد لوگ مجھے یاد کریں گے'' جناب (ر) وزیراعظم شوکت عزیز کا فرمانا درست تھا' ان کی
ں ٹریکل ڈاؤن ہو چکی ہیں اور اس وقت تک ٹریکل ڈاؤن ہوتی رہیں گی جب تک ملک میں کوئی
شوکت عزیز نہیں آتا اور وہ مریض کے منہ سے آکسیجن کا ماسک الگ نہیں کرتا۔ واہ شوکت عزیز

⊘ ⊘ ⊘

وقت نہیں رکتا

چین کا نجومی بادشاہ کے دربار میں پیش ہوگیا' بادشاہ علم نجوم کے خلاف تھا' اس کا خیال تھا ستارہ شناسی ڈھونگ اور فریب ہے اور نجومی لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں لیکن وزیراعظم کا اصرار تھا یہ نجومی بادشاہ معظم کو حیران کر دے گا' آپ ایک بار اسے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دے دیں' بادشاہ نے ناچار اجازت دے دی یوں چین کا نجومی دربار میں پیش ہوگیا' بادشاہ نے اس سے پوچھا ''میرا نام کیا ہے'' نجومی نے ادب سے عرض کیا ''حضور دنیا آپ کو اردشیر بابکان کے نام سے جانتی ہے'' بادشاہ نے قہقہہ لگایا اور مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا ''میں اپنا اصل نام جاننا چاہتا ہوں'' نجومی نے حساب لگایا اور عرض کیا ''حضور آپ وہ نام جاننا چاہتے ہیں جو آپ کی والدہ ماجدہ نے تجویز کیا تھا یا وہ جس سے آپ کے والد آپ کو پکارتے تھے یا پھر وہ جو آپ کی رضاعی والدہ نے رکھا تھا'' بادشاہ تھوڑا سا پریشان ہوا اور غور سے نجومی کی شکل دیکھنے لگا' نجومی نے تختی منگوائی' اس پر تینوں نام لکھے اور بادشاہ سلامت کو پیش کر دیئے' بادشاہ نام پڑھ کر پریشان ہوگیا' اس کے بعد بادشاہ نجومی سے پوچھتا رہا اور نجومی جواب دیتا رہا' نجومی کا ہر جواب درست تھا یہاں تک کہ بادشاہ نجومی کے فن کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگیا' سوال و جواب کا یہ سلسلہ رات تک جاری رہا' رات جب بادشاہ تھک گیا تو اس نے نجومی سے آخری سوال پوچھا' اس نے نجومی سے پوچھا ''ہم آتش پرست ہیں' ہم آگ کو اپنا خدا مانتے ہیں' تم بتاؤ ہمارا مذہب کب تک زندہ رہے گا'' نجومی نے زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچیں اور ذرا سا سوچ کر بولا ''بادشاہ سلامت آپ کا مذہب ڈیڑھ سو سال قائم رہے گا' آج سے ٹھیک ایک سو پچاس برس بعد ایک قوم ایران آئے گی' ایران فتح کرے گی اور آپ کا آتش کدہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بجھا دے گی'' بادشاہ نے نجومی کو آرام کرنے کی اجازت دے دی' شاہی چراغ بجھایا اور بستر شاہی پر دراز ہوگیا' بادشاہ نے جوں ہی آنکھیں بند کیں' اسے اپنے مرحوم والد یاد آ گئے' بادشاہ کے والد نے اسے وصیت کی تھی ''ہمارا مذہب دنیا کے آخری کونے اور آخری سانس تک پہنچنا چاہیے'' بادشاہ اٹھ بیٹھا اور اس نے باقی رات ڈیڑھ سو سال کے اندیشوں میں کاٹ دی' یہ ایران کا مشہور بادشاہ اردشیر بابکان تھا' بابکان کے بارے میں کہا جاتا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے

شیر کے ارادے اور ہاتھی کے فیصلے سے نواز رکھا تھا' وہ دل میں جو ٹھان لیتا تھا وہ اسے کر گزرتا تھا' اردشیر بابکان نے دوسرے دن جنتریاں بنانے والوں کو بلوایا اور دربار میں کھڑے ہو کر اعلان کر دیا ''ہم حکم دیتے ہیں' ایران کے کیلنڈر کو تین سو سال پیچھے کر دیا جائے'' بادشاہ کا حکم تھا چنانچہ تاریخ کو تین سو سال پیچھے دھکیل دیا گیا' بادشاہ کا خیال تھا اس اقدام سے وقت کے فرشتے مغالطہ کھا جائیں گے اور یوں آتش پرستی کا سلسلہ آگے بڑھتا رہے گا' اردشیر بابکان یہ بندوبست کر کے فوت ہوگیا اور اس کی جگہ نئے بادشاہوں نے لے لی' ان بادشاہوں نے بھی بابکان کے فیصلے کا احترام کیا لیکن وقت کے فرشتوں کا حساب آگے پیچھے نہ ہو سکا' ڈیڑھ سو سال ڈیڑھ سو سال ہی رہے اور پھر وہ لوگ ایران آئے' انہوں نے ایران فتح کیا اور آتش کدہ بجھا کر چلے گئے اور یوں اردشیر بابکان کو وقت کو تین سو سال پیچھے دھکیلنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔

31 مئی اور یکم جون کی درمیانی رات گھڑی میرے سامنے میز پر پڑی تھی' ٹیلی ویژن پر بار بار اعلان ہو رہا تھا ''عوام گھڑیاں ایک ایک گھنٹہ آگے کر لیں'' میں نے گھڑی اٹھائی اور بارہ بجے کو ایک بجے میں تبدیل کرنے لگا لیکن عین اس وقت اردشیر بابکان تاریخ کے صفحات سے نکلا اور اس نے آ کر میری کلائی پکڑ لی' اس کا کہنا تھا وقت کو آگے اور پیچھے کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا' دس کلو لوہا اور دس کلو کپاس ایک برابر ہوتے ہیں' ہتھیلی پر رکھا بیج اور پتھروں میں بوئی گٹھلی کیلنڈر کو دو سو سال آگے کرنے سے درخت نہیں بن سکتی' جون کی تپتی دوپہریں جون کو دسمبر کہنے سے ٹھنڈی نہیں ہوتیں اور ابلتا ہوا پانی محض کیلنڈروں کو آگے پیچھے کرنے سے برف نہیں بنتا' انسان کا مقدر تاریخیں اور گھڑیاں بدلنے سے نہیں بدلا کرتا' اس کیلئے ارادے' عزم' دل اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم لوگ محنت اور ارادے کا کام بھی گھڑیوں سے لینا چاہتے ہیں' میں نے ان باطل خیالات کو دماغ سے جھٹکنے کیلئے سر کو جھٹکے دیئے اور وقت کو وقت سے ملانے کیلئے گھڑی کی ناب تلاش کرنے لگا لیکن اس دوران شاہ ایران رضا شاہ پہلوی تاریخ کے اوراق سے نکلا اور میرے سامنے کھڑا ہوگیا' رضا شاہ پہلوی کی رگوں میں بھی اردشیر بابکان کا خون تھا چنانچہ اس نے بھی وقت کو شکست دینے کا فیصلہ کیا تھا' 1971ء میں شاہ ایران نے ایرانی شہنشاہیت کا 2500 سالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا' اس نے پوری دنیا کے سربراہان کو اس جشن میں شرکت کی دعوت دی' جب دعوت نامے جاری ہوگئے تو پتہ چلا ایرانی شہنشاہیت کو ابھی محض ایک ہزار چار سو 64 سال گزرے ہیں اور اگر اس غلطی کی بھنک مغربی میڈیا کو ہوگئی تو وہ رائی کا پہاڑ بنا دے گا اور اس سے شاہ ایران کی سبکی ہوگی' معاملہ شاہ کے حضور پیش کیا گیا' بادشاہ نے چند سیکنڈ سوچا اور اس کے بعد

وزیروں سے پوچھا ''اڑھائی ہزار سال ہونے میں کتنے سال باقی ہیں'' وزیروں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا ''ایک ہزار 36 برس'' بادشاہ نے اطمینان کا سانس لیا اور عمائدین سلطنت کو حکم دیا ''آج سے ایران کے کیلنڈر کو ایک ہزار 36 سال آگے کر دیا جائے'' یہ بھی بادشاہ کا حکم تھا چنانچہ ایک ہفتے میں ایران کی ساری جنتریاں اور کیلنڈر جمع کیے گئے' انہیں سرعام آگ لگا دی گئی اور عوام کو نئے کیلنڈر تھما دیئے گئے یوں تاریخ کا گیپ ختم ہو گیا شہنشاہیت کے اڑھائی ہزار سال پورے ہو گئے اور بادشاہ نے 12 اکتوبر 1971ء کو جشن منا لیا لیکن کیلنڈر کی یہ تبدیلی شاہ کے مسائل ختم نہ کر سکی' عوام کے دلوں میں سر اٹھاتی نفرت کا رخ نہ موڑ سکی' ایران میں انقلاب آیا اور محض آٹھ برسوں بعد کیلنڈر دوبارہ اصل پوزیشن پر بحال ہو گیا۔

شاہ ایران کو وقت کو شکست دینے کا خبط تھا' اس کے اس خبط سے اس کے تمام حواری سیاستدان اور تمام عمائدین واقف تھے' ایک دن وزیراعظم عباس ہویدا اور مجلس شوریٰ کے صدر مہندس ریاضی بادشاہ کے پاس بیٹھے تھے' شاہ نے گھڑی دیکھی اور وزیراعظم سے وقت پوچھا' وزیراعظم نے عرض کیا ''حضور شام کے چھ بجے ہیں'' شاہ نے حیران ہو کر دوبارہ اپنی گھڑی دیکھی اور مجلس شوریٰ کے صدر سے بھی وقت پوچھا' مہندس ریاض نے فوراً عرض کیا ''حضور چھ بجے ہیں'' شاہ نے خفگی سے اپنی گھڑی اتاری اور غصے سے بولے ''میری گھڑی ایک گھنٹہ پیچھے ہے'' یہ سننے کی دیر تھی' وزیراعظم اپنی نشست سے اٹھا' بھاگ کر شاہ کے پاس پہنچا' اس کے ہاتھ سے گھڑی اچک لی اور ادب سے عرض کیا ''میں قربان جاؤں' آپ کے غلام یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ حضور گھڑی درست کرنے کی زحمت گوارہ کریں' آپ اپنی گھڑی کو ایسے ہی رہنے دیں' ہم ساڑھے تین کروڑ لوگ اپنی گھڑیاں ایک ایک گھنٹہ پیچھے کر لیتے ہیں'' شاہ نے خوشی سے وزیراعظم کو تھپکی دی' وزیراعظم محل سے باہر آیا اور اس نے پورے ملک کی گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے کر دیں۔

یہ عباس ہویدا ہی وزیراعظم تھا جسے انقلاب کے بعد 7 اپریل 1979ء کو لاکھوں لوگوں کے سامنے سرعام پھانسی دے دی گئی تھی اور اس وقت ایران کی کوئی کلائی اور اس کلائی پر بندھی کوئی گھڑی اس کی پھانسی کی گھڑی کو نہ ٹال سکی اور یہ گھڑی آج تک چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے حکمران گھڑی کو ایک گھنٹہ آگے کر دیں' کیلنڈر کو تین سو سال پیچھے لے جائیں یا ایک ہزار 36 سال آگے لیکن بدقسمتی کی گھڑیاں نہیں ٹلتیں' وقت کے داغ نہیں دھلتے اور مسائل کے انبار ختم نہیں ہوتے' مسئلے صرف اور صرف مسئلے حل کرنے سے ختم ہوتے ہیں' اس ملک میں اگر لوڈشیڈنگ ہے تو ہم خواہ اپنی گھڑیاں دس دس گھنٹے پیچھے کر

لیں لیکن ہمارے بلب روشن نہیں ہوں گے' ہمارے پنکھے نہیں چلیں گے چنانچہ ہمیں بجلی کیلئے بجلی کا بندوبست کرنا پڑے گا' ہمیں ڈیم بنانے پڑیں گے' ہمیں نئے بجلی گھر لگانا پڑیں گے اور جب تک ہم یہ نہیں کریں گے ہم خواہ گھڑیوں کو روزانہ آگے یا پیچھے کرتے رہیں ہمارا یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا' انسان جلے ہوئے زخموں پر برف رکھ کر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے' لوگ پیار کو ڈھول کی تھاپ سے زیادہ دیر تک نہیں بہلا سکتے اور معاشرے گھڑیوں کو آگے پیچھے کر کے زیادہ دیر تک وقت کو دھوکہ نہیں دے سکتے کہ وقت وہ خوفناک سچائی ہے جس کے سامنے فرعونوں کے سر بھی جھک گئے تھے اور جس کا رخ نمرود بھی نہیں بدل سکا تھا' وقت کسی کے کہنے پر رکتا ہے اور نہ ہی تھمتا ہے اور دنیا میں صرف وہی قومیں کامیاب ہوتی ہیں جو وقت کے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہیں' جو وقت کی دوست بن جاتی ہیں یا پھر وقت کو اپنا دوست بنا لیتی ہیں اور گھڑیوں اور کیلنڈروں سے دشمنی کرنے والی قومیں وقت کی دھول میں گم ہو جاتی ہیں اور ہم اگر وقت کی دھول میں گم ہونے سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی وقت کو دھوکہ دینے کا سلسلہ بند کرنا ہوگا' ہمیں بھی وقت کے ساتھ ساتھ بھاگنا ہوگا' ورنہ وقت کا ریلا ہمیں اپنے ساتھ بہا لے جائے گا اور ہم تاریخ کے جوہڑ میں کائی بن کر تیرتے رہیں گے' ایک ایسی کائی جو صرف مکھیاں اور مچھر پیدا کر سکتی ہے۔

⊘ ⊘ ⊘

بکری جو کھائے گی وہی لوٹائے گی

پاکستان میں بجلی کی لوڈشیڈنگ اور مہاتما گاندھی کی بکری کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔

گاندھی جی نے آخری عمر میں کھانا پینا ترک کر دیا تھا' وہ صرف بکری کے دودھ پر زندہ تھے۔ گاندھی جی کے مریدوں نے ان کی سیوا کیلئے بکری کا مستقل انتظام کر دیا تھا' یہ بکری گاندھی جی کی بکری کہلاتی تھی اور اسے ہندوستان بھر میں وی وی آئی پی کا درجہ حاصل تھا۔ گاندھی جی جہاں تشریف لے جاتے تھے یہ بکری بھی ان کے ٹین ڈبے' لوٹے اور بستر کے ساتھ وہاں جاتی تھی اور کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر اسے بڑی عقیدت اور چاؤ سے نہلاتے' ٹہلاتے اور بہلاتے تھے۔ دنیا میں تین حلال جانوروں کا دودھ انسانی غذا کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ گائے' بھینس اور اونٹنی۔ گائے کا دودھ انسانی جسم کیلئے انتہائی سودمند اور ہاضم ہوتا ہے' اس دودھ میں چربی کم ہوتی ہے لہٰذا یہ انسانی خون میں کلسٹرول کی مقدار نہیں بڑھاتا' بھینس کا دودھ گائے کے مقابلے میں گاڑھا ہوتا ہے' اسے ہضم کرنے کیلئے بھاگ دوڑ بھی کرنا پڑتی ہے اور اس میں کلسٹرول بھی زیادہ ہوتا ہے جبکہ اونٹنی کا دودھ مکمل غذا ہے' اس میں وہ تمام اجزاء اور عناصر موجود ہیں جو انسانی جسم کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔ غذاؤں کے ماہرین کا خیال ہے انسان کیلئے اونٹنی کے دودھ کے دو پیالے اور چار کھجوریں چوبیس گھنٹے کیلئے کافی ہوتی ہیں۔ گاندھی جی کھانا پینا ترک کر چکے تھے' وہ بکری کے دودھ کے صرف دو پیالے پیتے تھے چنانچہ وہ کمزور ہوتے جا رہے تھے' گاندھی جی کے مریدوں نے اس کا بہت دلچسپ حل نکالا' وہ بکری کو چارے کے ساتھ ساتھ بادام' پستے' اخروٹ اور انجیر کھلانے لگے' گاندھی جی کی بکری روزانہ آدھ کلو ڈرائی فروٹ کھا جاتی تھی' اس بندوبست کے نتیجے میں بکری کا دودھ گاڑھا ہو گیا اور یوں گاندھی جی صرف دو پیالے کے دودھ ہی سے اچھے بھلے ہو گئے۔ ہندوستان میں اس سے ایک محاورے نے جنم لیا' وہ محاورہ کچھ یوں تھا ''بکری جو کھائے گی وہی لوٹائے گی''۔

آپ حیران ہوں گے گاندھی جی کی بکری اور پاکستان میں لوڈشیڈنگ میں کیا چیز مشترک ہے' یہ اشتراک میں اگلی سطروں میں آپ کو سمجھاؤں گا' سردست آپ بجلی کی اہمیت ملاحظہ کیجئے۔ بجلی آج کے

دور میں آکسیجن کی حیثیت رکھتی ہے' دنیا کے جو ممالک بجلی کی کمی کا شکار ہیں وہ شدید سماجی اور معاشی مسائل میں مبتلا ہیں۔ ہم سب سے پہلے معاشی مسائل کا جائزہ لیتے ہیں۔ دنیا کی ساری انڈسٹری' سارے دفاتر اور سارے بازار بجلی کے محتاج ہیں' بجلی بند ہونے سے فیکٹریوں میں کام رک جاتا ہے' فیکٹریاں بند ہونے سے پروڈکشن کم ہو جاتی ہے' پروڈکشن کم ہونے سے آرڈرز کی منسوخی شروع ہو جاتی ہے' دوسرے ممالک کے خریدار دوسرے ممالک کا رخ کرتے ہیں یوں ایکسپورٹس رک جاتی ہیں' پروڈکشن کی کمی مقامی مارکیٹ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے' بازاروں سے اشیاء غائب ہونے لگتی ہیں' فیکٹری مالکان پر معاشی دباؤ پڑتا ہے اور وہ ملازمین کی تعداد گھٹا دیتے ہیں جس سے بے روزگاری پھیلتی ہے' یہ بے روزگار لوگ معاشرے میں پریشانی کا باعث بنتے ہیں' بازار میں اشیاء کم ہوتی ہیں جس سے تاجروں کے کاروبار پر اثر پڑتا ہے' خریدار بازاروں میں آتے ہیں تو انہیں ضرورت کی اشیاء نہیں ملتیں چنانچہ وہ حکومت کو گالیاں دیتے ہوئے واپس چلے جاتے ہیں' سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر میں بجلی نہیں ہوتی تو ان کے کمپیوٹرز اور مشینیں بند ہو جاتی ہیں' فوٹو سٹیٹ مشینیں' فیکس مشینیں' بینکوں کا کاروبار' ورکشاپس اور پٹرول پمپس بجلی کے تعطل کی وجہ سے بند ہو جاتے ہیں' یہ لوگ اگر بجلی کی جگہ جنریٹر چلاتے ہیں تو یہ بندوبست کب تک ان کا ساتھ دے گا؟ اگر یہ جنریٹرز اور یو پی ایس کو مستقل شکل دے دیتے ہیں تو ان کے اخراجات دو سے تین گنا ہو جاتے ہیں جس سے یہ لوگ اپنی سروسز کے نرخ بڑھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور نرخوں میں یہ اضافہ خریدار' گاہک یا کلائنٹ کیلئے قابل قبول نہیں ہوتا یوں معاشرہ کھینچا تانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اب آپ صورتحال ملاحظہ کیجئے' بجلی بند ہونے سے کارخانے بند ہوئے' کارخانوں کی بندش سے بیرون ممالک سے سرمایے کی ترسیل بند ہوئی جس سے فارن ایکس چینج کے ذخائر کم ہو گئے۔ دوم' پیداوار میں کمی آئی جس سے بازاروں میں اشیاء کی قلت پیدا ہو گئی۔ سوم' کارخانوں کے ملازمین بے روزگار ہوئے۔ چہارم' سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر میں کام معطل ہوا' دکانیں' شوروم اور ورکشاپس بند ہو گئیں اور ملک کا سروسز سیکٹر بیٹھ گیا' وہاں سے ٹیکسوں کی آمدن بند ہوئی اور یوں پورا معاشرہ معاشی بدحالی کا شکار ہو گیا۔ دوسری طرف گھروں' سکولوں اور غیر سرکاری دفتروں میں بجلی بند ہوئی' ٹیلی ویژن' فریج اور دیگر ودیو بند ہوئے' گلیوں میں اندھیرا ہو گیا اور جرائم پیشہ لوگوں نے اس اندھیرے کا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا چنانچہ دوسرے ''اینڈ'' سے بھی معاشرہ پریشانی' غصے اور خلجان میں مبتلا ہو گیا' عوام نے یہ غصہ باہر نکالنا شروع کر دیا یوں دیہاتوں' قصبوں اور شہروں میں فسادات شروع ہو گئے' حکومت نے فسادات روکنے کی کوشش کی جس سے عوام بپھر گئے اور یوں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

یہ ہے آج کی اصل حقیقت' ہماری دنیا میں بجلی آکسیجن کی حیثیت رکھتی ہے اگر معاشرے کو یہ آکسیجن ملتی رہے تو معاشرہ مطمئن بھی رہتا ہے اور ترقی پذیر بھی لیکن جب یہ آکسیجن رک جاتی ہے تو معاشرے کی ہیئت تبدیل ہونے لگتی ہے اور ہم آج کل ایک ایسی ہی صورتحال کا شکار ہیں۔ ملک میں بجلی کی لوڈشیڈنگ پندرہ' پندرہ گھنٹوں تک چلی گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں ہماری انڈسٹری آخری سانسیں لے رہی ہے' فیصل آباد اور سیالکوٹ میں بارہ ہزار چھوٹی بڑی ملیں' کارخانے اور فیکٹریاں بند ہو چکی ہیں جن کی وجہ سے لاکھوں افراد بے روزگار ہو چکے ہیں۔ کراچی' لاہور اور پشاور کے بازار سنسان پڑے ہیں' کراچی شہر کے کاروبار میں 60 فیصد کمی آ گئی ہے جبکہ آئی ٹی سے وابستہ سینکڑوں ادارے آخری ہچکیاں لے رہے ہیں' سرکاری دفاتر میں اوسطاً چار گھنٹے لوڈشیڈنگ ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہمارے دفتری اوقات اوسطاً چار گھنٹے رہ گئے ہیں' لاہور شہر میں بارہ سو باربر شاپس مندے کا شکار ہیں' ملک بھر میں بیس ہزار سروس سٹیشنز' ورکشاپس اور فرنیچر کے کارخانے بند ہیں جبکہ تین بڑے شہروں میں پلاسٹک' جیولری اور جوتوں کے دس ہزار کارخانے بندش کے قریب ہیں۔ رہی سہی کسر پٹرول کی قلت اور گیس کی لوڈشیڈنگ نے پوری کر دی ہے۔ جس سے لوگ بپھر کر سڑکوں پر آ گئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے اگر حکومت نے ہنگامی پیمانے پر بجلی کا بندوبست نہ کیا تو پاکستان میں انقلاب کا دھانہ کھل جائے گا اور یہ انقلاب محض انقلاب نہیں ہو گا یہ سول وار یا خانہ جنگی ہو گی۔

ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا بجلی کی کمی ایک مستقل مسئلہ ہے چنانچہ حکومت کو اس کا کوئی مستقل حل تلاش کرنا چاہیے۔ حکومت اس سلسلے میں تین' چار بڑے اقدامات کر سکتی ہے۔ اول حکومت انڈسٹری کو بجلی کی الگ لائنز دے دے اور ان لائنز کو لوڈشیڈنگ سے مبرّیٰ قرار دے دے تاکہ انڈسٹری کا پہیہ چلتا رہے' لوگوں کو روزگار' ملک کو سرمایہ اور شہریوں کو اشیاء ملتی رہیں کیونکہ اگر آپ کی جیب میں پیسے ہوں گے تو آپ اندھیرے میں بھی گزارا کر لیں گے لیکن اگر گھر میں روٹی نہ ہو تو اندھیرا زیادہ گہرا محسوس ہوتا ہے۔ سردیوں میں گیس پر لوڈ بڑھ جاتا ہے چنانچہ حکومت سردیوں کے تین ماہ سی این جی سٹیشن بند کر دیا کرے۔ یہ درست ہے سی این جی سٹیشن بند ہونے سے مڈل کلاس کیلئے سواری کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا لیکن چولہا گاڑی سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ آپ گاڑی کو کفایت شعاری سے استعمال کر سکتے ہیں لیکن شہروں میں گیس کے بغیر چولہا جلانا اور کھانا پکانا ممکن نہیں ہوتا' اگر حکومت عوام کو مسئلہ سمجھا دے تو لوگ حکومت کے ساتھ کوآپریٹ کریں گے۔ حکومت مشکل مہینوں میں تمام سرکاری عمارتوں بالخصوص سیکرٹریٹ اور ایوانوں کیلئے بجلی کا کوٹہ طے کر دے' بجلی کے ہیٹروں پر پابندی لگا دی جائے اور اس کے بعد

عوام سے کفایت شعاری کی اپیل کی جائے' مجھے یقین ہے لوگ حکومت کے ساتھ تعاون کریں گے۔ پٹرول اور گیس (سی این جی) کی بچت کیلئے حکومت ہنگامی پیمانے پر پبلک ٹرانسپورٹ کو بہتر بنائے' بڑے شہروں میں انڈر گراؤنڈ اور مانو ریل کے منصوبے بھی شروع کیے جائیں اور آرام دہ اور سبک رفتار بسیں بھی شروع کی جائیں۔ اس سلسلے میں تین قسم کی بسیں چلائی جا سکتی ہیں۔ اے کلاس بسوں میں بیوروکریٹس' امراء اور اپر مڈل کلاس کے شہری سفر کریں' ان بسوں کا کرایہ زیادہ ہو۔ بی کلاس بسیں مڈل کلاس کیلئے ہوں' ان کا کرایہ درمیانہ ہو اور سی کلاس بسیں لوئر مڈل کلاس کیلئے ہوں اور ان کا کرایہ انتہائی کم ہو۔ یہ بسیں شیڈول اور ٹائمنگ کے مطابق چلیں جس سے توانائی اور وقت دونوں کی بچت ہو گی اور حکومت ملک میں گاڑیوں کی خریداری بھی کنٹرول کرے' کسی بھی شہری کو دوسری اور تیسری گاڑی کی اجازت نہ دی جائے۔ یوں پٹرول کی غیر پیداواری کھپت میں کمی آئے گی اور یہ پٹرول بجلی کی پیداوار میں صرف ہو سکے گا۔

ہمیں ماننا پڑے گا انڈسٹری معاشرے کیلئے گاندھی جی کی بکری کی حیثیت رکھتی ہے اور بجلی اس بکری کیلئے ڈرائی فروٹ۔ ہم اگر معاشرے کو صحت مند اور زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں انڈسٹری کی اس بکری کو زیادہ ڈرائی فروٹ کھلانا پڑے گا کیونکہ یہ بکری جو کھائے گی وہی لوٹائے گی لہٰذا اگر ہم نے اسے ترجیح نہ دی تو یہ معاشرے کو روزگار فراہم نہیں کر سکے گی اور یوں پورا معاشرہ نقاہت کا شکار ہو جائے گا' ہم بہت جلد خانہ جنگی تک پہنچ جائیں گے۔

⊘ ⊘ ⊘

عدل بھی مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے

حاجی پرویز خان راولپنڈی کے حلقہ این اے 55 سے پاکستان مسلم لیگ ن کے رکن اسمبلی ہیں' حاجی صاحب چند روز قبل ایک خوفناک سکینڈل کا شکار ہو گئے' حاجی صاحب ایف اے فیل ہیں' انہوں نے اس سال ایف اے کا امتحان دینے کیلئے فارم جمع کرائے' انہیں رول نمبر سلپ بھی جاری ہوئی لیکن 29 اپریل کو گورنمنٹ گارڈن کالج راولپنڈی کے امتحانی سنٹر اے پر چھاپہ پڑا اور چھاپے کے دوران کمرہ امتحان سے بلال جاوید نام کا ایک نوجوان گرفتار ہو گیا' یہ نوجوان حاجی پرویز خان کا بھتیجا تھا اور ان کی جگہ مطالعہ پاکستان کا پرچہ دے رہا تھا' بلال جاوید کی گرفتاری ایک سیاسی بحران کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی' آج کل پاکستان مسلم لیگ ن حاجی پرویز خان کے خلاف انکوائری کر رہی ہے اور پاکستان مسلم لیگ ن اور میاں نواز شریف کی سیاست کا دارومدار اب بڑی حد تک اس انکوائری پر استوار ہے کیونکہ میاں صاحب نے پچھلے تین برسوں سے مسلسل انصاف اور عدل کا جھنڈا اٹھا رکھا تھا' وہ مسلسل فرماتے آ رہے تھے جس ملک میں انصاف نہ ہو وہ ملک نہیں چل سکتے اور اگر ہم نے ملک میں انصاف قائم نہ کیا تو پنجاب میں بھی سوات جیسے حالات پیدا ہو جائیں گے وغیرہ وغیرہ چنانچہ حاجی پرویز خان 29 اپریل کے بعد میاں صاحب کے قول اور فعل کے درمیان کھڑے ہو گئے ہیں اور پوری قوم اب میاں صاحب کی طرف دیکھ رہی ہے' لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں وہ میاں نواز شریف جس نے سابق چیف جسٹس عبدالحمید ڈوگر کی صاحبزادی کے اضافی نمبروں پر زمین آسمان ایک کر دیئے تھے وہ اپنے ایم این اے کی ''تعلیمی بے ایمانی'' پر اب کیا ایکشن لیتے ہیں؟ اگر میاں صاحب اپنے ایم این اے کو پارٹی' قومی اسمبلی کی رکنیت اور سیاست سے بے دخل کر دیتے ہیں تو شاید انہیں این اے 55 سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے اور اگر یہ این اے 55 اور حاجی پرویز خان کو بچا لیتے ہیں تو شاید میاں صاحب اپنے ان تمام اخلاقی دعوؤں سے محروم ہو جائیں جو انہوں نے پچھلے آٹھ برسوں میں ''اچھو'' کئے تھے' بہر حال میاں نواز شریف کی سیاست اب ایک فیصلے پر کھڑی ہے۔

حاجی پرویز خان کے اس ایشو کا دنیا کے ایک پرانے لیکن حتمی فلسفے سے بڑا گہرا تعلق ہے' یہ

ـہ کیا تھا' اس کیلئے ہمیں اس کرد زادے کی زندگی میں جھانکنا پڑے گا جسے تاریخ نے سلطان صلاح
ین ایوبی کا نام دیا تھا' یہ کرد نسل سے تعلق رکھتے تھے' یہ عراق میں پیدا ہوئے تھے اور جوانی میں مصر اور
م کے حکمران بن گئے تھے' انہوں نے پوری زندگی صلیبی جنگیں لڑیں اور ان جنگوں میں عیسائیوں کو
ت ناک شکستیں دیں' سلطان صلاح الدین ایوبی نے فلسطین فتح کر کے 90 برس بعد قبلہ اول
سائیوں اور یہودیوں سے واپس لیا' سلطان صلاح الدین ایوبی شاندار ایڈمنسٹریٹر اور عادل حکمران تھے'
یوں نے اپنے دور میں یہودیوں اور عیسائیوں کو بے شمار مراعات دیں جن کے باعث یہ لوگ ان کے
مدید ابن گئے' وہ درویش صفت انسان اور کھلے ہاتھ اور کھلے دل کے حکمران تھے' آپ ان کی سادگی اور
یشی کا اندازہ صرف اس بات سے لگا لیجئے کہ 55 سال کی عمر میں جب ان کا انتقال ہوا تو وہ صرف
ہ درہم کے مالک تھے لہٰذا ان کی تدفین کیلئے تابوت اور کفن دمشق کے قاضی فاصل نے دیا تھا' سلطان
لاح الدین ایوبی مسلمانوں کے پہلے حکمران اور جرنیل تھے جن سے یورپ کے حکمرانوں' عوام'
جیوں اور پادریوں کا واسطہ پڑا تھا اور سلطان نے اپنے حسن سلوک سے یورپ کے لوگوں اور حکمرانوں
دل موہ لیا جس کے نتیجے میں نہ صرف یورپ کے بادشاہ اور امراء سلطان کی تعریف پر مجبور ہو گئے بلکہ
م شہری بھی بڑی تیزی سے اسلام قبول کرنے لگے' اس دور میں اسلام اور مسلمان چھ براعظموں تک پہنچ
کے تھے اور ان کی پیش قدمی سے یہودی اور عیسائی شدید پریشان تھے چنانچہ پریشانی کے اس عالم میں
وقت کے پوپ نے مسلمانوں کی ترقی کی وجوہات معلوم کرنے کیلئے سٹڈی کرائی' اس نے سو کے
یب سکالرز مختلف اسلامی ممالک میں بھجوائے' یہ لوگ تین سال تک ان علاقوں میں رہے اور انہوں
نے واپسی پر اپنی رپورٹ پوپ کو جمع کرائی' پوپ کو اس تحقیقاتی رپورٹ سے معلوم ہوا مسلمانوں کے غلبے
سب سے بڑی وجہ ان کا نظام عدل ہے' یہ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر عمل
رتے ہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا اگر فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی
وری کرتیں تو خدا کی قسم میں ان کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا اور تم سے پہلے والی قومیں اس لئے برباد ہو گئیں کہ
ب اعلیٰ طبقے کا کوئی شخص جرم کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیا جاتا تھا اور جب یہ جرم کسی عام شہری سے سرزد ہو
تا تھا تو اسے پوری سزا دی جاتی تھی' پوپ نے جب یہ مثال پڑھی تو اس نے سر ہلایا اور اعتراف کیا
بے شک ہم ہی وہ قوم ہیں جو بڑے بڑے جرائم پر بڑے لوگوں کو چھوڑ دیتے ہیں اور چھوٹے لوگوں کو
ی کے چھوٹے چھوٹے جرموں پر پھانسی چڑھا دیتے ہیں اور ہم اس وقت تک مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر
یں گے جب تک ہم ان کا یہ نظام عدل ان سے نہیں چھینتے''۔ اس دن کے بعد دنیا میں ایک دلچسپ

تبدیلی آئی' یورپی اقوام نے مسلمانوں کا نظام عدل لے لیا' انہوں نے قانون اور عدالت کے سامنے بادشاہ اور عوام دونوں کو برابر کر دیا جبکہ ہم نے یورپی اقوام کا وہ نظام اپنے ممالک میں نافذ کر دیا جس میں بالائی طبقہ قانون سے مکمل طور پر آزاد تھا اور عام شہری قانون کا سب سے بڑا شکار تھا چنانچہ یہ نتیجہ نکلا آج یورپی اقوام وہاں ہیں جہاں کبھی ہم ہوتے تھے اور ہم آج وہاں ہیں جہاں کبھی یورپی اقوام ذلت' پسماندگی اور خرابی کی زندگی گزار رہی تھیں۔

آپ اس فلسفے کو سامنے رکھ کر پوری دنیا پر نظر دوڑائیں آپ کو اس وقت دنیا دو حصوں میں تقسیم نظر آئے گی' وہ ملک جن میں قانون کے سامنے بادشاہ اور عام شہری برابر ہیں اور وہ ملک جن میں بالائی طبقے کے لوگ قانون سے بالاتر ہیں جبکہ عام شہری انصاف کے کٹہرے میں کھڑے ہیں' آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے پہلی قسم کے ممالک ترقی یافتہ ہیں جبکہ دوسری قسم کے تمام ممالک پسماندہ اقوام میں شمار ہوتے ہیں' آپ اب دوسری قسم کے تمام ممالک کی فہرست بنائیں تو آپ یہ جان کر مزید حیران ہوں گے کہ 95 فیصد اسلامی ممالک دوسری قسم کی فہرست میں آتے ہیں' کیوں؟ اس کیوں کا جواب صرف اور صرف انصاف ہے' اسلامی دنیا اور ہم مسلمان بے انصاف' ظالم اور بے ایمان لوگ ہیں' ہم دوہرے معیار کے منافق لوگ ہیں' ہم میں شاہ عبداللہ' شیخ محمد بن راشد المکتوم' بشار الاسد' سلطان محمد اور آصف علی زرداری کیلئے الگ قانون ہے جبکہ عام زید' بکر اور صدیق کیلئے دوسرا قانون' ہمارے ملک میں سیاستدان اربوں کھربوں روپے کی کرپشن کے بعد این آر او کے شیمپو سے نہا دھو کر پاک صاف ہو جاتے ہیں جبکہ تنوروں سے روٹی چرانے' سائیکل کی چین اتارنے اور شک کی بنیاد پر گرفتار ہونے والے سینکڑوں ہزاروں لوگ پانچ پانچ سال جیل میں گزار دیتے ہیں' اس ملک میں ہر ایم این اے کے دامن پر کرپشن' لوٹ کھسوٹ اور ظلم کے سو سو دھبے ہیں لیکن قانون اور انصاف کو اس کے دروازے پر دستک تک کی جرأت نہیں ہوتی جبکہ سینکڑوں لوگ داڑھی رکھنے اور نماز پڑھنے کے جرم میں برسوں سے گھروں سے غائب ہیں اور ان لوگوں کے لواحقین کی چیخیں بھی انصاف اور قانون کی دہلیز تک پار نہیں کر پا رہیں' آپ پاکستان کی 62 سال کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں' اس ملک میں آج تک حاجی پرویز خان جیسے کسی سیاستدان کو سزا نہیں ہوئی' اگر کوئی سیاستدان جیل بھی گیا تو نہ صرف اس کے سارے مقدمے ختم ہو گئے بلکہ وہ بعد ازاں صدارت' وزارت عظمیٰ اور وزارت کے عہدوں پر بھی متمکن ہوا' اس کے مقابلے میں اس ملک کا جو بھی عام شخص بے گناہی کے جرم میں کسی تھانے' عدالت یا جیل پہنچ گیا وہ دوبارہ زندگی میں کبھی نارمل نہ ہو سکا' یہ ہے ہمارا انصاف کا سسٹم چنانچہ ہم آج جانوروں سے بدتر زندگی بھی گزار رہے ہیں

ارے ہاتھ اور ہماری جھولیاں بھی غیروں کے سامنے کشکول بنی ہوئی ہیں۔

میں واپس ایم این اے حاجی پرویز خان کی طرف آتا ہوں' یہ بنیادی طور پر حاجی پرویز خان س نہیں یہ میاں نواز شریف کا امتحان ہے' اگر میاں صاحب یہ امتحان پاس کر گئے تو ملک میں ایک کلچر کا آغاز ہو گا اور قوم کل کو ان تمام ایم این ایز' ایم پی اے حضرات اور سیاستدانوں کا احتساب ے گی جنہیں اس نے اپنے وسائل کی رکھوالی کا فریضہ سونپا تھا لیکن وہ پارلیمنٹ میں پہنچ کر چور اور بن گئے' یہ کلچر اگر ایک بار پنپ گیا تو ترقی کا نقطہ آغاز ہو گا کیونکہ صرف علم ہی مومن کی کھوئی ہوئی ت نہیں بلکہ عدل بھی وہ خوبی تھی جو ہم نے غیروں کے ہاتھ گروی رکھ دی تھی اور ہم جب تک یہ خوبی ورپ سے واپس نہیں لیں گے ہم اس وقت تک اقوام عالم کے چوک پر اسی طرح بھیک مانگتے رہیں

بوٹی مافیا

حاجی پرویز خان کیس کے تین پہلو ہیں' ایک پہلو حاجی پرویز خان ہیں' حاجی صاحب پاکستان مسلم لیگ ن کے پرانے ورکر ہیں' حاجی صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز گلی محلے سے کیا' یہ پارٹی کے انتہائی غریب' محنتی اور مخلص کارکن ہیں' یہ مسلم لیگ کیلئے نعرے لگاتے تھے' تنگی ترشی میں زندگی گزارتے تھے اور دفتر کے چوبارے پر ہی سو جاتے تھے' انہوں نے راولپنڈی سے کونسلر کا الیکشن بھی لڑا لیکن ہار گئے' 2008ء میں الیکشن ہوئے اور جاوید ہاشمی این اے 55 سے پاکستان مسلم لیگ ن کے امیدوار بنے تو حاجی صاحب نے ہاشمی صاحب کے پوسٹر لگائے تھے' حاجی صاحب کا بیک گراؤنڈ ''ہمبل'' تھا' تعلیم کم تھی اور ایکسپوژر بھی نہ ہونے کے برابر تھا' 2008ء کے ضمنی الیکشنز کے دوران پارٹی ٹکٹ دینے کا وقت آیا تو چوہدری نثار علی خان نے حاجی صاحب کی سفارش کی اور یوں حاجی پرویز خان این اے 55 سے ایم این اے منتخب ہو گئے' میں یہاں آپکو انسان کی فطرت کا ایک دلچسپ پہلو بتاتا چلوں' ہم میں سے 90 فیصد لوگوں کے 90 فیصد فیصلوں کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی' ہم سب کی طبیعت میں ایک عجیب سی حرص پائی جاتی ہے' ہم بلا ضرورت اور بلاوجہ چیزوں پر قبضہ کرتے چلے جاتے ہیں' میرے ایک دوست نے 14 گھر بنا رکھے ہیں' میں ان سے اکثر اتنے گھروں کی وجہ پوچھتا ہوں لیکن وہ مجھے آج تک اسکی کوئی مضبوط دلیل نہیں دے سکے' ہم سب کے گھروں میں کاٹھ کباڑ کا ایک کمرہ ضرور ہوتا ہے' ہم اس میں گھر کی تمام ٹوٹی پھوٹی چیزیں ڈال دیتے ہیں اور یہ چیزیں کئی برسوں تک وہاں پڑی رہتی ہیں' ہم کاٹھ کباڑ کا یہ کمرہ کیوں بناتے ہیں یہ کمرہ ہماری اس نفسیاتی بیماری کا ثبوت ہے' ہم بنیادی طور پر حریص واقع ہوئے ہیں چنانچہ ہم اپنی ٹوٹی پھوٹی چیزیں بھی چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہوتے' حاجی صاحب بھی ہم جیسے 90 فیصد لوگوں میں سے ایک ہیں چنانچہ انہوں نے ایم این اے بننے کے بعد ایف اے کرنیکا منصوبہ بنا لیا جبکہ انہیں اسکی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی' صدر آصف علی زرداری کی مہربانی سے بی اے کی شرط ختم ہو چکی تھی اور اب کوئی بھی شخص کسی ڈگری کے بغیر پارلیمنٹ میں جا سکتا تھا مگر میں نے عرض کیا کہ ہم میں سے 90 فیصد لوگوں کے 90 فیصد فیصلوں کی کوئی وجہ نہیں ہوتی چنانچہ حاجی صاحب نے بھی بلاوجہ اور بلاضرورت ایف اے کرنیکا فیصلہ کر لیا اور اپنی جگہ اپنے بھتیجے بلال جاوید کو امتحان میں

ویا اور حاجی صاحب یہ غلطی کرتے ہوئے یہ بھول گئے انسان جوں جوں اوپر جاتا ہے اسے اتنی ہی
وہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے' ترقی ریت کا وہ محل ہوتی ہے جسے غلطی کی ایک پھونک دوبارہ ریت
ذروں میں تبدیل کر دیتی ہے' میرے ایک بزرگ دوست اکثر کہا کرتے ہیں میں نے زندگی میں
شمار لوگوں کو اوپر جاتے اور پھر وہاں کوئی ایک غلطی کرتے دیکھا اور اسکے بعد انہیں دوبارہ گلی محلوں میں
تے پایا' میرے اس بزرگ دوست کی بات سو فیصد درست ہے کیونکہ انسان جوں جوں اوپر جاتا ہے
کے پاس غلطیوں کی گنجائش کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے' عروج تاش کے پتوں کا وہ مینار ہوتا ہے جس پر
غلط پتہ رکھنے کی دیر ہوتی ہے اور یہ سارا مینار اپنے ہی قدموں پر آ گرتا ہے' یہ کیس ثابت کرتا ہے
دار کے ایوانوں میں پہنچنے والے تمام لوگوں کو ہر ذاتی فیصلے سے پہلے اپنے آپ سے دو سوال ضرور
چھنے چاہئیں ایک' کیا مجھے اسکی واقعی ضرورت ہے دو' اگر یہ بات لوگوں کے نوٹس میں آ گئی تو اس سے
ی عزت پر حرف تو نہیں آئیگا؟

حاجی پرویز خان کیس کا دوسرا پہلو ہمارا اخلاقی زوال ہے' میاں نواز شریف نے جب حاجی
یز خان کے خلاف تحقیقات کیلئے کمیٹی بنائی اور اس کمیٹی نے تحقیقات شروع کیں تو راولپنڈی کے تعلیمی
ڈ' پولیس اور انسپکشن ٹیم کے تمام ارکان نے حلف اٹھانے کے باوجود غلط بیانی اور جھوٹ کا سہارا لیا' ان
م لوگوں کے بیانات ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے' کیوں؟ اس کی وجہ بوٹی مافیا ہے' یہ بنیادی طور پر
مافیا کے دو گروپوں کے درمیان لڑائی تھی' ایک گروپ نے حاجی پرویز خان کیلئے نقل کا بندوبست کیا تھا
دوسرے گروپ نے پہلے مافیا کو شکست دینے کیلئے بلال جاوید کو پکڑنے کا فیصلہ کر لیا' حاجی صاحب
کیس میں کاغذی کارروائی پوری نہیں کی گئی تھی چنانچہ جب تحقیقات شروع ہوئیں تو تمام گروپوں نے
وٹ بولنا شروع کر دیا جس کے باعث سینیٹر پرویز رشید' شاہد خاقان عباسی اور نزہت صادق پر مشتمل ٹیم
یوز ہو گئی اور اس سے حاجی پرویز خان بے گناہ محسوس ہونے لگے لیکن بعد ازاں ٹیم نے آزاد
ئعوں سے تحقیقات کا فیصلہ کیا' ٹیم نے راولپنڈی کے ایم ایس ایف کے لڑکوں سے آف دی ریکارڈ
لومات لیں' شاہد خاقان عباسی نے ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ کا بندوبست کیا' بلال جاوید سے اپنی نگرانی
لکھوایا گیا' ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ نے تصدیق کی پرچے کی رائٹنگ اور بلال جاوید کی رائٹنگ یکساں
' پولیس کے اہلکاروں سے بھی آف دی ریکارڈ معلومات لی گئیں اور یوں حاجی پرویز خان کا جرم
ت ہو گیا' میاں نواز شریف اس معاملے میں سخت واقع ہوئے ہیں' میاں صاحب نے 1999ء میں
چوری کے الزام میں بیگم عابدہ حسین کے خلاف پرچہ درج کرا دیا تھا' میاں صاحب کے ایک ساتھی
رل ریٹائر سکندر خدمت کمیٹیوں کے چیئرمین تھے' جنرل صاحب نے اپنی پوزیشن کا ناجائز فائدہ

اٹھاتے ہوئے بینک سے صنعتی قرضہ لیا تھا' میاں صاحب نے انہیں بلا کر کہا تھا ''آپ کاروبار کریں یا خدمت کریں'' اور انہیں اس عہدے سے ہٹا دیا' میاں صاحب نے ایک ایم این اے کو اس بنیاد پر ٹکٹ دینے سے بھی انکار کر دیا تھا کہ ان کی شہرت اچھی نہیں تھی' حاجی پرویز خان کے معاملے میں حاجی صاحب کے بے شمار دوستوں نے میاں صاحب سے سفارشیں کیں لیکن میاں صاحب نے انہیں استعفیٰ دینے کا حکم دے دیا لیکن حاجی صاحب کے دوستوں نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری' یہ لوگ اب چودھری عابد شیر علی کے ذریعے اس معاملے کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ معاملہ جس قدر الجھے گا یا اس میں جتنی تاخیر کی جائے گی اس سے عابد شیر علی کی شہرت کو بھی نقصان پہنچے گا اور پارٹی کا امیج بھی خراب ہوگا۔

حاجی پرویز خان کیس کا تیسرا پہلو ہمارا نظام تعلیم ہے' یہ کیس اس ناسور کی نشاندہی کرتا ہے جس نے ہمارے پورے نظام تعلیم کو اپنے پنجے میں جکڑ رکھا ہے اور یہ ناسور ''نقل'' ہے' ہمارے تمام تعلیمی ادارے ''بوٹی مافیا'' کے قبضے میں ہیں' اس بوٹی مافیا کی مہربانی سے میڈیکل کالجوں اور انجینئرنگ یونیورسٹیوں کا میرٹ ناقابل یقین حد تک اوپر چلا گیا ہے' یہ لوگ لاکھوں روپے لیکر نالائق اور نااہل طالب علموں کو 90 فیصد تک نمبر دلا دیتے ہیں جسکے نتیجے میں نااہل طالب علم میڈیکل کالجوں اور انجینئرنگ یونیورسٹیوں میں چلے جاتے ہیں جبکہ اہل طالب علم تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں' یہ نااہل طالب علم جب ڈاکٹر اور انجینئر بنتے ہیں تو سینکڑوں معصوم لوگوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں' یہ ''بوٹی مافیا'' پی سی ایس اور سی ایس ایس جیسے امتحانات تک بھی پہنچ چکا ہے' یہ لوگ پرچے آؤٹ بھی کر دیتے ہیں' پرچے چیک کرنیوالے لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں اور آخری وقت پر رزلٹ میں تبدیلی بھی کرا دیتے ہیں' مجھے ایک بار سی ایس ایس کے پرچے چیک کرنے کا اتفاق ہوا' اس دوران ایسے ایسے لوگوں کی سفارش آئی کہ میں پریشان ہو گیا' ان سفارشی حضرات میں قومی اسمبلی کے سپیکر بھی شامل تھے' انکے ایک عزیز نے سیالکوٹ سے پرچہ دیا تھا' میں نے سپیکر صاحب سے معذرت کر لی' اس پر وہ ناراض ہو گئے اور یہ ناراضگی آج تک جاری ہے' یہ ہمارے نظام تعلیم کی صورتحال ہے' حاجی پرویز اس صورتحال کے صرف ایک چاول ہیں باقی دیگ ابھی دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے' حکومت کو چاہیے یہ فوری طور پر ''بوٹی مافیا'' پر توجہ دے' حکومتی اور اپوزیشن کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کھرے لوگوں کی ٹیمیں بنائے اور یہ لوگ پورے ملک سے اس ناسور کو اکھاڑ کر پھینک دیں' وفاقی حکومت کے پاس اگر وقت نہیں تو میاں شہباز شریف پنجاب میں بوٹی مافیا پر ضرور توجہ دیں' میاں صاحب سینیٹر پرویز رشید' احسن اقبال اور شاہد خاقان عباسی جیسے لوگوں کو متحرک کریں' یہ لوگ کوئی سسٹم بنائیں اور کم از کم پنجاب کو اس گھناؤنے کاروبار سے ضرور پاک کر دیں' خدا کی پناہ جس ملک میں اسلامیات کے پرچوں میں نقل ہوتی ہو اس ملک کا کیا مستقبل ہوگا۔

وہ وقت تو نہیں آیا

یہ 1976ء کا سن تھا اور امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر پاکستان کے دورے پر تھا' وزیر اعظم
[...]کستان ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی' امریکہ چاہتا تھا ذوالفقار علی بھٹو ایٹمی پروگرام
[...]ک کر دیں' ہنری کسنجر امریکی صدر کا پیغام بھٹو کو پہنچانے آیا تھا' بھٹو صاحب نے بڑے سکون سے کسنجر
[...]ی بات سنی اور اس کے بعد ہنری کسنجر سے مخاطب ہوئے ''آپ میرے دوست ہیں' آپ مشورہ دیجئے
[...]ے کیا کرنا چاہئے'' ہنری کسنجر ذرا سا مسکرایا اور نرم آواز میں بولا ''مسٹر پرائم منسٹر سفارت اور اقتدار کے
[...]یل میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا' میں اس وقت محض ایک پیغام رساں ہوں' آپ کو اپنے کسی مشیر
[...]ے مشورہ کرنا چاہئے'' بھٹو صاحب مسکرائے اور خوبصورت لہجے میں جواب دیا ''میں اس کے باوجود
[...]پ کو اپنا دوست سمجھتا ہوں چنانچہ آپ سے مشورے کی درخواست کرتا ہوں'' ہنری کسنجر نے قہقہہ لگایا
[...]ر بھٹو صاحب کی طرف دیکھ کر بولا ''آپ واقعی ایک شاطر انسان ہیں'' بھٹو صاحب نے خاموشی سے
[...]ی نظریں اس پر جما دیں' ہنری کسنجر نے تھوڑی دیر توقف کیا اور اپنے لہجے میں شائستگی بھر کر بولا ''میں
[...]ادی طور پر آپ کو مشورہ نہیں بلکہ وارننگ دینے آیا ہوں' امریکہ کو پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے بے
[...]ر خدشات لاحق ہیں لہٰذا آپ کے پاس میری بات ماننے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں'' بھٹو صاحب نے
[...]کرا کر پوچھا ''فرض کرو میں انکار کر دیتا ہوں تو!'' ہنری کسنجر کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی' اس نے ان کی
[...]کھوں میں آنکھیں ڈالیں اور ایک' ایک لفظ چبا کر بولا ''پھر ہم تمہیں عبرتناک مثال بنا دیں گے'' بھٹو
[...]احب کا رنگ سرخ ہو گیا' وہ کھڑے ہوئے' انہوں نے ہنری کسنجر کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بولے
[...]پاکستان امریکی صدر کے بغیر بھی چل سکتا ہے' اب تم لوگوں کو اس خطے میں اپنے لئے نیا حلیف تلاش
[...]رنا پڑے گا'' بھٹو صاحب مڑے اور باہر نکل گئے۔

مجھے یہ واقعہ وزارت خارجہ کے ایک سینئر افسر نے سنایا تھا' یہ صاحب بھٹو صاحب کے بعد
[...]رل ضیاء الحق کے ساتھی بنے اور ترقی کرتے کرتے ان کے قریبی رفقاء میں شامل ہو گئے۔ 1987ء
[...]ں افغانستان سے روسی فوجوں کا انخلاء شروع ہو گیا اور صدر جنرل ضیاء الحق یک دم اکیلے ہو گئے' ان کی

انا کو دھچکا پہنچا اور انہوں نے پاکستان میں موجود سی آئی اے کے افسروں اور سفارتی عملے کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں ایک سفارتی تقریب میں صدر کا سامنا اچانک امریکی سفیر سے ہو گیا اور جنرل صاحب نے درجنوں لوگوں کے سامنے سفیر کو لتاڑ دیا' جنرل صاحب نے اسے مخاطب کر کے کہا ''تم لوگوں کا خیال ہے ہم تمہاری مدد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے' یاد رکھو پاکستان ایک مضبوط اور توانا ملک ہے اور اگر ہم روس کو افغانستان سے بھگا سکتے ہیں تو ہم امریکہ سے بھی نبٹ سکتے ہیں'' امریکی سفیر خاموش رہا' جنرل ضیاء الحق نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا اور اس کا چہرہ اونچا کر کے بولے ''تم اپنی حکومت کو بتا دینا تمہارے پاس ہماری دوستی کے سوا کوئی آپشن نہیں'' سفیر نے سر ہلایا اور دائیں' بائیں ہو گیا۔ یہ افسر اس وقت تقریب میں موجود تھا اور اس نے یہ ''سانحہ'' بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا' یہ افسر دوسرے دن جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کیلئے گیا اور ان سے بڑی عاجزی سے عرض کیا ''سر میں دس' گیارہ برس پہلے بھٹو صاحب کے ساتھ کام کرتا تھا' سر میں نے ہنری کسنجر اور ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے درمیان مکالمہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا تھا' بھٹو صاحب اس مکالمے کے بعد بہت پر اعتماد اور ہنری کسنجر اداس تھا' بھٹو صاحب نے عوام میں نکل کر بھی امریکہ کو للکارنا شروع کر دیا تھا لیکن سر' پھر ایک وقت آیا' آپ نے بھٹو صاحب کو کرسی سے اتارا اور انہیں عدالتوں کے حوالے کر دیا اور عدالتوں نے انہیں پھانسی کی سزا دے دی اور یوں بھٹو صاحب دنیا میں حقیقتاً عبرت کی مثال بن گئے'' جنرل ضیاء الحق نے غصے سے اس کی طرف دیکھا' وہ افسر گھبرا گیا لیکن اس نے بات جاری رکھی اور بولا ''سر آپ جب امریکی سفیر کو سر عام لتاڑ رہے تھے تو اس وقت وہ مجھے ہنری کسنجر لگ رہا تھا' سر' میں اپنے تجربے کی بنیاد پر سمجھتا ہوں امریکہ کی دوستی میں ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے جب امریکہ کے دوستوں کیلئے دوستی نبھانا مشکل ہو جاتا ہے اور یہ دوستی جوتے میں کانٹا بن جاتی ہے'' جنرل صاحب خاموش رہے' وہ افسر بولا ''سر میں نے واپسی پر ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے گاڑی رکوا کر مجھے نیچے اتار دیا تھا' بھٹو صاحب کا خیال تھا وہ امریکیوں کو امریکیوں سے بہتر جانتے ہیں۔ سر' مجھے معلوم ہے آپ بھی میری باتوں سے خوش نہیں ہونگے اور شائد اس بار بھی میرے ساتھ وہی سلوک ہو لیکن سر' میں اس نازک وقت میں آپ کو سمجھانا اپنا فرض سمجھتا ہوں' آپ مہربانی فرما کر اس وقت امریکیوں سے نہ الجھیں' یہ ڈس پوزیبل کلچر کی اولاد ہیں' ان کی نظر میں وفا اور وفاداری بے معنی الفاظ ہیں''۔ جنرل ضیاء الحق کی قوت برداشت جواب دے گئی' وہ کھڑے ہوئے اور خاموشی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا' وہ صاحب بھی اٹھے فوراً ان کے دفتر سے نکل گئے اور طویل عرصے تک دوبارہ اس دفتر میں داخل نہ ہوئے۔

یہ افسر مجھے بے شمار مرتبہ ملے اور جب بھی بھٹو صاحب اور جنرل ضیاء الحق کے بارے میں بات ہوئی' انہوں نے کہا ''میرے دونوں باسز نے میرا مشورہ نہیں مانا لہٰذا دونوں افسوسناک انجام کا شکار ہو گئے'' میں نے ان سے پوچھا تھا ''اس کی وجہ کیا تھی'' وہ فوراً بولے ''یہ امریکی مزاج ہے' دراصل وہ کسی کے ساتھ زیادہ دیر نہیں چل سکتے' امریکہ کے ساتھ تعلقات اگر نفرت اور محبت (ہیٹ اینڈ لو) پر مبنی ہوں تو آپ ان کے ساتھ دیر تک چل سکتے ہیں' آپ یورپ' آسٹریلیا اور لاطینی امریکہ کی طرح کبھی ان کی بات مان لیں اور کبھی انہیں آنکھیں دکھا دیں' آپ کا وقت بہت اچھا گزرے گا۔ ہم یہاں جاپان اور چین کی مثال بھی دے سکتے ہیں' یہ دونوں ممالک بیک وقت امریکہ کے دوست بھی ہیں اور دشمن بھی' یہ امریکہ کے ساتھ تجارت بھی کرتے ہیں اور اسے آنکھیں بھی دکھاتے ہیں چنانچہ امریکہ کا ان کے ساتھ کوئی ایشو نہیں جبکہ ان کے مقابلے میں ہم لوگ امریکہ کے ساتھ ہمیشہ فرمانبرداری تک چلے جاتے ہیں' ہم امریکہ کی محبت میں اپنا آئین اور اپنا قانون تک بدل دیتے ہیں جس کے بعد امریکہ کی طرف سے ''ڈو مور'' کے مطالبے شروع ہو جاتے ہیں اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے جب پاکستان کے حکمرانوں کیلئے امریکی مطالبات ماننا ممکن نہیں رہتے' اس وقت ذوالفقار علی بھٹو ہو یا جنرل ضیاء الحق وہ امریکہ کو اپنی قانونی اور آئینی مجبوریاں بیان کرتا ہے لیکن امریکہ اس کی بات کا یقین نہیں کرتا۔ امریکیوں کا خیال ہوتا ہے پاکستان میں سب کچھ ممکن ہے اور ان کا ''دوست'' اب انہیں دھوکہ دے رہا ہے چنانچہ امریکی اپنا رویہ بدلتے ہیں جس کے بعد پاکستانی حکمران کو وہ ساری خدمات یاد آ جاتی ہیں جو اس نے امریکیوں کیلئے سرانجام دی تھیں' وہ بڑے زعم میں امریکیوں کو اپنی وفاداریاں یاد کراتا ہے اور امریکی کندھے اچکا کر جواب دیتے ہیں' ہم نے اس کے عوض تمہیں پاکستان میں حکومت کرنے کا موقع دیا تھا اور اس کے جواب میں پاکستانی حکمران امریکہ کو دھمکیاں دینے لگتا ہے اور پھر ذوالفقار علی بھٹو ہو یا جنرل ضیاء الحق' دونوں عبرتناک مثال بن جاتے ہیں''۔ وہ خاموش ہو گئے۔

میں پچھلے دو دن سے صدر پرویز مشرف اور امریکی تعلقات میں تبدیلیاں محسوس کر رہا ہوں' صدر پرویز مشرف نے 11 جنوری کو سنگا پور کے اخبار سٹریٹس ٹائمز کو انٹرویو دیا اور اس انٹرویو میں انہوں نے امریکہ کو للکار کر کہا ''اگر امریکی فوج ہمارے قبائلی علاقے میں گھسی تو ہم اسے پاکستان پر حملہ تصور کریں گے اور یہ ہماری خودمختاری کے منافی ہوگا اور میں امریکہ کو چیلنج کرتا ہوں وہ ہمارے پہاڑوں پر آ کر دکھائے' وہ اس دن کو پچھتائے گا'' صدر نے فرانس کے اخبار نگار کو بھی انٹرویو دیا اور اس انٹرویو میں بھی انہوں نے فرمایا ''اگر امریکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہماری مدد نہیں کرتا تو وہ اپنے لئے

دوسرا حلیف تلاش کر لے“ پتہ نہیں کیوں میں نے جب سے صدر کے یہ دونوں انٹرویوز پڑھے ہیں‘ مجھے وہ بوڑھا سفارتکار یاد آ رہا ہے اور میں بار بار سوچ رہا ہوں خدانخواستہ کہیں پاک امریکہ تعلقات میں ایک بار پھر وہ وقت تو نہیں آ گیا جب کونڈو لیزا رائس پاکستان آئے اور ہمارے ایوان اقتدار میں بیٹھ کر یہ کہہ دے ”آپ کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں“ میں جب بھی یہ سوچتا ہوں تو میری روح کانپ اٹھتی ہے اور سوچتا ہوں صدر پرویز مشرف کی باری بھی آ چکی ہے‘ اب دربدری اور جیل صدر مشرف کا مقدر بن چکی ہے۔

⊘ ⊘ ⊘

وہ مشرف‘ یہ مشرف

یہ 5 جنوری کی تاریخ تھی اور 2002ء کا سن تھا‘ نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں گیارہویں سارک سربراہ کانفرنس ہو رہی تھی‘ یہ کانفرنس بریندرا انٹرنیشنل کانفرنس ہال میں منعقد ہو رہی تھی اور اس کانفرنس میں بنگلہ دیش کی وزیراعظم بیگم خالدہ ضیاء‘ بھوٹان کے وزیراعظم لیونپو خاندو وانگ چک‘ بھارت کے وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی‘ مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم‘ نیپال کے وزیراعظم شیر بہادر دیوبا‘ پاکستان کے صدر پرویز مشرف اور سری لنکا کی صدر چندریکا کمارا تنگا اور دنیا بھر کے میڈیا کے نمائندے شریک تھے‘ یہ کانفرنس بڑے نازک حالات میں ہو رہی تھی‘ پاک بھارت سرحد پر پاکستان اور بھارت کی فوجیں ایک دوسرے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر کھڑی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا کسی طرف سے ایک گولی چلنے کی دیر ہے اور پورا خطہ ایٹمی جنگ کے جہنم میں اتر جائے گا چنانچہ پوری دنیا کی نظریں اس سارک کانفرنس پر لگی تھیں۔ کانفرنس کے دن صدر پرویز مشرف ڈائس پر کھڑے ہوئے‘ صدر پرویز مشرف نے اس کانفرنس سے خطاب کیا‘ انہوں نے اٹل بہاری واجپائی کو مخاطب کیا اور مسکرا کر فرمایا ”پاکستان بھارت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے“ ہال میں بیٹھے مندوبین نے تالیاں بجا کر صدر مشرف کی حوصلہ افزائی کی اور صدر پرویز مشرف دوبارہ خطاب کرنے لگے۔ جب صدر پرویز مشرف نے خطاب ختم کیا تو وہ ڈائس سے نیچے اترے‘ وہ اٹل بہاری واجپائی کی طرف بڑھے اور انہوں نے واجپائی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا‘ ہال میں تالیوں کا شور بلند ہوا اور فوٹوگرافروں نے اس منظر کو اپنے اپنے کیمروں میں محفوظ کر لیا بعدازاں دنیا بھر میں صدر مشرف کے اس اقدام کو سراہا گیا اور دنیا بھر کے میڈیا نے مشرف واجپائی ”ہینڈ شیک“ کو خصوصی کوریج دی۔ یہ وہ ”ہینڈ شیک“ تھا جس کے نتیجے میں پاک بھارت جنگ کے بادل چھٹ گئے اور دونوں ملکوں نے اپنی اپنی فوجیں واپس بلا لیں‘ یورپ کے میڈیا نے اس لمحے کو امن کا ہینڈ شیک قرار دیا۔ ان دنوں صدر نے بے شمار غیر ملکی اخبارات اور ٹیلی ویژن نیٹ ورکس کو انٹرویو دیئے تھے اور ان انٹرویوز میں انہوں نے فرمایا تھا ”میرے لئے پاکستان سب سے پہلے آتا ہے اور میں پاکستان اور پاکستانی عوام کی بقاء کیلئے کسی بھی شخص سے ہاتھ ملا سکتا ہوں“۔

یہ واقعہ 5 جنوری کی خنک شام کو پیش آیا تھا اور ان دنوں ایک کرنل صاحب میرے ساتھ راول ڈیم پر واک کیا کرتے تھے' میں نے اس دن کرنل صاحب سے پوچھا "فوج صدر کے اس اقدام کو کس طرح دیکھ رہی ہے" کرنل صاحب نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "ہم اسے جنرل صاحب کے صبر' برداشت اور وسعت قلبی کی انتہا سمجھتے ہیں" میں نے وضاحت کی درخواست کی تو وہ بولے "دنیا کے ہر فوجی کو لڑنے' مرنے اور مارنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے' دنیا کا کوئی فوجی مذاکرات نہیں کر سکتا' وہ دشمن سے ہاتھ ملانا گناہ اور کفر سمجھتا ہے۔ پاک فوج کے جوانوں اور افسروں کو بھی پہلے دن سے یہ بتایا جاتا ہے بھارت تمہارا دشمن ہے اور دشمن کے ساتھ تمہارا رویہ دشمنوں جیسا ہونا چاہئے چنانچہ ایک ایسی فوج کے کمانڈر کا اٹل بہاری واجپائی کی کرسی کے پاس جانا اور ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دینا جہاد اکبر سے کم نہیں' ہم تصور کر سکتے ہیں جنرل پرویز مشرف نے یہ مرحلہ کتنی مشکل اور اذیت سے طے کیا ہوگا" میں نے کرنل صاحب سے پوچھا تھا "اس کا مطلب ہے اگر صدر مشرف صرف جرنیل یا آرمی چیف ہوتے تو وہ کبھی واجپائی سے ہاتھ نہ ملاتے" کرنل صاحب نے فوراً ہاں میں سر ہلایا اور بولے "میں آپ کو 1999ء کی مثال دیتا ہوں' 20 فروری 1999ء میں اٹل بہاری واجپائی وزیراعظم میاں نواز شریف کی دعوت پر بس کے ذریعے لاہور آئے تھے اور اس وقت بعض اخبارات میں یہ خبر چھپی تھی آرمی چیف جنرل پرویز مشرف بھارتی وزیراعظم کے استقبال کیلئے واہگہ بارڈر پر نہیں گئے تھے۔ لوگوں نے اس وقت ان کے رویے پر اعتراض کیا تھا لیکن میں بطور فوجی جنرل پرویز مشرف کی مجبوری سمجھ سکتا ہوں' اگر اس وقت جنرل مشرف واہگہ بارڈر جاتے تو انہیں پروٹوکول کی وجہ سے بھارتی وزیراعظم کو سیلوٹ کرنا پڑتا اور پاک فوج کے چیف کیلئے یہ ایک انتہائی مشکل مرحلہ ہوتا ہے چنانچہ جنرل مشرف واہگہ بارڈر نہیں گئے۔ یہ ایک جنرل کا رویہ تھا لیکن اس وقت وہ پاکستان کے صدر ہیں چنانچہ انہیں صدر بن کر سوچنا پڑ رہا ہے' وہ جانتے ہیں اس وقت ملک کے 16 کروڑ لوگوں کا مقدر ان سے جڑا ہے اور اگر انہوں نے لچک کا مظاہرہ نہ کیا تو اس خطے کے کروڑوں لوگوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی چنانچہ پرویز مشرف نے اپنے اندر موجود جرنیل کی انا اور تربیت کو کچل دیا اور اس کی جگہ صدر پاکستان کی وسعت قلبی کو بٹھا دیا اور ہم یہ سمجھتے ہیں یہ ایک سیاستدان' ایک چیف ایگزیکٹو اور ایک بڑے اور مضبوط ملک کے حکمران کا سیاسی رویہ ہے اور اگر ان کی جگہ کوئی بھی سیاسی حکمران ہوتا وہ یہی کرتا" میں نے کرنل صاحب سے پوچھا تھا "صدر کے اس اقدام کا کیا نتیجہ نکلے گا" کرنل صاحب نے فرمایا تھا "یہ ثابت ہو جائے گا صدر پرویز مشرف سب سے پہلے پاکستان کے نعرے کے ساتھ مخلص ہیں اور وہ حقیقتاً پاکستان کو اپنی انا سے بڑا سمجھتے

یں اور اگر پاکستان کی بقاء اور ترقی کیلئے انہیں اپنے بڑے سے بڑے دشمن کے سامنے بھی جھکنا پڑا تو ک منٹ نہیں سوچیں گے"۔

مجھے کرنل صاحب کے خیالات مثبت اور اچھے لگے تھے اور میں بڑی حد تک ان کے خیالات ا قائل ہو گیا تھا لیکن پھر میاں نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو کا معاملہ آیا اور صدر پرویز مشرف نے طعی لہجے میں اعلان کر دیا وہ ان دونوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور یہ کبھی پاکستان نہیں آ سکیں گے' مجھے اس ت صدر صاحب کی ضد اور انا بے جا لگی کیونکہ پاکستانی عوام کی اکثریت محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز ریف کو اپنا لیڈر سمجھتی تھی اور لوگ انہیں ملک میں دیکھنا چاہتے تھے اور اگر صدر پرویز مشرف اس وقت وام کی رائے کا تجزیہ کرتے تو انہیں یہ دونوں لیڈر "سب سے پہلے پاکستان" کا حصہ محسوس ہوتے لیکن مدر عوامی رائے کے خلاف ڈٹے رہے' اس کے بعد 9 مارچ 2007ء کا ایشو سامنے آیا' چیف جسٹس ار محمد چودھری گزشتہ ایک برس میں عوام کے ہیرو بن کر ابھرے تھے لیکن صدر نے اس ہیرو کو سپریم کورٹ سے بے دخل کر دیا' چیف جسٹس کی یہ بے دخلی بھی سب سے پہلے پاکستان کے فلسفے کے خلاف تھی' س کے بعد پاکستان کے عوام نے چیف جسٹس کے حق میں تحریک شروع کی' پورا ملک چیف جسٹس کی مایت میں گھروں سے نکل آیا' عوام کی یہ حمایت اس قدر شدید تھی کہ ملکی تاریخ میں پہلی بار فوج کو پسپائی تیار کرنا پڑی لیکن صدر نے عوام کی اس حمایت کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا' صدر کا یہ انکار بھی سب ے پہلے پاکستان کے فلسفے کی خلاف ورزی تھی' 20 جولائی 2007ء کو سپریم کورٹ نے چیف جسٹس کو ال کر دیا' اس وقت پاکستانی عوام کی خواہش تھی صدر ایک قدم آگے بڑھیں' وہ چیف جسٹس کے دفتر یا مر جائیں' انہیں مبارکباد پیش کریں اور ملکی اداروں کے درمیان موجود کشمکش ختم کر دیں' عوام کی یہ اہش بھی سب سے پہلے پاکستان کا تقاضا تھی لیکن اٹل بہاری واجپائی کے سامنے لچک کا مظاہرہ کرنے لے صدر پرویز مشرف اپنی انا کے مورچے میں ڈٹے رہے اور یوں یہ موقع بھی ضائع ہو گیا۔ اس کے د 3 نومبر 2007ء کا دن آیا' صدر نے ملک میں ایمرجنسی پلس لگائی اور 60 ججوں کو کرسی انصاف سے محروم کر دیا' 16 کروڑ لوگ صدر کے اس اقدام کے بھی خلاف تھے' لوگوں کی خواہش تھی صدر پرویز رف ذرا سی لچک کا مظاہرہ کریں' وہ معزول ججوں سے ملیں اور صدارتی حکم کے ذریعے انہیں خود ہی ال کر دیں' یہ خواہش بھی سب سے پہلے پاکستان کا تقاضا تھی اور تقاضا ہے لیکن تادم تحریر صدر اس الے میں بھی لچک کا مظاہرہ کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں اور پیچھے رہ گئے 18 فروری کے الیکشن تو 18 وری کے دن قوم نے صدارتی پارٹی کو شکست فاش دے دی' یہ الیکشن پرویز مشرف کے تمام فیصلوں

پر عدم اعتماد ثابت ہوئے آج 2 مارچ 2008ء ہے لیکن صدر عوام کی اس رائے کو بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں' پاکستان کے 16 کروڑ عوام کی خواہش ہے صدر ایوان سے نکلیں' آصف علی زرداری' میاں محمد نواز شریف اور اسفند یار ولی سے ملاقات کریں' انہیں مبارک باد پیش کریں' انہیں حکومت بنانے کی دعوت دیں اور اگر نئی پارلیمنٹ صدر کو قبول نہ کرے تو وہ استعفیٰ دے دیں اور باعزت طریقے سے اقتدار سے رخصت ہو جائیں' عوام کی یہ خواہش بھی سب سے پہلے پاکستان کے فلسفے کا حصہ ہے لیکن افسوس صدر اس خواہش کا احترام کرنے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں' وہ عوام کے عدم اعتماد کے باوجود ابھی تک مسلم لیگ ق سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں' لوگ جب بھی ان حقائق کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں وہ صدر پرویز مشرف جو پاکستان کیلئے اپنے ازلی دشمن اٹل بہاری واجپائی کے سامنے جھک گیا تھا' وہ آج اپنے پاکستانی عوام کی رائے تسلیم کرنے کیلئے کیوں تیار نہیں؟ وہ صدر جو سب سے پہلے پاکستان کو اپنا فلسفہ حیات سمجھتا تھا وہ آج پاکستان اور پاکستانی عوام کی آواز سننے کیلئے کیوں تیار نہیں؟ لوگ پوچھتے ہیں جس صدر مشرف نے 2002ء میں 60 سال کے ازلی دشمن سے ہاتھ ملا کر پاکستان اور بھارت کو ایٹمی جنگ سے بچا لیا تھا وہ آج آصف علی زرداری' میاں نواز شریف اور اسفند یار ولی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر پاکستان کو اس خونی بحران سے کیوں نہیں بچاتے؟ صدر نے جس وسعت قلبی اور لچک کا مظاہرہ واجپائی کے سامنے کیا تھا وہ اسی لچک اور وسعت قلبی کا اظہار پاکستانی عوام کی رائے کے سامنے کیوں نہیں کرتے؟ میں جب بھی لوگوں کی یہ باتیں سنتا ہوں تو میں کنفیوز ہو جاتا ہوں اور مجھے سمجھ نہیں آتی 2002ء کے صدر ٹھیک تھے یا 2008ء کے صدر مشرف' وہ صدر اچھے تھے یا یہ صدر اچھے ہیں لیکن ساتھ ہی میں سوچتا ہوں صدر مشرف دنیا کے ان بدنصیب لوگوں میں شامل ہیں جنہیں عزت راس نہیں آتی' وہ ہمیشہ بے عزت ہو کر کوچہ اقتدار سے نکلتے ہیں اور مشرف کا وہ وقت آ چکا ہے۔

⊘ ⊘ ⊘

صدارتی کیمپ آفس میں

میں گیٹ کے اندر داخل ہو گیا' سامنے فوج کے کمانڈوز کھڑے تھے' بیرک میں سے سیکورٹی کتا لایا گیا' جرمن کتے نے گاڑی سونگھی اور مایوسی میں سر ہلا دیا' سیکورٹی آفیسر نے وائرلیس پر کوڈ ورڈز میں کوئی پیغام دیا' دوسری طرف سے فوراً جواب آ گیا' سیکورٹی آفیسر نے ہوا میں ہاتھ ہلایا اور بیریئرز اوپر اٹھنے لگے' میں صدارتی کیمپ آفس میں داخل ہو گیا۔

میں اس عمارت میں چوتھی بار داخل ہو رہا تھا۔ میں پہلی بار یہاں آیا تھا تو یہ آرمی ہاؤس تھا اور اس وقت صدر پرویز مشرف محض جنرل پرویز مشرف تھے اور انہوں نے چند دن پہلے آرمی چیف کا عہدہ سنبھالا تھا۔ میں دوسری بار آیا تو جنرل پرویز مشرف' صدر جنرل پرویز مشرف ہو چکے تھے اور اس عمارت پر صدارتی کیمپ آفس کی تختی لگ چکی تھی۔ تیسری مرتبہ 9 مارچ کا تازہ تازہ واقعہ ہوا تھا اور صدر پرویز مشرف نے واقعے کا پس منظر بتانے کیلئے چھ صحافیوں کو کیمپ آفس بلایا تھا اور آج میں چوتھی مرتبہ اس عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ عمارت کی آن بان اور شان وہی تھی' کیمپ آفس کے ڈرائیو وے کے سامنے سخت چہرے والے کمانڈوز بھی اسی طرح کھڑے تھے' صدر کے دفتر کے سامنے بھی فوج کے خوبصورت جوان کھڑے تھے' عمارت کے اندر باوردی بیرے بھی اسی طرح احتیاط کے ساتھ چل رہے تھے اور صدر کے اے ڈی سی' ملٹری سیکرٹری اور عملے کے دوسرے ارکان بھی سینہ تان کر کھڑے تھے لیکن اس کے باوجود اس عمارت' اس ماحول میں کسی چیز کی کمی تھی' وہاں کوئی چیز تھی جو پہلے نہیں ہوا کرتی تھی یا پھر اس بار وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی' وہ چیز کیا تھی؟ میں نے اس مسنگ ایلیمنٹ کی تلاش میں دائیں بائیں دیکھا' شائد وہاں اعتماد کی کمی تھی' شائد بے یقینی کے سائے تھے یا پھر شائد وہاں طوفان سے پہلے کی خاموشی یا بدلتے ہوئے مقدر کی چاپ تھی۔ وہاں کچھ تھا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں اسی صوفے پر بیٹھا دیا گیا جس پر 9 مارچ 2007ء کو چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری بیٹھے تھے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے سامنے صوفے کی طرف دیکھا اور مجھے وہ تاریخی تصویر یاد آ گئی جس میں ٹھیک میری جگہ افتخار محمد چوہدری بیٹھے تھے اور دائیں بازو کے سنگل صوفے پر صدر جنرل پرویز مشرف

اور پھر اس تصویر نے ایک ایسے بحران کو جنم دیا تھا جس کی لہریں ابھی تک اس ایوان کی دیواروں کے ساتھ ٹکرا رہی ہیں۔ میں نے افسوس سے گردن ہلائی اور سوچا بعض لمحے بعض تصویریں اور بعض فیصلے کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ اگر 9 مارچ 2007ء کو یہ "سٹینگ ارینجمنٹ" نہ ہوتا' اگر اس صوفے پر افتخار محمد چودھری کو نہ بیٹھایا جاتا اور صدر اس صوفے پر بیٹھ کر چیف جسٹس کو بدلنے کا فیصلہ نہ کرتے تو آج حالات کیا ہوتے؟ میں ابھی اس سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا کہ میرے سامنے دونوں دروازے کھلے اور میجر جنرل ریٹائرڈ راشد قریشی اندر آ گئے' ان کے ہاتھ' چہرے اور آواز کی گرم جوشی تا حال قائم تھی۔ میں نے ان سے عرض کیا "جناب میں آپ اور طارق عزیز کا دل سے احترام کرتا ہوں" انہوں نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری طرف دیکھا' میں نے عرض کیا "اس کی وجہ آپ لوگوں کی وفاداری ہے' اس وقت جب انسان کا سایہ بھی پرایا ہو جاتا ہے آپ دونوں اس وقت بھی صدر پرویز مشرف کے ساتھ کھڑے ہیں' وفاداری اور کردار دنیا میں سب سے اہم ہوتے ہیں' انسان اور بٹیر میں فرق ہونا چاہئے" جنرل نے قہقہہ لگایا اور کہا "ہم آخری سانس تک صدر کے ساتھ ہوں گے" دروازہ ایک بار پھر کھلا' صدر کے ایم ایس اندر داخل ہوئے اور مہذب آواز میں بتایا "صدر ملاقات کیلئے ریڈی ہیں" ہم دونوں اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے' باوردی دربانوں نے دروازے کھولے اور میں چند لمحے بعد صدر پرویز مشرف کے سامنے کھڑا تھا۔

صدر تیزی سے میری طرف بڑھے اور ہاتھ ملا کر بولے "ہاؤ آر یو جاوید" میں نے کہا "سر مجھے چھوڑیئے آپ اپنی بتایئے' آپ کیسے ہیں" صدر نے قہقہہ لگایا اور جواب دیا "آئی ایم فائن' لوگوں نے میرے بارے میں غلط خبریں پھیلا رکھی ہیں" میں صدر کے سامنے بیٹھ گیا' صدر نے چند لمحے سوچا اور اس کے بعد بولے "میں تمہارے پروگرام دیکھتا ہوں' کالمز پڑھتا ہوں' مجھے محسوس ہوتا ہے تم منفی دماغ (نیگٹو مائینڈڈ) شخص ہو' تمہارے پاس معلومات کی کمی ہے جس کی وجہ سے تم ادھوری تصویر پینٹ کرتے ہو' میں نے سوچا میں تمہیں بلاؤں اور تمہیں اصل حقائق بتاؤں" میں نے عرض کیا "صدر صاحب آپ نے درست فرمایا' میں واقعی ایک منفی ذہن کا شخص ہوں' صرف آپ نہیں بلکہ پاکستان پیپلز پارٹی' مسلم لیگ ن اور مسلم لیگ ق کی قیادت بھی مجھے منفی سمجھتی ہے" صدر نے حیرت اور دلچسپی سے میری طرف دیکھا' میں نے عرض کیا "پاکستان میں دو قسم کے صحافی ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جنہیں ساری رولنگ کلاس مثبت سمجھتی ہے لیکن عوام انہیں منفی خیال کرتے ہیں اور دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جنہیں رولنگ ایلیٹ منفی خیال کرتی ہے مگر عوام مثبت سمجھتے ہیں' میرا شمار چونکہ دوسری قسم میں ہوتا ہے لہٰذا حکمران کلاس

پسند نہیں کرتی" صدر مسکرائے اور انہوں نے بات بدل دی' انہوں نے فوراً ریٹائرڈ فوجی افسروں کا شروع کر دیا' مجھے محسوس ہوا وہ اپنے سابق فوجی دوستوں کے رویے سے بہت دل گرفتہ ہیں اور میں دیر ان کے پاس بیٹھا رہا وہ زیادہ تر وقت ان کے بارے میں گفتگو کرتے رہے" صدر کا کہنا تھا "وہ ایسے ایسے لوگوں کو اپنے خلاف بات کرتے دیکھتے ہیں جو ان کے بہت قریب رہے تھے اور جنہوں ان سے بے شمار مفادات حاصل کئے تھے تو انہیں بہت افسوس ہوتا ہے اور اس وقت انہیں حضرت علیؓ قول یاد آ جاتا ہے کہ تم جس شخص پر احسان کرو اس کے شر سے بچو" صدر کا کہنا تھا "ایکس سروس مین ایک میجر بھی شامل ہے یہ میرا بیچ میٹ تھا اور سپاہی سے ترقی کر کے پی ایم اے میں پہنچا تھا' اکیڈمی تمام لڑکے اس کا مذاق اڑاتے تھے اور میں اسے سپورٹ کرتا تھا' اسے انگریزی نہیں آتی تھی اور میں سے کہتا تھا تم انہیں پنجابی میں گالیاں دیا کرو' تم ان کے برابر ہو' وہ میجر کے رینک سے ریٹائر ہوا تو میں وقت بریگیڈئر تھا' میں اس کی نوکری کی درخواست لے کر جرنیل کے پاس گیا تھا' وہ اس نوکری سے لا گیا تو میں نے دوسری جگہ اس کی نوکری کا بندوبست کیا لیکن وہ بھی اب میرے خلاف نعرے لگا رہا ہے"۔ صدر نے ایک ایسے سابق جرنیل کا ذکر کیا جس کے ساتھ ان کے گھریلو تعلقات تھے' صدر کا کہنا تھا "وہ آخر میں سینیٹر بننا چاہتے تھے' میں نے معذرت کر لی تو وہ میرے خلاف ہو گئے" میں نے عرض کیا "لیکن وہ تو دعویٰ کر رہے ہیں آپ انہیں سینیٹر بنانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے معذرت کی تھی" صدر نے وراً جواب دیا "جھوٹ' وہ بننا چاہتے تھے' میں نے معذرت کی تھی" صدر نے ایک سابق جنرل کا ذکر کیا' ان کا کہنا تھا "جب جنرل آصف نواز نے انہیں نوکری سے نکالا تھا تو وہ اس وقت بھی سٹاف کار اور یونیفارم میں ان سے ملنے جاتے تھے' 12 اکتوبر 1999ء کے بعد بھی وہ ان کے گھر جاتے رہے' وہ دو سال تک ان کے گھر "وزٹ" کرتے رہے لیکن جنرل کی خواہشات بڑی طویل تھیں' وہ کہتے تھے مشرف تم اب آرام کرو' ہم اس ملک کو سنبھال لیں گے"۔ صدر کا کہنا تھا "وہ جنرل وزیراعظم بننا چاہتے تھے' ان کی خواہش پوری نہ ہوئی چنانچہ وہ بھی ان سے ناراض ہو گئے"۔ صدر نے ایک اور سابق جنرل کا ذکر کیا' ان کا کہنا تھا "میں نے انہیں سعودی عرب میں سفیر بنایا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو بہت بڑا فلاسفر سمجھتے ہیں' وہ شاہی خاندان سے ملتے تھے اور نہ ہی فارن آفس کو رپورٹ کرتے تھے' وہ وہاں بری طرح فیل ہو گئے' ہم نے انہیں واپس بلایا تو وہ بھی ناراض ہو گئے"۔ صدر نے ایک اور جرنیل کا نام لیا اور کہا "میں نے اسے بلوچستان کا گورنر بنایا' وہ بگٹی کے معاملے میں کچھ نہ کر سکے' وہ بگٹی سے ڈرتے تھے' وہ اس سے میٹنگ تک نہیں کرتے تھے اور آخر میں انہوں نے اس جرنیل کا ذکر بھی کیا جو آج کل صدر کے حوالے

سے خبروں میں بہت ''ان'' ہیں۔ صدر کا کہنا تھا وہ جب تک یونیفارم میں رہے انہوں نے فوج کی کسی میٹنگ میں منہ نہیں کھولا تھا' وہ ''گگو'' بن کر میرے سامنے بیٹھے رہتے تھے' میں نے انہیں فیڈرل سروسز کمیشن کا چیئرمین لگایا بعدازاں ہم نے چیئرمین کی مدت ملازمت میں کمی کی تو وہ بھی ناراض ہو گئے''۔ صدر کا کہنا تھا ''یہ سب لوگ اپنے اپنے وقت پر مجھ سے مفاد لیتے رہے تھے لیکن اب یہی لوگ ایماندار بھی بن گئے ہیں' جرأت مند بھی اور انقلابی بھی اور میں ان کے بیان پڑھ پڑھ کر حیران ہوتا رہتا ہوں۔''

صدر نے اس کے بعد شوکت عزیز سے لے کر اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں بے شمار باتیں کیں لیکن یہ تمام باتیں میں اپنے کسی آئندہ کالم پر اٹھا رکھتا ہوں۔ سردست میں اتنا بتاتا چلوں میں جب صدارتی کیمپ آفس سے باہر نکلا تو گیٹ تک اداسی اور خاموشی کے ڈھیر لگے تھے اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا درخت سوکھ رہا ہے اور پرندے اڑ چکے ہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

ہائے ہائے

یہ صدر ایوب خان کے اقتدار کے آخری دن تھے' صدر کے سیکرٹری اطلاعات اور قریبی مشیر الطاف صدر سے ملاقات کیلئے ایوان صدر گئے' یہ ایوان صدر اس وقت راولپنڈی میں ہوتا تھا' آج کل اس ت میں فاطمہ جناح یونیورسٹی قائم ہے اور صدر کے سابق آفس میں یونیورسٹی کی وائس چانسلر بیٹھتی ہیں۔ ف گوہر نے دیکھا صدر ایوب خان لان میں اکیلئے بیٹھے ہیں اور ملازمین برآمدے میں کھڑے ہو کر انہیں ہے ہیں' الطاف گوہر صدر کے پاس چلے گئے' صدر ایوب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور انہیں بیٹھنے رہ کر دیا۔ الطاف گوہر صدر ایوب کے سامنے بیٹھ گئے' دونوں کے درمیان بڑی دیر تک خاموشی کا وقفہ رہا' وران الطاف گوہر بڑے غور سے صدر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے رہے' صدر کے چہرے پر ی' اداسی اور شکست کے آثار تھے۔ صدر ایوب نے اچانک سر اٹھایا' الطاف گوہر کی طرف دیکھا اور لہجے میں بولے'' الطاف میرا خیال ہے مجھے اب اقتدار چھوڑ دینا چاہئے'' الطاف گوہر کیلئے یہ بات ف سے کم نہیں تھی کیونکہ آمریت کی تاریخ میں کبھی کوئی آمر خود اقتدار سے جدا نہیں ہوا' فوجی جرنیلوں' وں اور اقتدار پر شب خون مارنے والوں کیلئے اقتدار تخت نہیں ہوتا' تختہ ہوتا ہے اور جو آمر ایک بار اس پر جائے اس تختے سے اس کے بعد اس کی نعش ہی اترتی ہے۔ الطاف گوہر نے صدر سے وجہ پوچھی تو ایوب نے ایک عجیب وجہ بتائی' ان دنوں ملک بھر میں ایوب ۔۔۔ کتا ہائے ہائے کے نعرے لگتے تھے' ایک ے سے کوئی شخص ایوب کتا کا نعرہ لگاتا تھا اور دوسری طرف سے پورا مجمع ہائے ہائے کی آواز لگاتا تھا۔ ایوب نے بتایا' وہ صبح کے وقت ایوان صدر کے لان میں آئے تو ان کے پوتے' پوتیاں اور نواسے' نواسیاں باغیچے یل رہی تھیں' ان بچوں نے ایک سٹیج بنا رکھا تھا اور جلسہ جلسہ کھیل رہے تھے' ایوب خان آہستہ آہستہ چلتے ے ان کے قریب کھڑے ہو گئے' بچوں میں سے کسی بچے نے ایوب کتا کا نعرہ لگایا اور جواب میں تمام بچوں ا میں ہاتھ لہرا کر ہائے ہائے کی آوازیں لگانا شروع کر دیں' ایوب خان یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے' ان کا رنگ گیا اور وہ وہاں سے اٹھ کر یہاں آ گئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔ صدر ایوب خان کا کہنا تھا' عوام کی نفرت صدر کی دیواریں عبور کر کے اندر آ چکی ہے اور اب ان کے پوتے' پوتیاں اور نواسے' نواسیاں بھی ہائے

ہائے کے نعرے لگارہی ہیں چنانچہ اب ان کا اقتدار میں رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ الطاف گوہر نے صدر ایوب کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ایوب خان اپنا انجام جان چکے تھے چنانچہ جب یحییٰ خان نے انہیں مستعفی ہونے کا آپشن دیا تو انہوں نے چپ چاپ کاغذ پر دستخط کر دیئے' جنرل یحییٰ خان نے انہیں آخری سیلوٹ کیا اور امیر گلستان جنجوعہ (یہ اس وقت کرنل تھے اور بعد ازاں صدر اسحاق خان نے انہیں صوبہ سرحد کا گورنر بنا دیا تھا) انہیں چپ چاپ اسلام آباد میں ان کے ذاتی گھر چھوڑ گئے۔ ایوب خان نے باقی زندگی اس گھر میں گزار دی۔

صدر ایوب خان کا المناک انجام دنیا کا پہلا واقعہ نہیں تھا' دنیا کے تمام آمروں کی زندگی میں عوامی نفرت کا ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب انہیں وہ پتے بھی ہوا دینے لگتے ہیں جن پر وہ تکیہ کیے ہوتے ہیں۔ جب انہیں ان کے قریب ترین دوست' رشتے دار اور احباب بھی چھوڑ جاتے ہیں اور اس کے بعد احتساب کا خوفناک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور بدقسمتی سے صدر پرویز مشرف بھی اس دور میں داخل ہو چکے ہیں اور وہ تیزی سے اکیلے ہوتے چلے جا رہے ہیں' آپ قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے گزشتہ روز صدر کے ترجمان میجر جنرل (ر) راشد قریشی پر بھی فالج کا اٹیک ہو گیا اور یوں صدر کا آخری ساتھی بھی ''گراؤنڈ'' ہو گیا۔ جنرل راشد قریشی پچھلے ایک ماہ سے دوستی کا حق ادا کر رہے تھے' وہ تمام محاذوں پر اکیلے لڑ رہے تھے اور بڑی حد تک دشمنوں کا بھرپور مقابلہ بھی کر رہے تھے لیکن ان کی اچانک بیماری سے صدر کا یہ سہارا بھی چھن گیا۔ جنرل راشد قریشی کے بعد اب پوری دنیا میں صرف ایک شخص بچا ہے جو صدر کی ترجمانی کر سکتا ہے اور وہ شخص ڈاکٹر شیر افگن نیازی ہیں' اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر شیر افگن نیازی کو بلاتکان بولنے کا ملکہ دے رکھا ہے' ڈاکٹر صاحب 24 گھنٹوں میں سے 28 گھنٹے بول سکتے ہیں اور اس دوران کسی دوسرے کی بات نہیں سنتے لہٰذا میرا صدر صاحب کو مشورہ ہے وہ فوراً ڈاکٹر شیر افگن نیازی کو اپنا ترجمان مقرر کر دیں اور اس کے بعد تماشا دیکھیں' دنیا بھر کے چینلز ہوں گے اور ان پر ہر پانچ منٹ بعد ڈاکٹر صاحب جلوہ افروز ہوں گے اور صدر صاحب کی بلے بلے ہو جائے گی' اگر صدر صاحب فوری طور پر یہ فیصلہ نہیں کرتے تو پھر میرا مشورہ ہے وہ فوراً باعزت طور پر مستعفی ہو جائیں کیونکہ جنرل راشد قریشی کی بیماری کے بعد صدر صاحب پر ایک اور اٹیک ہونے والا ہے اور اس اٹیک کا نام گرو بلی ہے' استاد عطاء عرف گرو بلی خواجہ سراؤں کا چیف ہے اور اس نے گزشتہ روز صدر پرویز مشرف کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کر دیا ہے۔ گرو بلی نے کل ٹیکسلا میں پریس کانفرنس کی اور اس پریس کانفرنس میں اعلان کیا ''گزشتہ نو برسوں میں ملک دن بدن زوال پذیری کی طرف گامزن رہا اور صدر پرویز مشرف کی پالیسیوں اور غلط فیصلوں کی وجہ سے ملک میں بحران پیدا ہوئے اور مہنگائی نے غریبوں کا جینا محال کر دیا''۔

گرو بلی نے اعلان کیا ''لہٰذا ہم نے وکلاء تحریک اور ن لیگ کے احتجاج میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے' ہم نے ملک بھر میں موجود اپنے تمام چیلوں کو ہدایت کر دی ہے وہ وکلاء تحریک اور ن لیگ کے جلسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں''۔ میں نے جب سے گرو بلی کی یہ خبر پڑھی ہے مجھے اس وقت سے صدر ایوب خان یاد آ رہے ہیں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے' یہ صدر پرویز مشرف پر آخری اٹیک ہے۔ خدا کی پناہ' جس شخص نے ملک کی فوج میں اتنا قطعی اقتدار دیکھا ہو کہ اس نے صرف ٹیلی فون پر امریکہ کو اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت دے دی ہو' جس نے بلوچستان پر چڑھائی اور لال مسجد اور مدرسہ حفصہ کو توپوں سے اڑا دینے کا حکم دے دیا ہو' جس نے دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کی قیادت کو جلاوطن کر دیا ہو اور جس نے ڈاکٹر عبدالقدیر جیسے ہیرو کو اٹھا کر نظر بند کر دیا ہو اور چیف جسٹس آف پاکستان کو گھر میں محبوس کر دیا ہو' اس شخص کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آ جائے کہ خواجہ سرا بھی اس کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کر دیں' اس سے بڑی عبرت کیا ہو گی چنانچہ صدر صاحب کو چاہئے وہ گرو بلی کے اعلان کو قدرت کی آخری وارننگ سمجھیں اور اپنے آپ کو عزت بری کرا لیں۔

ہم اب فرض کرتے ہیں صدر پرویز مشرف گرو بلی کی وارننگ پر بھی توجہ نہیں کرتے تو پھر کیا ہو گا؟ اس کا جواب مجھے مسلم لیگ ن کے راہنما خواجہ آصف اور پیپلز پارٹی کے سینیٹر محمد لطیف کھوسہ نے گزشتہ روز دیا تھا' میری خواجہ آصف سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا 20 جون کو میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری نے صدر پرویز مشرف کے مؤاخذے کا فارمولہ طے کر لیا ہے' جولائی میں صدر پرویز مشرف کے خلاف مؤاخذے کی تحریک پیش کر دی جائے گی لیکن خواجہ آصف کا کہنا تھا حکمران اتحاد صدر کے مؤاخذے کے لیے غیر روایتی طریقہ استعمال کرے گا۔ میں نے خواجہ صاحب سے یہ طریقہ جاننے کی کوشش کی لیکن انہوں نے بتایا ''میں رازداری کا پابند ہوں' بس دو ہفتوں میں بات سامنے آ جائے گی''۔ میری ملاقات رات کو سینیٹر لطیف کھوسہ سے ہوئی تو کھوسہ صاحب نے انکشاف کیا ''ہم نا صرف صدر کے مؤاخذے کی تیاری کر چکے ہیں بلکہ ہم نے نئے صدر کا فیصلہ بھی کر لیا ہے اور یہ بس چند دن کی بات ہے''۔ میں نے جب سے لطیف کھوسہ اور خواجہ آصف کے انکشافات سنے ہیں' میں اس وقت سے پریشان ہوں کیونکہ پاکستانی سیاست اس وقت تار پر چل رہی ہے' تار بہت باریک اور نازک ہے جبکہ حکمران اتحاد کی ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اگر حکمران اتحاد نے جلد سے جلد یہ بوجھ اتارنا شروع نہ کیا تو یہ تار کسی بھی وقت ٹوٹ جائے گی اور ہم دوبارہ جیسے تھے کی پوزیشن پر آ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کرم کرے کیونکہ آنے والے دن بہت خوفناک اور فیصلہ کن ہیں' وزیراعظم نے فوج کو صوبہ سرحد میں آپریشن کی اجازت دے دی ہے اور مجھے خطرہ ہے اس آپریشن کا آغاز کہیں

اسلام آباد سے نہ ہو جائے۔

تاش کے کھیل میں ایک ایسا وقت آتا ہے جس میں کھلاڑیوں نے اپنے اپنے پتے شو کرنا ہوتے ہیں' ہماری سیاست میں بھی ''شو'' کا وقت آ چکا ہے بس چند دن کی بات ہے' صدر مستعفی ہو جائیں گے' ان کا مؤاخذہ شروع ہو گا یا پھر حکمران اتحاد ٹوٹ جائے گا۔ بس چند دن باقی ہیں لیکن ایک بات طے ہے صدر پرویز مشرف صدر ایوب خان سے مختلف انسان ہیں' صدر ایوب نے ایک بار ہائے ہائے سنی تھی اور انہوں نے اقتدار چھوڑ دیا تھا لیکن صدر پرویز مشرف 16 کروڑ لوگوں کی ہائے ہائے سن کر بھی میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ ہمیں صدر مشرف کی اس استقامت کی ضرور داد دینی چاہئے لیکن ساتھ ہی انہیں یہ خبر بھی دینی چاہئے کہ جناب صدر تاریخ میں آج تک کوئی ایسا حکمران زیادہ دیر تک ایوان اقتدار میں نہیں ٹھہر سکا جس کے بارے میں عوام نے ہائے ہائے کا نعرہ لگا دیا ہو چنانچہ آپ بھی اب ایوان اقتدار کے چند دنوں کے مہمان ہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

مؤاخذہ نہیں ہو گا

''وزیراعظم امریکہ سے بہت خوش لوٹے ہیں'' اس کی آنکھوں میں چمک تھی جبکہ میں اس کی
یبلشمنٹ پر حیران تھا' مجھے حیران ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ پاکستانی' امریکی اور یورپی میڈیا بڑے تواتر
سے وزیراعظم کے امریکی دورے کو ناکام قرار دے رہا تھا' یہ واویلا صرف غیر جانبدار میڈیا تک محدود
یں تھا بلکہ وہ تمام صحافی بھی با نگ دہل کلمہ حق کہہ رہے تھے جو وزیراعظم کے خصوصی طیارے پر ان کے
ساتھ امریکہ گئے تھے' لندن میں جس طرح وزیراعظم کا سواگت کیا گیا' لندن سے امریکہ روانگی کے
ت جس طرح تاخیر ہوئی' واشنگٹن میں جس طرح وزیراعظم کو ''خوار'' کر کے ویل کم کیا گیا' صدر بش
کے ساتھ ملاقات کے بعد جس طرح وزیراعظم کو میڈیا کے سامنے پیش کیا گیا اور جس طرح صدر بش نے
زیراعظم کے خیالات پر میڈیا کو آنکھیں ماریں' وزیراعظم کے رفقائے کار اور وفد میں شامل معززین کو
س طرح گلی میں کھڑا کر کے تلاشی کے عمل سے گزارا گیا' وزیراعظم نے جس طرح امریکی ٹیلی ویژن
نلو کو انٹرویوز دیئے اور ان انٹرویوز میں جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا' وزیراعظم نے امریکی بزنس
ینوں اور سرمایہ کاروں کو جس طرح پاکستان میں سرمایہ کاری کی ترغیب دی اور انہوں نے جس طرح
ریکہ میں مقیم پاکستانیوں کو پاکستان میں امن و امان' سلامتی اور جمہوریت کا لیکچر دیا ان تمام وارداتوں
ں کسی بھی جگہ خوشی' عظمت' اطمینان اور کامیابی کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ میں حیران تھا وزیراعظم خوش'
ش کیوں لوٹے ہیں' میں اس کی طرف دیکھتا رہا اور وہ چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا' وہ آصف علی
رداری سے لے کر وزیراعظم تک اور وزیراعظم سے لے کر صدر تک اور صدر سے لے کر جی ایچ کیو تک
م مقتدر حلقوں اور مقتدر ہستیوں کا منظور نظر ہے' وہ پچھلے دس برسوں سے اقتدار کے ایوانوں کا اہم مہرہ
آ رہا ہے' اس نے صدر پرویز مشرف کی ہر نازک موقع پر مدد کی تھی' وہ پہلا شخص تھا جس نے پاکستان
لز پارٹی اور صدر پرویز مشرف کے درمیان رابطے کرائے تھے' جس نے پاکستانی میڈیا میں آصف علی
رداری کیلئے گنجائش پیدا کی تھی اور جو بیک وقت ایوان صدر اور زرداری ہاؤس دونوں کا مشیر ہے چنانچہ
ر دیکھا جائے تو وہ خبروں کا منبع ہے' وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھے بتایا تھا مخدوم امین فہیم وزیراعظم نہیں
ں گے۔ میں نے اس وقت اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا تھا کیونکہ محترمہ اس وقت تازہ تازہ شہید

ہوئی تھیں اور آصف علی زرداری نے چند دن قبل مخدوم امین فہیم کو اپنا وزیراعظم قرار دیا تھا۔ میں نے اس خبر کا سورس اور وجہ پوچھی تو وہ ہنس کر ٹال گیا' الیکشن کے بعد اس کی بات سچ ثابت ہوئی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھے بتایا تھا وزیراعظم پنجاب سے ہوگا' وہ پہلا شخص تھا جس نے بتایا تھا وزیراعظم کوئی نہ کوئی مخدوم ہوگا' جس نے بتایا تھا حکومت جج بحال نہیں کرے گی' جس نے بتایا تھا پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن کا اتحاد ٹوٹ جائے گا' جس نے بتایا تھا آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف کے درمیان غلط فہمیاں جنم لے رہی ہیں اور جس نے بتایا تھا امریکہ صدر پرویز مشرف کو تنہا چھوڑ رہا ہے اور وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھے بتایا تھا وکلاء کی تحریک کمزور ہو جائے گی اور جس نے مجھے اعتزاز احسن کے مستقبل کے بارے میں بتایا تھا' میں نے ہر بار اس کی بات سے اختلاف کیا لیکن اس کی تمام اطلاعات درست ثابت ہوئیں اور سیاست کا قافلہ اس کے بتائے راستے پر آگے بڑھتا رہا' اس نے مجھے اڑھائی برس قبل بتایا تھا آصف علی زرداری اور محترمہ بے نظیر بھٹو اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں پاکستان میں فوج اور امریکہ کی مخالفت کے ساتھ حکومت نہیں کی جا سکتی اور اگر کبھی آئندہ پیپلز پارٹی کی حکومت بنی تو زرداری صاحب اور محترمہ فوج اور امریکہ کو کبھی ناراض نہیں کریں گی۔

میں آج پھر اس کے شاہانہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا اور اس کا کہنا تھا "وزیراعظم امریکہ سے بہت خوش لوٹے ہیں" میں نے اس سے پوچھا "اس خوشی کی وجہ" اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا "وزیراعظم 18 جون کو شرم الشیخ گئے تھے' وہاں ان کی ملاقات صدر بش کے ساتھ ہوئی تھی اور وزیراعظم نے بڑی حد تک صدر بش کو صدر پرویز مشرف کے مؤاخذے پر رضامند کر لیا تھا' صدر بش نے ان سے کہا تھا وہ حتمی جواب چند دنوں میں دیں گے" میں نے پوچھا "اور اب" اس نے مسکرا کر جواب دیا "اور اب صدر بش نے انہیں حتمی جواب دے دیا ہے" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا' وہ بولا "لیکن صدر بش اپنے پرانے دوست کی بے عزتی نہیں چاہتے' ان کا کہنا ہے جو بھی کیا جائے تہذیب اور شائستگی کے دائرے میں رہ کر کیا جائے" میں نے پوچھا "اس کا مطلب ہے پھر مؤاخذہ نہیں ہوگا" اس نے ہاں میں سر ہلا دیا اور فوراً بولا "ہوگا' ہوگا لیکن اس طرح نہیں ہوگا جس طرح تم لوگ توقع کر رہے ہو" میری حیرت میں اضافہ ہو گیا' وہ بولا "تم مجھے ایک سوال کا جواب دو" میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا' وہ بولا "میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری صدر پرویز مشرف سے کیوں خائف ہیں" میں نے عرض کیا "صدر پرویز مشرف کے اختیارات اور بیک گراؤنڈ سے" اس نے ہاں میں سر ہلایا اور اپنے گھٹنے پر ہاتھ مار کر بولا "یہ ہوئی ناں بات' صدر مشرف کے پاس 58 دو ب کے اختیارات ہیں' وہ کسی بھی وقت اسمبلیاں توڑ سکتے ہیں' ان کے پاس مسلح افواج کے سربراہان کی معطلی اور تقرری کے اختیارات بھی

ہیں' الیکشن کمیشن بھی ان کا ماتحت ہے اور بڑی حد تک آئی ایس آئی بھی ان کے قریب ہے' وہ کمانڈو رہے ہیں' انہوں نے 9 برس تک بلاشرکت غیرے اقتدار کے مزے بھی لوٹے چنانچہ سب جانتے ہیں وہ کسی بھی وقت کچھ کر سکتے ہیں" میں خاموشی سے دیکھتا رہا اور وہ بولا "چنانچہ صدر پرویز مشرف اپنے اختیارات استعمال کرنے کی کوشش کریں گے لیکن امریکا انہیں ایسا نہیں کرنے دے گا اور یوں صدر پرویز مشرف مستعفی ہو جائیں گے اور یہ ایک باعزت ترین ذریعہ ہے" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے عرض کیا "تو اس کا مطلب ہے حکومتی اتحاد صدر کا مؤاخذہ نہیں کرے گا" اس نے قہقہہ لگایا اور نرم آواز میں بولا "کر بھی رہا ہے اور نہیں بھی کر رہا" میں نے پوچھا "وہ کیسے" وہ بولا "مؤاخذے کی راہ میں چار بڑی رکاوٹیں ہیں' امریکہ' فوج' تین بڑی سیاسی جماعتیں اور این آر او" میں نے پوچھا "وہ کیسے" وہ بولا "میں بتا چکا ہوں صدر بش اپنے پرانے دوست صدر پرویز مشرف کی توہین نہیں چاہتے اور پاکستان پیپلز پارٹی امریکہ کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گی۔ دوم' صدر پرویز مشرف آرمی چیف رہے ہیں' فوج کے دل میں آج بھی ان کیلئے ہمدردیاں موجود ہیں اور فوج اپنے سابق چیف کو "سویلین" سیاستدانوں کے سامنے جھکنے نہیں دے گی۔ سوم' ملک کی تین بڑی سیاسی جماعتیں صدر پرویز مشرف کے مؤاخذے پر رضامند نہیں ہیں' یہ پارٹیاں پاکستان مسلم لیگ ق' ایم کیو ایم اور اے این پی ہیں اور ان جماعتوں کی رضامندی کے بغیر مؤاخذے کیلئے پارلیمنٹ میں مطلوبہ تعداد پوری نہیں ہو سکے گی لیکن یہ جماعتیں 58 دو ب اور سروسز چیفس کی تقرری کے اختیارات ختم کرنے پر رضامند ہیں اور چار' این آر او ہے' 2007ء میں پاکستان پیپلز پارٹی اور صدر پرویز مشرف کے درمیان سمجھوتہ ہوا تھا' اس سمجھوتے کے نتیجے میں این آر او آئے تھے اور ان این آر او کی وجہ سے محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان واپس آئی تھیں' اس سمجھوتے کے دوران صدر پرویز مشرف کو برطانیہ' امریکہ اور متحدہ عرب امارات نے گارنٹی دی تھی' اس گارنٹی میں یہ شامل تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی صدر کا مؤاخذہ نہیں کرے گی" میں نے حیرت سے پوچھا "تو پھر ہوگا کیا؟" وہ بولا "بہت آسان ہے' صدر پرویز مشرف کے خلاف مؤاخذے کی تحریک پیش کی جائے اور صدر صاحب استعفیٰ دے دیں" میں نے پوچھا "اور ججز کا ایشو" اس نے قہقہہ لگایا اور ذرا سا آگے جھک کر بولا "اس کیلئے ہمیں نومبر کا انتظار کرنا پڑے گا"۔ میں نے اس سے عرض کیا "لیکن میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری کے مذاکرات بے نتیجہ رہے" اس نے قہقہہ لگایا اور کہا "لیکن ہوگا وہی جو میں نے تمہیں بتا دیا"۔

⊘ ⊘ ⊘

بادشاہ سے بھکاری

وینڈی چیمبر لین پاکستان میں امریکہ کی سفیر رہی ہیں' وہ 18 جولائی 2001ء سے جون 2002ء تک سفیر رہیں اور صدر پرویز مشرف کے ساتھ ان کے ''برادرانہ تعلقات'' تھے' وہ آج کل امریکہ کے ایک تھنک ٹینک مڈل ایسٹ انسٹیٹیوٹ کی سربراہ ہیں۔ یہ تھینک ٹینک مشرق وسطیٰ کے توانائی کے بحران' خطے میں سوویت پالیسی' مشرقی وسطیٰ میں تشدد اور مذاکرات اور امریکہ کے مشرق وسطیٰ سے تعلقات جیسے ایشوز پر کام کرتا ہے اور اس کا ہیڈ کوارٹر واشنگٹن میں ہے۔ جنرل (ریٹائر) پرویز مشرف آج کل امریکہ میں اپنے عاشقوں کے جوتوں سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں' پانچ روز قبل وینڈی چیمبر لین نے سابق صدر سے ملاقات کی اور جنرل ریٹائر پرویز مشرف کو مڈل ایسٹ انسٹیٹیوٹ میں ملازمت کی پیش کش کی۔ وینڈی چیمبر لین کا کہنا تھا پرویز مشرف یہ آفر قبول کر لیں تو مڈل ایسٹ انسٹیٹیوٹ میں ان کیلئے پاکستان چیئر قائم کر دی جائے گی اور پرویز مشرف اس چیئر پر ''تشریف'' رکھ کر پاکستان میں امریکی مفادات کے بارے میں ایک کتاب مزید تحریر کر سکیں گے۔ پرویز مشرف کے قریبی ذرائع نے اس پیش کش کی تصدیق کر دی ہے اور یہ اشارے بھی دیئے ہیں کہ پرویز مشرف یہ آفر قبول کر لیں گے۔

میں نے جب سے یہ اطلاع سنی ہے میں اس وقت سے دو معاملات پر حیران ہوں۔ ایک' اگر مڈل ایسٹ انسٹیٹیوٹ پرویز مشرف سے کتاب لکھوانے کیلئے چیئر تشکیل دے رہا ہے تو پھر اسے پرویز مشرف کی چیئر کے ساتھ برادرم ہمایوں گوہر کیلئے بھی ایک چھوٹی لیکن کھلی کرسی لگوانا پڑے گی کیونکہ پرویز مشرف کی پہلی کتاب ''ان دی لائن آف فائر'' عرف سب سے پہلے پاکستان کی طرح یہ کتاب بھی ہمایوں گوہر ہی کو لکھنا پڑے گی۔ آپ کو یاد ہو گا پرویز مشرف کی پہلی کتاب دنیا کی واحد تخلیق تھی جسے ''مصنف'' نے بھی پورا نہیں پڑھا تھا چنانچہ جب بھی صحافی پرویز مشرف کو ان کی کتاب کے کسی اقتباس کا حوالہ دیتے تو وہ کندھے اچکا کر فرماتے تھے ''میں نے اگر کتاب میں یہ لکھا ہے تو میں نے لکھا ہو گا''۔ دو' میں قدرت کے انتقام پر حیران ہوں' اللہ تعالیٰ نے جنرل پرویز مشرف کو اسلامی دنیا کے سب سے بڑے ملک کا سربراہ بنایا تھا' وہ دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت کے صدر تھے' وہ دنیا کی پانچویں بڑی فوج کے کمانڈر بھی تھے' نائن

الیون کے بعد ان کا شمار عالمی میڈیا میں سب سے زیادہ کوریج لینے والی شخصیات میں بھی ہوا' وہ دنیا کی 20 موثر ترین شخصیات میں بھی شمار ہوتے تھے' وہ خود کو اللہ تعالیٰ کی (نعوذ باللہ) مقرب ترین ''ہستی'' بھی سمجھتے تھے اور وہ اس سلسلے میں یہ دلیل دیتے تھے ''میں تین بار خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ چکا ہوں' میں ٹھیک اس جگہ کھڑا ہوا ہوں جہاں حضرت بلالؓ نے اذان دی تھی' وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے مجھے اللہ تعالیٰ نے چار بار موت کے منہ سے بچایا لیکن آج اللہ تعالیٰ کی یہ مقرب ''ہستی'' اور دنیا کی بیس موثر ترین شخصیات میں رہنے والا شخص' دنیا کی پانچویں بڑی فوج کا کمانڈر اور دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت کا صدر امریکہ کے ایک چھوٹے سے تھینک ٹینک میں ملازمت کا متمنی ہے' وہ شخص جس کی آمد پر کبھی لوگوں نے مٹھائیاں تقسیم کی تھیں اور جس کے سات نکاتی ایجنڈے کے بارے میں میاں شہباز شریف نے کہا تھا ''اگر پرویز مشرف اپنے سات نکات میں سے آدھے نکتوں پر بھی نیک نیتی سے عمل کر لیتا ہے تو ہم لوگ پوری زندگی جلا وطنی پر مجبور ہو جاتے'' وہ شخص آج ملک اور بیرون ملک جوتوں سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آج اس کی حالت یہ ہے حکومت پاکستان اس کی جان اور آبرو کی حفاظت کیلئے اس کی رہائش گاہ کو خفیہ رکھنے پر مجبور ہے جبکہ لندن اور امریکہ میں اسے جوتوں سے بچانے کیلئے پولیس اور کمانڈوز کی مدد لینا پڑتی ہے اور وہ آج دنیا کی کسی سڑک پر نہیں نکل سکتا' دنیا میں اس سے بڑی عبرت کیا ہو گی۔

مجھے پرویز مشرف کا یہ انجام دیکھ کر ہندوستان کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اور مسلم ہسپانوی ریاست کا آخری بادشاہ ابو عبداللہ محمد یاد آ رہے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر نے زندگی کی آخری گھڑیاں رنگون میں انگریزوں کی قید میں گزاری تھیں' انگریزوں نے اس کیلئے رنگون میں ایک ایسی ''ہندوستانی چیئر'' تخلیق کر دی تھی جس پر بیٹھ کر بادشاہ سلامت بارشیں گنا کرتے تھے اور اپنے ملاقاتیوں سے حسرت سے کہتے تھے میں وہ بدنصیب ہوں جسے کوئے یار میں تدفین تک کیلئے جگہ نہیں ملے گی۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے کچن' لباس اور جوتوں کیلئے وظیفہ مقرر کر رکھا تھا' انگریز ہرکارے جب وظیفہ دینے آتے تھے تو بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے اور وہ بھیگی ہوئی آواز میں کہتا تھا ''افسوس بہادر شاہ ظفر تم پر افسوس' اللہ نے تمہیں بادشاہ بنایا تھا لیکن تم بھکاری بن گئے'' بہادر شاہ ظفر کی نعش آج بھی رنگون میں دفن ہے اور یہ تاریخ کو زبان حال سے چیخ چیخ کر بتا رہی ہے وہ بادشاہ جو اپنی سلطنتیں دوسروں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں وہ دنیا سے بھکاری بن کر رخصت ہوتے ہیں۔ ابو عبداللہ محمد کا انجام بھی یہی ہوا تھا' اس نے الحمراء کی چابیاں فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا کے حوالے کیں' غرناطہ کے قبرستان سے اپنے آباؤ اجداد کی ہڈیاں نکالیں اور مراکش کے شہر فیض آ گیا۔ اس نے زندگی کی آخری گھڑیاں فیض شہر میں بھیک مانگتے گزاری

تھیں، وہ لوگوں کے سامنے کشکول رکھتا تھا اور کہتا تھا "اللہ کے نام پر غرناطہ کے آخری بادشاہ کو ایک کوڑی دے دو" اگر کوئی راہگیر اسے بڑا سکہ دے دیتا تھا تو وہ یہ سکہ لوٹا کر کہتا تھا "نہیں میں کوڑی سے زیادہ کا حق دار نہیں ہوں" یہ ابوعبداللہ محمد بھی مرنے کے بعد تاریخ کے قبرستان کی کسی گمنام قبر میں سو گیا لیکن اس کی عبرت آج تک جاگ رہی ہے اور پرویز مشرف جیسے لوگوں کا دامن جھٹک جھٹک کر کہہ رہی ہے تقدیر جن لوگوں کو بادشاہ بنا دے انہیں اپنے آپ کو بھکاری نہیں بنانا چاہئے۔ مجھے اس لمحے شاہ ایران بھی یاد آ رہا ہے' شاہ ایران ایسی ہستی تھی جس نے بادشاہت کے غرور میں ایران کا کیلنڈر ایک ہزار سال آگے کر دیا تھا اور ایک بار اس کی گھڑی رک گئی تھی تو پورے ملک کی گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے کر دی گئی تھیں لیکن پھر اس نے بھی امریکہ کی اسی طرح چاکری شروع کر دی جس طرح پرویز مشرف کرتے رہے تھے چنانچہ شاہ ایران جب تہران سے فرار ہوا تو اس نے اپنے سامان میں ایران کی مٹی کے دو ٹرنک بھی رکھوا دیئے لیکن پھر ایک ایسا وقت آیا جب پوری دنیا کے دروازے شاہ ایران پر بند ہو گئے' مصر کے صدر انور السادات کو اس پر رحم آیا اور اس نے اسے مرنے کیلئے بھیک میں چند گز زمین دے دی' شاہ ایران نے خیرات کی اسی زمین پر آخری ہچکی لی تھی' شاہ ایران کی قبر آج بھی قاہرہ میں موجود ہے اور اس کی بے رونقی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے جو حکمران اپنی مٹی سے دغا کرتے ہیں انہیں پناہ کیلئے پرائی مٹی کی بھیک لینا پڑتی ہے۔

جنرل پرویز مشرف کا جرم کیا تھا؟ یہ آج کے سورج کا سب سے اہم سوال ہے۔ پرویز مشرف بنیادی طور پر عوامی توقعات' لوگوں کے جذبات اور لوگوں کے نظریات کے قاتل ہیں۔ انہوں نے اپنے اقتدار کیلئے پورے ملک کو دہشت گردی کی نام نہاد جنگ میں دھکیل دیا تھا' ان کی مہربانی سے پاکستان میں داڑھیاں' نمازیں' روزے اور سجدے جرم بن گئے' انہوں نے امریکہ کو خوش کرنے کیلئے ہزاروں ماؤں کو آنسوؤں کی سزا دی تھی' وہ صرف اپنے اقتدار کیلئے آئین اور انصاف سے کھیلتے رہے' انہوں نے خود کو زمین پر خدا سمجھ لیا تھا چنانچہ ان کے عزائم کے راستے میں جو بھی آیا انہوں نے اسے اڑا دیا خواہ وہ نواب اکبر خان بگٹی ہوں یا لال مسجد کے غازی ہوں یا پھر مدرسہ حفصہ کی معصوم اور بے گناہ بچیاں چنانچہ قدرت نے اپنی دراز رسی کھینچنا شروع کی اور ایک ایسا وقت آ گیا جب پاکستان کی سرزمین پرویز مشرف پر تنگ ہو گئی چنانچہ آج وہ سیکورٹی کے بغیر پاکستان میں بھی کسی سڑک پر قدم نہیں رکھ سکتے اور اپنے اصلی گھر امریکہ میں بھی آزادانہ نہیں پھر سکتے۔ کل کا بادشاہ آج امریکہ میں ملازمت تلاش کر رہا ہے۔ فرڈیننڈ مارکوس جنرل پرویز مشرف کا نظریاتی بھائی تھا' اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا' وہ فلپائن سے بھاگ کر امریکہ پہنچا' امریکہ نے اسے ہونولولو میں پناہ دی اور اس نے آخری عمر پناہ گزینوں کے لئے

مختص وظیفہ لینے کیلئے قطاروں میں کھڑے ہو کر گزار دی۔ مجھے لگتا ہے وہ وقت دور نہیں جب پرویز مشرف بھی وظیفہ خواروں کی قطار میں جا کھڑے ہوں گے۔ میرے ایک بزرگ دوست روز نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے پرویز مشرف کی درازی عمر کی دعا کرتے ہیں' وہ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر عرض کرتے ہیں یا پروردگار جنرل پرویز مشرف کو اتنی عمر ضرور عطا فرما کہ ہم اس پر مقدمہ بنتے اور اسے سزا پاتے دیکھ سکیں۔ میں ان کی دعا سن کر اکثر کہتا ہوں مقدمہ تو شائد ممکن نہ ہو کیونکہ جس ملک میں یحییٰ خان جیسے شخص کو پرچم میں لپیٹ کر دفن کیا گیا ہو اور اس کی قبر کو سلامی پیش کی گئی ہو پرویز مشرف کو عدالت میں وہاں کون پیش کرے گا لیکن ہم دنیا کی عدالت میں پرویز مشرف کو پیش ہوتے اور اپنے جرائم کی سزا پاتے ضرور دیکھیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ ملک فروشوں کی روح قبض کرنے سے پہلے انہیں بھیک کی قطار میں ضرور کھڑا کرتا ہے' وہ انہیں ایک بار بادشاہ سے بھکاری ضرور بناتا ہے اور پرویز مشرف قدرت کے اس چوراہے پر کھڑے ہو چکے ہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

اللہ کی بادشاہی

رانا بھگوان داس صاحب نے مسکرا کر فون بند کر دیا' میں نے پوچھا ''اینی گڈ نیوز'' وہ آہستہ سے بولے'' لارجر بنچ نے جنرل پرویز مشرف کو صدارتی الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی ہے لیکن حکومت 17 اکتوبر سے قبل نتائج کا اعلان نہیں کر سکے گی'' نصر بھائی نے پوچھا '' یہ فیصلہ حکومت کے خلاف ہے یا حق میں'' رانا بھگوان داس مسکرائے اور بڑے محتاط انداز سے جواب دیا'' ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا' عدالت نے پورے دلائل نہیں سنے اور جب تک اصل فیصلہ نہیں آتا اس وقت تک کچھ نہیں کہا جا سکتا'' میں نے عرض کیا'' ہم ایک لمحے کیلئے فرض کرتے ہیں آپ سپریم کورٹ کے جج نہیں ہیں' آپ صرف قانونی ماہر ہیں لہٰذا آپ قانونی ماہر کی حیثیت سے فیصلے کے بارے میں بتائیں'' جسٹس رانا بھگوان داس پچھلے تین دن سے ہمارے ساتھ تھے' ہم ایک گھر میں رہ رہے تھے' سارا دن پیرس میں اکٹھے گھومتے تھے' میرے بڑے بھائی چودھری نصر اقبال اور دیرینہ دوست مبشر شیخ ہمارے گائیڈ اور لیڈر تھے لیکن کسی بھی مرحلے پر جسٹس صاحب نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا' وہ ایک ایک لفظ سوچ کر بولتے تھے' بس وہ میرے والد صاحب کے ساتھ گپ لگاتے ہوئے ذرا سا ریلیکس ہو جاتے تھے لیکن جوں ہی ہم لوگ ان کی رینج میں آتے تھے وہ سپریم کورٹ کے سابق اور موجودہ مقدموں پر گفتگو سے پرہیز شروع کر دیتے تھے' جس وقت لارجر بنچ کا فیصلہ آیا تو اس وقت ہم فرانس کے پرانے بادشاہوں کے محلات شتودی وارسائی میں گھوم رہے تھے' یہ محلات فرانسیسی بادشاہوں نے بنوائے تھے لیکن فرانس میں انقلاب آیا' عوام وارسائی پہنچے' بادشاہ' ملکہ اور اس کی آل اولاد کو اٹھایا اور پیرس شہر میں لا کر موت کے گھاٹ اتار دیا' اس وقت سے آج تک شتودی وارسائی عجائب گھر اور عبرت کی نشانی بن چکے ہیں اور ہر سال 6 کروڑ لوگ ان کے نظارے کیلئے آتے ہیں' رانا صاحب مسکرائے اور چمکتی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بولے'' میں فرض نہیں کر سکتا' میں اس وقت جج ہوں اور ایک جج کو عدالتی فیصلے سے پہلے رائے زنی نہیں کرنی چاہیے'' وہ رکے اور دوبارہ بولے'' لیکن میرا خیال ہے ہمارے ساتھی 28 ستمبر کے فیصلے کی تلافی کا موڈ بنا رہے ہیں' یہ بنچ بڑا زبردست ہے اور انشاء اللہ عدلیہ 17 اکتوبر سے

پہلے ایک اور تاریخی فیصلہ دے گی''

شتودی وارسائی میلوں پر پھیلے محلات ہیں' ان محلات میں دنیا کا قیمتی ترین ماربل' لکڑی' سونا ر کپڑا استعمال کیا گیا' چوبی فرش پر تیس تیس میٹر کے قالین' دیواروں پر سونے کی پچی کاری اور چھتوں پر انی دیوتاؤں کی طاقت کی نقش گیری دیکھنے والوں کی ساری توجہ کھینچ لیتی ہے' محلات کا چپہ چپہ فن اور سن ذوق کی انتہا ہے' ان محلات میں گھومتے ہوئے محسوس ہوتا ہے فن کاروں نے سنگ مرمر کا ایک ایک کڑا چننے کیلئے پورا پورا پہاڑ کاٹا تھا اور تصویر میں ایک رنگ بھرنے کیلئے پوری پوری دھنک نچوڑ دی تھی اور ک فٹ لکڑی حاصل کرنے کیلئے کئی کئی جنگل جڑوں سے اکھاڑ دیئے تھے اور شاہی جولاہوں نے ایک ک تار کیلئے کئی کئی نسلوں کی قربانی دی تھی اور تب جا کر کہیں اس محل کی ایک دیوار' ایک چھت' ایک کھڑکی ر ایک چوکھٹ مکمل ہوئی تھی' میں نے زندگی میں میلوں پر پھیلے بے شمار جنگلات دیکھے ہیں لیکن میلوں پر پھیلا ہوا باغ پہلی مرتبہ دیکھا تھا' اس محل کے باغ میں گھومنے کیلئے منی ٹرین اور گالف کارٹس چلتی ہیں لیکن ن کے باوجود آپ کو صرف باغ سے گزرنے کیلئے دو گھنٹے لگ جاتے ہیں' باغ میں مصنوعی جھیلیں' شکار ہیں اور سینکڑوں فوارے ہیں اور ایک ایک چپے پر بے شمار اقسام کے پھول کھلے ہیں' محل کا سب سے بصورت مقام بادشاہ اور ملکہ کا رہائشی علاقہ ہے' اس علاقے کو کنگ چیمبر اور کوئین چیمبر کہا جاتا ہے' نگ چیمبر میں بادشاہ کا بیڈ روم' کورٹ روم اور ڈرائنگ روم شامل ہے' بیڈ روم کنگ لوئی 14 نے 170ء میں بنوایا تھا اور اس کمرے کی تین بڑی خصوصیات ہیں' اول یہ کمرہ فرش سے لے کر چھت تک وٹ کا نادر نمونہ ہے' اس کمرے میں کوئی ایسی جگہ نہیں جس پر کاریگروں نے اپنی کاریگری اور فن کا ہارنہ کیا ہو' دوم اس کمرے میں بادشاہ کا شاہی بستر اور کرسیاں رکھی ہیں اور یہ کرسیاں' میز اور بستر کا ایک تار بھی اپنی جگہ فن کا نادر نمونہ ہے اور سوم شاہی بستر کے پاؤں کی طرف ایک قد آدم کھڑکی ہے' ٹرکی سورج کے رخ ہے' لوئی 14 طاقت کے گھمنڈ میں جتلا تھا' اس کا حکم تھا سورج کو روز اس کے موں سے طلوع ہونا چاہیے چنانچہ روز رات کے وقت اس کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے جاتے تھے اور جب بادشاہ کی آنکھ کھلتی تھی تو اسے سورج پاؤں سے طلوع ہوتا دکھائی دیتا تھا' لوئی 14 برسوں تک رج کو مسلسل قدموں تلے اگاتا رہا لیکن 1715ء کی ایک صبح سورج بادشاہ کے حکم سے آزاد ہو گیا' اس سورج نکلا لیکن لوئی چودہ کی روح پرواز کر چکی تھی' اس دن عوام کو معلوم ہوا بادشاہ چلے جاتے ہیں لیکن رج باقی رہ جاتے ہیں' میں نے شاہی آرام گاہ میں کھڑے ہو کر شاہی بستر کی طرف دیکھا اور پھر کھڑکی ے باہر جھانکا' کھڑکی میں آج بھی سورج چمک رہا تھا جبکہ شاہی آرام گاہ میں درجنوں سیاح دیواروں پر

چڑھے سونے کو دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے' میں نے رانا صاحب سے پوچھا "دنیا بھر کے بادشاہ خود کو دنیا کیلئے ناگزیر کیوں سمجھتے ہیں" رانا صاحب نے مسکرا کر جواب دیا "شاید دنیا بھر کے بادشاہ بے وقوف ہوتے ہیں"۔

ہم لوگ شتودی وار سائی میں گھوم رہے تھے تو پاکستان سے اطلاع آئی صدر جنرل پرویز مشرف نے پیپلز پارٹی کی مدد حاصل کرنے کیلئے آرڈیننس جاری کر دیا ہے جس کے بعد بے نظیر بھٹو سمیت بے شمار سیاستدانوں کے خلاف جاری مقدمے واپس ہو جائیں گے اور ان کے تمام جرائم معاف ہو جائیں گے' ہمارے ساتھیوں میں سے ایک ساتھی نے اس خبر پر بڑا خوبصورت تبصرہ کیا' اس نے کہا یہ آرڈیننس صدر پرویز مشرف اور بے نظیر بھٹو دونوں کی اخلاقی شکست ہے' دونوں نے ثابت کر دیا ہمارے ملک کی سیاست سے اخلاقیات اور عزت نفس رخصت ہو چکی ہے' میں نے اپنے ساتھی سے اتفاق کیا' صدر پرویز مشرف سیاستدانوں کے احتساب کا نعرہ لگا کر اقتدار میں آئے تھے لیکن آج وہی جنرل پرویز مشرف صرف صدارت کیلئے بے نظیر بھٹو کے خلاف قائم کرپشن کے تمام مقدمات واپس لے رہے تھے' انسان ایسی صدارت کا کیا کرے گا جس کے عوض انسان کو اپنے وقار' اپنی عزت اور اپنے اخلاقی مرتبے سے نیچے آنا پڑے' بے نظیر بھٹو اور پیپلز پارٹی بھی 38 برس سے جمہوریت کے نعرے لگاتی آ رہی تھی لیکن آج یہی پارٹی اور یہی بے نظیر بھٹو کرپشن کے مقدموں سے نکلنے اور اپنے منجمد اکاؤنٹس کی بحالی کے عوض اپنے بنیادی مؤقف سے انحراف کر رہی تھی' مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی اس سمجھوتے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو' مخدوم امین فہیم' رضا ربانی اور ڈاکٹر صفدر عباسی آئینے میں اپنا منہ کیسے دیکھیں گے اور یہ لوگ عوام کا سامنا کیسے کریں گے؟ اس آرڈیننس نے ثابت کر دیا جنرل پرویز مشرف ہوں یا محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستانی سیاست کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد ہے اور یہ مقصد اقتدار ہے اور اس اقتدار کیلئے ہمارے حکمران اپنے تمام دشمنوں کے ساتھ سمجھوتہ کر سکتے ہیں' یہ لوگ کسی بھی سطح پر جا سکتے ہیں' ہمارے ایک ساتھی نے مجھ سے پوچھا "اگر صدر پرویز مشرف محترمہ بے نظیر بھٹو کے جرائم معاف کر سکتے ہیں تو پاکستانی جیلوں میں بند 52 ہزار دوسرے مجرموں کا کیا قصور ہے" میں نے ہنس کر جواب دیا "ان کے دو جرائم ہیں ایک انہوں نے چھوٹا جرم کیا تھا' یہ چند ہزار اور چند لاکھ روپے کے چور اور ڈاکو ہیں اور دوسرا یہ صدارتی الیکشن میں حکومت کی مدد نہیں کر سکتے' اگر ان لوگوں نے اربوں کھربوں روپے لوٹے ہوتے تو آج انہیں مال بھی مل جاتا اور معافی بھی اور اگر یہ صدارتی الیکشن میں ووٹ دے سکتے تو حکومت ان لوگوں کو کال کوٹھڑیوں تک سے نکال کر پارلیمنٹ لے آتی" ہمارے ساتھی نے ہنس کر مشورہ دیا "حکومت کو چاہیے وہ

[illegible]وں میں بند تمام مجرموں اور ملزموں کو صدارتی الیکشن کا حصہ بنا لے تاکہ ملک میں جب بھی صدارتی [illegible]شن کا وقت آئے پاکستان کی ساری جیلوں کے دروازے کھل جائیں اور حکومت ووٹ لے کر تمام [illegible]موں کو جرم کرنے کا ایک ایک اور موقع فراہم کر دے" میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا لیکن رانا [illegible]حب مسکرا کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔

ہم شتودی وار سائی سے باہر نکلے تو ہم لوگ محل کی خوبصورتی اور پائیداری کی تعریف کر رہے [illegible] تمام احباب کا خیال تھا اڑھائی سو سال گزرنے کے بعد بھی محل کی شان و شوکت میں کوئی فرق نہیں [illegible] محل کے فرش سے لے کر چھت تک ایک ایک نقش کی آب و تاب اسی طرح قائم اور دائم ہے اور یوں [illegible]سوس ہوتا ہے بادشاہ سلامت' ملکہ عالیہ' شہزادے' شہزادیاں' وزیر' مصاحب' خادم اور خادمائیں ابھی اٹھ [illegible]ر باہر نکلی ہیں اور چند لمحے بعد واپس آ جائیں گی اور ان کی ایک ایک سانس قانون اور آئین کا درجہ [illegible]تیار کر جائے گی' نصر بھائی نے فوراً کہا "ان بادشاہوں نے جب یہ محل بنایا تھا تو ان کا خیال تھا ہم سدا [illegible]ں کے باسی رہیں گے لیکن جب اختیار اور اقتدار رخصت ہوا تو ہوا کی طرح نکل گیا اور پیچھے صرف [illegible]واریں اور دروازے رہ گئے" ہم سب لوگ خاموش رہے' وہ بولے "بادشاہی نے جب فرانس کے [illegible]شاہوں کا ساتھ نہیں دیا تو یہ پرویز مشرف اور بے نظیر بھٹو کا کیا ساتھ دے گی" وہ دوبارہ بولے "اللہ کی [illegible]ین پر صرف اللہ کی بادشاہی باقی رہے گی اور لوئی ہو یا صدر مشرف یا بش یہ سب ہوا کے جھونکے ہیں' یہ [illegible]ب رخصت ہو جائیں گے" ہم سب شتودی وار سائی سے باہر آ گئے۔

⦸ ⦸ ⦸

آخری امید

"میں اب کہاں جاؤں گا" یہ وہ سوال ہے جو پچھلے تین دن سے صدر (سابق) پرویز مشرف کو کروٹ نہیں لینے دیتا ہوگا' نو برس تک اقتدار اور اختیار کا بلا شرکت غیرے مالک و مختار رہنے والے شخص کیلئے آج دنیا بھر میں پناہ کی کوئی جگہ نہیں' وہ پاکستان میں اس لئے نہیں رہ سکتے کہ وہ اس ملک میں محفوظ نہیں ہیں' ان کے گرد جوں ہی سیکورٹی کا حصار ختم ہوگا' وہ جوں ہی بم پروف گاڑی سے باہر نکلیں گے اور سیکورٹی ایجنسیوں کے اہلکار دائیں بائیں ہو جائیں گے تو ہمارے محبوب صدر (سابق) خودکش حملہ آوروں کے نرغے میں آ جائیں گے' جس کے بعد حکمران اتحاد بھی عوامی دباؤ میں آ کر انہیں گرفتار کر سکتا ہے اور ان پر غداری کا مقدمہ بھی قائم ہو سکتا ہے چنانچہ پرویز مشرف کو پاکستان سوٹ نہیں کرتا' ہمارے محبوب صدر (سابق) سعودی عرب بھی جا سکتے ہیں لیکن اس ملک میں ایک بہت بڑا مسئلہ ہے' ہمارے صدر روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے عادی ہیں جبکہ سعودی عرب میں اعتدال پسندی اور روشن خیالی پر پابندی ہے چنانچہ وہ زیادہ دنوں تک وہاں نہیں رہ سکیں گے' ترکی بھی ان کی منزل ہو سکتی ہے لیکن ترکی فدائیوں سے زیادہ دور نہیں' عراق' ایران اور افغانستان سے کسی بھی وقت کوئی "بھٹکا" ہوا شخص وہاں پہنچ سکتا ہے اور صدر (سابق) کی قیمتی جان کیلئے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے؟ یورپ بھی صدر کا ٹھکانہ ہو سکتا ہے لیکن یورپ کے لوگ سرکاری خزانے سے کسی سابق دوست کی سیکورٹی کا بوجھ نہیں اٹھاتے چنانچہ یورپی ممالک پرویز مشرف کو لمبے عرصے کیلئے برداشت نہیں کریں گے اور رہ گیا صدر کا عزیز ترین دوست امریکہ! وہ امریکہ جس کیلئے صدر (سابق) پرویز مشرف نے اپنے ایمان تک کی قربانی دی تھی' کیا وہ امریکہ پرویز مشرف کو پناہ دے دے گا؟ کیا اس امریکہ کے پاس پرویز مشرف کیلئے گنجائش ہوگی اور یہ وہ سوال ہے جو صدر (سابق) کو تین دن سے کروٹ نہیں لینے دے رہا ہوگا' کیوں؟ کیونکہ صدر (سابق) بھی جانتے ہیں امریکہ نے آج تک اپنے کسی سابق وفادار کو پناہ نہیں دی۔

صدر (سابق) جانتے ہیں امریکی تاریخ کا سب سے وفادار دوست شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی تھا' یورپی پریس اسے "امریکن گورنر" کہتا تھا' وہ امریکی وفاداری میں بہت آگے چلا گیا تھا' شاہ

…ایران میں داڑھی اور پردہ پر پابندی لگا دی۔ اس کے دور میں کوئی باپردہ عورت گھر سے نکلتی تھی تو …ں سرِ عام اس کا برقع پھاڑ دیتی تھی' شاہ ایران نے تمام زنانہ سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں …ٹ کو یونیفارم بنا دیا' شراب نوشی' رقص اور زنا کو فیشن بنا دیا' شاہ کے دور میں ایران دنیا کا واحد ملک تھا …میں کالجوں میں شراب کی دکانیں تھیں' یونیورسٹیوں میں خواتین کی سودے بازی ہوتی تھی اور اس …وہ کاروبار کو قانونی حیثیت حاصل تھی' شاہ کے زمانے میں دو جرنیلوں کے ہم جنس پرست بیٹوں نے …ں میں شادی کی' سرکاری سطح پر نہ صرف ان کی دعوت ولیمہ ہوئی بلکہ شاہ اور اس کی کابینہ نے خصوصی …پر اس تقریب میں شرکت کی۔ شاہ نے امریکہ کی محبت میں ایران میں موجود 42 ہزار امریکیوں کو …رتی حیثیت دے دی لیکن پھر شاہ کی امریکہ نواز پالیسیوں پر بغاوت ہوئی' یہ بغاوت تین سال تک …ی رہی' شاہ نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا لیکن عوام نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا' شاہ نے …ت شاہ پور بختیار کے حوالے کی اور ملک سے فرار ہو گیا' اس کا خیال تھا امریکہ اب اس کی وفاداریوں …لہ دے گا لیکن جوں ہی شاہ ایران کا طیارہ ایران کی حدود سے نکلا' امریکہ نے آنکھیں پھیر لیں' شاہ …مصر گیا' پھر مراکش' پھر بہاماس اور پھر میکسیکو' وہ اس دوران امریکہ سے مسلسل مدد مانگتا رہا لیکن وائٹ …اس کا ٹیلی فون تک نہیں سنتا تھا۔ شاہ ایران سوا سال تک مارا مارا پھرتا رہا لیکن کسی نے اس کی مدد نہ …امریکہ نے اس کے اکاؤنٹس تک "سیز" کر دیئے' آخر میں انورالسادات کام آیا اور اس نے اسے مصر …پناہ دے دی۔ جولائی 1980ء میں قاہرہ میں اس کا انتقال ہوا' انتقال کے وقت اس کے پاس اس …یسری بیوی کے سوا کوئی نہ تھا اور کوئی شخص اس کا جنازہ تک پڑھنے نہیں آیا تھا چنانچہ اسے اس کے بیڈ …ی میں امانتاً دفن کر دیا گیا۔

شاہ ایران کے بعد "اناس تا سیو سو" امریکہ کا دوسرا قریبی دوست تھا' وہ نکاراگوا میں امریکی …ٹ تھا' نکاراگوا میں کمیونزم کی تحریک شروع ہوئی تو امریکہ نے اناس تاسیو سو کو ڈالر اور اسلحہ دے کر …یونزم کے خلاف کھڑا کر دیا۔ تاسیو سو امریکہ کی جنگ کو اپنی جنگ سمجھ کر لڑتا رہا' 1979ء میں نکاراگوا …اس کے لئے حالات مشکل ہو گئے' وہ ملک سے فرار ہوا لیکن جوں ہی اس نے نکاراگوا سے باہر قدم …' امریکا نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا' اس نے امریکہ آنے کی کوشش کی لیکن امریکی حکومت نے …ت نہ دی' یوں اناس تاسیو سو جنگلوں اور غاروں میں چھپ کر زندگی گزارنے لگا' وہ 1980ء میں …پریشانی کے عالم میں انتقال کر گیا اور اس کے قریبی دوستوں نے اسے پیراگوئے کے شہر اسلشن میں …کر دیا' آج لوگ اس کے نام تک سے واقف نہیں ہیں۔ چلی کا آمر جنرل اگارتے اگستو پنوشے …یکہ کا تیسرا دوست تھا' پنوشے نے 1973ء میں سی آئی اے کی مدد سے جنرل ایلینڈ کی منتخب حکومت

پر شب خون مارا تھا‘ وہ اقتدار میں آیا اور اس نے چلی کی عوام کے خلاف آپریشن شروع کر دیا۔ پنوشے 1990ء تک چلی پر حکمران رہا‘ ان 17 برسوں میں پنوشے نے امریکہ کے کہنے پر اپنے ہزاروں شہری قتل کرائے‘ امریکہ کی ناپسندیدہ تنظیموں پر پابندیاں لگائیں اور امریکہ کی خواہش پر اپنے شہریوں کے انسانی حقوق غصب کئے‘ یہاں تک کہ 1990ء میں عوام پنوشے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے‘ وہ مارچ 1990ء میں لندن فرار ہو گیا‘ اس کا خیال تھا برطانیہ اور امریکہ اسکی وفاداریوں کی قدر کریں گے لیکن لندن آتے ہی برطانوی پولیس نے اسے گرفتار کیا اور اسے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا‘ اس نے اس ناروا سلوک پر امریکہ سے احتجاج کیا لیکن امریکی حکومت نے اسے جواب تک دینے کی زحمت نہ کی‘ برطانوی حکومت نے اسے 2000ء میں چلی کے حوالے کر دیا‘ اس کے خلاف مقدمہ چلا‘ 3 دسمبر 2006ء کو اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ دم توڑ گیا‘ اس کی موت پر پورے ملک میں خوشیاں منائی گئیں جبکہ امریکی حکومت نے ایک سطر کا تعزیتی پیغام تک جاری نہ کیا۔ انگولا کا باغی سردار‘ ”جوناس سیومنی“ بھی امریکہ نواز لیڈر تھا‘ وہ برس ہا برس تک انگولا میں امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا‘ نومبر 1992ء میں امریکہ نے اسے کیمونسٹوں کے ساتھ امن معاہدے کا حکم دیا‘ اس نے معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے نتیجے میں جوناس سیومنی بے دست و پا ہو گیا‘ معاہدے پر دستخطوں کے دو ماہ بعد کیمونسٹوں نے ”ہامبو“ میں اس کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کر دیا‘ وہ فرار ہو گیا‘ آج اس واقعہ کو 16 سال گزر چکے ہیں لیکن جوناس سیومنی جان بچانے کیلئے چھپتا پھر رہا ہے اور امریکی حکومت اس کا ٹیلی فون تک نہیں سنتی۔ جنرل نوریگا بھی پانامہ میں امریکہ کا آلہ کار تھا‘ اسے بھی امریکیوں نے کیمونسٹوں کے خلاف استعمال کیا۔ وہ 1990ء تک امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا لیکن امریکہ کی تسلی نہ ہوئی لہٰذا امریکہ نے پانامہ پر حملہ کر دیا‘ صدر نوریگا گرفتار ہوا‘ امریکی ایما پر عدالت نے اسے 40 سال قید بامشقت کی سزا سنا دی اور نوریگا گزشتہ 18 برس سے جیل میں امریکی دوستی کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ فرڈی ننڈ مارکوس 22 برس تک فلپائن میں امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا۔ اس نے فلپائن سے کیمونسٹوں کو چن چن کر ختم کر دیا لیکن 1986ء میں امریکہ ہی نے اس کی حکومت ختم کرا دی‘ مارکوس امریکہ آ گیا‘ امریکہ نے اسے پناہ تو دے دی لیکن اسے وہ عزت اور وہ توقیر نہ دی جس کا وہ حق دار تھا‘ یوں مارکوس نے باقی زندگی ہونولولو کے ایک چھوٹے سے مکان میں گزاری اور امریکہ میں اسے ایک عام پناہ گزین کے برابر وظیفہ ملتا تھا‘ مارکوس 1999ء میں اسی بے بسی کے عالم میں آنجہانی ہو گیا۔ 1979ء ہی میں امریکہ نے رہوڈیشیا میں بشپ ایبل منرور یوا کو موغابے اور نکومو کے مقابلے میں کھڑا کیا‘ بشپ امریکیوں کیلئے لڑتا رہا لیکن جب وہ لڑتے لڑتے کمزور ہو گیا تو امریکہ نے اس کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا اور باقی رہ گیا صدر

ام حسین۔ انقلاب ایران کے بعد امریکہ نے صدام حسین کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا‘ صدام حسین امریکہ کی ایماء پر 22 ستمبر 1980ء کو ایران پر حملہ کیا‘ یہ جنگ 20 اگست 1988ء تک 8 سال ی رہی اور اس میں دس لاکھ افراد ہلاک اور 20 لاکھ زخمی ہوئے۔ صدام حسین 1990ء تک امریکہ کا ست رہا لیکن پھر امریکہ نے تیل کے لالچ میں عراق پر حملہ کر دیا‘ اس جنگ میں 86 ہزار عراقی شہری ید ہوئے‘ 2003ء میں امریکہ نے ایک بار پھر عراق پر حملہ کیا‘ صدام حسین گرفتار ہوا اور امریکی یات پر اسے 30 دسمبر 2006ء کو بغداد میں پھانسی دے دی گئی۔

شاہ ایران سے لے کر صدام حسین تک امریکی تاریخ دوست کشی کی ہزاروں مثالوں سے ری پڑی ہے۔ امریکہ نے دو سو چودہ برس کی تاریخ میں آج تک اپنے ہر دوست کو پرویز مشرف کی رح استعمال کیا اور جب اس کی ضرورت ختم ہو گئی تو اسے ”جمہوریت پسندوں“ کے حوالے کر کے بھول یا‘ امریکی اپنی خارجہ پالیسی کو ”ڈسپوزل ڈپلومیسی“ کہتے ہیں‘ ان کا فلسفہ ہے خریدو‘ استعمال کرو اور یک دو‘ یہ لوگ پرویز مشرف جیسے لوگوں کو کاغذ کے گلاس‘ پلیٹ‘ ٹشو اور گندی جراب سے زیادہ اہمیت یں دیتے۔ یہ لوگ ہمیشہ کیس ٹو کیس اور پراجیکٹ ٹو پراجیکٹ چلتے ہیں اور ان کے دوست جنرل آگستو شے ہوں‘ جنرل رضا شاہ پہلوی ہوں یا جنرل پرویز مشرف یہ لوگ اس وقت تک انہیں دوست سمجھتے ں جب تک وہ ان کیلئے خدمات سرانجام دے سکتے ہیں اور جس دن انہیں محسوس ہوتا ہے یہ شخص ان کی مہ داری“ بنتا جا رہا ہے‘ یہ اس کی قبر تک پر ”سابق“ کی مہر لگا دیتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے در (سابق) پرویز مشرف کے امریکی دوست ان کی فائل بھی اب تک کلوز کر چکے ہیں چنانچہ اب جب ں پرویز مشرف وائٹ ہاؤس فون کریں یا وہ کونڈو لیزا رائس کو مدد کیلئے پکاریں گے تو انہیں جواب ملے گا آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال مصروف ہے‘ آپ تھوڑی دیر بعد فون کیجئے گا“ اور یوں پرویز مشرف کی یاں فون ڈائل کرتے کرتے دم توڑ جائیں گی‘ چنگیز خان نے ایسے لوگوں کے بارے میں صدیوں لے کہا تھا ”جو شخص اپنی قوم کا نہ ہو سکا وہ ہمارا کیا ہو گا“ چنانچہ جو لوگ اپنی قوم کے نہیں ہوا کرتے ان کا جام بھی ہوتا ہے‘ پرویز مشرف اب آخری وقت تک واشنگٹن کی طرف دیکھتے رہیں گے اور انہیں بچانے لیے وہاں سے کوئی ستر واں بیڑا نہیں آئے گا‘ کیوں؟ کیونکہ وہ امریکہ جس نے شاہ ایران کو فراموش کر یا تھا وہ صدر پرویز مشرف کیلئے کہاں آگے بڑھے گا‘ امریکہ ایمان فروشوں کی آخری امید ہوتا ہے اور یہ مید کبھی پوری نہیں ہوتی۔

⦸ ⦸ ⦸

ایک مشورے کا فاصلہ

برطانیہ کی آئرن لیڈی مارگریٹ تھیچر سے کسی صحافی نے پوچھا تھا ''قدرت جب کسی حکمران پر مہربان ہوتی ہے تو اسے کیا دیتی ہے'' مارگریٹ تھیچر نے مسکرا کر جواب دیا ''قدرت اسے اچھے مشیر اور سمجھدار دوست دیتی ہے'' اسی قسم کا جواب صدر رچرڈ نکسن نے بھی دیا تھا' رچرڈ نکسن امریکہ کی تاریخ کا ذہین ترین صدر تھا' نکسن کا آئی کیو لیول 70ء کی دہائی کے تمام صدور سے زیادہ تھا اور افغانستان سے کیوبا اور پولینڈ سے سائبیریا تک دنیا کے تمام ایشوز اس کی ''فنگر ٹپ'' پر ہوتے تھے' نکسن پروفیسر صدر کہلاتا تھا لیکن اس جینئس صدر کے دور میں واٹر گیٹ سکینڈل آیا اور وہ اڑھائی سال بعد فارغ ہو گیا اور کتابیں لکھنے میں معروف ہو گیا' کسی نے نکسن سے پوچھا تھا ''آپ اتنے سمجھدار اور پڑھے لکھے سیاستدان تھے لیکن آپ کی حکومت اڑھائی سال بعد ختم ہو گئی' کیوں؟'' رچرڈ نکسن نے مسکرا کر جواب دیا تھا ''مشیروں کی وجہ سے'' وہ رکے اور دوبارہ بولے ''میرے مشیر ناتجربہ کار' جلد باز اور کوتاہ فہم تھے چنانچہ میرا اقتدار بھی گیا' عزت بھی اور ساکھ بھی'' رچرڈ نکسن نے اس کے بعد بڑے تاریخی الفاظ کہے تھے' انہوں نے کہا تھا ''حکمران کسی بھی شخص کو وزیر بنا دیں لیکن وہ اپنے لئے مشیروں کا انتخاب ہمیشہ سوچ سمجھ کر کریں'' مجھے اس وقت کنفیوشس بھی یاد آ رہا ہے اور ارسطو بھی' چین کے بادشاہ اور نواب بچوں کو دانائی سکھانے کیلئے کنفیوشس کے پاس بھجوایا کرتے تھے اور کنفیوشس مستقبل کے بادشاہوں کو یہ مشورہ دیا کرتا تھا ہمیشہ ٹھنڈے مزاج اور صلح جو لوگوں کو مشیر منتخب کرنا کیونکہ بادشاہوں کی بادشاہت فوجیں نہیں ان کے مشیر چلایا کرتے ہیں اور ارسطو نے سکندر اعظم کو ایتھنز سے رخصت کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا اگر کوئی ملک تلوار کو نیام سے نکالے بغیر فتح ہوتا ہو تو اس کیلئے کبھی جنگ نہ کرنا' تم میدان میں فوجی اور تخت پر دانشور نظر آنا اور یاد رکھو معاف کر دینا اور محبت سے پیش آنا بادشاہوں کی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے اور یہ بھی یاد رکھنا کبھی کسی بے وقوف اور ناکام شخص کو اپنا مشیر نہ بنانا اور کبھی بے وفا کو اپنا ساتھی نہ سمجھنا' مجھے تاریخ اسلام کے مشہور بادشاہ خلیفہ ہارون الرشید کا واقعہ بھی یاد آ رہا ہے' خلیفہ کو بغداد کے مشہور درویش بہلول دانا نے کہا تھا ''جب اللہ تعالیٰ کسی بادشاہ پر خوش ہوتا ہے تو وہ اسے عقل دیتا ہے۔''

آج 2007ء کا سن ہے اور جولائی کی 26 تاریخ ہے' آج صدر جنرل پرویز مشرف کو کستان کا اقتدار سنبھالے پورے سات سال نو مہینے اور چودہ دن ہو چکے ہیں' ان پونے آٹھ برسوں میں م نے صدر پرویز مشرف کی مقبولیت کو اوپر سے نیچے آتے دیکھا' مجھے آج بھی 12 اکتوبر کا دن یاد ہے' س دن لوگ ایک دوسرے کو مبارکبادیں دے رہے تھے' مجھے صدر پرویز مشرف کا سات نکاتی ایجنڈا بھی ہے' میڈیا نے اس ایجنڈے کو نیا آئین قرار دیا تھا' مارچ 2007ء میں میاں شہباز شریف نے لندن ں میرے سامنے اعتراف کیا تھا ''میں نے جیل میں صدر پرویز مشرف کا سات نکاتی ایجنڈا سنا تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا اگر پرویز مشرف آدھے نکتوں پر بھی عمل کر لیں تو پاکستان سے سیاستدان یشہ ہمیشہ کیلئے فارغ ہو جائیں گے'' مجھے یاد ہے احتساب اس سات نکاتی ایجنڈے کا مرکزی نکتہ تھا' ومت نے ''نیب'' بنائی تھی اور نیب نے ''کراس دی بورڈ'' احتساب شروع کر دیا تھا لیکن آنے والے ں میں ''نیب'' سے مسلم لیگ ق برآمد ہوئی' اس کے بعد نیب اور ایجنسیوں کی مدد سے الیکشن کرائے ئے' سیاستدانوں کے ساتھ ''گیو اینڈ ٹیک'' ہوا اور ان سیاستدانوں کی مدد سے پانچ حکومتیں بنائی گئیں' م نے جب نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے کرپٹ ساتھیوں کو صدر صاحب کی وردی پر استری پھیرتے یکھا تو ان کا اعتماد ٹوٹ گیا' اس سے پہلے نائن الیون آیا اور پاکستان نے اپنی تیس برس پرانی افغان لیسی کو یوٹرن دے دیا' حکومت شمالی اتحاد کے ساتھ مل کر مجاہدین کو گرفتار کرتی رہی اور ان کے عوض ریکہ سے ڈالر وصول کرتی رہی' حکومت نے امریکہ کی ہدایت پر وزیرستان میں فوج بھجوا دی اور اپنی ج نے اپنے ہی لوگوں پر گولہ باری شروع کر دی' امریکہ کے حکم پر ملک کو روشن خیال اور اعتدال پسند یا جانے لگا' پاکستان کے تعلیمی نصاب کو مغربی تڑکا لگایا جانے لگا' ملک میں داڑھی' برقعے اور چادر کا ق اڑایا جانے لگا' مدرسوں کو ٹارگٹ کیا گیا' مسجدوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے اور لوگوں کو گھروں سے ٹھا کر غائب کیا جانے لگا' اس دوران ڈاکٹر عبدالقدیر گرفتار ہوئے' ڈاکٹر صاحب سے ٹیلی ویژن پر فی مانی منگوائی گئی اور انہیں گھر میں محصور کر دیا گیا اور اس کے بعد 9 مارچ 2007ء کا دن آ گیا' صدر نے ف جسٹس آف پاکستان کو کیمپ آفس میں بلوایا' استعفیٰ دینے کا حکم دیا' چیف جسٹس نے انکار کیا تو یں ''غیر فعال'' کر دیا گیا' عوام اور وکیل چیف جسٹس کی بحالی کیلئے آگے بڑھے تو حکومت نے انہیں کنے کیلئے پوری طاقت لگا دی' صدر صاحب نے چیف جسٹس کے مقابلے میں جلسے اور ریلیاں شروع دیں' 12 مئی کو کراچی میں گولی چلانے کی اجازت دے دی گئی' چیف جسٹس کے جلسوں کی ''لائیو' وریج روک دی گئی' اخبارات پر سنسر لگا دیا گیا اور کالم نگاروں کے کالموں کی پڑتال شروع ہو گئی' حکومت

نے چیف جسٹس کا ایشو دبانے کیلئے لال مسجد کے معاملے کو ہوا دی' مدرسہ حفصہ کی طالبات کو آنٹی شمیم اور چینی خواتین کو اغواء کرنے کی ترغیب دی اور میڈیا میں ان خبروں کو خصوصی کوریج دلائی گئی اور حکومت نے چیف جسٹس کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کیلئے لال مسجد پر فوجی آپریشن بھی شروع کر دیا' مسجد پر گولہ باری ہوئی اور اس آپریشن کے دوران شہید ہونے والے طلباء اور طالبات کی نعشیں تک غائب کر دی گئیں۔

اگر ہم ان واقعات کا غیر جانبداری سے جائزہ لیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے بعض لوگ صدر پرویز مشرف سے انتہائی غیر سنجیدہ اور غیر دانشمندانہ فیصلے کرا رہے ہیں اور حکومت نے ان لوگوں کی ایڈوائس پر مسلم لیگ ق کی تشکیل سے لے کر لال مسجد پر حملے تک بے شمار غلط فیصلے کئے اور ان فیصلوں کے نتیجے میں صدر مشرف ملک میں تنہا ہوتے چلے گئے' عربی کی کہاوت ہے غلط فیصلہ خطرناک نہیں ہوتا جتنا اس فیصلے پر ڈٹ جانا خطرناک ہوتا ہے اور اگر ہم حکومت کا ٹریک ریکارڈ دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے حکومت نے آج تک نہ صرف غلط فیصلے کئے ہیں بلکہ وہ ان غلط فیصلوں پر ڈٹ بھی گئی تھی چنانچہ آج حالت یہ ہے وہ وزراء جو پچھلے پانچ برسوں سے اقتدار کے مزے لوٹ رہے ہیں وہ بھی سامنے آ کر صدر پرویز مشرف کو سپورٹ کرتے ہوئے گھبرا رہے ہیں' ہمارے شاندار وزیر اطلاعات و نشریات محمد علی درانی تک خاموش رہنے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ شیخ رشید وزیر اطلاعات کا قلمدان چھن جانے کے باوجود ڈس انفارمیشن پھیلاتے رہتے تھے وہ بھی لال حویلی تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور انہوں نے پچھلے دو ہفتوں میں اخبارات کو اپنی تازہ ترین تصویر نہیں بھجوائی' یہ کیوں ہے اور اس صورتحال کے اصل ذمہ دار کون ہیں' اگر کنفیوشس سے مارگریٹ تھیچر تک دنیا کے تمام عقلمندوں اور کامیاب حکمرانوں کو دیکھا جائے تو اس صورتحال کے ذمہ دار صدر کے قریبی مشیر دکھائی دیتے ہیں' صدر کو بدقسمتی سے ایسے مشیر ملے تھے جو جلد باز بھی تھے' جنگجو بھی' غصیلے بھی اور منتقم مزاج بھی لہٰذا یہ لوگ صدر سے ایک کے بعد دوسری غلطی کراتے چلے گئے یہاں تک کہ حکومت تمام اطراف سے دباؤ اور بحرانوں کا شکار ہو گئی' دنیا کے تمام حکمرانوں کو تحمل مزاج اور وسیع القلب ہونا چاہیے لیکن فوجی حکمرانوں کیلئے یہ دونوں خوبیاں ناگزیر ہیں کیونکہ وہ فوجی ہوتے ہیں اور انہوں نے پوری زندگی لڑائی' جنگ اور مار کٹائی کی ٹریننگ لی ہوتی ہے چنانچہ انہیں ہمیشہ ٹھنڈے مزاج کے مشیروں کا انتخاب کرنا چاہیے' سکندر اعظم نے کہا تھا میں میدان جنگ میں جرنیلوں اور دربار میں دانشوروں سے مشورے کرتا ہوں اور جب تک میں ایسا کرتا رہوں گا میں کامیاب رہوں گا لیکن افسوس صدر نے میدان جنگ اور دربار میں تمیز نہ رکھی چنانچہ وہ بند گلی میں آ گئے' آج ان کے سامنے پاکستانی عوام کھڑے ہیں اور پیچھے امریکہ' وہ آگے بڑھتے ہیں تو بھی نقصان

اٹھاتے ہیں اور اگر یوٹرن لیتے ہیں تو امریکہ ان کا دشمن بن جائے گا' یہ سب ان کے مشیروں کا کیا دھرا ہے' ان مشیروں نے انہیں ہمیشہ غلط موقع پر غلط مشورے دیئے اور جب انہیں غلطی کا احساس ہوا تو مشیروں نے انہیں ''ڈٹ'' جانے کا مشورہ دیا' صدر کے سات سال اور نو ماہ تو جیسے تیسے گزر گئے لیکن 20 جولائی کے فیصلے کے بعد محسوس ہوتا ہے حکومت کے پاس غلطی کی کوئی گنجائش موجود نہیں' صدر کے مشیر ایک بار پھر ان کے گرد جمع ہیں اور اگر صدر مشرف نے اس بار بھی ان کا مشورہ مان لیا تو یہ مشیر رہیں گے اور نہ ہی حکومت' ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے حکومت ایک مشورے کے فاصلے پر کھڑی ہے۔

⊘ ⊘ ⊘

”آفٹر آل یو آر اے ہیومن بینگ“

رومی سلطنت (رومن ایمپائر) دنیا کی پہلی بڑی سلطنت تھی‘ تاریخ میں ایک ایسا وقت بھی گزرا تھا جب شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک پوری دنیا رومی سلطنت کی باج گزار تھی‘ روم کا یہ عروج صرف طاقت‘ فوج اور سرمائے کی بدولت نہیں تھا بلکہ رومی علم‘ آرٹ‘ کلچر‘ سائنس‘ روحانیت‘ تعمیرات اور سیاست میں بھی پوری دنیا سے آگے تھے‘ روم شہر کی آبادی 103 قبل مسیح میں دس لاکھ تھی اور یہ دنیا کا پہلا شہر تھا جس کی آبادی نے 10 لاکھ کا ہندسہ عبور کیا تھا‘ پمپئی رومی سلطنت کا شہر تھا‘ یہ شہر حضرت داؤدؑ کے دور میں تعمیر ہوا تھا اور 87 قبل مسیح میں آتش فشاں کے لاوے میں دفن ہو گیا اور یہ دنیا میں عیاشوں کی پہلی جنت تھی‘ اس شہر میں زمانہ قبل مسیح میں شراب خانے‘ ریستوران‘ بیکریاں اور پبلک پارک ہوتے تھے اور اس شہر میں مرد کو مرد اور عورت کو عورت سے شادی کی اجازت تھی اور زیبرا کراسنگ اور کریم کیک اس شہر میں ایجاد ہوئے تھے‘ روم شہر میں قبل مسیح میں 800 حمام تھے اور ہر حمام میں 1600 لوگ بیک وقت غسل کر سکتے تھے اور زمانہ قبل مسیح میں رومی حکومت پورے شہر کو گرم پانی سپلائی کرتی تھی‘ رومیوں نے اڑھائی سو قبل مسیح میں روم سے نیپلز اور نیپلز سے جنوبی ساحلوں تک 765 میل لمبی پکی سڑک بنائی تھی‘ یہ دنیا کی پہلی طویل اور پکی سڑک تھی‘ رومیوں نے 72ء میں روم شہر میں عظیم الشان ایمپی تھیٹر بنایا تھا‘ یہ ایمپی تھیٹر کلوزیم کہلاتا تھا اور اس میں 80 ہزار تماشائی بیک وقت گلیڈی ایٹر کے مقابلے دیکھ سکتے تھے۔

عظیم رومی سلطنت کی شان اس کے بادشاہ تھے‘ یہ بادشاہ سیزر کہلاتے تھے اور ان کی عجیب روایات تھیں مثلاً رومی بادشاہ کے ہاں جب ولی عہد پیدا ہوتا تھا تو یہ اپنی سلطنت میں سے انتہائی عالم فاضل‘ ذہین اور مدبر شخص کا چناؤ کرتے تھے اور اسے ولی عہد کی تربیت کی ذمہ داری سونپ دیتے تھے‘ یہ اتالیق ولی عہد کو دنیاوی‘ روحانی اور عسکری علوم سکھاتا تھا اور جب ولی عہد تخت نشین ہو جاتا تھا تو یہ اتالیق ہمیشہ اس کے پیچھے کھڑا رہتا تھا اور جب بھی بادشاہ کے لہجے میں غرور آتا تھا یا وہ گردن تان کر کوئی غلط حکم صادر کرتا یا پھر وہ کبھی وردی کے گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا تھا تو یہ اتالیق اپنا ہاتھ بادشاہ کے کندھے پر رکھتا تھا اور بادشاہ کے کان پر جھک کر نرم آواز میں کہتا تھا ”سیزر آفٹر آل یو آر اے ہیومن بینگ“ (بادشاہ

سلامت بالآخر آپ بھی انسان ہیں) بادشاہ کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا تھا اور وہ اپنے حکم پر نظرثانی کر لیتا تھا‘ مؤرخین کا متفقہ فیصلہ ہے جب تک رومی بادشاہوں کے کندھوں پر ایسے اساتذہ کے ہاتھ آتے رہے اس وقت تک ”رومن ایمپائر“ قائم رہی لیکن جب اتاری جرنیلوں اور شوکت عزیزوں نے ان اتالیق کی جگہ لے لی تو دنیا کی یہ عظیم سلطنت اپنے ہی پاؤں میں گر کر ریزہ ریزہ ہو گئی اور آج جب روم کے شہری اپنے پرانے مکان ڈھاتے ہیں تو انہیں بنیاد سے کسی نہ کسی ناگزیر شخص کی ہڈیاں‘ میڈلز اور وردی ملتی ہے اور شام تک یہ ساری اشیاء روم کے عجائب گھر میں رکھ دی جاتی ہیں۔

کل 28 نومبر 2007ء تھا اور میں ٹیلی ویژن پر جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف کو پاکستانی فوج کی کمان حاضر سروس جنرل اشفاق پرویز کیانی کے حوالے کرتے دیکھ رہا تھا اور مجھے رہ رہ کر روم کے سیزر یاد آ رہے تھے‘ جناب پرویز مشرف کیلئے یہ ایک انتہائی مشکل اور صبر آزما لمحہ تھا‘ ان کے سامنے ”کمانڈ سٹک“ میز پر لا کر رکھی گئی لیکن انہوں نے رخ پھیر لیا‘ جنرل ریٹائر پرویز مشرف کو سٹک اٹھاتے ہوئے بھی مشکل پیش آ رہی تھی لیکن جنرل اشفاق کیانی نے آگے بڑھ کر ان کی یہ مشکل بھی آسان کر دی‘ جنرل پرویز مشرف نے سٹک نئے آرمی چیف کے حوالے کی اور دیر تک سلامی کے دستوں کو واپس جاتے دیکھتے رہے‘ فوج کے ساتھ اپنے آخری خطاب میں ان کی آواز رندھ گئی اور ان کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں‘ سابق آرمی چیف نے انگلی سے آنکھ صاف کی اور بھرائی ہوئی آواز میں اپنی یادیں تازہ کرنے لگے‘ سابق آرمی چیف پرویز مشرف نے فرمایا ”46 سال کے بعد فوج کو الوداع کہتے ہوئے اس بات کا دکھ ہو رہا ہے کہ کل اس فوج کی کمان میرے پاس نہیں ہو گی“ سابق آرمی چیف نے فرمایا ”مجھے افسوس ہے بعض عناصر اس فوج پر انگلیاں اٹھاتے ہیں‘ یہ بھٹکے ہوئے اور ناسمجھ لوگ ہیں‘ فوج کے بغیر پاکستان کا وجود نہیں ہو سکتا“ جب سابق آرمی چیف جنرل (ریٹائر) پرویز مشرف ان خیالات کا اظہار فرما رہے تھے تو اس وقت بے شمار ”ناسمجھ اور بھٹکے ہوئے لوگ“ خوشیاں منا رہے تھے‘ راولپنڈی اور اسلام آباد کی کچہری میں آتش بازی ہو رہی تھی اور دہشت گرد وکیل ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کر رہے تھے‘ 28 نومبر کی دوپہر جب جنرل صاحب ہاکی سٹیڈیم سے نکلے تو ان کے سینکڑوں ہزاروں منصوبے تاریخ کا حصہ بن چکے تھے اور تاریخ ایک ایسا قبرستان ہے جس میں روم کے سیزروں سے لے کر مصر کے فرعونوں تک دنیا کے ہر ناگزیر شخص کی ہڈیاں دفن ہیں۔

مسلمانوں کی روایت ہے وہ ہمیشہ جانے والوں کی خوبیاں بیان کرتے ہیں‘ آیئے ہم بھی آج جنرل پرویز مشرف کی خوبیاں یاد کرتے ہیں‘ جنرل پرویز مشرف حقیقتاً ایک شاندار انسان ہیں‘ یہ انتہا

نجات

یہ ننھے منے سے ہاتھ' پاؤں' سر اور آنتیں تھیں' لوگ جسموں کے ٹکڑے جمع کرتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے' بشریٰ کے جسم کے ٹکڑے فاصلے پر تھے جبکہ زبیر اور صائمہ کے اعضاء پھاٹک کے قریب پڑے تھے' یہ اعضاء بھی کیا تھے قیمے کا ڈھیر تھے اور لوگ اس قیمے کو ہاتھوں سے سمیٹ کر چادروں میں ڈال رہے تھے' ان تینوں کے سر پٹڑی کے درمیان پڑے تھے اور ان کی آنکھیں کھلی تھیں' شاید یہ آنکھیں اس وقت بھی دیکھ رہی ہوں' شاید ان آنکھوں میں اس وقت بھی روشنی' رنگ اور سائے لہراتے ہوں اور یہ بچے ان چادروں اور جسموں کے ٹکڑے جمع کرتے ان لوگوں کو دیکھ سکتے ہوں' شاید یہ بچے ان لوگوں کی آوازیں اور ان کی سسکیاں بھی سن سکتے ہوں اور ایک دوسرے سے حیرت سے پوچھتے ہوں'' دنیا کے لوگ صرف مُردوں کو سنجیدہ کیوں لیتے ہیں''نعشیں جمع کرنے والے چلتے چلتے ''کانٹے'' تک پہنچ گئے' کانٹے کی دتی کے پاس دو چھوٹے سے سکول بیگ پڑے تھے' لوگوں نے بیگ اٹھا کر دیکھے' بیگوں پر تازہ لہو کے چھینٹے اور انسانی جسم کے لوتھڑے چپکے تھے' ایک نوجوان نے بیگ کھول کر دیکھا' بیگ سے کچی جماعت کا ایک میلا کچیلا قاعدہ نکلا' قاعدے کے پہلے صفحے پر کاربن پینسل سے زبیر رمضان لکھا تھا' نوجوان نے دوسرا بیگ بھی کھول کر دیکھا' اس بیگ میں بھی ایک بوسیدہ قاعدہ تھا اور اس قاعدہ پر صائمہ کا نام لکھا تھا' نوجوان نے یہ بیگ نعشوں کی چادر میں رکھ دیئے' یہاں پہنچ کر کہانی ختم ہوگئی! یہ کہانی شروع کہاں سے ہوئی تھی؟ جی ہاں! اس کہانی کا پہلا آغاز بشریٰ اور رمضان تھے۔

محمد عارف گھوڑے شاہ باغبان پورہ میں سبزی بیچتا تھا' وہ صبح سویرے کھوتی ریڑھی پر سبزی لادتا تھا اور سارا دن گلی محلوں میں ٹماٹر لو' کدو لو کی آوازیں لگاتا تھا' وہ کوٹ خواجہ سعید میں دو مرلے کے مکان میں رہتا تھا' اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں' عارف کے دونوں بیٹے'' کاروبار'' میں اس کا ہاتھ بٹاتے تھے' بشریٰ' محمد عارف کی بڑی بیٹی تھی' یہ بچی آٹھ جماعت پاس تھی اور محمد عارف کے طبقے میں آٹھ جماعتیں اعلیٰ تعلیم سمجھی جاتی ہیں' محمد عارف نے 2000ء میں بشریٰ کی شادی محمد رمضان کے ساتھ کر دی' محمد رمضان کا والد محمد عاشق دھوبی تھا' محمد عاشق کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں' اس کا بڑا بیٹا محمد رمضان ویلڈنگ کا کام کرتا تھا' دوسرے بیٹے محمد شان کی عمر پندرہ سال تھی' وہ ٹافیوں کی فیکٹری میں کام کرتا تھا'

WWW.PAKSOCIETY.COM

تیسرے بیٹے محمد آصف علی کی عمر 13 سال تھی اور وہ پلاسٹک کی جوتیاں بنانے کے کارخانے میں کام کرتا تھا' بیٹیوں میں سے ایک بیٹی کی شادی ہو چکی تھی جبکہ دو بیٹیاں گھر بیٹھی تھیں' محمد رمضان اور بشریٰ کی شادی 2000ء میں ہوئی جس کے بعد محمد رمضان نے ٹھوکر نیاز بیگ کے چودھری ٹاؤن میں دو مرلے کا مکان کرائے پر لے لیا' مکان کا کرایہ' بجلی کا بل اور پانی کا خرچ ساڑھے تین ہزار روپے تھا' رمضان کو ویلڈنگ کے کام میں روزانہ اڑھائی سو روپے ملتے تھے' وہ چودھری ٹاؤن سے روز سیون اپ سٹاپ آتا تھا اور اس سفر کے دوران اس کے ماہانہ تین ساڑھے تین ہزار روپے خرچ ہو جاتے تھے' اللہ تعالیٰ نے 2002ء میں انہیں بیٹے کی نعمت سے نوازا' بشریٰ نے اس کا نام زبیر رکھا' 2005ء میں ان کے ہاں صائمہ پیدا ہوئی' بشریٰ نے ایک دن رمضان کو مشورہ دیا'' آپ کے آنے جانے میں وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور تین ساڑھے تین ہزار روپے بھی کیوں نہ ہم سیون اپ سٹاپ کے قریب کوئی مکان کرائے پر لے لیں'' محمد رمضان کو تجویز اچھی لگی چنانچہ محمد رمضان نے مکہ کالونی میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا' اس کمرے کا کرایہ پندرہ سو روپے تھا' یہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ 14 مارچ 2008ء کو اس کمرے میں شفٹ ہوگئے' بشریٰ کے تین بڑے مسئلے تھے' اول خاندانی غربت' وہ چوتھی نسل سے غریب تھی' اس کا والد غریب تھا' اس کے والد کا والد اور اس کا والد بھی غریب تھا' وہ جس خاندان میں بیاہ کر آئی تھی' اس نے بھی کئی پشتوں سے غربت کے سوا کچھ نہیں دیکھا لہٰذا جب بشریٰ اپنے بچوں کو دیکھتی تھی تو اسے محسوس ہوتا تھا اس نے اپنی خاندانی غربت کو'' ایکس ٹینشن'' دے دی ہے' دوم وہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھی' اس نے آٹھ جماعتیں پاس کی تھیں اور آٹھ جماعتیں پاس لوگوں کی آنکھیں خواب دیکھتی ہیں چنانچہ وہ جب بھی آنکھیں بند کرتی تھی تو اس کے دماغ میں امارت' فراوانی اور آسودگی کے خواب تڑپنے لگتے تھے اور سوم وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتی تھی' اس نے اپنے بچوں کیلئے ایک ایک سکول بیگ اور ایک ایک قاعدہ خرید لیا تھا' وہ اپنے بچوں کو پڑھانے کی کوشش کرتی تھی لیکن اس کے پاس بچوں کو سکول میں داخل کرانے کے وسائل نہیں تھے' اس نے اس مسئلے کا بڑا دلچسپ حل تلاش کیا' اس نے اپنی خالہ کے گھر کو سکول ڈکلیئر کر دیا' اس کی خالہ دیبا واٹن کی بہار کالونی میں رہتی تھی' بشریٰ روز صبح اپنے بچوں کو تیار کرتی' ان کے کندھے پر بیگ رکھتی اور انہیں اپنی خالہ دیبا کے گھر چھوڑ آتی' بچے خالہ دیبا کے گھر کو سکول سمجھتے اور ایک دو گھنٹے وہاں بیٹھ کر پڑھ لیتے اور اس کے بعد بشریٰ انہیں واپس گھر لے آتی' یہ جھوٹ موٹ کا سکول ان بچوں اور بشریٰ کا معمول تھا۔

12 اپریل کا دن بشریٰ کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا' اس دن نہ جانے کیوں بشریٰ کو محسوس ہوا' یہ جھوٹ موٹ کا سکول اس کے بچوں کا مقدر نہیں بدل سکے گا' زبیر ایک دو برس بعد باپ کے ساتھ

ویلڈنگ کی دکان پر جا بیٹھے گا اور صائمہ کسی کے گھر میں جھاڑو پھیرنے کی ذمہ داری سنبھال لے گی' اس کے بچے بھی اپنی ماں کی طرح پراٹھے اور دہی کا خواب دیکھتے دیکھتے بوڑھے ہو جائیں گے' بشریٰ کو محسوس ہوا غربت ایک ایسا وسیع سمندر ہے جس میں وہ اور اس کا خاندان تنکے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور یہ تنکا بھی کسی دن سمندر کی تہہ میں بیٹھ جائے گا' اس رات اس کا خاوند واپس آیا تو وہ بہت تھکا ہوا تھا' بشریٰ نے خاوند کو کھانا کھلایا اور اس کے بعد دیر تک اس کی ٹانگیں دباتی رہی' وہ دونوں رات گئے تک باتیں کرتے رہے' صبح دس بجے رمضان کام پر چلا گیا' بشریٰ نے رمضان کیلئے کھانا پکایا' دونوں بچوں کو تیار کیا' ان کے سکول بیگ لئے' کمرے کو تالہ لگایا اور چابی مالک مکان کے حوالے کر کے کہا ''رمضان آئے تو اسے کہنا کھانا کھا لے' میں خالہ کے گھر جا رہی ہوں'' وہ بچوں کی انگلی پکڑ کر ریلوے پھاٹک پر آئی اور ریل کی پٹڑی پر بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگی' اس دوران جعفرا ایکسپریس سیون اپ پھاٹک کے قریب پہنچ گئی' بشریٰ اٹھی' اس نے بچوں کے کندھوں پر سکول بیگ لٹکائے' انہیں اٹھا کر سینے سے لگایا اور ٹرین کے سامنے کود گئی' ٹرین نے ایک لمحے میں ان تینوں کے چیتھڑے اڑا دیئے' جسم تو ٹریک پر بکھر گئے لیکن سکول بیگ کانٹے کے دستے کے قریب جا گرے' رمضان نے آ کر یہ ٹکڑے دیکھے تو وہ بے ہوش ہو کر گر گیا' لوگ اسے اٹھا کر میو ہسپتال لے گئے' وہ ہوش میں آیا تو اس کے پاس بیوی اور بچوں کے جنازے تک پہنچنے کیلئے کرایہ نہیں تھا' وہ میو ہسپتال کے سامنے کھڑا ہو گیا' ایک رکشے والے نے ترس کھایا اور اسے سیون اپ سٹاپ پر چھوڑ گیا۔

بشریٰ کو خودکشی کئے ہوئے آج پانچ دن ہو چکے ہیں لیکن محمد رمضان کو اس کی خودکشی کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی' وہ اپنے رشتے داروں اور محلے والوں سے پوچھتا ہے ''بشریٰ کو کیا غم تھا' اس کو کیا تکلیف تھی'' لوگ یہ سن کر آنکھوں پر کپڑا رکھ لیتے ہیں' رمضان اور اس کے رشتے دار بہت بے وقوف ہیں' وہ یہ جانتے ہی نہیں غربت جب انتہا کو چھو لیتی ہے تو اس سے نجات کا صرف اور صرف ایک ہی طریقہ بچتا ہے اور اس طریقے کا نام موت ہے اور بشریٰ کو اس سچائی' اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا' بشریٰ جان گئی تھی یہ دنیا اس کے بچوں کو تعلیم' روٹی اور کپڑے نہیں دے سکتی چنانچہ' اس دنیا کو چھوڑ دینے ہی میں اس کی عافیت ہے' بشریٰ اور اس کے بچے چلے گئے لیکن ان بچوں کے سکول بیگ اور مسلے کچلے قاعدے پیچھے رہ گئے ہیں اور ان قاعدوں اور ان بیگوں پر خون کے چھینٹے پڑے ہیں اور یہ چھینٹے اپنا قاتل تلاش کر رہے ہیں' بشریٰ اور اس کے بچوں کا قاتل کون ہے؟ یہ آج کے دن کا سب سے بڑا سوال ہے لیکن افسوس اس حکومت کے کسی وزیر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔

حکومت کیا کرے

وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اٹھنے لگے تو مرحومہ بشریٰ کی ساس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور ان
عرض کیا ''میری ابھی تین بیٹیاں بن بیاہی بیٹھی ہیں' ہم کرائے کے مکان میں رہتے ہیں' ہمارا
ان روزانہ سو روپے کماتا ہے' ہم تیس روپے کا گھی خریدتے ہیں اور چالیس روپے کا آٹا۔ آپ بتائیں
اقی زندگی کیسے بسر کریں گے'' مرحومہ کے خاوند محمد رمضان کی والدہ نے وزیراعظم سے عرض کیا''
صاحب! آپ مہنگائی کو توڑ دو ورنہ ہمارے دوسرے بچے بھی مر جائیں گے'' وزیراعظم بوڑھی
ون کی باتیں سن کر دنگ رہ گئے اور انہوں نے اسی وقت اس خاندان کو مکان فراہم کرنے اور سرکاری
چ پر بچیوں کی شادی کرانے کا اعلان کر دیا' وزیراعظم نے اس خاندان کو دو لاکھ روپے کا چیک بھی پیش
ا' وزیراعظم اس کے بعد ایک کمرے کے اس مکان سے نکلے تو انہوں نے مکہ کالونی کی سڑک بنوانے
آبادی کو دیگر سہولیات فراہم کرنے کا حکم بھی دیا' وزیراعظم ان تمام احکامات کے بعد مکہ کالونی سے
ت ہو گئے لیکن وہ جاتے جاتے اپنے پیچھے بے شمار سوالوں کی گرد چھوڑ گئے۔

پاکستان میں اس وقت محمد رمضان اور بشریٰ جیسے 8 کروڑ لوگ ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جنہیں دنیا
بڑے بڑے معیشت دان خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والی مخلوق کہتے ہیں لیکن یہ بے
رے ایسے لوگ ہیں جنہیں خط غربت کا پتہ ہے اور نہ ہی انہیں یہ معلوم ہے یہ خط شروع کہاں سے ہوتا
اور ختم کہاں ہوتا ہے۔ پاکستان ایک ایسا بدقسمت ملک ہے جس میں چار کروڑ بیس لاکھ لوگوں کے
س اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ کل کیلئے آٹا خرید سکیں' یہ لوگ روز مزدوری کیلئے نکلتے ہیں اور جس دن
یں دو اڑھائی سو روپے کی دیہاڑی مل جاتی ہے یہ لوگ اس دن کا آٹا خرید لیتے ہیں بصورت دیگر یہ
ی کا پیالہ پی کر سو جاتے ہیں' ان چار کروڑ بیس لاکھ اور 8 کروڑ لوگوں میں نہ جانے کتنے لوگ بشریٰ اور
رمضان کی نفسیاتی کیفیت سے گزر رہے ہیں' ان میں کتنے لوگ ہوں گے جو سارا سارا دن ٹرین کے
منے لیٹنے' پل سے چھلانگ لگانے اور زہر کھانے کی ترکیبیں سوچتے ہیں اور شام کو اپنے اس ارادے کو
گلے دن پر ملتوی کر دیتے ہیں' ہمارے وزیراعظم کتنے رمضانوں کے گھر جائیں گے' وہ کتنی بشراؤں کی
یت کریں گے' وہ کتنے محمد عارفوں کو مکان دیں گے اور وہ کتنے عاشق حسینوں کی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے

کرائیں گے' یہ غربت نہ ختم ہونے والا ایک ایسا صحرا ہے جس پر ایک آدھ دن کی بارش کوئی نخلستان آباد نہیں کر پائے گی' اس کیلئے ہمیں ٹھوس اقدامات کرنا ہوں گے' اس کیلئے ہمیں اپنی ترجیحات کو ری شیپ کرنا ہوگا' ہمیں قومی سطح پر غربت کے ناسور' افلاس کے کینسر اور ناداری کی ''ٹی بی'' کا مقابلہ کرنا ہوگا اور پھر کہیں جا کر ہمیں منزل ملے گی' ہم تمام کالم نویسوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے ہم ایسے ڈاکٹر ہیں جو مرض کی تشخیص تو کر لیتے ہیں لیکن ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہوتا' یہ الزام بڑی حد تک درست ہے' بلاشبہ ہم ایسے سرجن ہیں جنہیں مریض کا پیٹ پھاڑنا تو آتا ہے لیکن ہم زخموں کو سینے کے ماہر نہیں ہیں چنانچہ ہم اکثر اوقات آپریشن کے بعد مریض کو آپریشن تھیٹر میں چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں لیکن میں آج یہ گلہ بھی دھو دینا چاہتا ہوں' میں آج سے ایک ایسی بحث کا آغاز کر رہا ہوں جس میں ہم پاکستان کے بنیادی مسائل کا حل تلاش کریں گے' میں اپنے تمام قارئین کو دعوت دیتا ہوں اگر ان کے پاس پاکستان سے غربت ختم کرنے کا کوئی فارمولہ موجود ہے اور وہ محدود پیمانے پر یہ فارمولہ ٹیسٹ کر چکے ہیں اور اس ٹیسٹ کے مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں تو وہ اپنا یہ فارمولہ مجھے بھجوا دیں' میں ان کے فارمولے وقتاً فوقتاً اس کالم میں شائع کرتا رہوں گا' ہو سکتا ہے یہ فارمولہ ارباب اختیار تک پہنچ جائے' وہ اسے ''پک'' کر لیں اور یوں یہ ملک اس ''ٹریک'' پر آ جائے جس کے آخر میں روشنی کاشت ہوتی ہے۔

میں اس بحث کا آغاز کرتا ہوں' جناب وزیراعظم صاحب دنیا میں معیشت کے دو بڑے نظام ہیں' ایک ویسٹرن اکنامک سسٹم ہے اور دوسرا اسلامی نظام معیشت۔ ویسٹرن اکنامک سسٹم میں حکومتیں ملک میں بڑے بڑے منصوبے شروع کرتی ہیں' وہ موٹر ویز بناتی ہیں' ملک میں صنعتوں اور میگا مالز کا جال بچھاتی ہیں' وہ بڑے بڑے بازار اور منڈیاں بناتی ہیں' بینک اور سرمایہ کاری کے ادارے قائم کئے جاتے ہیں اور جب ان اداروں میں معاشی سرگرمیاں شروع ہوتی ہیں تو یہ سرگرمیاں پہلے ملک کے مراعات یافتہ طبقے تک پہنچتی ہیں' اس کے بعد مڈل کلاس کے پاس آتی ہیں اور اس کے بعد خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والے لوگوں تک پہنچتی ہیں۔ شوکت عزیز جیسے معیشت دان اس عمل کو ''ٹریکل ڈاؤن'' کہتے ہیں' معیشت کا یہ نظام اس وقت دنیا کے بے شمار ممالک میں کام کر رہا ہے اور کامیاب بھی ہے' اس نظام میں بے شمار خوبیاں ہیں لیکن اس میں دو انتہائی مہلک خرابیاں بھی ہیں' اس کی پہلی خرابی ٹریکل ڈاؤن ہے' اس نظام کو ٹریکل ڈاؤن ہونے کیلئے کم از کم تیس برس درکار ہوتے ہیں اور یہ تیس برس بھی ایسے ہوں جن میں معیشت کا عمل دن رات جاری رہے' اس سسٹم میں ایک دن کا التواء اس کے ٹریکل ڈاؤن لافلکٹ کو چھ ماہ آگے لے جاتا ہے اور اس کی دوسری خرابی اس کی مادیت پرستی ہے' یہ ایک ایسا نظام ہے جس کے سینے میں دل نہیں' یہ لوگوں کو مشین بنا دیتا ہے اور وہ کریڈٹ کارڈز' سود اور قسطوں کے ایک

جال میں الجھ جاتے ہیں جس سے انہیں موت کے بعد ہی رہائی ملتی ہے لہٰذا یہ سسٹم ہمارے جیسے ملک وٹ نہیں کرتا' اسکی بھی دو وجوہات ہیں' اول ہم مسلمان ہیں اور کوئی سودی نظام کسی مسلمان کو سوٹ کر سکتا' ہم جب کلمہ پڑھ لیتے ہیں تو ہم پر سود اور سودی نظام حرام ہو جاتا ہے چنانچہ یہ معیشت ہمیں ن اور برکت نہیں دے پاتی' دنیا کی چودہ سو سال کی تاریخ میں آج تک کسی اسلامی ملک میں یہ نظام یاب نہیں ہو سکا اور اگر کبھی کسی اسلامی ملک نے اس نظام کے تحت کامیابی حاصل بھی کی تو یہ کامیابی ی تھی' معیشت کا دوسرا نظام اسلامی ہے' اسلامی نظام کے تین بڑے اصول ہیں' پہلا اصول خیرات اسلام میں مال کا وہ حصہ جو مومن کی ضرورت سے زائد ہوتا ہے' اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر جاتا ہے گویا ایک گھر' ایک گاڑی' کپڑوں کے چار پانچ جوڑوں اور ماہانہ خرچ کے علاوہ ہمارے پاس چھ ہے وہ اللہ اور اس کے بندوں کی امانت ہے اور اگر ہم یہ مال ضرورت مندوں تک نہیں پہنچاتے تو خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں' ہم اللہ تعالیٰ کے مجرم ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ اپنے مجرموں کے ساتھ کرتا ہے۔ دوسرا اصول' اسراف سے پرہیز ہے' اسلام فضول خرچی کے ف ہے' اگر اسلامی ریاست کا حکمران دوسرا بلب روشن کر دے' دوسری گاڑی استعمال کر لے' دو سو ایکڑ ایوان بنا لے یا ساٹھ ارکان کی کابینہ بنا لے تو یہ اسراف ہے اور اگر کوئی مسلمان تاجر' کوئی دکاندار' کوئی مایہ کار اور کوئی بیوروکریٹ اپنی آمدنی کا زیادہ تر حصہ نمود و نمائش پر خرچ کر دے تو یہ بھی اسراف ہے ردہ اللہ کا مجرم ہے اور اللہ اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا جو وہ امانت میں خیانت کرنے والے سلمان کے ساتھ کرتا ہے اور اسلام کا تیسرا اصول ترجیح ہے' یہ وہ اصول ہے جس سے اسلامی معاشروں ن تبدیلی آتی ہے' اسلام دنیا کا واحد نظام ہے جو محروموں' ناداروں' بے بسوں اور بے کسوں کو امراء پر رجیح دیتا ہے' اسلام میں جو شخص جتنا محروم ہے اس شخص کو اتنی ہی فوقیت اور ترجیح دی جاتی ہے شائد یہی کی حضرت عمرؓ اپنے کندھے پر آٹے کی بوری اٹھا کر راتوں کو بھوکوں کے گھر جاتے تھے۔

اگر ہماری حکومت' اگر ہمارے وزیراعظم اس ملک کے محمد رمضانوں اور بشراؤں کو ترجیح اول لیں' اگر ہم آج سے اپنی معیشت کا آغاز پاکستان کی کچی آبادیوں اور غریبوں سے شروع کریں تو یقین جیے چند ماہ میں ہمارے ملک میں برکت بھی آ جائے گی اور سکون بھی۔ اللہ تعالیٰ غریب کے دل میں بستا ہے اور جب تک ہم غریب کے دل تک نہیں پہنچتے اس وقت تک ہم اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکیں گے اور ب تک ہم اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچیں گے اس وقت تک ہم پر اس کی برکت کے دروازے نہیں کھلیں گے ور جب تک کسی اسلامی ملک پر اللہ کی برکت کے دروازے نہیں کھلتے اس وقت تک وہ ملک خوشحال نہیں وتا۔ یہ ہے وہ فارمولہ اور یہی ہے وہ کام جو ہماری حکومت کو کرنا چاہئے۔

عمران مرزا جیسے لوگ

زاہد شاہ اٹھ کر چلے گئے لیکن میرے اندر اٹھنے کی ہمت نہیں تھی' کمرے میں یاسیت' دکھ اور افسوس کی ملی جلی کیفیت تھی' میری پلکوں پر آنسوؤں کی نمی اور حلق میں غم کی کڑواہٹ جمی تھی' میں نے ٹشو سے پلکیں صاف کیں' کرسی کے ساتھ ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

عمران مرزا کے ساتھ میری پہلی ملاقات 1998ء میں لندن میں ہوئی تھی' میں ہیتھرو ایئر پورٹ سے گرین سٹریٹ پہنچا اور میں نے جوں ہی گاڑی سے باہر قدم رکھا' ایک نہایت سریلی اور محبت بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''آپ کو لندن کی ٹھنڈی ہواؤں میں خوش آمدید کہتا ہوں'' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا' فٹ پاتھ پر درمیانے قد کا ایک خوبصورت نوجوان کھڑا تھا' اس کا جسم کسرتی تھا' آنکھوں میں چمک تھی اور اس نے ہلکی ہلکی داڑھی رکھی ہوئی تھی' اس نے گرم جوشی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا' اس کے ہاتھ میں محبت کی گرمائش اور جذبات کی حدت تھی' یہ میری عمران مرزا کے ساتھ پہلی ملاقات تھی' زاہد شاہ نے بتایا عمران مرزا جہلم شہر سے تعلق رکھتے ہیں' کسٹم میں انسپکٹر ہیں اور گانے بجانے کے شوقین ہیں' آٹھ نو ماہ پاکستان میں نوکری کرتے ہیں اور گرمیوں میں لندن آ جاتے ہیں' میں نے سوچا یہ لندن یاترا کسٹم کی برکت ہو گی لیکن آنے والے دنوں میں جب بھی میں عمران مرزا سے ملا مجھے اپنی پہلی سوچ پر شرمندگی ہوئی' اس ملاقات کے بعد عمران مرزا لندن میں میرا گائیڈ بن گیا' ہم دونوں کبھی ہائیڈ پارک نکل جاتے' کبھی میوزیم آف نیچرل ہسٹری چلے جاتے' کبھی لائبریری' کبھی پکاڈلی سرکس' کبھی میڈم تساؤ میوزیم اور کبھی کھلی بس پر بیٹھ کر پورے شہر کی سیر کرتے' میں اس دوران عمران مرزا کی شخصیت اور صلاحیتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا' میں نے زندگی میں بے شمار لوگوں کے بارے میں سنا تھا فلاں کو اللہ تعالیٰ یا بھگوان نے بڑا سریلا گلا دیا تھا لیکن عمران مرزا میری زندگی کا پہلا شخص تھا اور ہے جس کے پاس میں نے ایسا گلا دیکھا' قدرت نے اس کے گلے میں وہ ساری گراریاں اور سارے پرزے لگا دیئے تھے جو عام سطحی لوگوں کو کلاسیکل گائیک بناتے ہیں' وہ میوزک کی تمام باریکیاں بھی سمجھتا تھا اور اسے طبلے سے ہارمونیم تک زیادہ تر آلات موسیقی پر عبور بھی تھا' وہ چلتے چلتے کوئی راگ لگاتا تھا تو گورے رک

اس کی طرف دیکھتے تھے' مجھے اچھی طرح یاد ہے' ہم دونوں ماربل آرچ کے ٹیوب سٹیشن سے باہر نکل ...ہے تھے' سٹیشن کی سیڑھیوں پر کوئی نوجوان گورا گٹار کے ساتھ گانا گا رہا تھا' عمران مرزا اس کے پاس ...ڑا ہو گیا' ذرا دیر تک اسے دیکھتا رہا اور اس کے بعد بولا ''تم صرف بجاؤ' میں گاتا ہوں'' گورے نے ...ت میں سر ہلایا اور عمران مرزا نے گانا شروع کر دیا' ہمارے گرد چند لمحوں میں مجمع لگ گیا اور گورے ...گوریاں چٹکیاں اور تالیاں بجا کر اسے داد دینے لگے' عمران مرزا کا گانا ختم ہوا تو مجھے نے گٹار بجانے ...لے گورے کا ہیٹ سکوں سے بھر دیا اور وہ بے سرا گائیک عمران مرزا کو ان نظروں سے دیکھنے لگا جن ...ں صاف لکھا تھا ''اے اجنبی نوجوان تم دوبارہ کب آؤ گے'' انہی ملاقاتوں کے دوران معلوم ہوا عمران ...وانہ صرف کسٹم کے ایماندار ترین انسپکٹروں میں شمار ہوتا ہے بلکہ اس کی ایمانداری بیماری کی حدود کو چھو ...ی ہے اور وہ خود کھاتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو کھانے دیتا ہے یہ بھی معلوم ہوا وہ چھٹیاں گزارنے ...ن نہیں آتا کام کرنے آتا ہے' لندن میں جہلم کے بے شمار لوگ آباد ہیں' یہ لوگ لانڈری سے لے ...ر گروسری شاپ تک مختلف کاروبار کرتے ہیں' عمران مرزا چند ماہ کیلئے کسی جہلمی کی دکان' دفتر یا لانڈری ...اپ میں ملازم ہو جاتا ہے' وہ گانے بجانے کے پرائیویٹ فنکشن بھی کرتا ہے' لندن کے اردو اور پنجابی ...ے ایم چینلز پر کمپیئرنگ اور گلوکاری بھی کرتا ہے اور اس مشقت کے عوض اسے تین چار ہزار پاؤنڈ مل ...تے ہیں' وہ یہ پاؤنڈ پاکستان لاتا ہے اور اس رقم سے اس کے بچوں کی فیس اور کچن کا خرچہ چلتا ہے باقی ...ئی اس کی نوکری تو تنخواہ بڑی مشکل سے اس کی چائے' موسیقی اور مہمان نوازی کا بوجھ اٹھاتی ہے۔

عمران مرزا کی زندگی کے تین المیئے تھے' وہ موسیقی کا جینئس تھا (اور ہے) اللہ تعالیٰ نے اسے ...ر اور سنگیت تحفے میں دیئے تھے لیکن اس ملکوتی تحفے کے ساتھ وہ جہلم میں پیدا ہو گیا چنانچہ وہ خود کو عقاب ...ا ایسا بچہ محسوس کرتا تھا جس کی پرورش مرغیوں میں ہوئی اور زندگی اسے بٹیروں میں گزارنی پڑی' لوگ ...ں کے فن کے قدردان بھی تھے لیکن اس کا مذاق بھی اڑاتے تھے' اس کا دوسرا المیہ نوکری تھی' وہ جمالیاتی ...سوں سے لبریز شخص تھا لیکن اس کے پیٹ کے ساتھ کسٹم کا ڈھول بندھا تھا اور وہ اس ڈھول کو ایمانداری ...سے بجانا چاہتا تھا اور اس کا تیسرا المیہ اس کی سوچیں تھیں' وہ دماغی لحاظ سے بالغ اور وژنری شخص تھا لیکن ...ں کی سوچوں اور اس کے حالات میں بڑا فرق تھا چنانچہ مجھے اس کی ذات میں ایک عجیب سی گھٹن اور ...یشن محسوس ہوتا تھا' وہ مجھے کمرشل معاشرے کا ایک ایسا نان کمرشل تخلیق کار محسوس ہوا جسے معاشرہ تین ...ن پتھروں کی چکی میں پیس رہا تھا' میری عمران مرزا کے ساتھ ملاقاتیں رہنے لگیں' وہ کبھی اسلام آباد ...جاتا اور کبھی میں اس کے پاس جہلم چلا جاتا' وہ جہلم میں بہت پاپولر تھا' لوگ اس کی عزت کرتے تھے' وہ

اس لوئیر مڈل کلاس شہر کا ثقافتی رخ ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا‘ اس نے شہر میں میوزک کی اکیڈمی بنا رکھی تھی اور شہر کے بے شمار نوجوان اس اکیڈمی میں میوزک کی تربیت لیتے تھے‘ وہ جہلم میں ہر سال جشن بہاراں بھی کراتا تھا‘ یہ سات روز کا میلہ ہوتا تھا جس میں قومی سطح کے گلوکار آتے تھے‘ میں نے اس میلے میں غلام علی کو آتے اور گانے سے پہلے عمران مرزا کے گھٹنے چھوتے دیکھا تھا‘ اس دوران اس کی دو سی ڈیز بھی آئیں‘ وہ ریڈیو‘ ٹیلی ویژن اور تھیٹر کے بے شمار پروگراموں میں بھی آیا اور اس نے سننے والوں پر اپنے ٹیلنٹ کی دھاک بھی بٹھا دی لیکن بدقسمتی سے وہ مارکیٹ ویلیو نہ بن سکا اس کا فن اور ٹیلنٹ اسے روٹی اور کشادگی نہ دے سکا اور اس کی معاشی اور سماجی گھٹن قائم رہی۔

پھر وہ اچانک میرے رابطے سے کٹ گیا اور مہینوں اس کی کوئی خبر نہ ملی‘ چند دن قبل زاہد شاہ میرے پاس آئے اور انہوں نے انکشاف کیا‘ عمران مرزا پچھلے سال سے ’’برین ٹیومر‘‘ میں مبتلا ہے‘ اس کے سر میں ایسے مقام پر کینسر نکل آیا ہے جہاں سے پورے دماغ کو خون سپلائی ہوتا ہے‘ کینسر کی وجہ سے اس کا پورا جسم بے حرکت ہو گیا تھا اور وہ پورا سال بستر پر بے حس و حرکت پڑا رہا تھا‘ اب ڈاکٹروں نے اس کے دماغ سے مثانے تک ایک مصنوعی نالی لگا دی ہے جس کے ذریعے کینسر کا پانی نکلنا شروع ہو گیا ہے اور وہ اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہو گیا ہے‘ میرے لئے یہ خبر ایٹمی دھماکے سے کم نہیں تھی‘ میں نے شاہ جی سے پوچھا ’’عمران مرزا کے علاج کی کوئی صورت موجود ہے‘‘ شاہ جی نے بتایا ’’پاکستان میں اس مرض کا کوئی علاج نہیں ہاں البتہ برطانیہ میں لیزر کے ذریعے اس کا کینسر ختم کیا جا سکتا ہے لیکن اس کیلئے 60 ہزار پاؤنڈ کی ضرورت ہے اور عمران مرزا کا خاندان اتنی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا‘‘ شاہ جی کا کہنا تھا ’’تم کسی سرکاری محکمے سے عمران مرزا کیلئے فنڈز کا بندوبست نہیں کر سکتے‘‘ میں نے دکھی لہجے میں جواب دیا ’’نہیں‘‘ شاہ جی نے حیرت سے میری طرف دیکھا‘ میں نے عرض کیا ’’عمران مرزا کسی جرنیل‘ وزیر‘ مشیر اور کسی کرپٹ سیاستدان کا بیٹا نہیں چنانچہ حکومت کا کوئی محکمہ اس کیلئے فنڈز جاری نہیں کرے گا‘‘ شاہ جی نے پوچھا ’’پھر ہم کیا کریں‘‘ میں نے عرض کیا ’’ہمیں برطانیہ میں موجود پاکستانیوں سے رابطے کی کوشش کرنی چاہیے‘ اللہ کرے کسی کے دل میں عمران مرزا کیلئے رحم پیدا ہو جائے اور وہ اس کے علاج کے اخراجات کا بندوبست کر دے‘‘ شاہ جی چلے گئے لیکن میں اس دن سے سوچ رہا ہوں اس ملک میں عمران مرزا جیسے لوگ کہاں جائیں اور کیا اس ملک میں علاج معالجے کی ساری سہولتیں صرف حکمران طبقے تک محدود ہو کر نہیں رہ گئیں! میں نے سوچا کیا اس ملک میں عمران مرزا جیسے لوگوں کے پاس مرنے کے سوا بھی کوئی آپشن بچتا ہے‘ میرے پاس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا‘ ہو سکتا ہے آپ کے پاس موجود ہو!

آپ جانیں اور اللہ تعالیٰ جانے

عبدالحلیم اور نواب بی بی کا معاملہ درمیان ہی میں رہ گیا‘ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ی حالات میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی اور اس تبدیلی نے کالموں اور تجزیوں کا رخ بدل دیا اور یوں ں عبدالحلیم اور نواب بی بی کی تکلیف کو بھولتا چلا گیا۔ عبدالحلیم کا تعلق پشاور سے ہے جبکہ نواب بی بی وجرانوالہ کی رہنے والی ہیں۔ عبدالحلیم کے والد سکول ٹیچر ہیں اور پاکستان جیسے معاشرے میں ایک ول ٹیچر کی زندگی کس قدر مشکل ہوتی ہے اس کا اندازا صرف اساتذہ لگا سکتے ہیں۔ دنیا میں زندگی زارنے کیلئے تین اشیاء انتہائی ضروری ہوتی ہیں‘ مناسب آمدنی‘ عزت اور سماجی رتبہ جبکہ بدقسمتی سے رے ملک میں اساتذہ کے پاس یہ تینوں چیزیں نہیں۔ ہمارے اساتذہ کی آمدنی برصغیر پاک و ہند میں ب سے کم ہے‘ معاشرے نے استاد کو اس کی عزت سے محروم کر رکھا ہے اور پیچھے رہ گیا سماجی رتبہ تو وقت رنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں استاد تیسرے درجے کی مخلوق بنتا جا رہا ہے چنانچہ پاکستان میں تاد کی زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ عبدالحلیم کے والد بھی جیسے تیسے اپنے خاندان کا پیٹ لتے رہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے لیکن جوں ہی عبدالحلیم نے 19 ویں برس میں قدم ا‘ وہ بیمار ہو گیا اور وہ مختلف ڈاکٹروں سے ہوتا ہوا ہسپتال پہنچا اور وہاں جا کر اسے معلوم ہوا وہ کینسر جیسے ذی مرض میں مبتلا ہے۔ یہ خبر عبدالحلیم کے خاندان کیلئے قیامت سے قبل قیامت تھی‘ اس قیامت کی دو ہات تھیں ایک وجہ کینسر کا موذی مرض تھا۔ کینسر اس وقت دنیا کا سب سے خوفناک مرض ہے‘ دنیا میں ال 50 لاکھ لوگ اس مرض کے ہاتھوں جان دے دیتے ہیں اور سائنس دان ایک سو سال کی تحقیق باوجود ابھی تک اس کا کوئی توڑ نہیں نکال سکے۔ دوسری وجہ‘ اس مرض کا علاج تھا‘ کینسر کا علاج انتہائی ہے اور عبدالحلیم کے والد کے لئے ادویات کے اخراجات پورے کرنا ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹروں نے لحلیم کیلئے ’’میبتھرا‘‘ کا انجکشن تجویز کیا تھا‘ ڈاکٹروں کا خیال تھا اگر عبدالحلیم کو 8 انجکشن لگ جائیں تو کی زندگی بچ سکتی ہے۔ عبدالحلیم کے والد جیب میں چار ہزار روپے ڈال کر انجکشن لینے گئے تو پتہ چلا انجکشن ایک لاکھ 60 ہزار روپے میں ملتا ہے‘ وہ استاد تھے چنانچہ انہوں نے فوراً ایک لاکھ 60 ہزار

روپے کو 8 سے ضرب دی' پتہ چلا یہ 12 لاکھ 80 ہزار روپے بنتے ہیں' ماسٹر صاحب نے اپنے سارے اثاثہ جات کی مالیت معلوم کی تو پتہ چلا اگر وہ اپنی تمام جائیداد اور اثاثے بھی بیچ دیں' وہ گھر کے سارے برتن' سارے ٹین ڈبے' تمام بکس' سارے صندوق' پورے خاندان کے کپڑے حتیٰ کہ اپنے خاندان کے سارے کمبل اور رضائیاں بھی بیچ دیں تو بھی ان کے پاس تین' چار لاکھ روپے سے زائد رقم جمع نہیں ہو پائے گی' وہ پریشان ہو گئے اور اسی پریشانی کے عالم میں انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا' میں نے انجکشن بنانے والی کمپنی سے رابطہ کیا' کراچی میں فارماسیوٹیکل کے مالکان کی تنظیم کے صدر کو فون کیا اور اپنے چند احباب اور دوستوں سے درخواست کی لیکن مسئلے کا کوئی حل نہ نکلا' یہ تمام احباب پوری کوشش کے باوجود انجکشن کی قیمت میں صرف چند ہزار روپے کمی کرا پائے۔ یوں ماسٹر صاحب کا مسئلہ جوں کا توں رہا۔ میں اسی پریشانی میں تھا کہ 27 دسمبر کا واقعہ پیش آ گیا اور معمول کی ساری چیزیں آگے پیچھے ہو گئیں۔

میں افراتفری کے اس موسم میں عبدالحلیم کی تکلیف کو بھول گیا لیکن کل اچانک مجھے عبدالحلیم یاد آیا اور میں نے فوراً اس کے لواحقین سے رابطہ کیا' معلوم ہوا عبدالحلیم ابھی تک ہسپتال میں لیٹ کر میرا انتظار کر رہا ہے' میں شرمندگی اور تاسف کے شدید احساس میں غرق ہو گیا اور مجھے محسوس ہوا یہ معاشرہ کس قدر سنگ دل ہے' اس ملک میں ہم عبدالحلیم جیسے ہزاروں نوجوان زندگی اور موت کی کشمکش میں چھوڑ دیے جاتے ہیں' ہماری حکومتیں کس قدر بے رحم ہیں' ان کے پاس صدر' وزیر اعظم اور وزراء کی حفاظت کیلئے اربوں روپے ہوتے ہیں' ہماری حکومتیں صدر کیلئے جہاز' گاڑیاں اور جیمرز خریدنے کیلئے کروڑ روپے لگا دیتی ہیں لیکن ان کے پاس عبدالحلیم جیسے بچوں کیلئے دوا اور ڈاکٹر نہیں ہوتے' یہ ملک الیکشن جیسی ''حماقت'' پر 6 ارب روپے لگا دیتا ہے لیکن اس کے پاس عبدالحلیم کے لئے 12 لاکھ 60 ہزار روپے نہیں ہوتے اور ہم لوگ کس قدر ظالم ہیں' ہم الیکشن مہم پر دو دو کروڑ روپے لگا دیتے ہیں لیکن ہمارے پاس عبدالحلیم جیسے ووٹر کے علاج کیلئے پیسے نہیں ہوتے۔ یہ نظام' یہ حکومت اور ہم سب لوگ ظالم' بے حس اور سنگ دل ہیں' اگر سنگ دلوں کے اس ملک میں کوئی دردِ دل رکھنے والا شخص بچا ہو تو عبدالحلیم اس نیک انسان کا راستہ دیکھ رہا ہے' وہ دردِ دل رکھنے والا شخص عبدالحلیم کے لواحقین سے 0300-5937291 پر رابطہ کر سکتا ہے۔ یہ بچہ ایسے لوگوں کو دعا کے سوا کچھ نہیں دے سکتا' ساڑھے بارہ لاکھ روپے میں اللہ تعالیٰ کا قرب اور ساتھ زیادہ مہنگا نہیں۔

گوجرانوالہ کی نواب بی بی بھی عبدالحلیم کی طرح ایک ضرورت مند خاتون ہیں' میں اکتوبر 2007ء سے اس خاتون کے بارے میں لکھنا چاہتا تھا لیکن سیاسی حالات اور ذاتی معروفیات

آڑے آتی رہیں۔ نواب بی بی جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں' انہوں نے لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پالا' دونوں بچیاں 27 اور 29 برس کی ہو چکی ہیں اور دونوں کی شادی کی عمر گزرتی چلی جا رہی ہے لیکن نواب بی بی کے پاس وسائل نہیں ہیں' نواب بی بی زندگی کی چکی میں پس پس کر ہیپاٹائٹس سی کی مریضہ ہو چکی ہیں' یہ خاندان کرائے کے مکان میں رہتا ہے اور اس کی واحد کفیل نواب بی بی ہیں۔ یہ خاندان نا ختم ہونے والے مصائب اور مسائل میں گھر چکا ہے اور ان مسائل کی وجہ سے ان لوگوں کیلئے موت زندگی سے زیادہ بامعنی اور خوبصورت ہو چکی ہے' یہ لوگ اس کالم کو آخری سہارا سمجھ رہے ہیں' اگر کوئی صاحب ثروت' کوئی سیٹھ' کوئی بزنس مین اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کوئی امین اس خاندان کا ہاتھ پکڑ لے' کوئی دردِ دل رکھنے والا شخص نواب بی بی کا علاج کرا دے' اس کی بچیوں کا جہیز بنا دے' بیٹے کو نوکری پر لگا دے اور ان کو مناسب ماہانہ خرچ دے دے تو یہ خاندان زندگی کی طرف واپس لوٹ سکتا ہے۔ اس خاندان سے 0321-6487767 پر رابطہ کیا جا سکتا ہے یا پھر اکاؤنٹ نمبر 6268-2 الائیڈ بینک پیپلز کالونی برانچ گوجرانوالہ (0730) میں رقم جمع کرائی جا سکتی ہے۔

میں نے برسوں پہلے اپنے ''بابے'' سے پوچھا تھا ''لوگ غریب' مسکین' نادار اور بیمار کیوں ہوتے ہیں'' میرے بابے نے حیرت سے میری طرف دیکھا تھا' میں نے عرض کیا تھا' ''ہم سب لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں' اللہ تعالیٰ ہمارے چھوٹے سے چھوٹے خلئے میں جنم لینے والی تکلیف تک سے واقف ہوتا ہے' وہ یہ جانتا ہے کس شخص میں تکلیف برداشت کرنے کی کتنی ہمت اور سکت ہے اور دنیا بھر کے مسکین' نادار' غریب اور بیمار بھی اللہ تعالیٰ کے در پر گڑگڑاتے رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے مسائل حل کیوں نہیں کر دیتا' وہ انہیں شفاء کیوں نہیں دیتا' وہ ان کی غربت اور ناداری دور کیوں نہیں کرتا' اللہ تعالیٰ ان بے بس لوگوں کا امتحان کیوں لیتا ہے؟'' میرے بابے نے قہقہہ لگایا تھا اور اس کے بعد فرمایا تھا ''اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا امتحان نہیں لیتا' وہ ان لوگوں کے ذریعے معاشرے کے صحت مند' صاحب ثروت' بااختیار' بااقتدار اور باوسیلہ لوگوں کا امتحان لیتا ہے' اگر کسی محلے میں کوئی بیمار شخص دوا کو ترستا ہوا مر جاتا ہے تو اس کی موت اس محلے کے تمام باوسیلہ' بااقتدار' بااختیار اور دولت مند لوگوں کا امتحان ثابت ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ اس موت کا ذمہ دار ان تمام لوگوں کو سمجھتا ہے اور حشر کے دن ان تمام لوگوں کو اس غفلت' اس کنجوسی اور اس بے حسی کا جواب دینا پڑے گا'' میرے بابا جی بولے ''یہ وہ حقیقت ہے جس سے حضرت عمرؓ واقف تھے چنانچہ انہوں نے فرمایا تھا' اگر دجلہ کے کنارے کتا بھی پیاسا مر گیا تو قیامت کے دن میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاؤں گا'' حضرت عمرؓ جانتے تھے ان کی سلطنت کے تمام مساکین' غریب' نادار اور بیمار

حتیٰ کہ جانوروں تک ان کی ذمہ داری اور ان کے اقتدار کا امتحان ہیں' حضرت عمرؓ کی طرح دوسرے صحابہ کرامؓ بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے چنانچہ یہی وجہ تھی وہ اپنے پاس ضرورت کے مطابق رقم رکھتے تھے اور اپنی آمدنی کا باقی حصہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے اگر انتقال کے وقت ان کے گھر میں دولت ہوئی اور اس دوران شہر میں کوئی ضرورت مند بھی موجود پایا گیا تو یہ دولت ان کی ساری نیکیاں کھا جائے گی" میرے بابے نے کہا تھا "اگر اللہ تعالیٰ کے امتحان میں پاس ہونا چاہتے ہو تو آگے پیچھے نظر رکھا کرو' لوگوں کی حاجتیں پوری کیا کرو"

میں آج عبدالحلیم اور نواب بی بی کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں' میں سمجھتا ہوں' میرا فرض ادا ہو گیا اب اس کالم کو پڑھنے والے جانیں یا اللہ تعالیٰ جانے۔

⊘ ⊘ ⊘

عنبرین تمہارے لئے

میں نے اخبار سے تصویر کاٹی' سفید کاغذ پر لگائی اور میز پر رکھ دی' میری آنکھوں کے گوشوں پر گرم نمکین پانی کے قطرے تھے' یہ قطرے لکیر بنانا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں پلکوں پر سنبھال لیا' میں عنبرین کے دکھ کو بہنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ ہمارے آنسو جذبات کی دنیا کی اینٹی بائیوٹک ہیں' یہ جب آنکھوں سے باہر آ جاتے ہیں تو دکھ کم ہو جاتا ہے' انسان کو ریلیف مل جاتا ہے اور یہ ریلیف اسے پرافٹ اینڈ لاس کی دنیا میں واپس لے جاتا ہے چنانچہ آپ اگر کسی کے دکھ کو زیادہ وقت دینا چاہتے ہیں تو اپنے آنسوؤں کو سنبھال لیں' وہ دکھ آپ کے خون کے ایک ایک قطرے کا حصہ بن جائے گا چنانچہ میں نے عنبرین کے حصے کے آنسو روک لئے' اگلے دن ممبئی میں دہشت گردی ہوئی اور عنبرین کی تصویر ممبئی کے تراشوں میں دب گئی' میں عنبرین کو بھول گیا لیکن آج صبح میں نے میز سے اخبار اور تراشے ہٹائے تو اس کی تصویر ایک بار پھر میرے سامنے آ گئی۔ یہ تصویر دو تصویروں کا مجموعہ تھی' ایک بڑی تصویر تھی جس میں میز پر ایک چھوٹی سی بچی پڑی تھی' بچی سفید چادر میں لپٹی تھی' درمیانی عمر کی ایک خاتون نے بچی کے پاؤں پکڑ رکھے تھے' خاتون کے ہونٹ کھلے تھے اور چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے' یوں محسوس ہوتا ہے خاتون دکھ اور تکلیف سے چیخ رہی ہے' بچی کے سرہانے ایک درمیانی عمر کا مرد کھڑا تھا' مرد آسمان کی طرف منہ اٹھا کر چیخ رہا تھا' اس کا کھلا منہ ایک دہائی' ایک فریاد دکھائی دے رہا تھا' اس بڑی تصویر کے اندر ایک چھوٹی سی تصویر تھی' یہ تصویر کلوز اپ تھا اور اس تصویر میں ایک نہایت ہی خوبصورت بچی سو رہی تھی' تصویر کے نیچے کیپشن درج تھا "حیدر آباد کی عنبرین کے والدین اس کی لاش پر بین کر رہے ہیں"۔

حیدر آباد شہر میں 25 نومبر 2008ء کو ایک "معمولی" سا واقعہ پیش آیا' حیدر آباد کے رکشہ ڈرائیور غازی خان کی دو سال کی بچی عنبرین کو سانس کی تکلیف ہوئی' بچی کے ماں باپ اسے ہسپتال لے گئے' ڈاکٹر نے بچی کیلئے دوائیاں لکھ کر دیں لیکن بچی کے والدین کے پاس دواؤں کیلئے پیسے نہیں تھے چنانچہ وہ دوائیاں نہیں خرید سکے' بچی چار دن بیمار رہی اور بیماری کے عالم میں انتقال کر گئی۔ دنیا سے رخصت ہونے والے تمام انسانوں کو کفن اور دفن کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کیلئے بھی رقم چاہئے ہوتی ہے' عنبرین کے والدین کے پاس اگر رقم ہوتی تو وہ اسے دوائیں ہی خرید دیتے۔ ان لوگوں نے بچی کی

لاش اٹھائی اور اسے ایدھی سنٹر لے آئے۔ یہ دونوں تصویریں ایدھی سنٹر میں لی گئی تھیں۔ آپ اگر یہ تصویر دیکھتے تو آپ کو اس مردہ بچی کے چہرے پر اپنی زندہ بچیوں کا عکس نظر آتا کیونکہ ہم سب کی بچیاں جب سوتی ہیں تو وہ عنبرین کی طرح معصوم دکھائی دیتی ہیں لیکن ہماری بچیوں اور اس بچی میں ایک فرق تھا۔ ہماری بچیاں نیند کے بعد جاگ جاتی ہیں جبکہ عنبرین کی آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو چکی ہیں۔ عنبرین کی آنکھیں اب حشر کے دن ہی کھلیں گی۔

عنبرین کی ماں اور اس کا والد ان تصویروں میں چیخ رہے ہیں' یہ لاش اور یہ دو چیخیں محض دو چیخیں اور ایک لاش نہیں ہیں' یہ اس ملک میں قانون اور انصاف کا جنازہ ہیں۔ یہ لاش اور یہ چیخیں ثابت کرتی ہیں' اس ملک میں سب کچھ ہے' اس ملک میں حکومت بھی ہے' حکومت کے پاس 61 وزراء' 1 ہزار 3 سو 92 محکمے' 1 کروڑ 9 لاکھ 4 ہزار 10 سرکاری ملازمین' 5 لاکھ 20 ہزار 40 دفاتر اور 11 لاکھ سرکاری گاڑیاں بھی ہیں۔ اس ملک کا ایک آئین' تعزیرات سے بھرپور اور ساڑھے چار سو اراکین کی پارلیمنٹ بھی ہے' اس ملک میں 10 ہزار ارب پتی بھی ہیں' اس ملک میں فیکٹریاں' ملیں اور کارخانے بھی ہیں' اس ملک میں شاپنگ سنٹرز اور بازار بھی ہیں اور اس ملک میں عدالتیں اور جج بھی ہیں' اس ملک میں رحمان ملک اور شوکت ترین بھی ہیں' اس ملک میں بابر اعوان (ڈاکٹر) اور فاروق ایچ نائیک بھی ہیں' اس ملک کا ایک خدا' ایک رسولؐ اور ایک مذہب بھی ہے' اس ملک میں عوام بھی ہیں اور اس ملک میں خزانے بھی ہیں لیکن اگر اس ملک میں کسی چیز کی کمی ہے تو وہ انصاف ہے' اس ملک میں انصاف نہیں۔ اس ملک میں خوف خدا اور اس خوف خدا کی توہین کی تفتیش کا کوئی ادارہ نہیں' اس ملک میں کوئی ایسا عہدیدار' کوئی ایسا ادارہ' کوئی ایسا ڈیپارٹمنٹ اور کوئی ایسا شعبہ نہیں جو اس ملک کے حکمرانوں سے یہ پوچھ سکے کہ جس ملک کے سیاستدان دو سال میں سرکاری خزانے سے اڑھائی ارب روپے کی دوائیں کھا جاتے ہوں' اس ملک کے پاس عنبرین جیسی بچیوں کے علاج کیلئے دو ہزار روپے اور اس کے کفن کیلئے ایک ہزار روپے کیوں نہیں ہیں؟ جو ان سے یہ پوچھ سکے جس ملک میں ایک وزیر قوم کو چھ کروڑ روپے میں پڑتا ہے اس ملک میں عنبرین جیسی بچی کو تین گز لٹھا اور درد کی دو گولیاں کیوں نہیں ملتیں؟ جو یہ سوال کر سکے جس ملک میں پارلیمنٹ پر ایک منٹ میں 55 ہزار روپے خرچ ہوتے ہوں اس ملک میں لوگ عنبرین جیسی بچیوں کی تدفین کیلئے ایدھی سنٹر کا رخ کیوں کرتے ہیں؟ جو یہ پوچھ سکے جس ملک میں دو' دو سو' ڈھائی ڈھائی سو لوگوں کو مفت عمرے کروائے جاتے ہیں' جس میں آٹھ' آٹھ ارب روپے سے ریڈ زون کے گرد دیواریں بنانے کے منصوبے بنائے جاتے ہیں' جس میں ایوان صدر کو زلزلے سے محفوظ بنانے اور نوڈیرو میں صدارتی کیمپ آفس کی سیکورٹی وال بنانے کیلئے کروڑوں روپے منظور کر لئے جاتے ہوں

اور جس ملک میں وزیر کی چائے کا دو دن کا بل 26 ہزار روپے آتا ہو اس ملک میں عنبرین جیسی بچیاں دوا اور کفن کو ترستی ہوئی دنیا سے کیوں رخصت ہو جاتی ہیں۔ کاش کوئی یہ سوال پوچھ سکتا اور جب تک اسے ان سوالوں کا جواب نہ ملتا وہ اس نظام کا گریبان پکڑ کر کھڑا رہتا۔ ہمیں ماننا پڑے گا پاکستان میں انصاف اور احتساب کا کوئی سسٹم نہیں' اس ملک میں کوئی ایسا ادارہ نہیں جو عنبرین جیسی بچیوں کے قتل پر حکمرانوں کا گریبان پکڑ سکے' جو عنبرین جیسی لاشوں کو انصاف دے سکے۔ ہمیں ماننا پڑے گا پاکستان میں اب روٹی' کپڑے' مکان اور دوا کیلئے آپ کا وزیر ہونا' مشیر ہونا اور سفیر ہونا ضروری ہے۔ آپ اگر بااختیار شخص ہیں تو آپ کیلئے تعلیمی بورڈوں کی سکریسی برانچز بھی کھل سکتی ہیں اور آپ اپنی بچیوں کی مرضی کے مطابق انہیں نمبرز بھی دلا دیتے ہیں اور انہیں میڈیکل کالجوں میں داخلے بھی اور اس کے بعد پورا نظام آپ کو تحفظ بھی فراہم کرے گا لیکن اگر آپ اس ملک کے عام شہری ہیں تو آپ کی بچی کو اس ملک میں دوا بھی نہیں ملے گی اور کفن بھی' آپ اگر اس ملک کے عام شہری ہیں تو آپ کا مقدر خیرات ہے آپ اگر خیرات پر زندگی گزارنے کیلئے تیار ہیں تو سو بسم اللہ ورنہ کسی ایدھی سنٹر کا رخ کریں' وہ آپ کو کفن فراہم کر دے گا' آپ اطمینان سے مر جائیں۔

میں نے تصویر اٹھا کر دیکھی' مجھے یوں محسوس ہوا عنبرین کی نعش مجھ سے کچھ پوچھ رہی ہے۔ عنبرین نے پوچھا ''انکل آپ نے میرے لئے کیا کیا'' عنبرین میری بچی! میں تمہارے لئے صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کیونکہ میں بے حسی کے سمندروں میں ڈوبتے ہوئے معاشرے کا ایک محتاط لکھاری ہوں' مجھے جب تک ظالم سلطان اجازت نہ دیں میں اس وقت تک ان کے سامنے کلمہ حق نہیں کہتا۔ میں اس قدر محتاط ہوں کہ میں آج تک اس ملک کے کسی سلطان کو یہ نہیں کہہ سکا کہ جو شخص ظالم ہو' جو شخص بے انصاف ہو اور جو شخص کرپٹ ہو وہ سلطان نہیں ہو سکتا۔ اس شخص کو اللہ کے بندوں پر حکومت کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ میری بچی۔۔۔ میں ایک بے بس معاشرے کا بے بس لکھاری ہوں چنانچہ عنبرین! میں تمہارے لئے صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں میں تم سے صرف معافی ہی مانگ سکتا ہوں۔ میری بچی مجھے معاف کر دو۔

"ہم لوگ کہاں جائیں"

کبیر والا کے محمد اسلم کا سوال بہت آسان اور سیدھا تھا "ہم لوگ کہاں جائیں" میں نے جواب دینے کیلئے منہ کھولا لیکن میری زبان ساکت اور لفظ مفلوج ہو گئے' میں نے بولنے کیلئے حلق تر کیا' میں نے منہ کے اندر زبان پھیری' میرے جبڑوں کے اندر زبان نے تبخیر معدہ کے مریض مگرمچھ کی طرح کروٹ بدلی لیکن آواز پیدا نہ ہوئی چنانچہ میں نے آہستگی سے فون نیچے رکھ دیا' ریسیور کے ماؤتھ پیس سے محمد اسلم کی آواز ٹوٹ ٹوٹ کر باہر آ رہی تھی اور پورے کمرے میں بکھر رہی تھی لیکن میں نے کانوں اور آنکھوں پر تکیہ رکھ لیا' میں نے محمد اسلم کے سیدھے اور آسان سوال کا گلہ گھونٹ دیا۔

محمد اسلم کبیر والا شہر کے ایک چھوٹے سے ہوٹل کا مالک ہے' اس کا والد چائے کا کھوکھا چلاتا تھا' محمد اسلم آٹھ سال کی عمر میں اس کھوکھے کی چائے دانی' پتیلی اور چولہا بن گیا' اس نے سارا بچپن' ساری جوانی اور ادھیڑ عمری کی ساری صبحیں' ساری شامیں اسی چائے خانے میں گزاریں' اس کا والد چائے بناتے اور چائے پلاتے پلاتے فوت ہو گیا تو محمد اسلم کو ورثے میں دس بائی پندرہ فٹ کی یہ دکان' بیس کپ' پانچ چائے دانیاں اور ایک چولہا ملا' اسلم نے اس وراثت کو گلے لگا لیا۔ انسان کیونکہ اللہ تعالیٰ کی واحد مخلوق ہے جس کی اگلی نسل پچھلی کے مقابلے میں آگے بڑھتی ہے' یہ ترقی بلندی کی صورت میں بھی ہوتی ہے اور پستی کی شکل میں بھی' اگر کوئی شخص ترقی کی طرف خواہ ایک ایک انچ بھی بڑھ رہا ہے تو ترقی کا یہ عمل اگلی نسل میں بھی جاری رہتا ہے جبکہ اس کے برعکس اگر کسی انسان کا مقدر "ریورس گیئر" میں چل رہا ہے تو ڈھلوان پر پھسلنے کا یہ سلسلہ اس کے بچوں تک دراز ہو جائے گا' یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک یہ انتہائی نقطے تک نہیں پہنچتا' اس کے بعد یہ پلٹتا ہے اور پھر پستی بلندی کی طرف بڑھنے لگتی اور بلندی پستی کی طرف کھسکنے لگتی ہے' عروج و زوال کا یہ کھیل دنیا کے ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں واپس محمد اسلم کی طرف آتا ہوں' زندگی کی لگام جب محمد اسلم تک پہنچی تو اس نے ترقی کی دہلیز پر ایک قدم رکھ دیا' اس نے چائے کے اس کھوکھے کو ایک چھوٹے سے ریستوران میں تبدیل کر دیا' وہ روزانہ چائے کے ساتھ تین چار سالن اور روٹیاں بھی بیچنے لگا یوں اسے تھوڑی سی خوشحالی نصیب ہوئی لیکن یہ خوشحالی اتنی

بڑی نہیں تھی کہ یہ اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکتا چنانچہ اس نے بھی اپنی طرح اپنے بچوں کو بچپن ہی میں پلیٹ' پتیلی' کپ اور چولہے بنا لیا' اس کے بچے بھی اس کے کاروبار کا حصہ بن گئے' محمد اسلم اور اس کے کنبے کا یہ سلسلہ جاری رہا لیکن کل رات محمد اسلم نے مجھے فون کیا اور اس نے مجھ سے بڑا آسان اور سیدھا سا سوال پوچھا "ہم لوگ کہاں جائیں" اور اس کے اس سیدھے اور آسان سے سوال نے میری زبان کی ساری نسیں کھینچ لیں' میں بے بس ہو کر لیٹ گیا۔

کبیر والا کے محمد اسلم کی کہانی اس ملک کے ان تیرہ' چودہ کروڑ بے بس پاکستانیوں کی داستان ہے زندگی جن کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی ہے' جن کی چادریں چھوٹی اور پاؤں لمبے ہیں اور جنہیں اب آکسیجن بھی راشن کارڈوں پر ملتی ہے اور جو روزانہ آسمان کی طرف سر اٹھا کر اپنے پروردگار سے پوچھتے ہیں "یا اللہ کیا تو نے ہمیں انسانیت کی تذلیل کیلئے پیدا کیا تھا" اور آسمان یہ سوال سن کر آنکھیں موند لیتا ہے۔ محمد اسلم کے ہوٹل پر چند دن قبل چھاپہ پڑا اور ٹی ایم او نے اسے دو ہزار روپے جرمانہ کر دیا' محمد اسلم نے وجہ پوچھی تو اسے بتایا گیا "وزیراعلیٰ میاں شہباز شریف نے پنجاب بھر میں روٹی کی قیمت دو روپے طے کی ہے لیکن تم یہ روٹی چار روپے میں فروخت کر رہے ہو' یہ قانون کی خلاف ورزی ہے" محمد اسلم نے قہقہہ لگایا اور ٹی ایم او سے عرض کیا "جناب یہ قانون صرف ان لوگوں پر لاگو ہوتا ہے جنہیں حکومت آٹے کا تھیلا اڑھائی سو روپے میں فراہم کرتی ہے' میں اوپن مارکیٹ سے چار سو بیس روپے میں انیس کلو آٹا خریدتا ہوں' آٹا لانے اور گوندھنے والے کو تنخواہ دیتا ہوں' نانبائی کو دیہاڑی دیتا ہوں' تنور میں گیس بھی استعمال ہوتی ہے اور تنور پر کام کرنے والوں کو پنکھے کی بھی ضرورت ہوتی ہے' یہ پنکھا بجلی سے چلتا ہے اور بجلی کا بل بھی آتا ہے' میں اگر ان ساری چیزوں کا حساب لگاؤں تو میں چھ روپے میں بھی روٹی نہیں بیچ سکتا" ٹی ایم او نے کہا "لیکن مجھے حکم ہے روٹی دو روپے میں بکے گی" محمد اسلم نے عرض کیا "جناب پھر آپ مہربانی فرما کر مجھے کنٹرول ریٹ پر آٹا فراہم کر دیں" ٹی ایم او نے جواب دیا "تم درخواست لکھ کر دے دو میں پراسس کر دیتا ہوں" محمد اسلم نے درخواست لکھ کر دے دی لیکن بیس دن سے پراسس مکمل نہیں ہوا' محمد اسلم کو کنٹرول ریٹ پر آٹا نہیں ملا اور محمد اسلم قانون کے خوف سے تنور نہیں چلا رہا۔ اس کی داستان کا دوسرا حصہ بھی انتہائی معمولی' سیدھا سادا اور چھوٹا ہے' پورے ملک میں لوڈشیڈنگ ہو رہی ہے' چھوٹے شہروں میں اکتوبر کے آخر میں بھی گرمی اور مکھیاں ہوتی ہیں اور مکھیوں اور گرمی کے باعث دن میں گاہک چھوٹی دکانوں کا رخ نہیں کرتے' محمد اسلم کو کسی نے بتایا وہ اگر ایک چھوٹے سے جنریٹر کا بندوبست کر لے تو اس کا کاروبار بچ سکتا ہے' اس نے جمع پونجی نکال کر گیس پر چلنے والا ایک سیکنڈ ہینڈ

جنریٹر لے لیا' جنریٹر تو آ گیا لیکن گیس کے بل میں اضافہ ہو گیا جس سے اس کی دکان کا بجٹ خراب ہو گیا' وہ ابھی اس بات سے پریشان تھا کہ چند دن پہلے گیس کے محکمے کا ایک اہلکار اس کے ہوٹل پر آیا اور اس سے جنریٹر کی تفصیل پوچھنے لگا' اس نے وجہ پوچھی تو اہلکار نے بتایا لاہور سے حکم آیا ہے جو دکاندار گیس پر جنریٹر چلا رہے ہیں ان کی رپورٹ بنا کر صوبائی دارالحکومت بھجوائی جائے۔ محمد اسلم پریشان ہو گیا' اس کا خیال ہے حکومت اب گیس پر چلنے والے جنریٹروں کے بارے میں بھی کوئی پالیسی بنانے لگی ہے' محمد اسلم شوگر' بلڈ پریشر اور گردوں کا مریض ہے چنانچہ یہ جذباتی صدمے اس کیلئے ناقابل برداشت ثابت ہوئے اور وہ گھر جا کر لیٹ گیا' وہ ہمت ہار گیا' اس نے گزشتہ رات مجھے فون کیا اور ایک سیدھا اور سادہ سوال پوچھا ''ہم لوگ کہاں جائیں''۔

محمد اسلم کا سوال بہت سادہ اور سیدھا ہے' وہ اس وقت خود کو کمرے میں بند ایسی بلی محسوس کر رہا ہے جس کے باہر نکلنے کے سارے راستے مسدود ہو گئے ہیں اور وہ بے چینی سے اس چیتے کا انتظار کر رہی ہے جو کمرے میں قدم رکھے اور بلی مرنے سے پہلے اس کی آنکھیں نوچ لے' محمد اسلم اس کیفیت کا اکیلا شکار نہیں' ملک میں اس جیسے تیرہ' چودہ کروڑ لوگ ہیں زندگی نے جن کا راستہ روک لیا ہے' جن کے روزگار کے چھوٹے چھوٹے ذریعے بند ہو رہے ہیں' جو روزانہ اس نظام کے سینکڑوں ہزاروں ظلم سہتے ہیں اور جن کی زندگی میں کوئی ایسی کھڑکی نہیں جس کے ذریعے ان کے صحن میں روشنی اور ہوا آ سکے' اس پورے ملک میں کوئی ایسا شخص نہیں جو آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام سکے' جو محمد اسلم جیسے لوگوں کے آنسو پونچھ سکے' جو انہیں حوصلہ اور دلاسہ دے سکے چنانچہ یہ تیرہ چودہ کروڑ لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں ''ہم لوگ کہاں جائیں'' اور یہ تاریخ کا وہ سوال ہے جو ہر انقلاب سے پہلے ہر کان پر دستک دیتا ہے۔ انقلاب فرانس سے پہلے' انقلاب روس سے قبل اور ایران میں جنم لینے والے انقلاب سے پہلے وہاں کے محمد اسلموں نے ایک دوسرے سے یہی سوال پوچھا تھا ''ہم لوگ کہاں جائیں'' یہ لوگ جب یہ سوال پوچھ پوچھ کر تھک گئے اور کسی نے انہیں جواب نہ دیا تو یہ اپنا سوال اٹھا کر بادشاہ کے محل کی طرف چل پڑے اور پھر حکمران طبقے کا جو بھی فرد راستے میں آیا یہ لوگ اسے روندتے کچلتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ یہ لوگ اور ان کا سوال بادشاہ کی گردن تک پہنچ گیا۔ مجھے محمد اسلم کے لہجے میں بھی اسی بغاوت کی آنچ محسوس ہوئی اور مجھے لگا جس دن کسی نے محمد اسلم جیسے لوگوں کو اسلام آباد' لاہور اور کراچی کا راستہ دکھا دیا' اس دن اس نظام اور اس نظام کے تمام ناجائز بچوں کو چھپنے کی جگہ نہیں ملے گی' آج چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے محمد اسلم جیسے لوگوں کی اقتصادی حالت کو دیکھتے

[illegible] اسلام آباد میں نئے جی ایچ کیو کی تعمیر رکوا دی' یہ جی ایچ کیو 27000 کنال پر بن رہا تھا اور اس [illegible] ارب روپے خرچ ہونا تھے' جنرل صاحب نے اچھا فیصلہ کیا کیونکہ ملک جس قسم کے حالات سے [illegible]ہا ہے اور اگر حالات کا یہ رخ اور یہ رفتار نہ تھمی تو شاید ہیڈ کوارٹرز' ایوان صدر' وزیراعظم ہاؤس اور [illegible] کے درمیان فاصلہ ختم ہو جائے' شاید اس پورے ملک میں سوال زیادہ ہو جائیں اور جوابوں کے [illegible] جگہیں کم پڑ جائیں۔

خدا کے بندو' محمد اسلم جیسے لوگوں کیلئے کبیر والا میں جواب کی گنجائش پیدا کرو کیونکہ اگر تم نے [illegible] کی تو محمد اسلم اپنا سوال کندھے پر اٹھا کر اسلام آباد اور لاہور آ جائے گا اور اگر یہ یہاں آ گیا تو [illegible] لوگ کہیں نہیں جا سکیں گے چنانچہ آپ لوگ محمد اسلم کے آنے سے پہلے پہلے ''ہم لوگ کہاں [illegible]'' کا جواب سوچ لو کیونکہ جب عام انسان یہ سوال پوچھتا ہے تو پھر وہ جواب کیلئے زیادہ دیر انتظار [illegible] کرتا۔

⊘ ⊘ ⊘

ابھی اور اسی وقت

''کیا واقعی کل آصف علی زرداری صدارت کا حلف لے لیں گے'' نوجوان کی آواز میں حیرت تھی' میں نے فوراً جواب دیا'' انشاء اللہ'' نوجوان نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور جذباتی لہجے میں بولا'' اس کا مطلب ہے پرسوں سے مہنگائی کم ہو جائے گی'' میں نے قہقہہ لگایا اور اس سے پوچھا '' تمہیں اس معاملے میں کیا جلدی ہے'' نوجوان نے فوراً کہا '' سر مجھے بہت جلدی ہے' میں رمضان سے ایک دن پہلے بازار گیا تھا اور میں نے اس دن پچیس روپے درجن کیلے' اسی روپے کلو انگور اور پندرہ روپے کلو آلو خریدے تھے لیکن میں رمضان کے پہلے دن بازار گیا اور میں نے چیزوں کی قیمت پوچھی تو کیلے سو روپے درجن ہو چکے تھے' انگور دو سو روپے اور آلو چالیس روپے کلو' سر وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میرے جیسے غریب لوگوں کیلئے روزہ رکھنا اور افطار کرنا ممکن نہیں رہا'' وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا'' سر میں آپ کے نوٹس میں دو باتیں لانا چاہتا ہوں' اول حکومت پانچ' چھ ماہ سے یہ ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے شرپسند قبائلی علاقوں میں گورنمنٹ کی رٹ کو چیلنج کر رہے ہیں اور ہم رٹ کی بحالی کیلئے وہاں آپریشن کر رہے ہیں' درست؟'' میں نے فوراً ہاں میں تصدیق کر دی' وہ بولا'' آپ فاٹا کو چھوڑیں اسلام آباد میں حکومت کی رٹ دیکھ لیں' پورے اسلام آباد میں کوئی ریٹ لسٹ نہیں اور اگر ہے تو کوئی دکاندار اس کی پابندی نہیں کر رہا' حکومت فاٹا میں رٹ قائم کرنے کی کوشش تو کر رہی ہے لیکن اس کی ناک کے عین نیچے کیا ہو رہا ہے اس کیلئے حکومت کے پاس کوئی وقت نہیں' حکومت قبائلی علاقوں میں دہشت گردی ختم کرنے کیلئے تو بے قرار ہے لیکن اسلام آباد میں شہریوں کے خلاف جو اقتصادی دہشت گردی ہو رہی ہے اس پر وہ مکمل طور پر خاموش ہے...... کیوں؟'' میں خاموشی سے سنتا رہا' وہ بولا'' اور جناب اللہ تعالیٰ نے رمضان کو مسلمانوں کیلئے رحمتوں کا مہینہ بنایا تھا لیکن مسلمان تاجروں نے اسے مڈل کلاس' لوئر کلاس اور غریب مسلمانوں کیلئے زحمت بنا دیا' لوگ حقیقتاً پانی کا پیالہ پی کر روزہ رکھنے اور نمک چاٹ کر افطار کرنے پر مجبور ہیں' میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں اللہ کی رحمت کو زحمت میں تبدیل کرنے والوں کا انجام کیا ہوگا؟'' وہ خاموش ہو گیا' میں نے اس سے پوچھا '' آپ کیا چاہتے ہیں'' وہ فوراً بولا'' میں چاہتا ہوں صدر آصف علی زرداری کچھ اور کریں یا نہ کریں لیکن وہ کم از کم ہمیں مہنگائی کی دہشت گردی سے ضرور نجات دلا دیں'' اس نے اتنا کہا اور فون بند کر دیا۔

ہم اگر نوجوان کے جذبات پر غور کریں تو اس کی بات غلط نہیں' دہشت گردی صرف بندوق کا ...نہیں ہوتی بلکہ لوگوں کو مہنگائی کی پھانسی پر لٹکا دینا' عام اور غریب شہریوں کو ناجائز منافع کی چھری سے ...ح کر دینا اور رحمتوں کے مہینے کو زحمتوں میں تبدیل کر دینا بھی دہشت گردی ہے اور حکومت جس طرح ...قل اور بموں کی دہشت گردی کے خلاف نبرد آزما ہے اسی سپرٹ کے ساتھ اسے بازاروں' منڈیوں اور ...نوں میں پروان چڑھنے والی اقتصادی دہشت گردی کا بھی مقابلہ کرنا چاہیے اور یہ صدر آصف علی ...داری سے عوام کا پہلا مطالبہ ہوگا۔ آپ ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے پاکستان جیسے زرعی ملک میں پیاز 40 ...پے کلو' آلو 40 روپے کلو اور ٹماٹر 50 روپے کلو مل رہے ہیں' لوگ آٹے کے تھیلے کیلئے دست و گریباں ہو ...ہے ہیں' یوٹیلٹی سٹورز میدان جنگ بنے ہوئے ہیں اور اچھے خاصے سفید پوش لوگ بھی مسجدوں میں ...اری کرنے پر مجبور ہیں جبکہ رمضان کے پہلے عشرے میں چالیس لوگ مہنگائی کی وجہ سے مجبور ہو کر ...دکشی کر چکے ہیں' یہ ہے اسلامی دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کی صورتحال' یہ ہے اسلامی جمہوریہ ...ستان کی حالت۔ پاکستان میں اس وقت عملاً حکومت نام کی کوئی چیز موجود نہیں' خود سوچئے جس ملک کا ...یراعظم یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے ہم آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے کہنے پر بجلی اور گیس کی ...ت بڑھا رہے ہیں' جس میں امریکی فوج پاکستان کی سرزمین پر اتر آئے' انگور اڈہ کے ایک گاؤں موسیٰ ... میں داخل ہو' ایک گھر میں گھسے اور بیس عورتوں اور بچوں کو قتل کر کے واپس چلی جائے' ہماری پارلیمنٹ ...ریکی جارحیت کے خلاف قرارداد مذمت پاس کرے اور اس کے جواب میں امریکہ کی طرف سے ...ذرت کی بجائے مزید تین میزائل حملوں کا تحفہ مل جائے اور جس ملک میں وزیراعظم کی گاڑی پر فائرنگ ...ہو جائے اور حکومت صرف جائے حادثہ پر کتے پھرا کر خاموش بیٹھ جائے' کیا اس ملک کی حکومت کو حکومت ... اور خوش فہمی زیادہ نہیں سمجھنا چاہیے؟ ہمیں یہ ماننا پڑے گا یہ ملک اس وقت اللہ کے آسرے پر چل رہا ...ہے اور راولپنڈی کی مری روڈ سے انگور اڈہ تک اور کراچی سے لے کر شمالی وزیرستان تک اس ملک کے کسی ...بھی کسی کونے' کسی دکان' کسی گھر اور کسی سڑک پر حکومت ہے اور نہ ہی اس کی رٹ اور ہمیں یہ بھی ماننا ...پڑے گا جس ملک کو دنیا بھر کے دشمن مل کر نقصان نہیں پہنچا سکے تھے اس ملک کو ہمارے سیاستدانوں اور ...ہمارے جمہوری لیڈروں نے صرف چار ماہ میں تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا ہے' حکومت نے عوام سے ...آکسیجن تک چھین لی' حکومت نے ان کیلئے وضو کا پانی اور افطار کی کھجور تک نہ چھوڑی چنانچہ آج اوپر آگ ...برساتا سورج ہے اور نیچے جہنم کی طرح دہکتی زمین اور ان دونوں کے درمیان اس ملک کے عوام ہیں' خوف ...ہے' مہنگائی ہے اور بے یقینی کی دہشت ہے اور دہشت اور خوف کے اس عالم میں آصف علی زرداری صدر ...بن چکے ہیں اور عوام ان سے مہنگائی کے خلاف حکومتی رٹ قائم کرنے کی توقع ضرور رکھتے ہیں۔

ہوسکتا ہے آصف علی زرداری حلف لینے کے بعد دوسرے بڑے بڑے مسائل میں الجھ جائیں اوران کے پاس مہنگائی جیسے چھوٹے مسئلے کیلئے وقت نہ بچے چنانچہ میرا خیال ہے صدر آصف علی زرداری کی فرصت سے قبل ملک کے خوشحال طبقوں کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے' مہنگائی کی پیدا کردہ زحمتوں کے اس میدان جنگ میں ایک مثال عبدالستار ایدھی اور عمران خان نے قائم کی' عبدالستار ایدھی نے رمضان سے قبل پورے ملک سے بھیک جمع کی تھی اور وہ اب ایک بڑا لنگر شروع کر رہے ہیں جس میں غریبوں کو تین وقت کھانا مفت ملے جبکہ عمران خان نے سستی روٹی کا پراجیکٹ شروع کردیا ہے' وہ عوام کو دو روپے میں روٹی فراہم کریں گے' یہ دونوں بڑے منصوبے ہیں اور ظاہر ہے ایسے منصوبے صرف عمران خان اور عبدالستار ایدھی جیسے لوگ ہی شروع کرسکتے ہیں لیکن کھاریاں جیسے چھوٹے سے قصبے کے چند حساس اور پڑھے لکھے نوجوانوں نے بھی ایک چھوٹا سا منصوبہ شروع کیا ہے' ان لوگوں نے مل ملا کر ایک فنڈ قائم کیا' یہ لوگ اس فنڈ سے منڈیوں' ہول سیلز مارکیٹوں اور کارخانوں سے کھانے پینے کی اشیاء خریدتے ہیں' شہر میں سستے بازار لگاتے ہیں اور یہ اشیاء اصل نرخ سے تیس فیصد سستے داموں بیچ دیتے ہیں' اس تنظیم میں وکیل' پروفیسر' ڈاکٹرز' بزنس مین' صحافی اور انجینئرز شامل ہیں اور یہ لوگ ان بازاروں میں خود اپنے ہاتھوں سے کام کرتے ہیں' ان لوگوں کا کہنا ہے ہر بازار میں انہیں لاکھ' ڈیڑھ لاکھ روپے نقصان ہوتا ہے لیکن عوام کو کھانے پینے کی ہر چیز مارکیٹ سے پچاس سے تیس فیصد سستی مل جاتی ہے' یہ لوگ ان بازاروں کا خسارہ چندے سے پورا کرتے ہیں' یہ ایک دلچسپ منصوبہ ہے اور اگر ملک کے تمام شہروں کے صاحبان ثروت' پڑھے لکھے' حساس لوگ اور بزنس مین اپنے اپنے شہر میں ایسی تنظیمیں بنالیں' یہ لوگ ایسے فنڈز قائم کرلیں' یہ لوگ فیکٹریوں اور کمپنیوں سے براہ راست سامان خریدیں' سستے بازار لگائیں اور مارکیٹ سے پچیس تیس فیصد کم نرخ پر خوردونوش کا یہ سامان فروخت کردیں تو اس سے غریب شہریوں کی زندگی میں سہولت بھی آجائے گی اور لوگ جان اور سانس کا رشتہ بھی قائم رکھ سکیں گے۔ اس ملک میں حکومت ختم ہوچکی ہے اور اگر اب اس ملک کا حساس' پڑھا لکھا' باشعور اور صاحب ثروت طبقہ بھی باہر نہ نکلا تو یہ ملک ختم ہوجائے گا' اگر ہم اس ملک کو برے انجام سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں حکومت یا ایوان صدارت کی طرف دیکھنے کی بجائے زندگی کی یہ صلیب خود اپنے کندھوں پر اٹھانا ہوگی' آصف علی زرداری صاحب کا امتحان تو کل سے شروع ہوگا لیکن اس ملک کے خوشحال طبقے امتحان کے درمیان میں پہنچ چکے ہیں اور اگر یہ لوگ اب بھی نہ سنبھلے تو یہ اور ان کی دولت دونوں اس ملک کے ملبے تلے دفن ہوجائے گی چنانچہ ابھی اور اسی وقت اٹھنے اور کچھ کرنے کا وقت ہے کیونکہ قدرت حکمرانوں کی بے حسی کی سزا قوموں کو پہلے اور حکمرانوں کو بعد میں دیا کرتی ہے اور اگر ہم نے ہمت نہ کی تو ہم پہلے سزا بھگتیں گے اور ایوان صدر کی باری بعد میں آئے گی۔

روم میں روم کی طرح رہیں

اطلاعات ونشریات کی وفاقی وزیر محترمہ شیری رحمان نے گزشتہ روز انکشاف کیا' صدر آصف ی زرداری کمرشل فلائٹ پر دوبئی سے لندن گئے تھے اور صدر محترم کا یہ اقدام سادگی کی بہترین مثال ہے' شیری رحمان نے انکشاف کیا صدر اس ماہ کے آخر میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں رکت کیلئے بھی کمرشل فلائٹ پر امریکہ جائیں گے اور ان کا وفد بھی بہت مختصر ہوگا۔ میں صدر آصف علی دداری کے اس اقدام کی تعریف کرنا چاہتا ہوں' یہ اقدام واقعی قابل تعریف اور قابل تقلید ہے۔ آپ خود وچئے پاکستان جیسے غریب ملک جس کے ساڑھے گیارہ کروڑ لوگ آٹے' پانی اور دوا کو ترس رہے ہیں' س کی نصف سے زائد آبادی خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے اور جس میں ایک بھی ایسا تعلیمی دارہ موجود نہیں جس میں حکمران طبقہ اپنے بچے داخل کراسکے۔ اس ملک کے حکمرانوں کو سادگی' کفایت عاری اور بچت کی ایسی ہی مثالیں قائم کرنی چاہئیں چنانچہ قوم صدر محترم کی سادگی اور کفایت شعاری کی ترف ہے لیکن ساتھ ہی میں شیری رحمان کی توجہ وفاقی حکومت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کیونکہ اقی حکومت میں اس قسم کی کوئی کفایت شعاری' سادگی اور بچت دکھائی نہیں دیتی' وزیراعظم پاکستان کے درا اور بیرون ملک خصوصی طیاروں پر سفر کرتے ہیں' وزیراعظم کا طیارہ ملتان تک جاتا ہے تو اس کی ایک واز پر تین ہزار لیٹر پٹرول خرچ ہوتا ہے اور اگر یہ طیارہ ملکی سرحدوں سے باہر نکل جائے تو یہ نہ صرف ھ لیٹر پٹرول خرچ کرکے واپس آتا ہے بلکہ لاکھوں ڈالرز بین الاقوامی ہوائی اڈوں کی پارکنگ فیس بھی ی جاتی ہے۔ وزیراعظم وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھانے کے بعد 18 مئی 2008ء کو سربراہی کانفرس ں شرکت کیلئے مصر کے شہر شرم الشیخ گئے تھے' وزیراعظم خصوصی طیارے پر وہاں گئے تھے اور ان کے ساتھ اس وقت تین درجن لوگ تشریف لے گئے تھے' 19 مئی کو کانفرنس ختم ہوگئی اور تمام سربراہان اپنے پنے ملکوں کو لوٹ گئے لیکن ہمارا وفد وہاں ٹھہرا رہا اور وزیراعظم کا شاف قاہرہ کے سرکاری دورے کا دوبست کرتا رہا لیکن مصری حکومت نے قاہرہ کے دورے کو سرکاری حیثیت دینے سے انکار کردیا یہاں ک کہ مصری سپیکر کے ساتھ ملاقات کا بہانہ بنایا گیا اور وزیراعظم اپنے پورے وفد کے ساتھ شرم الشیخ سے قاہرہ تشریف لے گئے' وفد کے ارکان اہرام مصر کی سیر کرتے رہے اور شام کو دریائے نیل کے

کنارے ''ٹہلتے'' رہے۔اس دورے پر کتنے اخراجات ہوئے تھے؟ محترمہ شیری رحمان اس کی تفصیل حاصل کرسکتی ہیں' وزیراعظم 6 جون 2008ء کو سعودی عرب کے دورے پر تشریف لے گئے تھے' اس دورے پر ان کے ساتھ کتنے لوگ گئے تھے؟' اگر وفاقی وزیراطلاعات یہ تعداد معلوم کرلیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہے گی' یہ سرکاری عمرہ تھا اور وفد کے تمام ارکان کی عبادت کا معاشی بوجھ اس ملک کے ان عوام نے اٹھایا تھا جو روز صبح آٹا کی قطار میں کھڑے ہوتے ہیں اور ڈنڈے کھا کر گھروں کو لوٹتے ہیں۔اس دورے کی خاص بات ''دم'' تھا' عمرہ اور حج کے دوران اگر حاجی صاحب سے کوئی غلطی ہو جائے یا اس کا کوئی مناسک پورا نہ ہو تو اس پر دم واجب ہو جاتا ہے اور یہ دم عموماً جانور کی قربانی ہوتا ہے' وزیراعظم کے وفد کے زیادہ تر ارکان عمرے کے بعد اپنا ''ہیئر سٹائل'' خراب نہیں کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے بال نہیں کٹوائے تھے اور ان کا ''دم'' بعدازاں پاکستانی سفارتخانے نے ادا کیا تھا' وزیراعظم یوسف رضا گیلانی 26 جولائی 2008ء کو امریکہ کے دورے پر گئے تھے' وہ اس دورے کے دوران بوئنگ جہاز امریکہ لے کر گئے تھے اور ان کے وفد میں ساٹھ' ستر لوگ شامل تھے' اس جہاز اور اس وفد کے اخراجات کس نے ادا کئے تھے؟ اور اس دورے کا کیا نتیجہ نکلا تھا؟ وزیراعظم وائٹ ہاؤس میں صدر بش کے ساتھ ملاقات فرما رہے تھے جبکہ ادھر امریکی فوج نے قبائلی علاقوں پر میزائل برسانا شروع کر دیئے تھے۔آپ تحقیق کرا کر دیکھ لیجئے وزیراعظم کے اس دورے پر بھی کتنے اخراجات آئے تھے؟

میں اس معاملے میں صرف موجودہ حکومت کو موردالزام نہیں ٹھہراتا' پچھلی حکومت بھی اسراف کی اس گنگا میں کھل کر ہاتھ منہ دھوتی رہی تھی' صدر پرویز مشرف نے پانچ برسوں میں غیر ملکی دوروں پر ڈیڑھ ارب روپے اڑا دیئے تھے' حد تو یہ تھی صدر مشرف نے امریکہ میں اپنی کتاب کی تقریب رونمائی پر 22 کروڑ 7 لاکھ روپے خرچ کئے تھے' 2007ء میں وہ لندن میں اپنے دوست بریگیڈئر نیاز کے ساتھ برج کھیلنے کیلئے رکے اور 18 لاکھ روپے فی دن پر کمرہ کرائے پر لیا' وزیراعظم شوکت عزیز نے تو دوروں کا ریکارڈ قائم کر دیا تھا' وہ اپنے لئے ''مشروبات'' تک سرکاری خزانے سے خریدتے تھے' مجھے اچھی طرح یاد ہے 1998ء میں جب پاکستان نے ایٹمی دھماکے کئے اور پاکستان پر اقتصادی پابندیاں لگیں تو شوکت عزیز خصوصی طور پر امریکہ سے پاکستان تشریف لائے تھے' شوکت عزیز کو پاکستان لانے کا فریضہ محترم اسحاق ڈار نے ادا کیا تھا' ڈار صاحب انہیں گورنر اسٹیٹ بینک بنانا چاہتے تھے' شوکت عزیز نے لاہور میں میاں نواز شریف سے ملاقات کی تھی اور اس ملاقات میں وزیراعظم کو کفایت شعاری کی تلقین کی تھی' شوکت عزیز کا فرمانا تھا وزیراعظم کو وزیراعظم ہاؤس اور گورنر ہاؤس بند کر دینے چاہئیں'

ے گھر میں شفٹ ہو جانا چاہئے اور پروٹوکول ختم کر دینا چاہئے' اس سے عوام پر اچھے اثرات مرتب ں گے اور وہ بھی کفایت شعاری کرے گی۔میاں صاحب شوکت عزیز کی سوچ سے ٹھیک ٹھاک متاثر گئے تھے لیکن جب شوکت عزیز وزیراعظم بنے تو انہوں نے نہ صرف وزیراعظم ہاؤس کو اپنا مورچہ بنالیا ۔وہ پاکستان کی تاریخ کا مہنگا ترین پروٹوکول بھی لیتے رہے' شوکت عزیز نے اس دوران 8 ارب پے کی بلٹ پروف گاڑیاں بھی خریدی تھیں' میں نے ایک بار انہیں 1998ء کی کفایت شعاری کی ز یاد کرائی اور ان سے عرض کیا ''آپ آج کفایت شعاری سے کام کیوں نہیں لے رہے'' تو ں نے جواب دیا ''1998ء اور 2006ء میں بڑا فرق ہے' ہم اب امیر ہو چکے ہیں'' آپ محمد میاں رو کی مثال بھی لیجئے' آپ ایک درویش صفت اور صوفی منش انسان ہیں لیکن نومبر 2007ء اور مارچ 200ء کے درمیان آپ پاکستان کے نگران وزیراعظم رہے' اس دوران آپ نے دو سرکاری عمرے ایک حج فرمایا تھا اور آپ کی قربانی اور ''دم'' کے پیسے پاکستانی سفارتخانے نے ادا کئے تھے' یہ رقم آج سفارتخانے کے کھاتے میں درج ہے۔

یہ ہے پاکستان کے حکمرانوں کی کفایت شعاری اور سادگی۔صدر محترم نے اگر کفایت شعاری ڑا اٹھایا ہے تو میری درخواست ہے صدر صاحب کی کفایت شعاری کا اثر باقی حکومت تک بھی جانا ہئے' صدر صاحب کو چاہئے وہ وزیراعظم' گورنرز اور وزرائے اعلیٰ کے سرکاری جہاز واپس لیں' وہ انہیں م کریں اور اس رقم کا آٹا خرید کر عوام میں تقسیم کر دیں یا پھر اعلیٰ درجے کی ایک ایسی یونیورسٹی بنا دی ے جس میں صرف اور صرف غریب طالبعلموں کو داخلہ دیا جائے۔حکومت کے تمام عہدیدار کمرشل ٹوں پر سفر کریں اور تمام وزراء کی سیکورٹی اور پروٹوکول ختم کر دیا جائے' اگر کسی وزیر' وزیراعلیٰ' گورنر یا اعظم کی جان کو خطرہ ہے تو وہ سیکورٹی کے اخراجات خود برداشت کرے یا پھر عہدہ چھوڑ دے۔اسی ح خوشحال ارکان اسمبلی اور صاحب ثروت وزراء بھی اپنی تنخواہیں اور مراعات قوم کو ''بخش'' دیں تاکہ م کو سانس لینے میں سہولت ہو سکے۔۔۔اگر صرف صدر کمرشل فلائٹ پر سفر کریں گے اور باقی حکومت للے تللے اسی طرح جاری رہیں گے تو اس سے سرکاری خزانے کو خاص فائدہ نہیں ہوگا' یہ بڑی عجیب ہوگی حکومت ایک چھوٹا سا سوراخ تو بند کر دے لیکن بالٹی کے پیندے میں بڑے بڑے سوراخ جود ہوں۔صدر صاحب تو کفایت شعاری کریں اور باقی حکومت سرکاری خزانہ اڑاتی رہے۔اگر کی اختیار کرنی ہے تو سب کریں ورنہ صدر بھی روم میں دوسرے رومیوں کی طرح زندگی گزارنا شروع دیں تاکہ قوم کو افسوس نہ ہو۔

کاش ہم بولیویا ہوتے

بولیویا جنوبی امریکہ کا ایک چھوٹا سا ملک ہے' اس کی سرحدیں ایک طرف برازیل' پیراگوئے اور ارجنٹائن سے ملتی ہیں جبکہ دوسری طرف چلی اور پیرو سے متصل ہیں' یہ خشکی میں گھرا ہوا سبز جنگلات کا ملک ہے اور اسے 1530ء میں ہسپانوی جہاز رانوں نے دریافت کیا تھا' ہسپانوی آقاؤں نے اس کا نام آڈینیشیا آف چرکاس رکھا' 1545ء میں اس علاقے میں چاندی دریافت ہوئی اور سپین کے بڑے بڑے تاجروں نے اس کا رخ کر لیا' ان لوگوں نے علاقے میں جدید شہر بنائے' مقامی لوگوں کو کان کنی اور چاندی نکالنے کی مشقت پر لگایا اور آڈینیشیا کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے لگے' یہ سلسلہ 1800ء تک جاری رہا' 1809ء میں وینز ویلا کے آزادی پسند لیڈر جنرل سائمن بولیور نے جنوبی امریکہ کی ہسپانوی کالونیوں کو آزاد کرانا شروع کیا' یہ جدوجہد 16 سال تک جاری رہی یہاں تک کہ 6 اگست 1825ء کو جنرل سائمن بولیور کے ایک ساتھی جنرل انتونیو جوز ڈی سوکر نے آڈینیشیا کو آزاد کرا لیا۔ مقامی لوگوں نے آزادی کے بعد ملک کو اپنے محسن جرنیل سائمن بولیور کے نام منسوب کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کا نام آڈینیشیا آف چرکاس کی جگہ بولیویا رکھ دیا' بولیویا 1825ء میں آزاد تو ہو گیا لیکن یہ 2005ء تک فوجی جرنیلوں' غیر ملکی طاقتوں اور طاقتور ہمسایوں کی سیاسی اور عسکری چراگاہ بنا رہا' ملک میں پونے دو سو سال تک انقلاب' ہنگامے اور شورشیں چلتی رہیں یہاں تک کہ 2005ء میں ایوو موریلس بولیویا کا صدر بن گیا' ایوو موریلس بولیویا کا مقامی باشندہ تھا' اس کا تعلق ملک کے انتہائی غریب طبقے سے تھا اور اسے ایک خاص رنگ کے سویٹر کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل ہوئی تھی' موریلس پچھلے بیس پچیس برس سے نیلے اور سرخ رنگ کا ایک دھاری دار سویٹر پہن رہا ہے' اس نے اپنا سارا سیاسی سفر اس سویٹر میں طے کیا' بولیویا میں کسی شخص نے اسے کسی دوسرے لباس میں نہیں دیکھا' وہ ایک مقبول عام سیاستدان ثابت ہوا' وہ 2005ء میں 54 فیصد ووٹ لے کر بولیویا کا صدر منتخب ہوا' صدر بننے کے بعد بھی بورلیس نے اپنا سویٹر پہننا ترک نہیں کیا' وہ اب تک بے شمار عالمی لیڈروں سے مل چکا ہے لیکن اس نے کبھی ٹائی اور سوٹ نہیں پہنا اور وہ صدر بش سے لے کر ٹونی بلیئر تک تمام لیڈروں سے اسی سویٹر میں ملا' بورلیس کی یہ سادگی آہستہ آہستہ فیشن کی شکل اختیار کر گئی اور بولیویا کی تمام گارمنٹس کمپنیوں نے یہ سویٹر بنانا شروع کر دیا ہے' یہ سویٹر "موریلس سویٹر" کہلاتے ہیں۔

امریکہ لاطینی امریکہ کے ممالک کو اپنی کالونی سمجھتا ہے چنانچہ برازیل سے لے کر ہنڈورس تک جنوبی امریکہ کے 25 ممالک پر امریکہ کی گرفت ہے لیکن ایوو موریلس کا سٹائل اور مقبولیت امریکہ کیلئے خطرے کی گھنٹی بن گیا۔ 1970ء کی دہائی میں بولیویا کے مشرقی صوبوں میں گیس نکل آئی' 1979ء میں بولیویا اور برازیل کے درمیان پائپ لائن بچھانے کا کام شروع ہوا اور 9 فروری 1999ء میں 20 برس بعد یہ گیس پائپ لائن مکمل ہوئی' یہ پائپ لائن تین ہزار چار کلومیٹر لمبی تھی اور اس پر ایک سو چھ بلین ڈالر لاگت آئی تھی' یہ پائپ لائن پرائیویٹ تھی اور اس کی آمدنی پر سفید فام باشندوں کی اجارہ داری تھی' ایوا موریلس صدر بنا تو اسے محسوس ہوا پائپ لائن کی وجہ سے بولیویا میں بے چینی پھیل رہی ہے کیونکہ ایک صوبے کے سفید فام عوام تیزی سے امیر ہو رہے ہیں جبکہ دوسرے صوبوں کے مقامی لوگ غربت اور افلاس میں دھنستے چلے جا رہے ہیں چنانچہ اس نے سوچا آئین میں تبدیلی کرنی چاہئے اور قدرتی گیس کی آمدنی پورے ملک پر خرچ کرنی چاہئے تاکہ بولیویا کے سارے لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو سکے۔ یہ تبدیلی امریکہ کیلئے قابل قبول نہیں تھی چنانچہ بولیویا میں موجود امریکی سفیر فلپ گولڈ برگ نے اپوزیشن لیڈروں سے ملاقاتیں شروع کر دیں' ان ملاقاتوں کے نتیجے میں بولیویا کے مشرقی صوبوں میں ایوو بورلیس کے خلاف ہڑتالیں' احتجاج اور ہنگامے شروع ہو گئے' بورلیس کی حکومت نے امریکی سفیر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن سفیر باز نہ آیا لہٰذا ستمبر کے دوسرے ہفتے بولیویا کی وزارت خارجہ نے امریکی سفیر کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیا' یہ حکم دنیا کی واحد سپر پاور کے منہ پر تھپڑ کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ ایک ایسا ملک جس کی آبادی صرف 91 لاکھ 19 ہزار ایک سو 52 ہو' جس کی فوج بمشکل تیس ہزار ہو اور جس کی معیشت امریکی گملوں میں پروان چڑھ رہی ہو' وہ ملک امریکہ جیسی سپر پاور کے سفیر کو ملک سے بے دخل کر دے' امریکہ اس حرکت کو آسانی سے ہضم نہیں کر سکتا تھا چنانچہ ردعمل میں امریکہ نے بھی بولیویا کے سفیر کو نکال دیا اور ساتھ ہی اسے سنگین نتائج کی دھمکی بھی دے دی۔ یہ دھمکی جب وینز ویلا پہنچی تو وینز ویلا کے صدر ہوگو شاویز نے بولیویا سے اظہار یکجہتی کیلئے امریکہ کے سفیر پیٹرک ڈاڈی کو 72 گھنٹے کے اندر ملک چھوڑنے کا حکم دیدیا۔ وینز ویلا دنیا کا تیل پیدا کرنے والا واحد غیر اسلامی ملک ہے' شاویز نے امریکہ کو دھمکی لگائی اگر اس نے بولیویا کیساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی تو وہ تیل کی فروخت بند کر دیگا' اسی دوران روس نے وینز ویلا میں اپنے طیارے بھجوا دیئے' یہ طیارے جدید اسلحہ سے لیس ہیں اور یہ امریکی طیاروں کا ٹھیک ٹھاک مقابلہ کر سکتے ہیں' وینز ویلا نے امریکہ سے اپنا سفیر بھی واپس بلا لیا ہے' یہاں پر یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ وینز ویلا کی آبادی صرف دو کروڑ 18 لاکھ ہے اور تیل کی دولت کے باوجود اس کا شمار دنیا کے پسماندہ ممالک میں ہوتا ہے۔ اس کے پاس صرف

ایک لاکھ فوج ہے اور امریکی اثر ورسوخ کی وجہ سے اس فوج کے پاس بھی جدید اسلحہ موجود نہیں۔

ہنڈورس جنوبی امریکہ کا ایک بہت ہی چھوٹا ملک ہے' اس ملک کی معیشت پھلوں بالخصوص کیلے کی برآمد پر استوار ہے اور اسی مناسبت سے یہ "بنانا ری پبلک" کہلاتا ہے' اس کی آبادی 60 لاکھ 20 ہزار ہے اور اس میں پولیس ہی فوج کا کام کرتی ہے۔ دو دن قبل ہنڈورس میں امریکہ کے نئے سفیر ہوگولورینز نے صدر مینوئیل زیلایا کو اپنی اسناد سفارت پیش کرنا تھیں لیکن جب بولیویا کا ایشو سامنے آیا تو ہنڈورس کے صدر نے امریکی سفیر سے اسناد سفارت لینے سے انکار کر دیا۔ یوں بولیویا کے معاملے پر پورے جنوبی امریکہ میں بیداری کا عمل شروع ہو گیا۔

ہم اگر پاکستان کا تقابل بولیویا' وینز ویلا اور ہنڈورس سے کریں تو ہمیں زمین و آسمان کا فرق دکھائی دے گا' پاکستان 17 کروڑ آبادی کا ملک ہے' ہم دنیا کی پہلی اسلامی اور ساتویں ایٹمی طاقت ہیں' ہمارے پاس دنیا کی بہترین فوج ہے اور ہمارے پاس 14 لاکھ ریگولر اور جز وقتی فوجی ہیں اور ہمارا دعویٰ ہے ہم نے سوویت یونین کو افغانستان میں شکست دے دی تھی اور اس شکست کے بعد سوویت یونین ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا لیکن آپ اس پاکستان کی صورتحال ملاحظہ کیجئے امریکی طیارے پندرہ دنوں سے پاکستانی حدود کی خلاف ورزی کر رہے ہیں' افغانستان سے پریڈیٹر طیارے اڑتے ہیں' پاکستانی حدود میں داخل ہوتے ہیں' گھروں پر میزائل داغتے ہیں اور اس حملے میں ہمارے دس بارہ معصوم' بے گناہ اور روزہ دار شہری شہید ہو جاتے ہیں اور ہم اس کے ردعمل میں اپنے میڈیا کو ایک کمزور سا احتجاج بھجوا دیتے ہیں' یہ احتجاج عموماً اس قسم کا ہوتا ہے' ہم کسی بیرونی طاقت کو اپنی سرحدوں کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دیں گے اور ہم اپنی سرحدوں کی حفاظت کرنا جانتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور اگلے ہی دن دوبارہ ہماری سرحدوں کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے اور ہم ایک بار پھر اپنی سرحدوں کی حفاظت کا نعرہ لگا دیتے ہیں' ہماری جرأت کا یہ عالم ہے ہم احتجاج میں بھی امریکہ کا نام نہیں لیتے۔ میں جب بولیویا' وینز ویلا اور ہنڈورس کا تقابل اپنے ملک سے کرتا ہوں تو شرم سے سر جھک جاتا ہے اور دعا نکلتی ہے کاش ہم بولیویا ہوتے' کاش ہمارے سینے میں بورلیس' ہوگو شاویز اور مینوئیل زیلایا کا دل ہوتا' کاش اللہ تعالیٰ نے ہمیں ملک کے ساتھ ساتھ جرأت' غیرت اور حوصلہ بھی دیا ہوتا۔ ہمیں ماننا پڑے گا اگر قوموں میں غیرت نہ ہو تو ایٹم بم بھی کسی ملک میں جرأت پیدا نہیں کر سکتا' ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا اگر انسان کے دل میں جرأت اور آنکھ میں غیرت ہو تو بولیویا' وینز ویلا اور ہنڈورس جیسے ملک اسلحہ' فوج اور بم کے بغیر بھی امریکہ کے سامنے کھڑے ہو سکتے ہیں اور اگر دل جرأت اور آنکھ غیرت سے محروم ہو تو ایٹم بم بھی کسی قوم' کسی انسان کو جرأت مند نہیں بنا سکتا۔ کاش ہم بولیویا ہوتے یا ہمارے لیڈر مورلیس یا ہوگو شاویز ہوتے۔

ہم کب جاگیں گے

12 جولائی کی رات چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے ملک کے چند سینئر کالم نگاروں کو ڈنر اور گفتگو کی دعوت دی تھی' میں بھی اس گفتگو میں شریک تھا' جنرل صاحب رات گئے تک برف کی چٹان بن کر صحافیوں کے درمیان بیٹھے رہے تھے جبکہ ملک کے سینئر ترین کالم نگار جنرل صاحب کو اپنے گرما گرم سوالوں سے جذباتی کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور جنرل اشفاق پرویز کیانی ہر کھولتے اور ابلتے ہوئے تیزابی سوال کو ہنس کر ٹال جاتے تھے۔ کالم نگار ذرا دیر بعد سوالوں کی نئی صف بندی کرتے تھے اور جنرل صاحب پر دوبارہ "اٹیک" شروع کر دیتے تھے لیکن وہ یہ کہہ کر "آپ بتائیے اس مسئلے کا کیا حل ہے" صحافیوں کے سوال صحافیوں کی طرف لوٹا دیتے تھے۔ یہ نشست دیر تک جاری رہی تھی' میری اس رات فلائٹ تھی' میں فرانس جا رہا تھا چنانچہ میں نے معذرت کی اور ائیرپورٹ چلا گیا اور یوں پاکستانی سیاست کے ساتھ میرا تعلق پندرہ دن کیلئے منقطع ہو گیا۔ اس دوران میں تین دن کیلئے مراکش بھی گیا' مراکش بلاشبہ میرے لئے ایک تجربے کی حیثیت رکھتا ہے اور میں بہت جلد مراکش کے بارے میں تفصیل سے لکھوں گا۔ سر دست میں مراکش کے بارے میں چند موٹی موٹی باتیں کرتا جاتا ہوں۔ مراکش ایک اسلامی ملک ہے لیکن حکومت کی لبرل پالیسیوں کے باعث مراکش کا شمار اس وقت دنیا کے تیزی سے ترقی کرنے والے ممالک میں ہوتا ہے' مراکش شہر دو حصوں میں تقسیم ہے' شہر کا قدیم حصہ مدینہ کہلاتا ہے اور بڑی حد تک اندرون لاہور سے ملتا جلتا ہے لیکن بھاٹی اور لوہاری کے برعکس اس کی گلیاں' محلے اور گھر صاف ستھرے ہیں' مجھے پرانے شہر میں کوئی کھلی نالی نہیں ملی اور کسی جگہ کوئی گٹر ابلتا نظر نہیں آیا' شہر کا دوسرا حصہ جدید ہے' یہ حصہ یورپی سٹائل میں بنایا گیا ہے اور اس میں یورپی سٹائل کی سڑکیں' پارکس' میگا مالز اور کیفے بارز ہیں اور آپ اس حصے میں گھومتے پھرتے ہوئے چند لمحوں کیلئے فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ آپ اس وقت کسی اسلامی ملک میں موجود ہیں۔ مراکش سٹی دن کو سونے اور رات کو جاگنے والا شہر ہے' شہر کی نوے فیصد آبادی دن کو اونگھتی رہتی ہے لیکن جوں ہی شام رات کی آغوش میں اترتی ہے تو پورے شہر کی آنکھ کھل جاتی ہے' جس کے بعد شہر کی تمام عمارتیں' سڑکیں' پارکس' گلیاں اور بازار روشنیوں میں نہا جاتے ہیں' مقامی فنکار آلات موسیقی لے کر گھروں سے نکلتے ہیں' کھلے میدانوں اور چوکوں میں بیٹھ جاتے ہیں' لوگ ان کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے

ہو جاتے ہیں اور رات بھیگنے تک موسیقی اور رقص کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ سیاحت مراکش کی سب سے بڑی انڈسٹری ہے‘ ایک اندازے کے مطابق سیاحوں کی تین سو سے زائد فلائٹس روزانہ یورپ‘ امریکہ اور مشرق بعید سے مراکش آتی ہیں اور ہزاروں لاکھوں سیاح ہفتوں تک مراکش میں یوروز‘ پاؤنڈز اور ڈالرز لٹاتے رہتے ہیں‘ مراکش کی حکومت سیاحوں کی اہمیت سے واقف ہے چنانچہ اس ملک میں سیاحوں کو خصوصی تحفظ حاصل ہے۔ میں تین دن مراکش سٹی میں پھرتا رہا‘ میں نے ان تین دنوں میں نوٹ کیا آپ ہوٹل سے لے کر بینک اور بینک سے گلی محلے کے چھوٹے سے چھوٹے منی چینجرز کے پاس چلے جائیں آپ کو تمام جگہوں پر ڈالرز‘ پاؤنڈز اور یوروز کا یکساں ایکسچینج ریٹ ملے گا‘ ٹیکسیاں بہت سستی ہیں اور تمام ٹیکسی ڈرائیور غیر ملکیوں کے ساتھ بڑے احترام سے پیش آتے ہیں‘ دکانداروں کا رویہ بھی سیاحوں کے ساتھ بڑا دوستانہ ہے‘ مراکش میں اگر کوئی سیاح کسی دکاندار‘ ٹیکسی ڈرائیور یا ہوٹل کی انتظامیہ کی شکایت کر دے تو حکومت اس کا اتنا خوفناک نوٹس لیتی ہے کہ فراڈ کرنے والے کیلئے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے‘ پورے شہر میں امن اور سکون ہے اور سیاح رات گئے تک بلاخوف وخطر سڑکوں پر پھرتے رہتے ہیں۔

میں 29 جولائی کو واپس لوٹا تو اسلام آباد پہنچتے ہی ایک بری خبر ملی‘ میرے ایک دوست ہیں سردار تنویر الیاس‘ سردار صاحب کے والد صاحب سعودی عرب کے دوسرے بڑے کاروباری گروپ التمیمی کے ساتھ منسلک ہیں‘ وہ سعودی عرب کے شاہی خاندان کے بہت قریب ہیں‘ سردار صاحب نے تین برس قبل اسلام آباد میں سینٹورس کے نام سے ایک سیون سٹار ہوٹل اور میگا کمپلیکس کی بنیاد رکھی تھی‘ یہ پاکستان کی تاریخ کا مہنگا ترین پراجیکٹ ہے اور اس پراجیکٹ کیلئے سردار تنویر الیاس نے سی ڈی اے کی تاریخ کا مہنگا ترین پلاٹ خریدا تھا‘ سردار صاحب نے سعودی عرب اور گلف کی بے شمار کمپنیوں کو بھی پاکستان میں سرمایہ کاری پر تیار کیا تھا‘ سینکڑوں کی تعداد میں اوورسیز پاکستانیوں نے بھی اس پراجیکٹ میں سرمایہ کاری کی تھی اور صدر پرویز مشرف کے بقول یہ منصوبہ آنے والے دنوں میں ایفل ٹاور کی طرح اسلام آباد کی شناخت بن جائے گا لیکن 29 جولائی کو سردار تنویر الیاس کے ساتھ ایک انتہائی خوفناک حادثہ پیش آ گیا‘ دن گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان آٹھ نوجوان ڈاکو سردار تنویر الیاس کے گھر میں داخل ہوئے‘ انہوں نے سیکورٹی گارڈ کو زخمی کر کے پھینکا‘ گھر کے افراد کو ایک کمرے میں بند کیا‘ ملازموں کو یرغمال بنا کر اڑھائی کروڑ روپے کے زیورات‘ نقدی اور قیمتی اشیاء جمع کیں‘ ان کی گٹھڑی بنائی اور پیدل فرار ہو گئے۔ میں نے جونہی اسلام آباد پہنچ کر موبائل فون آن کیا تو مجھے سردار تنویر الیاس کی ٹیلی فون کال آ گئی‘ وہ بری طرح گھبرائے ہوئے تھے‘ ان کا کہنا تھا انہیں اللہ تعالیٰ نے بے تحاشا دے رکھا ہے‘ ان کیلئے دو اڑھائی‘ تین کروڑ بڑی رقم نہیں لیکن اصل مسئلہ پاکستان کا امیج ہے‘ سردار تنویر الیاس کا کہنا تھا اس

کے کی خبر جب عام ہو گی تو غیر ملکی سرمایہ کاروں بالخصوص اوورسیز پاکستانی سرمایہ کاروں کا پاکستان اعتماد مزید متزلزل ہو جائے گا اور وہ لوگ یہ سمجھیں گے جس ملک میں سردار تنویر الیاس جیسا شخص محفوظ یں‘ جس ملک میں حکومت اسلام آباد کے سب سے بڑے غیر ملکی پراجیکٹ کے مالک کو تحفظ نہیں دے اور جس ملک کے دارالحکومت میں دن دیہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں‘ جس ملک میں پرائیویٹ گارڈز ڈز‘ دس ملازم ڈاکوؤں کو روکنے میں ناکام رہتے ہیں اور جس ملک میں ڈاکو پورے اطمینان سے گھر کو ک کر پیدل فرار ہو جاتے ہیں اس ملک میں انہیں سرمایہ کاری کا رسک نہیں لینا چاہئے۔ سردار تنویر اس کا کہنا تھا اس حادثے کے بعد ان کی امید کی آخری لو بھی کانپنے لگی ہے۔

میں نے سردار تنویر الیاس کو جھوٹی سچی تسلی دے دی لیکن پاکستان واپس آتے ہی میرا دل بل ہو گیا اور مجھے محسوس ہوا ایک طرف مراکش جیسے ممالک ہیں جن میں سیاح تک محفوظ ہیں‘ جن میں ومت سیاحوں کو گارنٹی دیتی ہے آپ ملک کے کسی بھی حصے میں کرنسی تبدیل کرائیں آپ کے ساتھ ایک م کی ہیرا پھیری نہیں ہو گی‘ جن میں حکومت نے سیاحوں کو مقدس مقام دے رکھا ہے اور پورے ملک ں کسی شخص کو سیاح کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں جبکہ دوسری طرف ہمارا ملک ہے جس ں سرمایہ کاروں کا سرمایہ اور جان دونوں غیر محفوظ ہیں۔ سوچنے کی بات ہے مراکش سیاحوں کو اتنا اہم کام کیوں دیتا ہے؟ بات بڑی واضح ہے مراکش کی حکومت جانتی ہے جو شخص بھی مراکش کی سرزمین پر دم رکھتا ہے وہ سرمایہ کاری کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ ملک کی معیشت میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے‘ وہ عوام لئے روزی روٹی کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ جب تک سرمایہ کار اور اس کا اعتماد محفوظ نہیں رہے گا اس ت تک مراکش آگے نہیں بڑھے گا۔ مراکش حکومت کی یہ سوچ ہے جس کی وجہ سے یہ ملک آج سرمایہ روں کی جنت بنتا چلا جا رہا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں ہمارے ملک میں سردار تنویر الیاس جیسے لوگ ان کے گھر تک محفوظ نہیں ہیں‘ یہ لوگ دن دیہاڑے لٹتے جا رہے ہیں لہٰذا سوچئے پھر ہم پر کون اعتماد رے گا۔ سرمایہ کاروں کے دل ٹڈی کے پروں سے بنے ہوتے ہیں‘ یہ لوگ گھاس کی پتی لرزنے سے ی گھبرا جاتے ہیں اور اپنا سرمایہ سمیٹ کر اس ملک میں جا بستے ہیں جہاں گھاس نہیں اگتی۔ آپ ستم ریفی دیکھئے ہمارے ملک میں سردار تنویر الیاس جیسے سرمایہ کاروں کی عزت نفس اور حوصلوں کو دن یہاڑے کچلا جا رہا ہے جبکہ حکومت آئی ایس آئی اور آئی بی کو وزارت داخلہ کے ماتحت بنانے کے یکیشن جاری کرنے اور واپس لینے میں مصروف ہے۔ پاکستان کی معاشی فصلیں اجڑ رہی ہیں اور رے وزیراعظم امریکہ میں پاکستان کی امداد بڑھانے کی درخواستیں کر رہے ہیں۔ ہم کس صدی کے ک ہیں اور ہماری عقل کس غار میں جاسوئی ہے‘ ہم کب جاگیں گے۔

کبوتر کا انڈا

کسی نے ماؤزے تنگ سے پوچھا ''قومیں کیسے ترقی کرتی ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا ''قومیں بحرانوں' مصیبتوں' آفتوں اور پریشانیوں سے ترقی کرتی ہیں'' پوچھنے والے نے پوچھا ''وہ کیسے؟'' ماؤزے تنگ نے کہا ''قوموں کو عام حالات میں اپنے پوٹینشل کا اندازہ نہیں ہوتا' قوموں کو عام دنوں میں اپنی خامیوں' کوتاہیوں اور اپنے نظام کی کمزوریوں کا علم نہیں ہوتا لیکن جب قوموں پر کرائسز آتے ہیں' جب ان پر آفتیں' مصیبتیں اور پریشانیاں اترتی ہیں تو انہیں اپنے پوٹینشل اور ٹیلنٹ کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے اور یہ اپنے نظام کی خامیوں' کوتاہیوں اور کمزوریوں سے بھی واقف ہو جاتی ہیں' ماؤزے تنگ کا کہنا تھا ''لیکن جو قومیں بحرانوں سے نہیں سیکھتیں' جو بحرانوں کے دوران اپنے پوٹینشل اور خامیوں کا اندازہ نہیں لگاتیں وہ قومیں کبھی ترقی نہیں کرتیں''۔

یہ چین کی سوچ اور ماؤزے تنگ کا وژن تھا اور آپ کو چین کے ہر معاملے میں ماؤزے تنگ کا یہ وژن اور سوچ دکھائی دے گی' آپ تانگ شان کے زلزلے ہی کو لے لیجئے' تانگ شان (TANG SHAN) چین کا ایک تاریخی شہر ہے' یہ شہر بیجنگ سے 95 میل دور شمالی چین میں واقع ہے' 1976ء تک اس کا شمار چین کے چند بڑے صنعتی اور کاروباری شہروں میں ہوتا تھا لیکن پھر 28 جولائی 1976ء کو رات تین بج کر 42 منٹ پر اس شہر پر قیامت ٹوٹ پڑی' صوبہ میں زلزلہ آیا' زلزلے کی مختلف لہریں ''تانگ شان'' میں جمع ہوئیں اور پورا شہر زمین بوس ہو گیا' ریکٹر سکیل پر اس زلزلے کی شدت 7 اعشاریہ 8 تھی' اس زلزلے میں تانگ شان کے 6 لاکھ 55 ہزار لوگ مارے گئے جبکہ 7 لاکھ 80 ہزار شدید زخمی ہوئے' یہ چین کی ایک ہزار سالہ تاریخ کا دوسرا جبکہ 20 ویں صدی کا سب سے بڑا زلزلہ تھا' اس وقت ماؤزے تنگ زندہ تھے' ان کی عمر 83 سال تھی اور وہ علیل تھے لیکن اس کے باوجود وہ تانگ شان پہنچ گئے' اس وقت پوری دنیا نے چین کو امداد کی پیشکش کی لیکن ماؤزے تنگ نے امداد لینے سے معذرت کر لی۔ ان کا کہنا تھا ''قدرت نے یہ آفت چین پر اتاری ہے لہٰذا اسے برداشت بھی صرف چین کرے گا'' اس دور میں کسی نے ماؤزے تنگ کو مشورہ دیا' زلزلے کے باعث تانگ شان کی زمین کمزور

ہو چکی ہے لہٰذا ہمیں اب اس جگہ شہر آباد نہیں کرنا چاہئے۔ ماؤ نے یہ مشورہ ماننے سے انکار کر دیا' انہوں نے فرمایا ''ہم ٹھیک اسی جگہ ایک ایسا تانگ شان آباد کریں گے جو پچھلے شہر سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط ہو گا'' ماؤ کے بیٹوں نے واقعی اپنے باپ کے قول کا پاس کیا' آج تانگ شان کا شمار چین کے چند بڑے شہروں میں ہوتا ہے' اس کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے' اس میں بے شمار فلک بوس عمارتیں' فیکٹریاں' فارم ہاؤسز اور فلیٹس ہیں اور دنیا آج اس شہر کو چین کا بہادر شہر (بریو سٹی آف چائنا) کہتی ہے۔

تانگ شان کی تعمیر نو بیسویں صدی کا بہت بڑا معجزہ تھا لیکن اس سے بڑا معجزہ شہر کے متاثرین کی بحالی تھی' زلزلے کے بعد شہر میں تین قسم کے لوگ تھے' ایک وہ لوگ جو زلزلے میں انتقال کر گئے' دوسرے وہ جو زخمی ہو گئے اور تیسرے وہ لوگ جو اس سانحے میں پوری طرح بچ گئے' چینی حکومت نے فوری طور پر نعشوں کو دفنا دیا' زخمیوں کو نکالا' ان کی مرہم پٹی کی اور زلزلے میں بچ جانے والوں کو ملبہ اٹھانے اور شہر کی تعمیر نو پر لگا دیا۔ دوسرا مرحلہ بحالی کا تھا' اس زلزلے میں تانگ شان کے چار لاکھ خاندان متاثر ہوئے تھے' ان متاثرین کے پاس رہنے کے لئے جگہ نہیں تھی' چینی حکومت نے متاثرہ خاندانوں کی خواتین' بچوں' بوڑھوں اور زخمیوں کو پورے ملک میں پھیلا دیا' حکومت ایک خاندان کے لوگوں کو جمع کرتی' ان کے ہاتھ میں ریل کا ٹکٹ پکڑاتی اور انہیں حکم دیتی تم لوگ فلاں شہر کے فلاں محلے میں چلے جاؤ وہاں فلاں شخص تمہارا انتظار کر رہا ہے' وہ خاندان وہاں پہنچ جاتا' جس کے بعد میزبان اس خاندان کے نان نفقے کا ذمہ دار ہو جاتا' یہ میزبان رضا کار تھے۔ حکومت نے زلزلے کے دوسرے دن ملک بھر میں اعلان کر دیا تھا ہمارے پاس چار لاکھ متاثرہ خاندان ہیں جو لوگ متاثرین کو اپنے پاس پناہ دے سکتے ہیں وہ اپنا اپنا نام لکھوا دیں۔ لوگوں نے نام لکھوا دیئے۔ اس کے بعد انتظامیہ متاثرہ خاندان کے افراد دیکھ کر رضا کار کا تعین کرتی اور اس خاندان کو رضا کار گھرانے کے پاس بھجوا دیتی۔ اس سکیم کے نتیجے میں 8 ہفتوں میں تمام متاثرہ خاندان سیٹل ہو گئے' تانگ کے ان متاثرین کو امریکن پریس نے پہلی مرتبہ انٹرنلی ڈس پلیسڈ پرسنز لکھا تھا لیکن ان لوگوں کو بحال کر کے چین نے ان آئی ڈی پیز کو چائنیز ماڈل فار ری ہیبلی ٹیشن میں تبدیل کر دیا۔

آپ ملاحظہ کیجئے چین نے تانگ شان کی آفت کا مقابلہ کس جرأت' عقل مندی اور سمجھ داری سے کیا لیکن جب ہم چین کی اس مثال کو اپنے حالات کے سامنے رکھ کر دیکھتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو حوصلے' عقل اور انتظام میں کوہ ہمالیہ کے سامنے کبوتر کا انڈا محسوس کرتے ہیں' ماؤزے تنگ نے تانگ شان کے متاثرین کو پورے چین کا مہمان بنا دیا تھا جبکہ ہم نے سوات' لوئر دیر اور بونیر کے مہمانوں کو

کیمپوں میں پھینک کر مہاجرین بنا دیا۔ ماؤزے تنگ نے متاثرین اور مہاجرین کو پورے چین کا مہمان بنا دیا تھا جبکہ ہم لوگوں نے اپنے ہی بہنوں اور بھائیوں کو مہاجر‘ متاثرین اور انٹرنلی ڈس پلیسڈ پرسنز کا نام دے دیا‘ ہم میں اتنی اخلاقی جرأت بھی موجود نہیں کہ ہم انہیں ’’مہمان‘‘ ہی قرار دے دیں اور ہم نے اس آفت کو اپنا پوٹینشل اور اپنے سسٹم کی خامیاں جانچنے کا پیمانہ بنانے کی بجائے بھیک مانگنے کا ذریعہ بنا لیا۔ آج ہماری پوری حکومت ان ڈس پلیسڈ پرسنز کے نام پر دنیا بھر سے بھیک مانگ رہی ہے اور اس بھیک پر فخر بھی کر رہی ہے اور خوشیاں بھی منا رہی ہے‘ ادھر کیمپوں میں پڑے ہمارے مہمان بھی ہمیں بددعائیں دے رہے ہیں‘ یہ بحران‘ یہ کیمپس اور یہ 25 لاکھ لوگ ہماری مس مینجمنٹ‘ ہماری بے حسی اور ہماری بے وقوفیوں کی زندہ مثال بھی ہیں‘ یہ ثابت کرتے ہیں ہم میں سیکھنے اور چیزوں کو بہتر انداز میں پایہ تکمیل تک پہنچانے کی صلاحیت موجود نہیں‘ ہم لوگ اگر تھوڑی عقل‘ شرم اور غیرت کا مظاہرہ کرتے‘ ہم ان 25 لاکھ لوگوں کو بھیک اور امداد کا ذریعہ بنانے کی بجائے انہیں اپنا ذاتی مہمان بنا لیتے‘ صدر اور وزیراعظم اپنی ذاتی جیب سے اگر بیس بیس خاندانوں کی کفالت کی ذمہ داری لے لیتے‘ ان کے بعد تمام وفاقی اور صوبائی وزراء دس دس خاندانوں‘ تمام ایم این ایز‘ تمام سینیٹرز‘ تمام ایم پی ایز اور تمام ناظمین پانچ پانچ خاندانوں کی ذمہ داری اٹھا لیتے اور اس کے بعد حکومت عوام سے اپیل کرتی اور عوام ان لوگوں کو ایک سال کیلئے اپنا مہمان بنا لیتے تو یہ لوگ نہ صرف پورے ملک میں تقسیم ہو جاتے بلکہ انہیں چھت بھی مل جاتی‘ روٹی بھی‘ دوا بھی اور روزگار بھی اور حکومت کیلئے ڈس پلیسڈ پرسنز کی آڑ میں چھپے طالبان پر نظر رکھنا بھی آسان ہو جاتا لیکن شاید ہم اس آبرومندانہ انتظام سے بھیک مانگنے کی عیاشی سے محروم ہو جاتے‘ ہماری بیوروکریسی کو بھی نوٹ کمانے کا موقع نہ ملتا۔ آج حکومت نے ایک ایک کیمپ میں سو سو خادم بھرتی کر رکھے ہیں‘ ان خادموں کو روزانہ پانچ سو روپے ادا کئے جاتے ہیں اور سینکڑوں ٹھیکے داروں کو خیمے بنانے‘ تاریں لگانے‘ بجلی کے کھمبوں کا بندوبست کرنے‘ پانی اور عارضی ہسپتال تعمیر کرنے اور خوراک کے انتظام کے ٹھیکے مل چکے ہیں‘ ہم اگر ان مہمانوں کو ملک میں پھیلا دیتے تو یہ ٹھیکے دار کروڑوں اربوں روپوں سے محروم رہ جاتے اور وہ سارے افسر بھی بے روزگار ہو جاتے جنہیں متاثرین کی آڑ میں نئی گاڑیاں خریدنے اور کروڑوں روپے جیب میں ڈالنے کا موقع مل رہا ہے چنانچہ ہم نے ان کیمپس کو بھیک مانگنے اور نوٹ کمانے کا ذریعہ بنا دیا اور میرا خیال ہے جب تک ہمیں بین الاقوامی برادری سے بھیک ملتی رہے گی اور ہماری بیوروکریسی کو ان کیمپوں سے دال روٹی ملتی رہے گی یہ کیمپس بھی قائم رہیں گے اور ہماری موقع پرست بیوروکریسی ڈس پلیسڈ لوگوں کے نام پر موجیں بھی اڑاتی رہے گی۔

ہم صرف ان کیمپوں سے نوٹ نہیں کما رہے بلکہ ہم دس‘ پندرہ لاکھ صحت مند مردوں کو بے کار
بنا رہے ہیں۔ آپ کسی کیمپ میں جا کر دیکھ لیں آپ کو وہاں ہٹے کٹے مرد خوراک کی قطار میں
ے دکھائی دیں گے‘ حکومت اور کچھ نہیں کر سکتی تو کم از کم ان لوگوں کو روزگار کیلئے شہروں میں
دے یا پھر انہیں فوج کے ساتھ آپریشن کیلئے واپس بھیج دیا جائے تاکہ یہ سوات میں امن قائم کرنے
ے مدد کر سکیں۔ حکومت کو چاہیے کیمپوں میں صرف خواتین‘ بچوں اور بوڑھوں کو رکھے اور تمام صحت مند
وں کو کسی کام پر لگا دے‘ انہیں کمانے اور زندگی کو دوبارہ قدموں پر کھڑا کرنے کی ہدایت کرے کیونکہ
یں ایسا نہ ہو ہم ان دس‘ پندرہ لاکھ کارآمد مردوں کو بھکاری بنا دیں اور یہ باقی زندگی امداد کیلئے ایوان
ر کی طرف دیکھتے رہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

ڈس پلیسڈ پرسن

سوات کے پندرہ لاکھ لوگ کیمپوں میں زندگی کی کس آری سے کٹ رہے ہیں اس کیلئے آپ کو دس منٹ کیلئے اپنی گاڑی سڑک کے کنارے روکنا ہو گی' آپ گاڑی روکئے' سوچ آف کیجئے' اپنی پشت سیٹ کے ساتھ لگایئے' آنکھیں بند کیجئے اور ایک لمحے کیلئے سوچئے آپ ایک پرامن زندگی گزار رہے ہیں' آپ نائین ٹو فائیو نوکری کرتے ہیں' سوٹ پہن کر دفتر جاتے ہیں' آپ کے دفتر میں سردیوں میں ہیٹر آن ہو جاتا ہے اور اپریل کے آخری ہفتے میں اے سی' آپ دن ایک بجے سے دو بجے تک لنچ کرتے ہیں اور آپ پانچ بجے اس صاف ستھری حالت میں گھر کیلئے نکل کھڑے ہوتے ہیں کہ آپ کے کوٹ پر ملازمت کی ایک سلوٹ تک نہیں ہوتی' آپ کے بچے کسی خوف اور کسی خطرے کے بغیر روزانہ سکول جاتے ہیں' آپ کی بیگم مارکیٹ سے سبزیاں' پھل اور دالیں خریدتی ہے اور اس دوران آپ کے گھر کے سارے دروازے کھلے رہتے ہیں' آپ نے زندگی میں کبھی چوکیدار نہیں رکھا' آپ کے پاس گاڑی کی سہولت بھی موجود ہے' آپ کی جیب میں ہر وقت اتنے پیسے ہوتے ہیں کہ آپ بلا جھجک ضروریات زندگی خریدتے رہتے ہیں' آپ اپنی شامیں واک کرتے ہوئے' دوستوں اور فیملی فرینڈز کی غیبتیں کرتے ہوئے اور ٹیلی ویژن پر سیاسی ٹاک شو دیکھتے ہوئے گزارتے ہیں لیکن پھر ایک روز اس زندگی کے سارے رنگ اڑ جاتے ہیں' آپ کے چاروں طرف گولیاں چلتی ہیں' آپ کی گلی کی نکڑ پر بم پھٹتے ہیں' مارٹر گرتے ہیں اور آپ کے ہمسائے کے گھر میں میزائل آ پھٹتا ہے' آپ کے بچوں کے سکول بند ہو جاتے ہیں' آپ کا دفتر تباہ ہو جاتا ہے' سڑکیں بلاک ہو جاتی ہیں' پٹرول پمپ بند ہو جاتے ہیں' شہر میں کرفیو لگ جاتا ہے' بینک رقم دینے سے انکار کر دیتے ہیں' بازاروں سے اشیاء غائب ہو جاتی ہیں' آپ کے محلے' آپ کی گلی میں نعشوں کا تعفن پھیل جاتا ہے' آپ کی بجلی بند ہو جاتی ہے' پانی کی لائین کٹ جاتی ہے اور آپ کے پورے جسم پر زندگی کی سلوٹیں ابھر آتی ہیں' آپ کو اپنے بدن سے بدبو آنے لگتی ہے' اس لمحے آپ اپنے خاندان کو بچانے کا فیصلہ کرتے ہیں' آپ گھر کا قیمتی سامان بکسوں میں بھرتے ہیں' یہ سارے بکسے خاندان کے افراد کے سروں پر رکھتے ہیں' اللہ سے زندگی کی دعا کرتے ہیں اور آپ برستے بموں اور ہوا میں تیرتی گولیوں کے درمیان گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں' آپ کے والد شوگر اور بلڈ

یشر کے مریض ہیں' آپ کی والدہ جوڑوں کے دائمی امراض کا شکار ہیں' آپ کی بیوی ماں بننے والی ہے' آپ کے بچے زیادہ دور تک چل نہیں سکتے' اس پر ستم یہ کہ تمام اہل خانہ نے اپنے اپنے سروں پر بکسے ی اٹھا رکھے ہیں اور آپ کے خاندان کے چاروں اطراف گولیاں بھی تیر رہی ہیں' اس عالم میں آپ ی والدہ کو گولی لگ جاتی ہے' ان کے جسم سے خون کا فوارہ ابل پڑتا ہے' آپ اپنے سر کا بکس نیچے پھینک یتے ہیں' آپ اپنی والدہ کو کندھے پر اٹھاتے ہیں اور دوڑ پڑتے ہیں' آپ کا خاندان آپ کا ساتھ دیتا ہے لیکن ان کیلئے اب بکسے اٹھا کر دوڑنا ممکن نہیں ہوتا چنانچہ ایک ایک کر کے آپ کے سارے بکسے راستے ں گرتے چلے جاتے ہیں' آپ مین روڈ پر آتے ہیں اور ہر گزرتی گاڑی والے کی منت کرتے ہیں لیکن س کے پاس کسی مزید مسافر کی گنجائش نہیں ہوتی' آپ مایوس ہو کر پیدل چل پڑتے ہیں' آپ کو راستے ں پانی کی بوند تک نصیب نہیں ہوتی' آپ کا پورا خاندان بغیر کھائے' بغیر پیئے پیدل چلتا رہتا ہے' چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ آپ پانچ راتوں اور چھ دنوں کی پیدل مسافت کے بعد پہلے کیمپ میں پہنچ جاتے ہیں۔

آپ کے بچوں کی ایڑھیوں سے اس وقت خون رس رہا ہوتا ہے' آپ کی بیوی چل چل کر ڈھال ہو چکی ہوتی ہے جبکہ والد بیماری اور والدہ زخم کے ہاتھوں جاں بلب ہوتی ہیں چنانچہ اس وقت آپ کے پاس کیا آپشن بچتا ہے؟ آپ اپنے خاندان کو کسی درخت کے نیچے بٹھا کر دوڑتے ہیں اور وراک لینے والوں کی لمبی قطار میں لگ جاتے ہیں' آپ کے پاس اس وقت چاول اور سالن لینے کیلئے تن تک نہیں ہوتا لیکن آپ سوچتے ہیں "کوئی بات نہیں میں اپنی جھولی میں چاول ڈلوا لوں گا" اور اس قت یہ سوچتے ہوئے آپ کے گمان تک میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ وہ جھولی ہے جس میں آپ نے چالیس سال تک ایک شکن نہیں آنے دی تھی' اسی دوران آپ کے بچے پانی پینے والوں کی قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں' آپ کے والدین ڈاکٹر کے سامنے لگی قطار میں لگ جاتے ہیں اور آپ کی ڈھال بیگم خیمہ حاصل کرنے کیلئے رجسٹریشن کی قطار میں کھڑی ہو جاتی ہیں' آپ آہستہ آہستہ چاولوں کی دیگ کے قریب پہنچ جاتے ہیں لیکن جوں ہی آپ کی باری آتی ہے تو چاول ختم ہو جاتے ہیں اور اعلان ہوتا ہے "امدادی سامان کا قافلہ اب کل آئے گا چنانچہ تمام خواتین وحضرات کل تک انتظار کریں" آپ سوچئے اس وقت آپ کی کیا حالت ہو گی' آپ مڑ کر بیگم کی طرف دیکھتے ہیں' وہ مایوسی میں سر ہلا کر اشارہ کرتی ہیں کیمپ میں کوئی خیمہ موجود نہیں' آپ کے بچے پانی کی قطار میں کھڑے ہو کر تھک جاتے ہیں جبکہ آپ کے والدین ڈاکٹر تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر کے پاس شوگر' بلڈ پریشر اور جوڑوں کے درد کی دوائیں موجود نہیں ہیں تاہم آپ کی والدہ کو اوپن ائیر آپریشن تھیٹر میں لے جایا جاتا ہے اور ان کے بازو یا ٹانگ سے گولی نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے' گولی نکل جاتی ہے لیکن اب "پین

کلز" موجود نہیں ہیں آپ اپنی والدہ کو سہارا دے کر آپریشن تھیٹر سے لے آتے ہیں لیکن آپ اب اپنی والدہ کو لے کر جائیں گے کہاں؟ رات آپ کے سر پر کھڑی ہے' پیٹ روٹی مانگتا ہے' سر کو چھپانے کیلئے ٹھکانہ چاہیے' بچوں کی ایڑھیوں سے خون نکل رہا ہے اور بیوی کے جسم میں آہستہ آہستہ درد ہلکورے لے رہا ہے' زمین نامہربان ہے' آسمان اجنبی ہے اور آپ اپنے ہی وطن میں مہاجر ہو چکے ہیں' آپ پر طالبانی سوچ کا الزام بھی لگ رہا ہے' لوگ آپ کی بڑھی ہوئی شیو کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں' خفیہ اداروں کے اہلکار بہانے بہانے سے آپ کے قریب آتے ہیں اور آپکے بیک گراؤنڈ کے بارے میں ٹوہ لینے کی کوشش کرتے ہیں' مچھر آپ اور آپکے خاندان کے زخموں کو اپنا رزق بنانے لگتے ہیں' آپکے بچے خالی دیگوں اور پانی کے ٹینکی سے ٹپکتے قطروں کو حسرت سے دیکھ رہے ہیں' آپکی زخمی والدہ درد سے کراہ رہی ہے اور آپکا والد بار بار آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور اللہ سے موت کی دعا کرتا ہے' اس لمحے آپ خلق خدا کے سامنے جھولی پھیلانے کا فیصلہ کرتے ہیں' آپ سوچتے ہیں آپ کیمپ سے باہر نکلیں' سڑک پر کھڑے ہو جائیں اور ہر گزرتے شخص کے سامنے ہاتھ پھیلا دیں۔

آپ اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں' کیمپ کے دروازے کی طرف بڑھتے ہیں اور اس وقت تک آپ یہ بھی فراموش کر دیتے ہیں آپ ایم اے پاس ہیں' آپ کے پاس دس دن پہلے تک ایک باعزت نوکری تھی' آپ روز شیو کرتے تھے' سوٹ پہنتے تھے' اپنی ذاتی کار پر دفتر جاتے تھے' آپ کے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے تھے' آپ کے بچے انگریزی سکول میں پڑھتے تھے اور اسلام آباد کے ایف الیون سیکٹر میں آپ کا ذاتی گھر ہوتا تھا' آپ گرمیوں میں یورپ اور امریکا بھی جاتے تھے' آپ کا ایک بھائی ایم این اے تھا' دوسرا وزیر تھا' تیسرا فوج میں بریگیڈیئر تھا اور باقی سارے کزن بیوروکریٹ تھے' آپ بھول جاتے ہیں آپ کے خاندان نے پچاس سال تک ملک پر حکمرانی کی تھی اور ملک کے تمام وسائل آپ کی کلاس سے ہو کر لوگوں تک پہنچتے تھے اور آپ کی زکوٰۃ اور خیرات پر درجنوں خاندان پلتے تھے' آپ یہ ساری باتیں' اپنا سارا ماضی فراموش کر دیتے ہیں کیونکہ اس لمحے آپ صرف اور صرف ایک انسان ہوتے ہیں' ایک محروم' بے بس اور مسکین انسان' آپ ایک مہاجر ہیں' ایک پناہ گزین' ایک ڈس پلیسڈ پرسن' ایک ایسا منگتا جس کے پاس اب ہاتھ پھیلانے کے سوا کوئی آپشن نہیں بچا' آپ سڑک پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور آپ اپنی طرف آنے والے پہلے انسان کی طرف ہاتھ بڑھانے لگتے ہیں' ٹھیک اس لمحے آپ کے شعور میں ایک سوال ابھرتا ہے' آپ سے آپ کا باطن پوچھتا ہے "مجھے قدرت نے کس جرم کی سزا دی" آپ اپنے اس سوال کا جواب ہی تلاش کر رہے ہوتے ہیں کہ آپ کی زندگی کا پہلا مخیر شخص آپ کے قریب پہنچ جاتا ہے اور آپ ایک مکینیکل عمل کے تحت اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیتے ہیں۔ (جاری ہے)

ڈس پلیسڈ پاکستانی پالی ٹیشن

آپ ایک سیاستدان ہیں' آپ تیس برسوں سے سیاسی شطرنج کے اہم مہرے ہیں' ملک میں آمریت ہو یا جمہوریت' فوج ہو یا پارلیمنٹ سیاست آپ کو "بائی پاس" نہیں کر سکتی۔ آپ ہر عہد اور ہر حکومت میں اپنا راستہ نکال لیتے ہیں۔ آپ پاکستان کے خوشحال ترین لوگوں میں بھی شمار ہوتے ہیں۔ کراچی' لاہور' اسلام آباد اور مری میں آپ کے گھر ہیں' ملتان اور بہاولپور میں آپ کی زمینیں ہیں' عطار اور سیالکوٹ میں آپ کی فیکٹریاں ہیں' کراچی میں آپ کا ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس ہے اور آپ مختلف ہاؤسنگ سکیموں میں بھی حصے دار ہیں۔ آپ نے احتیاطاً یورپ اور امریکہ میں بھی اپنے اکاؤنٹس کھول رکھے ہیں' آپ نے برے وقت کیلئے یورپ میں فلیٹس اور ولے بھی خرید رکھے ہیں اور آپ کے بچے بھی ملک سے ہزاروں میل دور دنیا کے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے ہیں چنانچہ آپ کی زندگی اور مستقبل دونوں ہر لحاظ سے "سکیور" ہے لیکن پھر ایک دن زندگی کے ان رنگوں میں بھنگ پڑ جاتا ہے اور آپ مینگورہ' بونیر اور شانگلا کے متاثرین جیسی صورتحال کا شکار ہو جاتے ہیں' آپ کی گلی میں بم پھٹتا ہے' گھروں کے شیشے ٹوٹ جاتے ہیں' آپ کے محلے کا ٹرانسفارمر اڑ جاتا ہے' ٹیلی فون کی لائنیں کٹ جاتی ہیں' موبائل کا ٹاور گر جانے سے نیٹ ورک جواب دے جاتا ہے' بینک اچانک بند ہو جاتے ہیں' اے ٹی ایم مشینیں جواب دے جاتی ہیں' مارکیٹس میں کتے پھرنے لگتے ہیں' آپ کے کریڈٹ کارڈز منجمد ہو جاتے ہیں اور تمام دوستوں' رشتے داروں اور عزیزوں سے رابطے منقطع ہو جاتے ہیں' آپ اپنے ہی گھر کی تلاشی لے کر رقم جمع کرتے ہیں' سارے ڈالرز' یوروز' ریال اور روپے نکالتے ہیں' رقم جوڑتے ہیں تو یہ ڈھائی تین لاکھ روپے بنتے ہیں' آپ اپنے پاسپورٹ اٹھاتے ہیں' اپنی بیگم کو گاڑی میں بٹھاتے ہیں اور شہر سے فرار ہونے لگتے ہیں لیکن آپ جس طرف جاتے ہیں وہاں بم پھٹ رہے ہیں' گولیاں سنسنا رہی ہیں' مارٹر گولے آسمان پر لکیر بنا رہے ہیں' تمام سڑکوں پر ملبہ اور نعشیں پڑی ہیں' عمارتیں گر چکی ہیں' دکانوں کے شٹر بند ہیں اور گلیوں' محلوں اور بازاروں میں جنگ جاری ہے' آپ آگ اور خون کے اس دریا میں جان بچاتے ہوئے بھاگ رہے ہیں' اچانک آپ کی گاڑی میں پٹرول کے خاتمے کی بتی جل پڑتی ہے' آپ پٹرول کی تلاش شروع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے شہر کے تمام پٹرول پمپس بند ہیں' اسی دوران آپ کی گاڑی بند ہو جاتی ہے' آپ کے سر' آپ کے ماتھے سے پسینہ بہتا ہے اور ریڑھ کی

ہڈی کے آخری سرے تک پہنچ جاتا ہے' گولیاں آپ کی گاڑی سے ٹکرانے لگتی ہیں' آپ گاڑی کے ٹائرز پھٹنے کی آواز سنتے ہیں' آپ کی ونڈ سکرین دانہ دانہ ہو کر آپ کے پاؤں میں بکھر جاتی ہے' آپ کی پچھلی نشستوں کی روئی اڑ اڑ کر ہوا میں بکھرتی ہے' آپ کی بیگم چیختے ہوئے آپ کو ہلاتی ہیں' آپ جھرجھری لیتے ہیں' گاڑی کا دروازہ کھولتے ہیں' بیگم کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور سڑک پر اندھا دھند بھاگ کھڑے ہوتے ہیں' اس عالم میں اچانک کسی طرف سے ایک گولی آتی ہے اور آپ کی بیگم کے سینے سے پار ہو جاتی ہے' ان کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے الگ ہوتا ہے' وہ سڑک پر گر جاتی ہیں اور آپ زندگی کی دوڑ میں ان سے آگے نکل جاتے ہیں' آپ ان کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔

آپ کسی نہ کسی طرح ائرپورٹ پہنچ جاتے ہیں' آپ کو معلوم ہوتا ہے تمام فلائٹس بند ہیں' آپ یو این کے لوگوں سے رابطہ کرتے ہیں' آپ اپنا ''سٹیٹس'' بتاتے ہیں' وہ آپ سے معذرت کر لیتے ہیں' آپ ان کی منتیں کرتے ہیں' آپ ان کی ٹھوڑی پر ہاتھ لگاتے ہیں' ان کے پاؤں پکڑتے ہیں' آپ کی گریہ وزاری پر کسی ایک شخص کو ترس آ جاتا ہے چنانچہ وہ آپ کو سی ون تھرٹی میں سوار کر لیتا ہے' آپ بڑی مشکل سے کراچی پہنچتے ہیں' کراچی میں آپ کو معلوم ہوتا ہے آپ کے منیجرز آپ کا سارا سرمایہ لے کر ملک سے فرار ہو چکے ہیں' آپ کے دفتر اجڑ چکے ہیں' آپ کی پراپرٹی پر غیروں کا قبضہ ہو چکا ہے اور آپ کے تمام دوست ملک سے باہر شفٹ ہو چکے ہیں' آپ پریشانی کے عالم میں سوچتے ہیں اب آپ کیا کریں؟ آپ بھی ملک سے فرار ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن اس وقت پتہ چلتا ہے فلائٹس بہت کم ہیں اور مسافر زیادہ۔ آپ ٹکٹ کے حصول میں مصروف ہو جاتے ہیں' آپ ان لوگوں کی منتیں کرتے ہیں جن کو آپ نے زندگی میں کبھی منہ تک نہیں لگایا تھا' آپ کو لوگوں کے پاؤں تک چھونا پڑتے ہیں اور آخر میں خوش قسمتی سے آپ ایک ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں' آپ کو جہاز میں سوار ہونے کیلئے چالیس گھنٹے ائرپورٹ کے فرش پر بیٹھنا اور لیٹنا پڑتا ہے۔ آپ کے کپڑے داغ دار ہو جاتے ہیں' آپ کی شیو بڑھ جاتی ہے' بال بکھر جاتے ہیں اور آپ کے جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھنے لگتے ہیں لیکن آپ ان کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے کیونکہ جب زندگی سب سے بڑی منزل بن جاتی ہے تو بدبو' شیو اور داغ بہت معمولی ہو جاتے ہیں بہر حال آپ جہاز میں سوار ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں' آپ سیٹ پر بیٹھ جاتے ہیں اور جوں ہی جہاز ہوا میں بلند ہوتا ہے آپ زندگی میں پہلی بار صدق دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

آپ ایک طویل سفر کے بعد یورپ میں اترتے ہیں لیکن آپ جوں ہی امیگریشن کی قطار میں کھڑے ہوتے ہیں تو پولیس کا ایک اہلکار آپ کے پاس آتا ہے اور آپ کو دوسرے مسافروں سے الگ کر لیتا ہے' آپ کو تحقیقات کیلئے کمرے میں لے جاتا ہے اور وہ لوگ مولانا صوفی محمد' مولانا فضل اللہ اور

[سو]ئل باغ کے بارے میں پوچھنے لگتے ہیں۔ آپ انہیں لاکھ یقین دلاتے ہیں آپ ایک لبرل اور سیکولر [شخ]ص ہیں' آپ نے پوری زندگی شراب سے ناشتہ کیا تھا' آپ نے آج تک کوئی نماز نہیں پڑھی اور آپ [نے] زندگی میں کوئی عمرہ اور حج نہیں کیا لیکن وہ آپ کی یقین دہانیوں پر توجہ دینے کی بجائے سوال پر سوال [پوچ]ھتے چلے جاتے ہیں۔ آپ ان سے ان تمام انگریز افسروں سے رابطہ کرانے کی درخواست کرتے ہیں جو [ک]بھی پاکستان میں تعینات رہے تھے اور آپ کے ان سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ وہ آپ کی بات مان [ج]اتے ہیں' وہ فون ملاتے ہیں لیکن آپ کا کوئی پرانا دوست آپ سے بات کرنے کیلئے راضی نہیں ہوتا۔ آپ کو [د]و دن تک ائرپورٹ پر رکھا جاتا ہے اور بعدازاں قسمت آپ پر دوسری بار مہربان ہوتی ہے اور آپ کو عارضی [م]ہاجر کا سٹیٹس دے دیا جاتا ہے۔ آپ کیمپ میں پہنچ کر اپنے بینکوں سے رابطہ کرتے ہیں' آپ کو اطلاع دی [ج]اتی ہے حکومت نے تمام غیر ملکیوں کے اکاؤنٹس منجمد کر دیئے ہیں۔ آپ اپنی پراپرٹی کے بارے میں [م]علومات لیتے ہیں معلوم ہوتا ہے برطانیہ میں افغانستان' عراق اور پاکستان کے تمام سیاستدانوں کی جائیداد [ی]ں ضبط ہو چکی ہیں' آپ اپنے دوستوں سے رابطے کرتے ہیں' آپ کے تمام دوست آپ کا فون ریسیو نہیں [ک]رتے ہیں' آپ ان کی مجبوری سمجھ جاتے ہیں کیونکہ وہ اگر کسی مہاجر کے کانٹیکٹ میں آتے ہیں تو حکومت [ا]ن کی نیشنلٹی کینسل کر دے گی۔ آپ لیبر پارٹی کے ان عہدیداروں سے رابطے کی کوشش کرتے ہیں جو وزیر [ک]ی حیثیت سے آپ سے ملتے تھے اور آپ انہیں پاکستان میں خصوصی پروٹوکول دلاتے تھے لیکن ان کے [س]یکرٹری بھی آپ سے معذرت کر لیتے ہیں' آپ کیمپ سے باہر جانے کی کوشش کرتے ہیں مگر آپ کو روک دیا [ج]اتا ہے کیونکہ اس کیمپ میں آپ کی حیثیت قیدی جیسی ہے' آپ دکھ اور افسوس کے عالم میں اپنی جیب میں [ہا]تھ ڈالتے ہیں' مہاجر کارڈ نکالتے ہیں' کارڈ پر آپ کی تصویر چھپی ہے اور اس کے نیچے لکھا ہوتا ہے ڈس پلیسڈ [پا]کستانی پالی ٹیشن۔ آپ کارڈ کا رخ پلٹتے ہیں۔ کارڈ کی بیک پر مہاجر کیمپ میں رہنے کے اصول اور ضابطے [تح]ریر ہوتے ہیں' کارڈ کے آخر میں تحریر ہوتا ہے آپ کو اس کیمپ میں ہفتے میں چالیس پاؤنڈ ملیں گے اور آپ کو [کا]رڈ پر تحریر تمام ضابطوں اور اصولوں پر عمل کرنا پڑے گا۔ آپ اگر ان اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو [آ]پ کو جیل میں بند کر دیا جائے گا' آپ کارڈ جیب میں ڈالتے ہیں' کیمپ کے ڈائننگ ہال میں پہنچتے ہیں' اپنی [پل]یٹ اور پیالا اٹھاتے ہیں اور خوراک کی لائن میں لگ جاتے ہیں' قطار آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے' آپ [آپ] کے پیالے میں دال کے دو چمچ ڈال دیئے جاتے ہیں' آپ ایک مکینیکل عمل کے تحت پیالہ واپس کھینچتے ہیں [او]ر پلیٹ آگے کر دیتے ہیں' آپ کی پلیٹ میں چاول ڈال دیئے جاتے ہیں' ٹھیک اس لمحے آپ کے باطن [سے] ایک سوال ابھرتا ہے ''یا باری تعالیٰ مجھے کس جرم کی سزا ملی'' آپ ابھی جواب تلاش کر رہے ہوتے ہیں کہ [کیم]پ کا گارڈ کرخت آواز میں چیختا ہے ''موو وو''۔ (جاری ہے)

ڈس پلیسڈ اسٹیبلشمنٹ

اور اگر آپ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ ہیں' آپ جنرل ہیں' سیکرٹری ہیں' چیئرمین ہیں' آئی جی ہیں اور ڈائریکٹر جنرل ہیں' آپ دو دو ایکڑ کے گھروں میں رہتے تھے' آپ کو سرکاری گاڑیاں ملتی تھیں' گاڑیوں کا پٹرول اور مرمت مفت ہوتی تھی' حکومت ٹیلی فون' گیس' خانساماں' مالی' چوکیدار' ڈرائیور' ویٹر' اے ڈی سی اور ٹیلی فون آپریٹر کی سہولت فراہم کرتی تھی' آپ کو ٹی اے اور ڈی اے بھی ملتا تھا' آپ' آپ کے بچوں اور والدین کا میڈیکل بھی فری تھا' آپ نے سرکاری خزانے سے تیس چالیس ملکوں کے دورے بھی کئے تھے' آپ کو فائیو سٹار میسوں اور کلبوں کی سہولت بھی حاصل تھی' آپ کی شامیں گالف کورسز اور راتیں پارٹیوں میں گزرتی تھیں' آپ کو ریٹائرمنٹ سے پہلے چار پانچ کروڑ روپے کا پلاٹ بھی مل جاتا تھا اور آپ سرکاری ٹھیکے داروں کے ذریعے اس پر محل جیسا گھر بھی بنا لیتے تھے' آپ کے بچے سرکاری وظیفوں پر غیر ملکی یونیورسٹیوں میں پڑھتے تھے' آپ کے ایک ایک دستخط کی مالیت پانچ پانچ' دس دس کروڑ روپے تھی اور آپ عمر بھر اس مالیت سے دل کھول کر "استفادہ" کرتے رہے تھے' آپ کے دائیں بائیں حکومتیں تبدیل ہوتی تھیں' ایک حکمران اقتدار کے ایوان سے نکل کر جیل جاتا تھا اور دوسرا جیل سے نکل کر ایوان اقتدار میں داخل ہو جاتا تھا لیکن آپ کا پرنالہ اپنی جگہ قائم رہتا تھا' آپ عارضی اقتدار کے مستقل ستون تھے' آپ ملک کے حقیقتاً بادشاہ تھے' لاکھوں کروڑوں لوگوں کا مقدر آپ کی میز اور کرسی کے گرد گھومتا تھا' آپ کو طاقت کے اس اندھے ارتکاز نے فرعون بنا دیا تھا چنانچہ آپ نے سرکاری دفتروں اور سرکاری نظام کو پاگل خانے کی شکل دے دی تھی' آپ کے دفتر ایسی بھول بھلیاں بن گئے تھے جن میں جو شخص ایک بار قدم رکھ دیتا تھا وہ پوری زندگی ان بھول بھلیوں سے باہر نہیں نکل سکتا تھا' آپ کے سرکاری نظام میں داخل ہونے والا کاغذ فائل بلکہ درجنوں فائلیں بن جاتا تھا لیکن سائل کا کام نہیں ہوتا تھا' لوگوں کو پیدائش اور انتقال کا سرٹیفکیٹ لینے' شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانے حتیٰ کہ قبر کیلئے زمین تک الاٹ کرانے کیلئے برسوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ آپ نے ایک ایسا نظام ترتیب دے رکھا تھا جس میں کوئی سائل اگر وقت معلوم کرنے کی درخواست دے دیتا تھا تو اسے دو دو سال تک اس کا جواب نہیں ملتا تھا اور کسی بدنصیب کو اگر کسی ہسپتال سے آکسیجن درکار ہوتی تھی تو اس کی درخواست بوڑھی

ہو جاتی تھی لیکن اسے تین منٹ کیلئے آکسیجن کا ماسک نہیں لگتا تھا۔ آپ اس قدر طاقتور تھے کہ اگر چاہتے تو پچاس پچاس ہزار ایکڑ زمینوں پر قبضہ کر لیتے تھے اور کوئی آپ کی طرف انگلی تک نہ اٹھا سکتا تھا۔ آپ کسی بھی وقت "قومی مفاد" کو جواز بنا کر اقتدار پر قابض ہو سکتے تھے اور آخری سانس تک جس قاعدے' جس قانون اور آئین کی جس دفعہ سے چاہتے اپنے جوتے صاف کرتے تھے۔ آپ اس قدر طاقتور تھے کہ آپ اگر ملک بھی توڑ دیتے تو بھی آپ کو پرچم میں لپیٹ کر اور گارڈ آف آنر دے کر دفن کیا جاتا تھا' آپ پورے ملک کو برباد کر دیتے تو بھی آپ کو سلامی دے کر ایوان اقتدار سے رخصت کیا جاتا تھا اور آپ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی پورے پروٹوکول اور سیکورٹی کے ساتھ ملک میں گھومتے تھے اور ملکی قوانین کا مذاق اڑاتے تھے لیکن پھر آپ کے ساتھ بھی وہی ہوا جو منگورہ' شانگلہ' بونیر اور دیر کے لوگوں کے ساتھ ہوا' آپ کے ساتھ کیا ہوا؟

آپ کے گھر کے قریب اچانک ایک بم پھٹا' آپ کے گھر کے سارے شیشے ٹوٹ گئے اور آپ کی گاڑیاں تباہ ہو گئیں' آپ گھبرا کر باہر نکلے تو آپ کے چاروں اطراف گولیاں سنسنا رہی تھیں' آپ بیگم صاحبہ' اپنی بہو اور پوتے پوتیوں کے ساتھ بیسمنٹ میں چھپ گئے' آپ کے گھر کے چاروں طرف شیلنگ ہو رہی تھی' دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور آپ بیسمنٹ میں چھپے بیٹھے تھے' آپ کے گارڈز' نوکر چاکر اور ڈرائیور بھاگ جاتے ہیں' آپ کا فریج آہستہ آہستہ خالی ہو جاتا ہے' آپ کی بجلی اور ٹیلی فون بند ہو جاتا ہے اور آپ بری طرح خوراک کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں' آپ اس وقت گھر سے نکلنے کا فیصلہ کرتے ہیں' آپ بیگم صاحبہ' بہو اور پوتے پوتیوں کو لے کر اپنے محل سے باہر نکلتے ہیں لیکن آپ باہر کی صورتحال دیکھتے ہیں تو آپ کو بے اختیار کابل' بغداد اور بیروت یاد آ جاتے ہیں' آپ کو یاد آ جاتا ہے آپ اپنی ٹھنڈی یخ سٹڈی میں گھوڑے کی کھال کے صوفے پر بیٹھ کر اطالوی کافی کا مگ اٹھا کر جاپانی پلازے پر یہ مناظر دیکھا کرتے تھے اور ہنس کر کہتے تھے یہ کتنے بے وقوف لوگ ہیں' انہوں نے امریکا کو اپنا دشمن بنا لیا' آپ کو اپنی جنت اجڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے' پورے شہر میں بلیک آؤٹ ہے' نعشیں سڑکوں پر پڑی ہیں' گھروں کے دروازے کھلے ہیں' مارکیٹیں لٹی پٹی ہیں اور حشر کے اس میدان میں آپ اپنے سہمے ہوئے پوتے پوتیوں کے ساتھ کسی ان دیکھی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں' زندگی کی تلاش میں پھرتے ان لمحوں کے دوران اچانک کسی طرف سے ایک گولی آتی ہے اور آپ کے پوتے کے جسم میں گم ہو جاتی ہے' آپ کا پوتا دلدوز چیخ مارتا ہے' آپ اسے اٹھاتے ہیں اور دیوانہ وار دوڑ پڑتے ہیں' آپ کی بیگم' آپ کی بہو اور آپ کے دوسرے پوتے پوتیاں بھی چیختے ہیں اور آپ کے ساتھ دوڑنے لگتے ہیں'

اس دوران آپ کے سارے خاندان کے پاؤں سے جوتے نکل جاتے ہیں لیکن آپ لوگ اس کی پرواہ کئے بغیر دوڑتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ آپ یو این کے کیمپ تک پہنچ جاتے ہیں۔

آپ کیمپ میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیتے ہیں لیکن آپ کا اصل امتحان ابھی باقی ہے' آپ ہزاروں لوگوں کو ننگی زمین اور کھلے آسمان تلے پڑا دیکھتے ہیں' یہ تمام لوگ بیمار بھی ہیں' زخمی بھی ہیں اور بھوکے بھی ہیں' آپ خوراک کی قطار کی طرف دیکھتے ہیں' آپ ریڈ کراس کے خیمے کی طرف دیکھتے ہیں' آپ رجسٹریشن آفس کی طرف دیکھتے ہیں' تمام خیموں کے سامنے ہزاروں لوگ کھڑے ہیں اور قطاریں چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہیں' آپ کیمپ کے انچارج کے خیمے میں جاتے ہیں' آپ کو بتایا جاتا ہے کیمپ انچارج چھٹی پر ہے' تین دن بعد آئے گا' آپ کا خون کھول اٹھتا ہے لیکن آپ کو اچانک یاد آتا ہے آپ کے دفتر میں بھی جب کوئی سائل آتا تھا تو اسے بھی یہی جواب ملتا تھا "صاحب چھٹی پر ہیں" آپ ڈپٹی انچارج کے خیمے کی طرف بڑھتے ہیں آپ کو بتایا جاتا ہے "صاحب میٹنگ میں ہیں' صبح فارغ ہوں گے" آپ کلرک کے پاس جاتے ہیں' آپ اس کو اپنا تعارف کراتے ہیں لیکن وہ بات سنے بغیر آپ کو حکم دیتا ہے "آپ تحریری درخواست دے دیں میں صبح صاحب کو پہنچا دوں گا" آپ دوسرے کلرک کے پاس جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے وہ چھٹی کر گیا ہے اور دوسری شفٹ کا کلرک ابھی ڈیوٹی پر نہیں پہنچا' آپ کیمپ کے کمانڈر کا نام معلوم کرتے ہیں' آپ یہ جان کر خوشی سے دیوانے ہو جاتے ہیں وہ تیس سال پہلے بوسنیا میں آپ کا کولیگ رہا تھا' آپ خوشی خوشی اس کے خیمے میں جاتے ہیں' آپ بڑی مشکل سے اسے اپنی پہچان کرانے میں کامیاب ہوتے ہیں' آپ اس سے درخواست کرتے ہیں وہ آپ کو کسی ایگزیکٹو یا وی آئی پی کیمپ میں شفٹ کر دے لیکن وہ آپ کو بتاتا ہے تمام کیمپس میں مختلف وبائیں پھیلی ہوئی ہیں چنانچہ کسی کیمپ کا پناہ گزین کسی دوسرے کیمپ میں نہیں جا سکتا' آپ اس کی منت کرتے ہیں کہ وہ آپ کو ملک سے باہر بھجوا دے لیکن وہ آپ کو بتاتا ہے کانگو' ڈینگی اور برڈ فلو کے اندیشے کی وجہ سے پوری دنیا نے اپنی فلائیٹس بند کر دی ہیں چنانچہ آپ اب اس کیمپ کے علاوہ کہیں نہیں جا سکتے" آپ مایوس ہو کر باہر نکلتے ہیں اور چپ چاپ خوراک کی قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں' آپ اس وقت آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور اپنے آپ سے پوچھتے ہیں "آخر مجھے کس جرم کی سزا ملی" آپ ابھی جواب تلاش کر رہے ہوتے ہیں کہ آپ سے پیچھے کھڑا پناہ گزین آپ کو دھکا دیتا ہے اور غصے سے چلاتا ہے "اوئے آگے چل ناں' بڑا آیا نواب" اور آپ مڑ کر بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہیں' آپ کے پیچھے ایک بدبودار بلڈی سویلین کھڑا ہوتا ہے۔ (جاری ہے)

ڈس پلیسڈ اینکر پرسن

آپ پاکستان کے مقبول ترین اینکر پرسن ہیں' آپ کا شمار ان ٹیلی ویژن اینکرز میں ہوتا ہے جنہوں نے عملی زندگی کا آغاز پرنٹ میڈیا سے کیا' صحافت میں جھنڈے گاڑھے اور جب پرائیویٹ ٹیلی ویژن چینلز شروع ہوئے تو آپ ٹیلی ویژن سکرین پر ظاہر ہو گئے' آپ ایوان اقتدار کے "ان سائیڈر" تھے' آپ بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے بڑے بڑے قائدین کے ذاتی دوست تھے' آپ بیورو کریسی کے اعلیٰ سرکل میں بھی "ان" تھے' آپ سفارتخانوں کی تمام تقریبات میں بھی دیکھے جاتے تھے' آپ خفیہ اور ظاہری اداروں کی بریفنگز بھی اٹینڈ کرتے تھے اور آپ کو واقعات کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے ہی ان کی اطلاع مل جاتی تھی چنانچہ آپ کا شو کامیاب چل رہا تھا۔ آپ کے مہمان سیاستدان آپ سے سکرین پر الجھنے سے پرہیز کرتے تھے کیونکہ آپ ان کی خامیوں اور کوتاہیوں سے بھی واقف تھے اور آپ ان کے ماضی کے بھی عینی شاہد تھے۔ آپ کے چند لفظ ملک میں آگ لگا دیتے تھے اور چند بول جلتی آگ پر بارش ثابت ہوتے تھے' آپ کے کیمرے اور آپ کے مائیک کو ملک کا کوئی قانون' کوئی ضابطہ نہیں روک سکتا تھا' آپ جو دکھانا چاہتے تھے آپ دکھاتے تھے اور جو بولنا چاہتے تھے آپ بولتے تھے۔ آپ کنگ میکر بھی تھے' آپ جس کا جھنڈا اٹھاتے تھے وہ ملک کا بادشاہ بن جاتا تھا اور جس کی یونیفارم اتارنے پر کمربستہ ہو جاتے تھے وہ نیکر میں ملک سے بھاگنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ آپ نے ججوں اور وکیلوں کی تحریک چلائی وہ کامیاب ہو گئی' آپ نے طالبان کو مظلوم ثابت کیا وہ ہو گئے' آپ نے طالبان کو بعد ازاں ظالم اور ان پڑھ ثابت کیا وہ ہو گئے۔ آپ نے سوات کے امن معاہدے کی تائید کی امن معاہدہ ہو گیا' آپ نے اس معاہدے کے خلاف بولنا شروع کیا سوات میں ملٹری آپریشن شروع ہو گیا۔ آپ نے لبرل ازم کا جھنڈا اٹھایا ملک میں لبرل ازم کا سیلاب آ گیا' آپ نے اسلامی شریعت زندہ باد کے نعرے لگائے شریعت کا سویا ہوا مطالبہ جاگ گیا' آپ نے کریکر دھماکوں کو ہیڈ لائن بنایا کریکر دھماکے میدان حشر کا منظر پیش کرنے لگے اور آپ نے کوڑوں کی جعلی ویڈیو کو خبر بنایا ملک پوری دنیا میں بدنام ہو گیا۔ آپ ملک میں اس قدر مضبوط تھے کہ ملک کا کوئی قانون' کوئی ضابطہ اور کوئی اصول آپ کی آزادی کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتا تھا' آپ نے سٹیٹ کے اندر اپنی سٹیٹ قائم کر لی تھی اور آپ کی سٹیٹ باہر کی سٹیٹ سے کہیں زیادہ مضبوط تھی' آپ ٹیلی ویژن چینلز کیلئے سونے کی کان تھے' آپ کی میز پر

روزانہ کوئی نہ کوئی نئی آفر نوکری کی کوئی نہ کوئی نئی پیش کش آتی تھی اور آپ اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیتے تھے' اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز کے مالکان بھی آپ کے سامنے بے بس تھے' وہ اگر آپ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے تھے تو ان کے چینل کی "ویورشپ" کم ہو جاتی تھی اور وہ اگر آپ کو "فری ہینڈ" دیتے تھے تو حکومت ان سے ناراض ہو جاتی تھی' آپ ملک میں ہیرو کی طرح زندگی گزارتے تھے لیکن پھر ایک دن آپ کے دروازے پر بھی برے دن دستک دیتے ہیں' آپ گھبرا کر باہر آتے ہیں تو آپ اپنی سڑک کو بنگلورہ' شانگلہ' بونیر اور لوئر دیر بنا دیکھتے ہیں' آپ کی گلی میں بھی بم پھٹتے ہیں اور آپ کے دائیں بائیں اور اوپر نیچے سے بھی گولیاں سنسناتی ہیں۔ آپ سمجھدار اور "ویل انفارمڈ" شخص تھے چنانچہ آپ نے اپنے بچوں' اپنی بیگم اور اپنے والدین کو دو ماہ پہلے ہی ملک سے باہر منتقل کر دیا تھا اور آپ نے اپنے پاسپورٹ پر یورپ اور امریکا کے پانچ پانچ سال کے ویزے لگوا لئے تھے' آپ فوراً اپنا بیگ اٹھاتے ہیں' گھر کو تالا لگاتے ہیں اور ایئر پورٹ کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے ہیں' آپ کو راستے میں معلوم ہوتا ہے ملک کے کمیونیکیشن کے تمام ذرائع معطل ہو چکے ہیں سیٹلائٹ کا لنک ڈاؤن ہے' کیبل کا نیٹ ورک ختم ہو چکا ہے اور ٹیلی فون لائنیں ڈیڈ ہو چکی ہیں' تمام چینلز کی نشریات معطل ہیں' شہر کی ساری سڑکیں بلاک ہیں' گلیوں اور محلوں میں نعشیں بکھری پڑی ہیں' گھروں کے دروازے کھلے ہیں اور دکانیں لٹ چکی ہیں جبکہ ساری آبادی کیمپوں میں شفٹ ہو چکی ہے' آپ بھاگتے' دوڑتے' گرتے' پڑتے ایئر پورٹ پہنچتے ہیں' یو این کا آخری سی ون تھرٹی صحافیوں کو لے جانے کیلئے ایئر پورٹ پر تیار کھڑا ہے' آپ جیسے تیسے جہاز میں سوار ہو جاتے ہیں' جہاز ہوا میں بلند ہوتا ہے' آپ لمبی سانس لیتے ہیں اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں۔

آپ یورپ پہنچ جاتے ہیں' آپ کو سب سے پہلے کیمپ میں لے جایا جاتا ہے' حکومت کی کوشش ہوتی ہے وہ آپ کو دوسرے پناہ گزینوں کی طرح کیمپ تک محدود کر دے لیکن حکومت صحافیوں کی بین الاقوامی تنظیموں سے ڈر جاتی ہے چنانچہ آپ کو چند دن بعد چھوڑ دیا جاتا ہے' آپ اپنے خاندان کو ایک کمرے کے چھوٹے سے فلیٹ میں رکھتے ہیں اور نوکری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں' آپ بہت پرامید ہیں کیونکہ دنیا بھر کا میڈیا آپ کے "فیچر" لیا کرتا تھا اور یورپ کے تقریباً تمام چینلز میں آپ کے دوست موجود ہیں لیکن آپ جوں ہی یورپی چینلز سے رابطہ کرتے ہیں' آپ ان کے رویے پر حیران رہ جاتے ہیں' یورپی چینلز آپ کے انگریزی تلفظ کو غیر معیاری قرار دے دیتے ہیں' آپ کی آئیڈیالوجی پر بھی شک کیا جاتا ہے' آپ کو بتایا جاتا ہے آپ کے طالبان سے "لنکس" تھے چنانچہ آپ کی سیکورٹی کلیئر نہیں' آپ کو شدت پسند' انتہا پسند اور مذہبی جنونی بھی قرار دیا جاتا ہے' آپ ان کو بتاتے ہیں آپ ایک لبرل اور روشن خیال صحافی ہیں۔ اس جواز پر آپ سے پوچھا جاتا ہے "کیا آپ پورک کا گوشت کھاتے

ہیں" آپ فوراً نفرت سے انکار میں سر ہلا دیتے ہیں' آپ سے پوچھا جاتا ہے "اور کیا آپ نے حج نہیں کیا؟ کیا آپ اب تک چار' پانچ عمرے نہیں کر چکے ہیں اور آپ کی بیگم نے اسلامیات میں ایم اے نہیں کیا اور آپ کے ایک بچے نے آدھا قرآن مجید حفظ نہیں کیا" آپ ہاں میں سر ہلا دیتے ہیں' آپ سے پوچھا جاتا ہے "آپ پھر خود کو لبرل اور روشن خیال کیسے کہہ سکتے ہیں" آپ اس الزام کے جواب میں سینکڑوں جواز پیش کرتے ہیں مگر آپ کا کوئی جواز تسلیم نہیں کیا جاتا' آپ انہیں بتاتے ہیں آپ پاکستان کے مقبول ترین اینکر پرسن تھے' لوگ آپکے ہاتھ چومتے تھے' وہ آپکی یہ دلیل سنکر قہقہہ لگاتے ہیں اور پوچھتے ہیں "آپکے ہاتھ کیوں چومے جاتے تھے" آپ بتاتے ہیں آپ مقبول تھے اسلئے آپکو بتایا جاتا ہے آپکے ہاتھ اسلئے چومے جاتے تھے کہ آپ شدت پسند تھے' آپ انکار کرتے ہیں لیکن آپکا یہ انکار بھی تسلیم نہیں کیا جاتا۔

آپ کئی ماہ تک دھکے کھاتے ہیں لیکن یورپ کا کوئی ادارہ آپ کو نوکری دینے کیلئے تیار نہیں ہوتا' آپ امریکا اور مڈل ایسٹ جانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کیونکہ آپ پناہ گزین ہیں اور کوئی پناہ گزین ملک نہیں چھوڑ سکتا' آپ صحافت کے علاوہ نوکری کی تلاش کرتے ہیں لیکن آپ کو کوئی ادارہ کلرک' آفس بوائے اور چپڑاسی تک رکھنے کیلئے تیار نہیں ہوتا' آپ کاروبار کا منصوبہ بناتے ہیں لیکن کسی پناہ گزین کو یورپ کے کسی ملک میں کاروبار کی اجازت نہیں ہوتی لہٰذا آپ زوال' بے بسی اور بے کسی کی دلدل میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ آپ کے تمام دوست' تمام ناظر' تمام قارئین اور تمام دعا گو ایک ایک کر کے آپ کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں یہاں تک کہ آپ کے گھر میں فاقوں کی نوبت آ جاتی ہے' آپ کا مالک مکان آپ کو گھر خالی کرنے کا نوٹس دے دیتا ہے' آپ کے پاس اب کوئی ٹھکانہ نہیں' روزگار کا کوئی ذریعہ نہیں اور آپ کسی ملک کے شہری نہیں۔ آپ فقط ایک پناہ گزین ہیں' لاکھوں کروڑوں دوسرے پناہ گزینوں کی طرح ایک پناہ گزین چنانچہ آپ کے سامنے اب صرف ایک آپشن بچتا ہے' آپ اپنی فیملی کے ساتھ پناہ گزین کیمپ میں منتقل ہو جاتے ہیں' آپ کیمپ میں داخل ہوتے ہیں اور پورے خاندان سمیت خوراک کی قطار میں لگ جاتے ہیں' آپ اس لمحے آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے پوچھتے ہیں "یا باری تعالیٰ آخر میرا کیا قصور تھا" آپ کو ابھی کوئی جواب نہیں ملتا کہ آپ کو اچانک ٹھوکر لگتی ہے اور آپ اپنے آگے کھڑے پناہ گزین کے قدموں میں گر جاتے ہیں' آپ اس وقت اپنے آپ سے پوچھتے ہیں "کیا میں وہی شخص ہوں لوگ جس کے ہاتھ چوما کرتے تھے"۔ (جاری ہے)

⊘ ⊘ ⊘

ڈس پلیسڈ نیشن

ٹوئن بی دنیا کا نامور مؤرخ تھا' اس نے تاریخ کی ایک معرکتہ الآرا کتاب تحریر کی' یہ دنیا کی قدیم قوموں کے عروج وزوال کی کہانی تھی' آپ اگر قوموں کی تشکیل اور تخریب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ ٹوئن بی کو ضرور پڑھیں' آپ کو انسان کی ساری معاشرتی سرشت سمجھ آجائے گی۔ ٹوئن بی نے عروج وزوال کی اس داستان کے درمیان ایک جگہ اپنے آپ سے حیرت سے پوچھا "میں حیران ہوں جب کسی قوم پر قدرت کا عذاب نازل ہوتا ہے تو اس قوم کے اچھے' نیک' سمجھدار اور پڑھے لکھے لوگ بھی اسی انجام کا شکار کیوں ہو جاتے ہیں جس سے اس قوم کے برے' ظالم' غاصب اور بدکردار لوگ دوچار ہوتے ہیں' میں اکثر سوچتا ہوں عذاب کے دور میں قدرت اچھوں اور بروں کے ساتھ یکساں سلوک کیوں کرتی ہے" ٹوئن بی اس سوال کا جواب تلاش کرتا رہا لیکن وہ کسی ٹھوس وجہ تک نہ پہنچ سکا مگر ہم لوگ اگر پاکستان کے حالات کا جائزہ لیں تو ہم بڑی آسانی سے وہ وجہ معلوم کر سکتے ہیں۔ آپ بونیر' لوئر دیر اور سوات کے ان 20 لاکھ شہریوں کو دیکھئے جو اس چلچلاتی دھوپ اور 40 سینٹی گریڈ کی گرمی میں کیمپوں میں پڑے ہیں' یہ لوگ قطار میں کھڑے ہو کر دو وقت کا کھانا وصول کر رہے ہیں' دوزخ کی طرح تپتے خیموں میں رہنے پر مجبور ہیں' پانی' دوا اور ڈاکٹر کو ترس رہے ہیں اور اپنے گھروں' محلوں اور شہروں کو یاد کر رہے ہیں۔ یہ 20 لاکھ لوگ کل تک اپنے گھر' کاروبار اور ایک خوشحال اور باعزت زندگی کے مالک تھے لیکن یہ آج دوسروں کے رحم وکرم پر پڑے ہیں۔ یہ لوگ بے گناہ بھی ہیں' معصوم بھی اور عزت دار بھی۔ ان میں سے نوے فیصد لوگ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں' یہ امانت دار بھی ہیں' راست گو بھی اور ہمدرد بھی اور انہوں نے کسی دوسرے انسان کو تکلیف نہیں پہنچائی لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے قدرت نے پھر انہیں کس جرم' کس گناہ کی سزا دی؟ میں آپ کو یہ بھی عرض کرتا چلوں اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء' اولیائے کرام اور مقرب بندوں کو ہجرت پر مجبور کرتا ہے یا پھر ان لوگوں کو جنہیں سزا دینا مقصود ہو اور ظاہر ہے یہ 20 لاکھ لوگ اولیائے کرام کی جماعت نہیں ہیں لہٰذا پھر ان لوگوں کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟ ان لوگوں کو خاموشی کی سزا مل رہی ہے' یہ لوگ اس وقت خاموش رہے تھے جب طالبان کی شکل میں ظالم' ان پڑھ اور سخت گیر لوگ ان کی بستیوں میں داخل ہو رہے تھے' یہ لوگ اس وقت بھی خاموش رہے تھے جب شدت پسندوں نے ان

کے دیہات' قصبوں اور شہروں کے چیدہ چیدہ لوگوں کو نشانہ بنانا شروع کیا' یہ لوگ اس وقت بھی خاموش رہے جب انتہا پسندوں نے سرکاری دفاتر بند کرا دیئے' سکولوں کو دھماکوں سے اڑا دیا' سڑکوں پر ناکے لگا کر ٹیکس وصول کرنا شروع کیے اور پورے پورے شہر کو اپنے قبضے میں کر لیا اور یہ لوگ اس وقت بھی خاموش رہے جب نام نہاد طالبان نے ان لوگوں پر اپنی مرضی کی شریعت نافذ کر دی لہٰذا یہ ان لوگوں کی خاموشی اور چپ تھی جس کی سزا قدرت نے انہیں دینے کا فیصلہ کیا چنانچہ آج یہ لوگ کیمپوں میں پڑے ہیں۔ آپ طالبان کی تعداد نکلوا کر دیکھ لیجئے پاکستانی اداروں کے اعداد وشمار کے مطابق یہ لوگ شروع میں ساڑھے تین ہزار تھے اور آج ان کی تعداد ساڑھے تیرہ ہزار ہے۔ اگر سوات کے 20 لاکھ لوگ شروع ہی میں ان تین چار ہزار لوگوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیتے' یہ لوگ انہیں اپنے دیہات' قصبوں اور شہروں میں قبضہ نہ کرنے دیتے تو یہ آج یوں کیمپوں میں نہ پڑے ہوتے' یہ آج یوں دوسروں کی امداد کے محتاج نہ ہوتے۔

ہم بھی اگر اس پورے ملک کو سوات' بونیر اور لوئر دیر بننے سے بچانا چاہتے ہیں' ہم لوگ بھی اگر ڈس پلیسڈ سٹیزن' ڈس پلیسڈ پالی ٹیشن' ڈس پلیسڈ اسٹیبلشمنٹ' ڈس پلیسڈ اینکر پرسن اور ڈس پلیسڈ نیشن کے انجام سے بچنا چاہتے ہیں' ہم بھی اگر کیمپوں کی ذلت اور خوراک کی قطاروں میں کھڑے ہونے کی ہزیمت سے بچنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں خاموشی توڑنا ہوگی' ہمیں معاشرے کیلئے اپنا فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔ ہمیں تسلیم کرنا ہوگا ہمارے ملک میں سماجی اور قانونی انصاف موجود نہیں چنانچہ ہماری پولیس' انتظامیہ اور جوڈیشری کو ڈس پلیسڈ ہونے سے پہلے پہلے اپنا قبلہ درست کر لینا چاہئے۔ آج سے تمام جج' وکلاء اور تمام پولیس اہلکار اپنی خاموشی توڑنے کا اعلان کر دیں' یہ لوگ جائز کو جائز اور ناجائز کو ناجائز کہنے کی جرأت پیدا کر لیں اور لوگوں کو فوری انصاف فراہم کریں خواہ انصاف کی فراہمی میں ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ ہمارے تمام سیاستدان اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیں' یہ اپنے ناجائز اثاثوں سے دست بردار ہو جائیں' اگر ان میں اتنی جرأت نہیں تو یہ اپنے خزانے عوام کی ویلفیئر پر لگانا شروع کر دیں' اس سے تعلیمی ادارے بنائیں' ہسپتال قائم کریں اور ایسی چھوٹی چھوٹی صنعتیں لگائیں جن کی ساری آمدنی ورکروں کی بہبود پر خرچ ہو' سیاستدان سمجھوتوں کی سیاست اور پارٹیوں کی آمریت کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیں۔ یہ لوگ حصول کی بجائے اصول کو مقصد بنا لیں' یہ لوگ دبنے' جھکنے اور مک مکاؤ سے بھی توبہ کر لیں اور خدمت کو سیاست بنا لیں' ہماری بیوروکریسی آج سے متحرک ہو جائے' یہ لوگ تاخیر اور رکاوٹ کو اپنے خمیر سے نکال کر باہر پھینک دیں' یہ لوگ فیصلہ کر لیں آج کا کام آج ہی ختم ہوگا' کوئی درخواست فائل نہیں بنے گی' جائز کام کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی اور ناجائز کام کسی قیمت

پر جائز نہیں ہوگا۔ ملٹری اسٹیبلشمنٹ فوجی بیرکوں اور سرحدوں تک محدود رہنے کا فیصلہ کر لے' فوج آج فیصلہ کر لے وہ اس جنرل کا حکم نہیں مانے گی جو اپنے اختیارات سے تجاوز کرے گا' جو اقتدار پر قابض ہونے کی کوشش کرے گا' فوج کی قیادت پلاٹوں اور زرعی زمینوں سے بھی دستبردار ہو جائے اور صرف شہداء اور ان کے پسماندگان کو پلاٹ دیئے جائیں اور باقی میجر سے لے کر جنرل تک تمام افسروں سے یہ سہولت واپس لے لی جائے۔ سول بیوروکریسی کی مراعات بھی واپس لے لی جائیں' وزراء کی مراعات ختم کر دی جائیں اور تنخواہیں آدھی کر دی جائیں' ملک میں کسی عہدیدار کو پروٹوکول اور سیکورٹی فراہم نہ کی جائے' وہ لوگ وزیر اور مشیر بنائے جائیں جو کم تنخواہ میں گزارا کر سکیں اور اپنی حفاظت خود کر سکیں۔ ملک کے بڑے بڑے ایوان' ہاؤسز اور رہائش گاہیں بیس سال کیلئے بند کر دی جائیں یا انہیں پرائیویٹائز کر دیا جائے' سیاسی جماعتوں کے اندر الیکشن کو لازمی قرار دے دیا جائے اور کوئی شخص تیسری بار پارٹی کا سربراہ نہ بن سکے۔ ملک کے تمام بچوں کی تعلیم' تمام شہریوں کا علاج اور تمام بچیوں کی شادی حکومت کی ذمہ داری ہو۔ یہ ذمے داریاں ناظموں کو سونپ دی جائیں اور جو ناظم یہ ذمہ داری پوری نہ کر سکے اسے بیس سال کیلئے جیل میں ڈال دیا جائے۔ حکومت میٹرک کے بعد تمام نوجوانوں کو فنی تعلیم دے' وہ نوجوان جو ڈاکٹر' انجینئر اور کمپیوٹر ایکسپرٹ بن سکتے ہیں ان کے علاوہ تمام بچوں کو کوئی نہ کوئی ہنر سکھایا جائے تاکہ یہ نوجوان اپنا رزق کما سکیں۔ حکومت ملک میں ایک کنال سے بڑا مکان بنانے پر پابندی لگا دے اور کوئی شخص زندگی میں دوسرا مکان نہ بنا سکے۔ حکومت کم آمدنی کے حامل لوگوں کو مکان کی سہولت فراہم کرے' حکومت ہنگامی طور پر پبلک ٹرانسپورٹ کا بندوبست کرے اور ذاتی گاڑیوں کے رجحان کی حوصلہ شکنی کی جائے' ملک میں تقریبات کیلئے ضابطہ اخلاق طے کر دیا جائے' تمام پارٹیاں ون ڈش ہوں' مہمانوں کی تعداد معین ہو اور کسی کو کسی قسم کے اسراف کی اجازت نہ ہو۔ عدالتوں میں کوئی مقدمہ چھ ماہ سے زیادہ نہ چلے' کسی کو کسی قسم کا پروٹوکول نہ دیا جائے' کسی وزیر کی گاڑی پر جھنڈا نہ لگے' کوئی نوجوان تعلیم مکمل کرنے کے بعد فارغ نہ رہے اور ہم سب لوگ آج سے بولنا شروع کر دیں۔ ہمیں جہاں ظلم' زیادتی اور کرپشن دکھائی دے ہم اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جائیں' ہم کسی کرپٹ' بے ایمان اور نااہل افسر کو برداشت کریں اور نہ ہی کسی بے ایمان سیاستدان کو۔ ہمیں معاشرے میں جہاں کوئی ظالم اور بے ایمان شخص نظر آئے ہم اس وقت تک اس کے دروازے پر بیٹھے رہیں جب تک اس کا احتساب نہیں ہوتا اور ہم حکومت کی ہر غلط پالیسی پر اس وقت تک احتجاج کرتے رہیں جب تک وہ پالیسی ری ورس نہیں ہوتی۔

یقین کیجئے ہم نے اگر آج یہ اقدام نہ کئے تو وہ وقت دور نہیں جب جرنلسٹ سے لے کر جج

ک اور وزیر سے لے کر جنرل صاحب تک ہم سب لوگ ڈس پلیسڈ ہوں گے۔ ہم سب کیمپوں میں ے ہوں گے' ہم سب اپنا اپنا پیالہ اور اپنی اپنی پلیٹ اٹھا کر قطار میں کھڑے ہوں گے اور لوگ دال کا یک چمچ دینے سے پہلے ہمیں گالی دیں گے' ہم سب ڈس پلیسڈ ہوں گے اور باقی زندگی رو رو کر گزاریں گے اور ہم سب سوات کے لوگوں کی طرح خاموشی کی سزا بھگتنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

⊘ ⊘ ⊘

پاکستان انقلاب کے دہانے پر

فرانس کی پہچان پیرس ہے اور پیرس کی جان شانزے لیزے ہے' شانزے لیزے دنیا کی خوبصورت اور مہنگی ترین شاہراہ ہے' یہ سڑک سینکڑوں سال پہلے فرانسیسی بادشاہوں نے اپنی چہل قدمی کیلئے بنائی تھی' یہ سڑک فرانسیسی کاریگروں نے چھوٹے چھوٹے پتھر جوڑ کر مکمل کی تھی اور یہ پتھر آج تک قائم ہیں' شانزے لیزے کو دنیا کی پہلی فیشن سٹریٹ بھی کہا جاتا ہے' اس سڑک کے دونوں اطراف دنیا کے مہنگے ترین برانڈز کے شورومز' ریستوران' کیفے اور سٹور ہیں' یہ سڑک ''پلاس دی لا کنکورڈ'' سے شروع ہوتی ہے' یہ دنیا کا سب سے بڑا چوک ہے جس کے عین درمیان میں ایک مخروطی ستون ہے' یہ ستون ہزاروں سال پہلے مصری کاریگروں نے تراشا تھا' اس دور میں مصر میں فرعون راعمسیس کی حکومت ہوتی تھی' یہ وہی فرعون ہے جس نے حضرت موسیٰ کے دور میں خدائی کا دعویٰ کیا' حضرت موسیٰ کے ساتھ اس کا مقابلہ ہوا اور وہ اور اس کی فوج دریائے نیل میں ڈوب کر مر گئی' یہ ستون مکمل ہوا تو کاریگروں نے اس پر تیشے سے فرعون راعمسیس کی طاقت' اختیار اور آئینی ترامیم کھود دیں اور یہ ستون بادشاہ معظم کے حضور پیش کر دیا' فرعون یقیناً رعایا کے اس تمغے پر خوش ہوا ہوگا اور اس نے یہ ستون اپنے ایوان صدر کے سامنے نصب کرا دیا ہوگا لیکن وقت بدلا' فرعون پر اکتوبر کا مہینہ آیا' وہ اور اس کی سلطنت دونوں بکھر گئے اور اس کا سارا اختیار' ساری طاقت اور سارے ایل ایف او ریت میں دفن ہو گئے' انیسویں اور بیسویں صدی میں مصری صحراؤں میں فرعون کے آثار قدیمہ دریافت ہوئے تو یہ ستون بھی کسی کونے کھدرے میں پڑا ہوا مل گیا' یہ ستون طویل عرصے تک مصری حکومت کی تحویل میں رہا' مصری بادشاہ محمد علی پاشا پیرس کے سرکاری دورے پر آیا تو وہ یہ ستون بھی ساتھ لے آیا اور کنگ لوئی کو تحفتاً پیش کر دیا' بادشاہ نے یہ ستون پیرس کے سب سے بڑے چوک میں لگوا دیا اور اس چوک کو ستون کے حوالے سے ''پلاس دی لا کنکورڈ'' کا نام دے دیا' یہ ستون آج تک یہاں موجود ہے اور اس پر قدیم مصری زبان میں کھدے ہوئے وہ سارے قصیدے بھی جوں کے توں ہیں جو پانچ ہزار سال قبل کے شیر افگنوں' وصی ظفروں اور درانیوں نے تخلیق کئے تھے لیکن افسوس دنیا کے ماہرین لسانیات آج تک کنکورڈ کی زبان ''ڈی کوڈ'' نہیں کر سکے مگر مجھے یقین ہے اگر کبھی دنیا کو کنکورڈ کی زبان سمجھ آ گئی تو وہ کچھ اس طرح ہو گی'' ہم بادشاہ کو دس بار

یونیفارم میں منتخب کرائیں گے' آئین صدر کو دونوں عہدے رکھنے کی اجازت دیتا ہے اور صدر موجودہ اسمبلیوں سے دوسری بار اعتماد کا ووٹ لے سکتا ہے'' وغیرہ وغیرہ۔

شانزے لیزے کی دوسری انتہا پر ''آرک ڈی تری اونف'' ہے' یہ بارہ دری قسم کی عمارت ہے لیکن اس کے صرف چار دروازے ہیں اور یہ نپولین بونا پارٹ کی فتوحات اور کامیابیوں کے اعتراف میں بنائی گئی تھی' اس عمارت کے عین درمیان میں ایک نامعلوم سپاہی کی یاد میں ایک مشعل روشن ہے' یہ مشعل پچھلے نوے برس سے مسلسل جل رہی ہے اور فرانس کے تمام فوجی اس مقام پر پہنچ کر سر سے ٹوپی اتارتے ہیں اور ان فرنچ سپاہیوں کو سیلوٹ کرتے ہیں جنہوں نے پہلی جنگ عظیم میں اپنے وطن کیلئے جان دی تھی' اس چوک کو ایک اور انفرادیت بھی حاصل ہے' پیرس کی بارہ بڑی سڑکیں اس آرک سے شروع ہوتی ہیں اور ان سڑکوں میں شاہراہ جمہوریت بھی شامل ہے' تاریخ بتاتی ہے اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب انقلاب فرانس آیا تو پیرس کے انقلابیوں نے اس مقام پر گلوٹین نصب کر دی تھی اور اس چوک میں روزانہ ڈیڑھ سو اشرافیہ' حکمرانوں اور سیاستدانوں کا سر قلم کیا جاتا تھا' انقلابی پیرس کے مختلف چوکوں میں کھڑے ہو جاتے تھے اور انہیں جس شخص کے ہاتھ نرم دکھائی دیتے تھے' جس کے جسم سے عطر اور صابن کی خوشبو آتی تھی اور جس نے تازی شیو بنائی ہوتی تھی وہ اسے روکتے تھے' سرسری عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ چلاتے تھے اور گلوٹین کے نیچے لٹا کر اس کا سر قلم کر دیتے تھے' میں جب بھی اس چوک پر پہنچتا ہوں تو مجھے نہ جانے کیوں یہ محسوس ہوتا ہے اس آرک کے نیچے آج بھی فرانس کی اس اشرافیہ کا خون موجود ہوگا جس نے عوام کیلئے روٹی تک ناممکن بنا دی تھی' جس نے فوج کو کھل کھیلنے کی اجازت دی تھی اور جس نے عوام کے احتجاج پر پابندی لگا دی تھی' یہ فرانس کی تاریخ کا وہ دور تھا جس میں سارے سول محکموں کے سربراہ فوجی تھے اور بادشاہ بھاری رشوت لے کر حکومت مختلف سیاستدانوں کے حوالے کرتا رہتا تھا' بادشاہ نے پیرس کے مضافاتی علاقے وارسائی میں محلات بنانے کا فیصلہ کیا تو اس نے اپنے وزیر خزانہ کو بلایا اور حکم دیا یہ محلات تم بنواؤ گے' وزیر خزانہ نے سر تسلیم خم کیا اور عوام کا خون نچوڑ کر معماروں کے حوالے کر دیا اور معماروں نے وارسائی میں دنیا کا سب سے بڑا محل کھڑا کر دیا' یہ محلات آج تک قائم ہیں' یہ شتو دی وارسائی کہلاتے ہیں اور ان کے در و دیوار سے عوام کے خون کی بو آتی ہے' آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہوگی' انقلاب فرانس کی بنیاد عدالت کے ایک فیصلے نے رکھی تھی' اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب لوگوں کے پاس آٹا ختم ہو گیا تھا اور وہ محل کے سامنے کھڑے ہو کر آٹے کی دہائی دینے لگے تھے اور نوخیز ملکہ نے انہیں روٹی کی جگہ کیک کھانے کا مشورہ دیا تھا تو ٹھیک اس وقت فرانس کی عدالت میں یہ مقدمہ چل رہا تھا بادشاہ کا ہر فرمان قانون ہے اور فرانس کی کسی اتھارٹی کے پاس اس سے

سرتابی کا اختیار نہیں' جس وقت لوگ پیرس کی گلیوں میں آٹا آٹا پکار رہے تھے ٹھیک اس وقت فرانس کی سپریم کورٹ نے اعلان کر دیا تھا ''بادشاہ کو زمین پر خدا کے تمام اختیارات حاصل ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت اس سے یہ اختیارات واپس نہیں لے سکتی'' اس حکم کے دوسرے دن بادشاہ کے ایک گماشتے نے ایک مالی کو ''آرک ڈی تری اونف'' کے مقام پر کوڑے مارنا شروع کر دیئے' لوگوں نے روکا تو گماشتے نے جیب سے بادشاہ کا حکم نامہ نکال کر دکھایا' اس حکم نامے کے مطابق شاہی گماشتے کسی بھی ایسے شخص کو کسی بھی مقام پر سزا دے سکتے تھے جس کے بارے میں اندیشہ ہو یہ نقص امن کا باعث بن سکتا ہے' یہ مالی شاہی گماشتے کی مار برداشت نہ کر سکا اور اس نے لوگوں کے سامنے دم توڑ دیا' مجمعے میں سے ایک پتھر آیا اور سیدھا شاہی گماشتے کے سر پر لگا' اس نے غصے سے ہجوم کو گالی دی اور پانچ منٹ بعد اس چوک میں اس گماشتے کی لاش پڑی تھی' یہ گماشتہ اس انقلاب کا پہلا شکاری تھا' اس کی نعش سے لوگوں کو معلوم ہوا ظالم بھی آخر کار انسان ہی ہوتے ہیں اور انسانوں کی زندگی اور موت میں کوئی آہنی پردہ حائل نہیں ہوتا' بس یہ معلوم ہونے کی دیر تھی پورے فرانس میں آگ لگ گئی اور لوگوں نے ظالموں کی نعشیں بچھا کر ان پر رقص شروع کر دیا' وہ دن ہے اور آج کا دن ہے فرانس میں اس کے بعد کسی نے ''کنکورڈ'' بننے کی کوشش نہیں کی۔

میں گزشتہ روز ''آرک ڈی تری اونف'' کی چھت پر کھڑا تھا' میرے قدموں میں شانزے لیزے بچھی تھی' پورا پیرس روشنیوں میں نہایا ہوا تھا' یہ فرانس کی ایک خوبصورت اور پر اسرار شام تھی' افق پر ابھی تک لالی کے آثار موجود تھے' میں نے پیرس کی خنک شام کا ایک لمبا سا گھونٹ بھرا اور سوچا فرانس اور پاکستان میں کیا فرق ہے' مجھے محسوس ہوا پاکستان 1780ء کا فرانس ہے' وہی مسائل' وہی ظلم' وہی جبر' زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کرنے کی وہی حرص' وہی مفاد پرست اور خوشامدی سیاستدان' قانون' آئین اور ضابطوں کی وہی بے حرمتی' انسانی جذبات اور احساسات سے کھیلنے کے وہی مشاغل' وہی تکبر اور بادشاہ پرستی کی وہی بدعت' وہی بے خوفی' وہی سنگدلی' وہی ہٹ دھرمی اور خود کو ناگزیر اور ضروری سمجھنے کی وہی ضد' وہی نوکر کی انا' اللہ کے قرب کے وہی دعوے اور خود کو عقل کل تسلیم کرانے کی وہی کوششیں' عوام کا وہی اضطراب' وہی بے چینی' وہی غصہ اور وہی شدت' ملک کی وہی مہنگائی' وہی بے روزگاری اور آٹے کی وہی قلت' میڈیا پر وہی ڈنڈے بازی اور فوج کا وہی کھلم کھلا استعمال' نظام کی وہی شکست وریخت' عدالتوں پر وہی عدم اعتماد' سیاستدانوں کی وہی بندر بانٹ' وہی ڈیلیں اور وہی سمجھوتے اور بادشاہوں کے وہی مصاحب اور ان کی وہی چمچہ گیری' مجھے محسوس ہوا 1780ء کے فرانس اور 2007ء کے پاکستان میں کوئی فرق نہیں بس ماچس کی ایک تیلی گرنے' ایک نعش کے تڑپنے اور ایک پتھر اٹھنے کی دیر ہے اور عوام ساری حدیں پار کر جائیں گے' مجھے پیرس کی اس شام نے بتایا پاکستان خونی انقلاب کے دہانے پر کھڑا ہے۔

پاگل خانہ

میرے دوست نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور ذرا سی تیز آواز میں بولا ''لیکن میں طارق نذیر نہیں ہوں' آپ......'' میرے دوست کی بات درمیان ہی میں رہ گئی اور ملاقاتی نے اونچی آواز میں چلانا شروع کر دیا ''آپ پہلے میری پوری بات سنیں' میں نے پچھلے ہفتے بل جمع کرا دیا تھا' یہ دیکھئے میرے پاس اس کی رسید بھی ہے'' اس نے رسید ہوا میں لہرائی اور دوبارہ غصے سے بولا ''لیکن اس کے باوجود آپ لوگوں نے میری بجلی کاٹ دی' میں کل سے اندھیرے میں بیٹھا ہوں' آپ کے دفتر سے کوئی فون نہیں اٹھاتا' مجھے بس اپنی بجلی واپس چاہیے' آپ مجھے ابھی لگوا کر دیں'' ملاقاتی کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی اور ہم پریشانی میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے' ہمارے دوست نے بڑی شائستگی سے عرض کیا ''جناب میں طارق نذیر نہیں ہوں اور نہ ہی یہ واپڈا کا دفتر ہے' بجلی والوں کا دفتر اگلی عمارت میں ہے' آپ غلط آ گئے ہیں'' وہ صاحب ٹھٹکے' انہوں نے ایک قدم کمرے سے باہر نکال کر نام کی تختی پڑھی' دوبارہ اندر آئے اور اسی جذبے سے بولے ''آپ کی بات درست ہے لیکن میری شکایت بھی غلط نہیں' آپ خود دیکھئے کیا یہ زیادتی نہیں' بجلی والے آدھی رات کو ایک ایسے شخص کی بجلی کاٹ دیں جس نے تمام بل بھر دیئے تھے' آپ میرا بل دیکھئے'' وہ بل لے کر ہمارے سروں پر آ گئے اور ہم سب پریشانی میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

یہ صاحب ہم ساڑھے سولہ کروڑ پاکستانیوں کی دیگ کا ایک دانہ ہیں اور یہ بھی اسی نفسیاتی اور دماغی عارضے میں مبتلا ہیں جس کی اس وقت پوری قوم شکار ہے' ہم اگر دماغی امراض کے تین چار لاکھ ماہرین کا بندوبست کریں اور انہیں پاکستان کے مختلف شہروں' قصبوں اور دیہات میں بھجوا دیں تو مجھے یقین ہے یہ ماہرین پندرہ دنوں میں پوری قوم کو پاگل قرار دے دیں' آپ کو اگر میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو آپ اپنے سمیت تمام لوگوں کا جائزہ لے لیں' آپ کو معلوم ہو گا ہم سب بلا تکان بولنے کی عادت میں مبتلا ہیں' آپ کسی کے پاس بیٹھ جائیں وہ گھنٹوں لایعنی گفتگو کرتا رہے گا اور اپنی بات کو حرف آخر سمجھے گا' میرا زیادہ تر وقت فون سنتے گزرتا ہے' مجھے روزانہ بیسیوں ایسے فون آتے ہیں جن میں دوسری

طرف موجود حضرات با آواز بلند یہ اعلان کرتے ہیں ''آپ میری بات سنیں'' اور اس کے بعد بلاتکان بولتے چلے جاتے ہیں اور ان کا اصرار ہوتا ہے میں ان کی بات کو (نعوذ باللہ) قرآن مجید یا حدیث تسلیم کر لوں' اگر میں اس دوران اختلاف کی جرأت کر بیٹھوں تو وہ گالی گلوچ پر اتر آتے ہیں' مجھے آج تک کوئی ایسا فون نہیں آیا جس میں فون گزار نے مجھ سے پوچھا ہو ''آپ اس وقت مصروف تو نہیں ہیں اور کیا میں آپ سے دو منٹ بات کر سکتا ہوں'' مجھے آج تک کوئی ایسا فون بھی موصول نہیں ہوا جس میں ''مقرر'' نے ایک دو منٹ میں بات ختم کر دی ہو' فون کے علاوہ بھی میں جب کسی کے ''قابو'' آ جاتا ہوں تو اس وقت تک اس کا فلسفہ جاری رہتا ہے جب تک میں وہاں سے بھاگ کھڑا نہیں ہوتا' دنیا کے دماغی امراض کے ماہرین اس نوعیت کی بلاتکان گفتگو کو پاگل پن سمجھتے ہیں' ان کی بات غلط نہیں' آپ کسی پاگل خانے میں جا کر دیکھ لیں آپ کو وہاں 90 فیصد پاگل تقریریں کرتے دکھائی دیں گے' میں اکثر دیکھتا ہوں ہمارے ہر شہری کے اندر لفظوں کا ابال ہے اور وہ کوئی ایسا کان تلاش کر رہا ہے جس میں وہ اپنا سارا لاوا انڈیل سکے' اس ملک میں بولنے والے کروڑوں ہیں لیکن سننے والا کوئی نہیں' پاگلوں کی دوسری ''خوبی'' غیر متعلقہ شخص کے سامنے احتجاج ہوتی ہے اور ہم میں سے ہر شخص اس عارضے کا شکار ہے' دودھ بلی پی جاتی ہے لیکن شکایت وہ چوہے سے کرتے ہیں' مجھ سے لوگ اکثر پوچھتے ہیں ''صدر پرویز مشرف نے 2007ء میں ایمرجنسی کیوں لگائی تھی'' میں ان سے عرض کرتا ہوں ''بھائی انہوں نے ایمرجنسی لگانے سے پہلے مجھ سے ہرگز مشورہ نہیں کیا تھا' آپ مہربانی فرما کر ان سے پوچھیے'' مجھ سے اکثر لوگ شکوہ کرتے ہیں ''صدر مشرف ملک کے ساتھ بڑی زیادتی کر گئے' آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف کا سیاسی کردار بھی ٹھیک نہیں اور یہ مولانا فضل الرحمٰن کیا کر رہے ہیں'' میں ان سے عرض کرتا ہوں'' حضور میں مولانا' میاں اور زرداری نہیں ہوں' مہربانی فرما کر آپ ان سے پوچھیں'' لیکن وہ میری بات مائینڈ کر جاتے ہیں' لوگ اکثر میرے پاس فوج' عدلیہ' پولیس' محکمہ مال' ریلوے اور مسلم لیگ کی شکایات بھی لے آتے ہیں اور ان کا اصرار ہوتا ہے میں ان کا مسئلہ فوراً حل کر دوں اور میرے پاس قہقہہ لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا' ایک مرتبہ تو کمال ہی ہو گیا۔ تین سال پہلے ایک صاحب نے مجھ سے مطالبہ کیا ''صدر بش عراق پر مسلسل حملے کر رہا ہے آپ اسے سمجھاتے کیوں نہیں ہیں'' میں نے فوراً وعدہ کیا میں اپنی اولین فرصت میں صدر بش کو عراق سے فوجیں نکالنے پر قائل کروں گا' ماہرین غلط فورم پر اس شکایت کو بھی پاگل پن کی علامت سمجھتے ہیں اور بدقسمتی سے یہ علامت ہم سب میں ظاہر ہو رہی ہے' ہم ایس ایچ او کے رویے کے خلاف مولوی سے شکایت کرتے ہیں اور مولوی صاحب کی کم علمی کی ایف آئی آر ڈاکٹر

صاحب کے پاس لکھوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

پاگل پن کی تیسری علامت شک ہوتی ہے' پاگل لوگ بے شمار قسم کے شکوک و شبہات کا شکار ہوتے ہیں' وہ اپنے والد سے لے کر بچے تک کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور اگر کسی سال ان کی بیری پر بیر نہ لگیں تو وہ اس میں بھی یہودی سازش تلاش کر لیتے ہیں' ہمارے معاشرے کی اکثریت میں پاگل پن کی یہ علامت دکھائی دیتی ہے' آپ کسی شخص کے پاس بیٹھ جائیں وہ آپ کو ہمسائے سے صدر بش تک شکوک و شبہات کا شکار دکھائی دے گا' مجھے آج تک کوئی ایسا قاری' کوئی ایسا سامع اور کوئی ایسا ناظر نہیں ملا جس نے کسی صحافی پر یہ الزام نہ لگایا ہو' فلاں نے یہ کالم' یہ پروگرام یا یہ تقریر فلاں سے پیسے لے کر کی تھی اور یہ پروگرام فلاں کی سپانسر شپ سے چل رہا ہے' لوگ اب شکوک و شبہات میں اس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کہ انہیں اپنے وضو تک پر اعتبار نہیں رہتا' مریض ڈاکٹر' موکل وکیل' گاہک دکاندار' شاگرد استاد' قاری مصنف اور حد یہ ہے نمازی امام پر شک کر رہا ہے' میں اکثر دیکھتا ہوں میرے قاری میرے کالموں کی تعریف کرتے ہیں لیکن جوں ہی میں ان کے خیال یا توقع سے ایک آدھ سطر آگے پیچھے ہوتا ہوں تو وہ مجھ پر فوراً ''بک گیا' ڈر گیا اور مل گیا'' قسم کا فتویٰ لگا دیتے ہیں اور پاگل پن کی چوتھی نشانی غصہ ہوتا ہے' پاگل کبھی اختلاف رائے برداشت نہیں کرتا' پاگلوں کے ڈاکٹر اکثر لواحقین کو مشورہ دیتے ہیں آپ اس سے کبھی اختلاف نہ کریں' یہ دن کو رات کہے تو آپ فوراً تسلیم کر لیں ورنہ ''یہ فلیئر اپ'' ہو جائے گا اور آپ کو اس سے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے' ہم میں سے 98 فیصد لوگ اب اسی صورتحال کا شکار ہیں' ہم اختلاف برداشت نہیں کرتے' ہم سب یہ سمجھتے ہیں ہمارا نظریہ' ہمارا فرقہ' ہمارا نکتہ نظر اور ہمارا خیال درست ہے اور باقی سب بکواس' باطل اور غداری ہے' ہم سب یہ سمجھتے ہیں ہماری اعتدال پسندی اصل ہے اور دوسروں کی ۔۔ل' ہماری روشن خیالی سچی ہے اور دوسروں کی جھوٹی اور آئین وہ ہے جسے ہم آئین سمجھتے ہیں اور قانون ۔۔ ہو گا جسے ہم قانون کہیں گے اور دوسرے تمام لوگ جھوٹے' فراڈ اور غدار ہیں' ہم لوگ بدقسمتی سے ۔۔تلاف رائے کو فوراً جنگ کی شکل دے دیتے ہیں اور پاگل پن کی پانچویں نشانی خودکلامی ہوتی ہے' پاگل ۔۔پنے ساتھ باتیں کرتے رہتے ہیں اور آپ کو اس ملک میں ہر دوسرا شخص خودکلامی کی عادت میں مبتلا ملے ۔۔ اور پاگل پن کی آخری نشانی طاقت اور دولت کی بے تحاشہ خواہش ہوتی ہے' پاگل کاغذ کے ہر ٹکڑے کو ۔۔ٹ سمجھ لیتا ہے اور وہ چادر کی بکل مار کر خود کو اچانک سکندر اعظم اور ہٹلر سمجھنے لگتا ہے' آپ اپنے اردگرد ۔۔یکھ لیجیے آپ کو ملک کا ہر شخص دولت جمع کرتا اور خود کو ہٹلر اور سکندر اعظم سمجھتا دکھائی دے گا' آپ چپڑاسی ۔۔ سے لے کر سیکرٹری تک دیکھ لیجیے آپ کو کسی شخص کے لہجے میں عاجزی اور انکساری نہیں ملے گی' یہ کیا ہے

یہ پاگل پن ہے۔

ہم اگر اپنے معاشرے کا تجزیہ کریں تو ہمیں یہ ملک' یہ معاشرہ ایک بہت بڑا پاگل خانہ محسوس ہوگا' ہم سب غیر متوازن ہو چکے ہیں' ہم میں سے غریب' غریب قسم کا پاگل ہے' امیر' امیر پاگل ہے' کمزور' کمزور پاگل ہے' طاقتور' طاقتور پاگل اور چھوٹا شخص چھوٹا پاگل ہے اور بڑا شخص بڑا پاگل لہٰذا ہم اپنے معاشرے میں جوں جوں اوپر کی طرف جاتے ہیں' ہمیں بڑے بڑے پاگل دکھائی دیتے ہیں اور میں جب بھی اپنے ان طاقتور اور با اختیار پاگلوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان میں سے صرف ایک شخص صحت مند اور ذہین دکھائی دیتا ہے اور اس شخص کا نام قوم ملک ہے لہٰذا میری خواہش ہے قوم ملک کو ساڑھے سولہ کروڑ لوگوں کے اس پاگل خانے کا وارڈن لگا دیا جائے۔

⊘ ⊘ ⊘

ہمارا کیا بنے گا

یہ قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کا واقعہ تھا' قائداعظم مسلم لیگ کے جلسے سے خطاب کیلئے جا رہے تھے' قائد نے انگریزی سوٹ پہن رکھا تھا اور ان کے سر پر ہیٹ تھا' وہ گھر سے نکلے اور گاڑی میں بیٹھ کر جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہو گئے' گاڑی کی چھت نیچی تھی چنانچہ آپ نے ہیٹ اتار کر گود میں رکھ لیا' آپ کے ساتھی نے راستے میں عرض کیا" جناب آپ مسلمانوں کے لیڈر ہیں لہٰذا آپ اب دیسی لباس پہننا سیکھ لیں" قائد نے فرمایا" دیسی لباس سے کیا مراد ہے" ساتھی نے عرض کیا" ہندوستان کے مسلمان شلوار قمیض' پاجامہ قمیض یا کرتے اور پاجامے کے ساتھ شیروانی یا اچکن پہنتے ہیں اور سر پر دیسی ٹوپی رکھتے ہیں" آپ نے پوچھا" لیکن میں یہ لباس کیوں پہنوں" ساتھی نے عرض کیا" جناب آپ مسلمانوں کے لیڈر ہیں چنانچہ جب آپ یہ لباس پہنیں گے تو آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا" قائداعظم نے گھور کر ساتھی کو دیکھا' گود میں پڑا ہیٹ اٹھایا' سر پر رکھا اور مضبوط لہجے میں بولے" میں منافق نہیں ہوں" اور اس کے بعد قیام پاکستان تک قائداعظم محمد علی جناح انگریزی لباس پہنتے رہے' پاکستان کے قیام کے بعد جب سرکاری لباس کا فیصلہ ہوا تو آپ نے شلوار قمیض' شیروانی اور جناح کیپ پہنی اور اس کے بعد انتقال تک دوبارہ انگریزی لباس نہیں پہنا' یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن اس واقعے میں آپ کو لیڈروں کا وژن' لیڈروں کی کمٹمنٹ' لیڈروں کا اخلاص اور لیڈروں کی شفافیت دکھائی دیتی ہے اور یہ واقعہ ثابت کرتا ہے قوموں کو بنانے اور چلانے والے لوگ کس قسم کے ہونے چاہئیں؟ لیڈروں کو کتنا واضح' شفاف اور اٹل ہونا چاہیے؟ انہیں منافقت' سمجھوتے اور لچک سے کتنا پاک ہونا چاہیے اور انہیں وعدے اور عہد کا کتنا پکا ہونا چاہیے؟ قائداعظم کی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی ملاحظہ کیجئے' وہ 1946ء میں دورے پر نکلے تو ان کی ملاقات ایک ہندو بنیے سے ہوئی' یہ کئی نسلوں سے بنیا تھا اور یہ قیمتی اشیاء گروی رکھ کر لوگوں کو قرض دیتا تھا' قائداعظم سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے قائد سے کہا" محمد علی جناح میں خاندانی بنیا ہوں' میری کئی نسلیں یہ کام کر رہی ہیں' آج تک ہماری نسل کا کوئی شخص اپنی زبان سے نہیں پھرا' لوگ اپنے زیور گہنے لے کر ہمارے پاس آتے ہیں' ہمارے پاس گروی رکھتے ہیں اور ان

کی رسید تک نہیں لیتے کیونکہ وہ جانتے ہیں وہ اپنی چیز کے بارے میں بھول سکتے ہیں لیکن ہم نہیں' میرے والد نے لوگوں سے جو امانتیں لی تھیں' وہ میرے پاس محفوظ ہیں اور میں لوگوں کی جو امانتیں جمع کر رہا ہوں' وہ میرا بیٹا لوٹائے گا'' قائداعظم خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے' بنیا بولا '' محمد علی تم ایک لیڈر ہو لہٰذا تمہیں بنیے سے ہزار گنا زیادہ ایماندار' اٹل اور قول کا پکا ہونا چاہیے' تم اپنی بات سے نہ پھرنا' تم نے مسلمانوں سے آزادی کا وعدہ کیا ہے تو یہ وعدہ پورا کرنا' کہیں ایسا نہ ہو لوگ کل کو یہ کہیں' محمد علی جناح تو بنیوں سے بھی چھوٹا نکلا'' قائداعظم نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور مسکرا کر فرمایا '' میں سیاستدان ہوں دکاندار نہیں' تم فکر نہ کرو' سورج دائیں سے بائیں ہو سکتا ہے لیکن میں اپنی بات سے نہیں پھروں گا'' یہ ہوتے ہیں لیڈر اور ان لوگوں کو کہتے ہیں سیاستدان' آج 2008ء میں بیٹھ کر ہم جب قائداعظم محمد علی جناح کے وژن اور اخلاص کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی شخصیت کا تقابل آج کے لیڈروں سے کرتے ہیں تو ہمیں شدید خفت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے' کہاں قائداعظم محمد علی جناح جیسے عظیم لوگ اور کہاں صدر پرویز مشرف اور آصف علی زرداری جیسے لوگ؟ کہاں وہ شخصیات اور کہاں آج کے لیڈر صاحبان؟ کہاں وہ لوگ جو خون کے آخری قطرے اور گلے کی آخری سانس تک ڈٹے رہتے تھے اور کہاں یہ لوگ جو ایک مہینے میں اپنے ہاتھ سے لکھے فرمان سے پھر گئے' کہاں وہ لوگ جنہیں پوری برطانوی حکومت' پورے ہندوستان کے کانگریسی لیڈر اور سارے زمانے کے خوف مل کر نہ ڈرا سکے اور کہاں یہ لوگ جو 58(2B) کے خوف سے کلمہ تک نہیں پڑھ رہے' جو اپنے بینک اکاؤنٹس' اپنے مقدموں اور اپنے جائیدادوں کے لالچ میں اونچا سانس نہیں لے رہے اور جو اپنے کہے' اپنے فرمائے اور اپنے لکھے سے منحرف ہو چکے ہیں' کیوں؟ یہ کیوں بھی کم ہوش رہا نہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی دو باتوں سے خوف زدہ ہے' اول جوڈیشری کی آزادی! افتخار محمد چودھری نے جون 2005ء میں عدلیہ کی عنان سنبھالنے کے بعد پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار عدلیہ کو وہ مقام دلایا تھا جس کے انتظار میں ملک کے کروڑوں لوگوں کی آنکھیں مدھم پڑ گئی تھیں اور جس کی خواہش میں اس ملک کی تین نسلیں مکمل کر ختم ہو گئی تھیں' جس وقت افتخار محمد چودھری نے حلف اٹھایا تھا اس وقت سپریم کورٹ میں 40 ہزار مقدمات زیر التواء تھے' افتخار محمد چودھری نے یہ مقدمات نمٹانے کا فیصلہ کیا' انہوں نے دن رات کام کیا اور 9 مارچ 2007ء تک 30 ہزار مقدمات نمٹا دیئے' چیف جسٹس نے اس کے ساتھ ساتھ چھ سے سات ہزار سوموٹو ایکشن لئے اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ان لوگوں کو انصاف ملنا شروع ہوا جو انصاف کے لفظ تک سے واقف نہیں تھے' چیف جسٹس اخبارات اور ٹیلی ویژن

کی خبروں میں آنے والے واقعات کا نوٹس لے لیا کرتے تھے اور ظالم فرعون ہو یا نمرود اسی وقت اسے عدالت میں طلب کر لیتے تھے اور جب تک ظالم مظلوم کی تلافی نہیں کرتا تھا اس وقت تک انصاف کا عمل جاری رہتا تھا' چیف جسٹس کے سوموٹو ایکشن کی صورتحال یہ تھی کہ باغبان پورہ لاہور میں بعض لوگوں نے حوالات میں دو بچوں کو قتل کر دیا' چیف جسٹس نے پولیس کے ذریعہ نہ صرف ملزم گرفتار کرائے بلکہ انہیں سپریم کورٹ بھی طلب کر لیا' یہ لوگ باغبان پورہ کے بہت بڑے بدمعاش تھے' سپریم کورٹ نے مقتول بچوں کے والدین کو ان سے 35 لاکھ روپے خون بہا لے کر دیا' عمر کوٹ کے ایک نالے میں تین ہندو بچے نہاتے ہوئے مر گئے' بچوں کی موت کی وجہ واپڈا اور سیڈا کی وہ تاریں تھیں جو ان اداروں نے نالے میں بچھا رکھی تھیں' یہ خبر کراچی کے انگریزی کے ایک ماہنامہ میں شائع ہوئی' چیف جسٹس نے سیڈا اور حیدر آباد الیکٹرک سپلائی کے ارباب اختیار کو طلب کیا اور مظلوم خاندانوں کو چھ چھ لاکھ روپے لے کر دیئے' سپریم کورٹ ان دنوں اتنی فعال ہو گئی تھی کہ اس نے سی بی آر کو ٹیکس نادہندگان سے کروڑوں روپے وصول کرا کر دیئے چنانچہ افتخار محمد چودھری کے یہ فیصلے تھے جن کی وجہ سے آج کی حکومت کو خطرہ ہے اگر چیف جسٹس بحال ہو گئے تو وہ اسی طرح سوموٹو ایکشن لیتے رہیں گے' عوام کو انصاف ملتا رہے گا اور لوگ سیاستدانوں کی اطاعت اور فرمانبرداری سے آزاد ہو جائیں گے اور چیف جسٹس کی بحالی کی راہ میں دوسری بڑی رکاوٹ این آر اوز ہیں' آصف علی زرداری نے صدر پرویز مشرف کے ساتھ ''ڈیل'' کر کے اپنے تمام مقدمات ختم کر لئے ہیں' صدر نے ان کے منجمد اکاؤنٹس بھی کھول دیئے ہیں' آصف علی زرداری ججوں سے یہ گارنٹی چاہتے ہیں کہ عدلیہ بحال ہونے کے بعد ان ''این آر اوز'' کو نہیں چھیڑا جائے گا لیکن جج انہیں یہ گارنٹی دینے کیلئے تیار نہیں ہیں چنانچہ حکومت ججوں کی بحالی کو ایک آئینی پیکج کے ساتھ منسلک کرنا چاہتی ہے' اس پیکج میں چار چیزیں شامل ہیں' اول معطل ججوں کی بحالی کے بعد سپریم کورٹ کے موجودہ جج بھی برقرار رہیں گے جس سے سپریم کورٹ میں ججوں کی تعداد 27 ہو جائے گی اور یوں ''باغی'' جج تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے حکومت کو ٹف ٹائم نہیں دے سکیں گے' دوم چیف جسٹس کی مدت ملازمت 3 سال طے کر دی جائے گی' یہ پیکج نافذ العمل ہوتے ہوتے جون تک چلا جائے گا' اس دوران افتخار محمد چودھری کے تین سال پورے ہو جائیں گے اور وہ بحال ہوئے بغیر ریٹائر ہو جائیں گے' سوم صدر کے 3 نومبر کے فیصلے کو قانونی شکل دے دی جائے گی اور چہارم چیف جسٹس کا سوموٹو ایکشن کا اختیار ختم یا محدود کر دیا جائے گا' یہ ہے حکومت کا منصوبہ۔ لیکن مجھے یقین ہے حکومت کا یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہو گا کیونکہ لوگ اسے قبول نہیں کریں گے۔

کیا اس کو سیاست کہتے ہیں؟ کیا یہ سیاستدان ہوتے ہیں اور کیا ان لوگوں کو لیڈر کہلانے کا حق حاصل ہے' اگر آج قائداعظم زندہ ہوتے تو سوچئے اس ساری صورتحال پر ان کا کیا ردعمل ہوتا؟ کیا وہ ان تمام سیاسی منافقتوں پر خاموش رہتے' میرا خیال ہے وہ ہرگز خاموش نہ رہتے اور اس جرم کی سزا میں وہ بھی ڈاکٹر عبدالقدیر اور افتخار محمد چودھری جیسے انجام کا شکار ہو جاتے یا پھر صدر پرویز مشرف انہیں بھی گھر سے اٹھا کر گوانتاناموبے بھجوا دیتے اور آصف علی زرداری اس مسئلے پر فرماتے' میں نے تو قائداعظم کو گرفتار نہیں کیا' آپ اس سے پوچھیں جس نے قائداعظم کو امریکہ کے حوالے کیا تھا' ذرا سوچئے ہم کیسے شاندار ملک میں رہ رہے ہیں اور کیسے شاندار لوگ ہمارے حکمران ہیں؟ ہمارا کیا بنے گا؟

⊘ ⊘ ⊘

ہم برطانوی عوام کے مجرم ہیں

لندن میں آج کل دنیا کے بیس بڑے ممالک کی کانفرنس ہو رہی ہے' یہ بیس ممالک دنیا کے چودھری ہیں اور یہ ہر سال کسی بڑے شہر میں بیٹھ کر باقی 225 ممالک کے مقدر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ میٹنگ میں فیصلہ کرتے ہیں اگلے سال کس ملک کو کون سی ٹیکنالوجی دی جائے گی اور کس ملک سے کون سا علم اور صنعت چھین لی جائے گی۔ یہ ممالک اس میٹنگ میں دنیا کے وسائل کو بھی آپس میں تقسیم کرتے ہیں' یہ فیصلہ کرتے ہیں اس سال تیل کا 30 فیصد حصہ جاپان خریدے گا' گیس یورپ کے تین ممالک حاصل کریں گے' روس جوہری توانائی سے فائدہ اٹھائے گا' جرمنی افریقہ کے ممالک کو اسلحہ بیچے گا' چین تیسری دنیا میں نئی منڈیاں قائم کرے گا' برطانیہ مشرقی بعید میں نئے بینکس اور انشورنس کمپنیاں بنائے گا اور فرانس سمندروں میں نئے معدنیاتی ذخائر تلاش کرے گا' وغیرہ وغیرہ۔ یہ ممالک اس میٹنگ میں چھوٹے ممالک کے قدرتی وسائل اور خام مال کی خرید و فروخت کا فیصلہ بھی کرتے ہیں اور اس مال کے نرخ بھی طے کرتے ہیں اور یہ ملک اس اجلاس میں یہ بھی طے کرتے ہیں کہ کس ملک کی معیشت کو کہاں تک لے کر جانا ہے اور کس ملک کی سٹاک ایکس چینج سے کتنا سرمایہ نکالنا ہے' دنیا کے بیس بڑے ممالک کے دانشوروں نے اس سارے گورکھ دھندے کو ایک خوبصورت نام دے رکھا ہے اور یہ نام ہے عالمگیریت۔ دنیا کے قریباً پونے چھ ارب لوگ اور 225 ممالک اس عالمگیریت کے خلاف ہیں کیونکہ عالمگیریت سے ہر اس ملک کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہے جو جی 20 کا ممبر نہیں اور ہر وہ شخص اس سے خسارے میں رہتا ہے جو 20 بڑے ممالک کا شہری نہیں۔ عالمگیریت کے خلاف یہ نفرت صرف محروم ملکوں اور محروم دنیا کے محروم شہریوں تک محدود نہیں بلکہ 20 بڑے ممالک کے باشعور' ہمدرد اور درد دل رکھنے والے عوام بھی اسے پسند نہیں کرتے' ان عوام کا خیال ہے جی ایٹ' جی ٹین یا جی ٹوئنٹی جیسے فورم نہ صرف نوآبادیات کی ایک نئی شکل ہیں بلکہ یہ محروم دنیا کے ساتھ ظلم بھی ہے چنانچہ جب بھی جی ٹوئنٹی' جی ٹین یا جی ایٹ ممالک کی میٹنگ ہوتی ہے تو ہزاروں لوگ کانفرنس ہال کے سامنے مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے اپنے ممالک کی قیادت کے خلاف نعرے لگاتے ہیں۔ پچھلے دو دنوں سے لندن میں بھی ایسے ہی مظاہرے ہو رہے ہیں۔ میں نے گزشتہ روز ٹیلی ویژن چینلز پر لندن میں بینک آف انگلینڈ کے سامنے

ہزاروں لوگوں کو جمع ہوتے' عالمگیریت کے خلاف نعرے لگاتے اور رائل بینک آف سکاٹ لینڈ کی عمارت کے شیشے توڑتے دیکھا' ٹیلی ویژن سکرین پر دور دور تک مظاہرین' پولیس اور دھواں دکھائی دے رہا تھا' پولیس مظاہرین کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن مظاہرین پولیس کے قابو سے باہر ہو رہے تھے' پولیس اور مظاہرین کے درمیان ہاتھا پائی کے دوران چند لوگ زخمی بھی ہو گئے۔ یہ زخمی سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر لیٹ گئے اور اپنی حکومت کو ٹھیک ٹھاک گالیاں دینے لگے۔

میں نے جب یہ منظر دیکھے تو مجھے برطانیہ پر بہت رحم آیا اور مجھے محسوس ہوا آج اگر برطانیہ کے پاس رحمٰن ملک جیسے جینئس اور پندرہ سو کنٹینرز ہوتے تو پوری دنیا یوں برطانیہ کی پولیس' وزرات داخلہ اور حکومت پر تھوں تھوں نہ کرتی کیونکہ رحمٰن ملک فوری طور پر آدھے لندن کو ریڈ زون قرار دے دیتے' اس علاقے کے گرد خاردار تاریں لگوا دیتے' سڑکوں پر بلاکس رکھوا دیتے' رینجرز کے پکے مورچے بنواتے اور ان مورچوں میں طیارہ شکن توپیں لگوا دیتے اور تمام برطانوی شہریوں کا ریڈ زون میں داخلہ ممنوع قرار دے دیتے۔ ''موراوور'' رحمان ملک لندن میں ڈبل سواری پر بھی پابندی لگوا دیتے' شہر میں دفعہ 144 بھی نافذ کر دی جاتی' شہر کے تمام شر انگیز نوجوانوں کو کانفرنس سے دو دن قبل تھانوں میں بند کر دیا جاتا' لندن میں خودکش حملہ آوروں کے داخلے کی خبریں پھیلا دی جاتیں اور کسی گاڑی سے بھاری اسلحہ اور بارود بھی برآمد کر لیا جاتا اور ان سارے انتظامات کے بعد کنٹینرز کے ذریعے لندن آنے والے تمام راستوں کی نس بندی فرما دی جاتی تاکہ ملک کے تمام تاجر' سوداگر' صنعت کار اور بزنس مین سر پر ہاتھ رکھ کر دہائی دیتے لیکن اس کے بعد بھی اگر مظاہرین قابو نہ آتے تو مظاہرین پر ڈنڈے اور آنسو گیس بھی برسائی جاتی اور ایک آدھ جگہ پر احتیاطاً فائرنگ بھی کرا دی جاتی' اگر اس کے بعد بھی حالات نہ سنبھلتے تو پیمرا کی مدد لی جاتی اور پورے ملک کے ٹیلی ویژن چینلز بند کر دیئے جاتے اور یوں مظاہرین تتر بتر ہو جاتے اور برطانیہ کی حکومت دنیا کے 20 بڑے ممالک کے سربراہان کے سامنے سرخرو ہو جاتی مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا کیونکہ ہم رحمٰن ملک صاحب کے ٹیلنٹ کو مارکیٹ نہیں کر سکے۔ دنیا آج کے دور کو کارپوریٹ ایج کہتی ہے اور کارپوریٹ ایج ایڈورٹائزنگ کی مرہون منت ہوتی ہے شاید اسی لئے دنیا کی تمام بڑی کمپنیاں' فرمیں اور حتیٰ کہ ممالک بھی اپنی خوبیوں' اپنے اوصاف اور اپنی کامیابیوں کے اشتہارات دیتے ہیں' یہ اشتہارات بعدازاں کاروبار میں اضافے کا باعث بنتے ہیں چنانچہ میری حکومت سے درخواست ہے ہم بھی اگر اپنے سسٹم اور اپنے سسٹم کے جینئس لوگوں کا ایک اشتہار بنائیں اور اس اشتہار کو عالمی میڈیا میں مشتہر کریں تو ہمیں بے پناہ فائدے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہم اپنی ''کنٹینرز ٹیکنالوجی'' کو عالمی مارکیٹ میں فروخت کر سکتے ہیں' ہم 245 ممالک میں یہ اشتہار دیں کہ اگر کسی ملک میں لانگ مارچ'

جلسے جلوس اور مظاہروں کا خطرہ ہے تو فوری طور پر ہم سے رابطہ کریں' ہم چند گھنٹوں میں مظاہرین کو تتر بتر کر دیں گے۔ مجھے یقین ہے ہم اس اشتہار کے ذریعے جناب رحمٰن ملک کی خدمات کو عالمی شکل دے سکتے ہیں اور ملک صاحب دنیا کے جس ملک میں بھی مظاہرہ ہو رہا ہو جیمز بانڈ زیرو زیرو سیون کی طرح وہاں پہنچیں اور مظاہرین کو بھگا کر واپس آ جائیں۔ پاکستان اس کام کیلئے ایک پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی بھی بنا سکتا ہے جس کے چیف ایگزیکٹو رحمٰن ملک ہوں جبکہ ڈائریکٹرز میں پنجاب کے تازہ تازہ سابق آئی جی خواجہ خالد فاروق کو شامل کر لیا جائے کیونکہ یہ دونوں کنٹینرز ٹیکنالوجی کے ماہر ہیں' اس کمپنی میں احتیاطاً ایسے حضرات کو بھی ڈائریکٹرشپ پیش کر دی جائے جو ارکان اسمبلی کو توڑنے کے ماہر ہیں تاکہ اگر کسی ملک میں اپوزیشن جماعتیں مظاہرہ کر رہی ہوں تو کمپنی کی آپریشنل برانچ کنٹینرز اور آنسو گیس کے ذریعے مظاہرین کا مقابلہ کرے جبکہ کمپنی کی فنانشل برانچ بوریوں اور سوٹ کیسوں میں نوٹ بھر کر سیون اور ایٹ کلب روڈ میں بیٹھ جائے اور ایم پی اے حضرات کی بولیاں لگانا شروع کر دے۔ کمپنی کی سروسز کو زیادہ جامع بنانے کیلئے اس میں آئینی اور قانونی ماہرین کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے' یہ لوگ آئینی پیرزادے ہونے چاہئیں تاکہ یہ ٹیلی ویژن چینلز پر آ کر دعویٰ کر سکیں کہ مظاہرین کے مطالبات غیر قانونی اور غیر آئینی ہیں اور کسی ایگزیکٹو آرڈر کے ذریعے ان کے مطالبے پورے نہیں ہو سکتے۔ مزید یہ لوگ گورڈن براؤن اور باراک حسین اوباما کو نئی آئینی ترامیم اور صدارتی آرڈیننس کے مشورے بھی دے سکیں تاکہ امریکہ' برطانیہ' فرانس' جرمنی اور جاپان میں بھی مثالی امن قائم ہو سکے۔

میں نے جب سے لندن کے مظاہرین کو رائل بینک آف سکاٹ لینڈ کے شیشے توڑتے ہوئے دیکھا' میں اس وقت سے برطانوی حکومت کی عقل پر افسوس کر رہا ہوں۔ میں ان لوگوں کی کم عقلی پر حیران ہوں کہ انہیں پاکستانی ماہرین کی مہارت تک سے واقفیت نہیں' یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہمارے ماہرین آدھے پاکستانی اور آدھے برطانوی ہیں' ان کے اہل خانہ آج بھی لندن میں مقیم ہیں اور یہ لوگ صرف ایک ٹیلی فون کال کے ذریعے ہمارے ماہرین کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ مجھے اس وقت بھی شدید افسوس ہے کہ ہم نے ٹیلنٹ کو صرف اپنی حد تک محدود کر رکھا ہے' ہم نے اگر دنیا کے بارے میں سوچا ہوتا تو آج پوری دنیا امن کا گہوارا ہوتی' آج مظاہرین یوں لندن میں دندناتے نہ پھرتے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے ہم اس معاملے میں برطانوی عوام کے مجرم ہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

بس ایک لیڈر چاہیے

انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام امریکی حکومت کا ایک دلچسپ منصوبہ ہے' اس پروگرام کے تحت امریکی حکومت تیسری دنیا کے دانشوروں' صحافیوں' تاجروں' سیاستدانوں اور سول سوسائٹی کے نمائندوں کو امریکا کا ''وزٹ'' کراتی ہے' یہ دو ہفتوں سے آٹھ ہفتوں کا پروگرام ہوتا ہے جس میں ان لوگوں کو امریکا کی مختلف ریاستوں' اداروں اور منصوبوں کا دورہ کرایا جاتا ہے' میرے ایک ناراض دوست مبشر بٹ بھی اس پروگرام کے ذریعے امریکا کے دورے پر گئے تھے' مبشر بٹ کا تعلق سفارت کاری کے ساتھ ہے چنانچہ امریکا میں مختلف سفیروں کے ساتھ ان کی ملاقاتیں کرائی گئیں' ان ملاقاتوں میں بٹ صاحب ایک ایسے سابق سفارت کار سے بھی ملے جس نے ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے ادوار میں پاکستان کے امریکی سفارت خانے میں کام کیا تھا' یہ سفارت کار'' پارٹی از اوور'' جیسے بدنام زمانہ فقرے کا بھی خالق تھا' مبشر بٹ کے ساتھ ملاقات کے دوران اس سفارت کار نے بڑا دلچسپ انکشاف کیا' اس کا کہنا تھا پاکستان 1960ء کی دہائی میں اس تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا تھا کہ ہم سفارت کار اکثر بحث کیا کرتے تھے بیس سال بعد کراچی زیادہ ترقی یافتہ ہوگا یا پھر لندن اور نیویارک۔ اس سفارت کار کا کہنا تھا کراچی اس دور میں ایشیا کا سب سے بڑا' ماڈرن اور ترقی کی طرف بڑھتا ہوا شہر تھا' پوری دنیا میں پاکستان کو عزت اور توقیر سے دیکھا جاتا تھا لیکن پھر پاکستان کی ترقی کو نظر لگ گئی اور آج ہم اس بات پر حیران ہیں کہ پاکستان قدرتی وسائل کے اس انبار کے باوجود ترقی کیوں نہیں کر سکا؟ اس امریکی سفارت کار کا کہنا تھا 1960ء کی دہائی میں بھارت پاکستان سے کہیں پیچھے تھا اور بھارتی سفیروں کو اپنی اسناد سفارت پیش کرنے کیلئے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا لیکن آج صورتحال اس سے بالکل الٹ ہے۔

مجھے بٹ صاحب نے یہ واقعہ کئی برس پہلے سنایا تھا مگر میں جب بھی کسی غیر ملکی دانشور' صحافی' رہنما اور سیاستدان کو بھارت کی تعریف کرتے دیکھتا یا سنتا ہوں تو مجھے فوراً اس امریکی سفارت کار کی بات یاد آ جاتی ہے اور میرا دل افسوس اور دکھ سے بھر جاتا ہے۔ پاکستان کبھی ترقی پذیر ممالک کا لیڈر تھا' کوریا کے دانشور اور سیاستدان پاکستان آ کر ہماری ترقی کا مشاہدہ کیا کرتے تھے اور ہمارے ماڈلز کو کاپی کرتے تھے' ملائشیا اور انڈونیشیا کی ایلیٹ کلاس کے بچے پاکستان کے تعلیمی اداروں میں پڑھتے تھے اور

واپس جا کر پاکستان کی مثالیں دیتے تھے۔ آپ لوگوں کو شاید یہ جان کر حیرت ہوگی 1960ء کی دہائی میں چین نے پاکستان سے تین ہوائی جہاز خریدے تھے اور ان میں ایک جہاز چین کے بانی ماؤزے تنگ استعمال کرتے تھے' یہ جہاز گزشتہ سال فروخت کیلئے پیش کیا گیا' پی آئی اے جنوب مشرقی ایشیا کی پہلی ایئر لائین تھی جس نے امریکا کیلئے فلائیٹس شروع کی تھیں' سوویت یونین ایک طویل عرصے تک پاکستان کو اپنے دوستوں کی فہرست میں شامل کرنے کیلئے بے تاب تھا' چین پاکستان کو اپنا دروازہ کہتا تھا' امریکا پاکستان کی رضامندی کے بغیر اس خطے کے کسی دوسرے ملک کی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھاتا تھا' ہم ہر لحاظ سے بھارت سے آگے تھے' پاکستان کے کھیت بھارتی کھیتوں سے زیادہ پیداوار دیتے تھے' ہمارے پاکستان میں دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام تھا' پاکستان میں دنیا کے بڑے بڑے ڈیم تھے' ہم بھارت کو بجلی فروخت کرنے کے منصوبے بناتے تھے اور پاکستانی علاقوں سے پیاز' لہسن' گندم اور دالیں سمگل ہو کر انڈیا جاتی تھیں لیکن پھر 2 اپریل 2009ء آ گیا' 2 اپریل کو لندن میں دنیا کے بیس بڑے ممالک کی سربراہ کانفرنس تھی' اس کانفرنس میں دنیا کے 20 چودھریوں نے عالمی معیشت کے بارے میں بڑے بڑے فیصلے کئے' اس کانفرنس میں امریکا' کینیڈا' برطانیہ' فرانس' جرمنی' جاپان' چین' آسٹریلیا' ارجنٹینا' برازیل' انڈونیشیا' اٹلی' میکسیکو' روس' سعودی عرب' جنوبی افریقہ' جنوبی کوریا' ترکی اور بھارت کے سربراہوں نے شرکت کی۔ آپ چالیس برسوں میں انقلاب دیکھئے' وہ بھارت جو کبھی پاکستان کی ترقی کو حاسدانہ نظروں سے دیکھتا تھا 2 اپریل کو اس کا وزیراعظم من موہن سنگھ امریکا کے صدر بارک حسین اوبامہ' برطانوی وزیراعظم گورڈن براؤن' فرانسیسی صدر نکولس سرکوزی' جاپانی وزیراعظم تارو آسو اور چینی صدر ہو جن تاؤ کے ساتھ بیٹھا تھا جبکہ اس وقت ہمارے صدر آصف علی زرداری افغانستان کے اس صدر کے ساتھ مذاکرات کر رہے تھے جس کی حکومت کابل کے دس مربع کلومیٹر کے ریڈ زون تک محدود ہے' ہم اس وقت ایران سے تیل کی خیرات مانگ رہے تھے اور ترکی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آپ ان چالیس برسوں کا انقلاب دیکھ لیجئے' ان چالیس برسوں میں بھارت خاک سے اٹھ کر جی ٹوئنٹی کلب میں شامل ہو گیا جبکہ ہم افغانستان کی ایڈوائس پر بڑے بڑے فیصلے کر رہے ہیں' کہاں وہ بلندی کہ امریکا چین سے ہاتھ ملانے اور چین امریکا کو دوستی کی دعوت دینے کیلئے پاکستان کا محتاج تھا' کہاں وہ بلندی کہ چین پاکستان کی محبت میں بھارت کو جنگ تک کی دھمکی دے دیتا ہے اور امریکا پاکستان کو خطے کا سب سے اہم ملک سمجھتا ہے اور کہاں یہ پستی کہ آج مائیک مولن اور رچرڈ ہالبروک پاکستان میں کھڑے ہو کر اعلان کر دیتے ہیں بھارت بڑا ملک ہے اور ہم پاکستان کی وجہ سے اسے ناراض نہیں کر سکتے' کہاں وہ دور کہ امریکا کیلئے پاکستان کو سینٹو اور سیٹو کا ممبر بنانا مجبوری تھی اور کہاں آج کا دن کہ امریکا' یورپ' چین اور روس کی خارجہ پالیسی بھارت کے بغیر مکمل

نہیں ہوتی' کہاں وہ دن کہ پاکستانی روپیہ سمگل ہو کر بھارت جاتا تھا اور کہاں یہ دن کہ دنیا کے امیر ترین لوگوں میں بھارت کے چالیس لوگ شامل ہو چکے ہیں' کہاں وہ دن کہ پاکستان یورپ کا دروازہ سمجھا اور کہا جاتا تھا اور کہاں یہ دن کہ پوری دنیا پاکستان کی طرف دہشت سے دیکھتی ہے اور دنیا کے جس کونے میں بھی دہشت گردی کی واردات ہوتی ہے تو پوری دنیا کی نظریں ہماری طرف اٹھ جاتی ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ اور کیا ہم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ پا سکتے ہیں؟ ایسا ہماری نالائقیوں کی وجہ سے ہوا' ہم نے اپنا سیاسی نظام چلنے نہیں دیا' ہم نے ہمیشہ نالائق ترین' بے ایمان ترین اور بے عقل ترین لوگوں کو اعلیٰ ترین عہدوں پر بٹھایا' ہمارا دفتری نظام دنیا کا بدترین سسٹم ہے اور آپ جس کام کو روکنا' بند کرنا اور خراب کرنا چاہتے ہیں آپ اسے کسی سرکاری محکمے اور کسی حکومتی ملازم کے حوالے کر دیں یہ لوگ چند گھنٹے میں شیر کو بلی بنا کر آپ کی گود میں بٹھا دیں گے' آپ کسی سرکاری دفتر کو یہ درخواست دے دیں" ہمارے ملک کا پورا نام پاکستان ہے یا اسلامی جمہوریہ پاکستان" آپ پیٹ پیٹ کر مر جائیں گے لیکن وہ سرکاری دفتر آپ کو پاکستان کا پورا نام نہیں بتائے گا۔ یہاں حالت یہ ہے گندم کا جو بیج آج چاہیے حکومت وہ چھ ماہ بعد منگواتی ہے اور نہروں' ندی اور نالوں پر پل بنانے کا فیصلہ عموماً برسات کے موسم میں کیا جاتا ہے اور چینی عموماً اس وقت امپورٹ کر لی جاتی ہے جب گنے کی ٹرالیاں شوگر ملوں کے گیٹ پر کھڑی ہوتی ہیں' ہم لوگ عموماً تدفین کے بعد کفن کا بندوبست کرتے ہیں اور مون سون گزرنے کے بعد چھتریوں کا ٹرک منگوا لیتے ہیں' ہم نے ہر دور میں بڑے بڑے محکمے' وزارتیں اور عہدے کوتاہ فہم' نالائق اور کرپٹ لوگوں کے حوالے کئے رکھے اور بیوروکریسی اور سیاست ہم نے ہمیشہ فوجی لنگر کے ضابطوں پر چلائی چنانچہ آج اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ بھارت جی 20 میں بیٹھا ہے اور ہم افغانستان' روانڈا' زائرے اور مالدیپ کے سٹیٹس پر پہنچ گئے ہیں اور افغانستان بھی بوقت ضرورت ہمیں دھمکی دے دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کیا ہم اس صورت حال سے نکل سکتے ہیں' ہاں ہم نکل سکتے ہیں کیونکہ جو ملک ڈاکٹر عبدالقدیر اور ڈاکٹر ثمر مبارک مند کے ذریعے ایٹم بم بنا سکتا ہے اور جس کے عوام افتخار محمد چودھری کو بحال کرا سکتے ہیں وہ ملک چاہے تو دس برسوں میں جی ٹوئنٹی کا ممبر بن سکتا ہے بس فیصلے اور قیادت کی بات ہے' اس ملک کو اگر آج ایک ایسی قیادت مل جائے جس کی نظر میں سارے وعدے اور معاہدے قرآن وسنت کی طرح مقدس ہوں اور جو پیٹ پر دو دو پتھر باندھ کر عوام سے ایک پتھر کی درخواست کر سکے تو یقین کیجئے ہم دوبارہ ترقی کی شاہراہ پر آ سکتے ہیں' اس ملک کو اب بس ایک لیڈر چاہیے' ایک ایسا لیڈر جو سرے محل کی بجائے تاریخ میں زندہ رہنا چاہتا ہو۔

آج سے

میں نے اٹھ کر کیلنڈر دیکھا' یہ 16 فروری 2009ء سوموار کا دن تھا' میں نے سرخ پنسل سے کیلنڈر پر نشان لگایا اور اپنے داغ دار' بدبودار اور غلاظت سے بھرپور ماضی کا تاوان ادا کرنے کے منصوبے بنانے لگا' مجھے اچانک محسوس ہوا میں ان چند نفسیاتی مریض' کوتاہ فہم' جنونی' کاملیت پسند اور بے وقوف لوگوں میں شمار ہوتا ہوں جو ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں' جو جمہوریت کے دشمن ہیں' جو لبرل حکومتوں کو چلنے نہیں دے رہے اور جن کی وجہ سے طالبان پولش انجینئروں کے گلے کاٹ رہے ہیں' مجھے محسوس ہوا میں ان درجن بھر غداروں' سیاہ کاروں اور جنونیوں میں شامل ہوں جو آزاد' ایماندار اور محب وطن عدلیہ کو آزاد نہیں مان رہے' جنہوں نے چیف جسٹس کی صاحبزادی کے 20 نمبروں کو بلاوجہ ایشو بنا دیا' جو ذرا سے ڈرون حملوں پر دل گرفتہ ہو جاتے ہیں' جنہیں صدر آصف علی زرداری کے وعدے بار بار یاد آتے ہیں اور جو کرپشن' اختیارات سے تجاوز اور ڈائریکٹ اور ان ڈائریکٹ 92 وزراء کے لشکر پر غمگین ہو جاتے ہیں' جو انسان کو انسان سمجھنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور جو بار بار یہ کہتے ہیں ایک شخص کے جرم پر پوری بستی پر میزائل داغ دینا اور بیس بیس بچوں اور عورتوں کی جان لے لینا کہاں کا انصاف ہے؟ جو بار بار کہتے ہیں سوئی تلاش کرنے کیلئے بھوسے کے ڈھیر کو آگ لگا دینا کہاں کی عقل مندی ہے اور جو حکومت سے کہتے ہیں خدا کیلئے لوگوں پر رحم کھایئے' یہ قوم وزیراعظم کی 36 مرسڈیز کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی اور یہ لوگ اس بات پر بھی کڑھتے رہے ہیں کہ ایک وفاقی وزیر نے 4 لاکھ 58 ہزار 8 سو 33 روپے کا پٹرول خرچ کر دیا تھا' یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت آ گئی لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی' یہ بھی کہتے ہیں حکومت کو اقوام متحدہ کا کمیشن بلانے کی بجائے محترمہ کے قتل کی تفتیش پاکستانی اداروں سے کرانی چاہیے اور یہ بھی کہتے ہیں اگر سوات کے لوگ شریعت چاہتے ہیں تو انہیں وہاں شریعت نافذ کرنے دیں اس میں کیا حرج ہے اور یہ بھی کہتے ہیں فوج' توپ اور گولی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی' دنیا کے تمام مسئلے مذاکرات اور سمجھوتوں سے حل ہوتے ہیں' آپ فوجوں کی بجائے جرگوں کا راستہ اختیار کریں اور جو یہ بھی کہتے ہیں' ہمیں کرائے کا ملک اور کرائے کی فوج نہیں

بنا چاہیے' ہمیں اپنی غیرت' اپنی عزت اور اپنی سلامتی کی حفاظت کرنی چاہیے لیکن 16 فروری کو مجھے اچانک محسوس ہوا میں غلط ہوں' میں غلط لوگوں کا ساتھ دے رہا ہوں اور مجھے فوری طور پر اپنی غلطیوں کی اصلاح کر لینی چاہیے۔

مجھے چاہیے میں جمہوریت کو مضبوط بناؤں' اس نظام کو طاقت دوں تا کہ یہ ملک ترقی کر سکے چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے میں آج سے صدارتی اختیارات کم کرنے کا مطالبہ نہیں کروں گا' میں ہرگز یہ نہیں کہوں گا ہمیں پارلیمانی نظام کو پوری طرح پارلیمانی بنانا چاہیے اور ہمیں صدر سے 58 ٹو بی اور سروسز چیفس کی تقرری سمیت سترہویں ترمیم کے اختیارات واپس لے کر وزیراعظم کو دے دینے چاہئیں' ہمیں پارلیمنٹ کو مضبوط کرنا چاہیے اور ایوان صدر کو کسی ایک پارٹی کا ایوان صدر نہیں ہونا چاہیے' میں آج سے ہرگز یہ مطالبہ نہیں کروں گا افتخار محمد چودھری اور ان کے ساتھی ججوں کو بحال ہونا چاہیے' میں 2 نومبر کی جوڈیشری کا مطالبہ بھی ترک کر رہا ہوں' میں وکلاء کی جدوجہد کا حصہ بننے سے بھی انکار کر رہا ہوں' میں نے آج سے ججوں کی کرپشن' اختیارات سے تجاوز اور غیر اخلاقی حرکتوں کو ان کا ''ذاتی فعل'' سمجھ کر خاموش رہنے کا فیصلہ بھی کر لیا ہے' میں آج سے پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن کی بیک ڈور ڈپلومیسی پر کڑھنا بھی بند کر رہا ہوں' مجھے آج سے پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ق کے رابطوں پر بھی کوئی اعتراض نہیں' میں آج سے یہ حقیقت بھی تسلیم کر رہا ہوں مری ڈکلیریشن اور 5 اور 7 اگست 2008ء کے معاہدے قرآن اور سنت نہیں تھے' یہ سب سیاسی بیان اور دعوے ہیں اور ان پر عملدرآمد کا مطالبہ جنونیت اور نفسیاتی بیماری ہے' مجھے آج سے ڈرون حملوں سے بھی کوئی غرض نہیں' یہ ڈرونز جلال آباد سے اڑتے ہیں یا تربیلا سے' یہ پشاور کے ہوائی اڈے پر پارک ہوتے ہیں یا جیکب آباد کے ایئر فورس بیس پر' انہیں پاکستان سے کنٹرول کیا جاتا ہے یا نواڈہ سے' یہ بے گناہوں اور مظلوموں کو قتل کر رہے ہیں یا پھر مجرموں اور گنہگاروں کو' میں نے آج سے اس مسئلے پر بھی خاموش رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے' میں آج سے یہ احتجاج بھی بند کر رہا ہوں کہ ہمارے ایک لاکھ 20 ہزار فوجی قبائلی علاقوں اور سوات میں تعینات ہیں' یہ 1971ء کی طرح اپنے ہی لوگوں پر گولی چلانے پر مجبور ہیں اور ان کی گولیاں سوات اور قبائلی علاقوں میں ایک نئی مکتی باہنی کی فصل تیار کر رہی ہیں' میں آج سے یہ بھی نہیں کہوں گا خودکش حملے ہماری غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہیں اور ہمارے قبائلی علاقوں میں را' موساد اور سی آئی اے ملوث ہیں اور یہ سب پاکستان کو توڑنے کے منصوبے پر کاربند ہیں اور ہمیں عام شہری اور مجرموں کے درمیان تفریق کرنا ہوگی' میں آج سے حکومت سے پرزور مطالبہ کروں گا وہ سوات سمیت پورے ملک میں انصاف کا وہ شاندار سسٹم نافذ کر

دے جس میں مقتول کی تین نسلیں انصاف تلاش کرتے کرتے قبروں میں چلی جاتی ہیں جبکہ قاتل عوام کے ووٹوں سے اسمبلیوں میں جا بیٹھتے ہیں اور جس میں انصاف صرف مضبوط اور بڑے لوگوں کو ملتا ہے' میں آج سے یہ کہنے لگا ہوں اٹک کے پل کے پار بسنے والے لوگ انسان نہیں ہیں چنانچہ انہیں ایٹم بم سے اڑا دینا چاہیے' میں نے آج سے بلوچستان کی ان مظلوم عورتوں کے بارے میں بھی خاموش رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے جو برسوں سے گھروں سے غائب ہیں اور ان کے لواحقین کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جگہ خون ٹپک رہا ہے' میں آج سے ان ساڑھے چھ سو ''مسنگ پرسنز'' کا مطالبہ بھی ترک کر رہا ہوں جنہیں پرویز مشرف نے امریکہ کے ہاتھوں بیچ کر ڈالر کھرے کر لئے تھے اور میں آج سے مدرسہ حفصہ کی مقتول بچیوں کے خون سے بھی تائب ہو رہا ہوں' میں آج سے یہ مطالبہ بھی بند کر رہا ہوں جنرل (ر) پرویز مشرف کو عدالت میں لایا جائے اور ان سے ان کی غلطیوں کا حساب مانگا جائے' میں آج سے یہ مطالبہ بھی بند کر رہا ہوں صدر آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف بیرون ملک موجود اپنی دولت واپس لائیں' میں آج سے ڈائریکٹ اور ان ڈائریکٹ 92 وزراء پر بھی خاموشی کا اعلان کرتا ہوں' مجھے آج سے یہ اعتراض بھی نہیں کروں گا کہ کون سا وزیر ساڑھے چار لاکھ روپے کا پٹرول پھونک جاتا ہے' کون سا وزیر کتنی گاڑیاں استعمال کرتا ہے' کون سا وزیر کس کس محکمے کا فنڈ کھا رہا ہے اور وزیراعظم سی ڈی اے سے پلاٹوں کا کوٹہ کیوں مانگ رہے ہیں' مجھے آج سے اس بات پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کی تحقیقات کا بل سرکاری خزانے سے کیوں ادا کیا جا رہا ہے؟ میں آج سے یہ مطالبہ بھی ترک کر رہا ہوں پاکستان پیپلز پارٹی کے ارکان محترمہ کی تحقیقات کے اخراجات پارٹی فنڈ سے کیوں ادا نہیں کرتے؟ میں آج سے حکومت کی ''مس مینجمنٹ'' کی نشاندہی بھی نہیں کروں گا' میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ' گیس کے پریشر میں کمی' انڈسٹری کی بندش' بے روزگاری' غربت اور مہنگائی کا ذکر بھی نہیں کروں گا' میں ملک میں کھاد کی کمی' گندم کی عدم دستیابی اور چینی کے آنے والے بحران کی بات بھی نہیں کروں گا اور میں آج سے یہ بھی نہیں کہوں گا پارلیمنٹ میں آئینی ترمیم کے بغیر صوبہ سرحد کو پختونخوہ کہنا غیر آئینی ہے اور میں یہ بھی نہیں کہوں گا حکومت چھوٹے چھوٹے سیاسی گروپوں سے بلیک میل ہو رہی ہے اور اس نے وزارت دو اور کام چلاؤ کی پالیسی اپنا رکھی ہے اور میں یہ بھی نہیں کہوں گا پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کی حکومت گرا کر بہت بڑی سیاسی غلطی کرے گی اور میں یہ بھی نہیں کہوں گا حکومت نے اگر سوات امن معاہدے پر عمل نہ کیا تو کیا ہوگا؟ اور میں یہ بھی نہیں کہوں گا پاکستان کا ایٹمی پروگرام اور فوج کا وجود خطرے میں ہے۔

میں آج سے پوری طرح تائب ہو رہا ہوں اور میں نے نہ صرف حکومت کا بھرپور ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے بلکہ میں تمام جنونی صحافیوں اور اینکر پرسنز سے بھی درخواست کروں گا وہ تمام لوگ بھی ہتھیار پھینک دیں تاکہ یہ ملک ترقی کر سکے' یہ سسٹم آگے بڑھ سکے اور ہم سب ایک دو برسوں میں تیسری دنیا سے نکل کر پہلی دنیا میں جا سکیں' میں ان تمام حضرات سے درخواست کروں گا آیئے ہم سب آج سے خاموش ہو جاتے ہیں کیونکہ ہم لوگ اس ملک کی ترقی کی واحد رکاوٹ ہیں' یہ صرف چند اخبار' چند ٹیلی ویژن چینلز' چند کالم نگار' چند رپورٹرز اور چند اینکر پرسنز ہیں جن کی وجہ سے یہ ملک ترقی نہیں کر رہا' ہم خاموش ہو جائیں تو خیر ہی خیر' بلے ہی بلے چنانچہ میں آج سے خاموش ہو رہا ہوں' آپ بھی کل سے خاموش ہو جائیں اور ملک کو.......... کے آسرے پر چھوڑ دیں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔

⊘ ⊘ ⊘

پارٹی ڈسپلن

میری آنکھ کھلی تو میں نے فوراً کیلنڈر کی طرف دیکھا' یہ اٹھارہ فروری 2009ء تھا' میری کایا پلٹ' میری تبدیلی کا تیسرا دن۔ میں نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور دنیا کو حکیم بابر اعوان کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا' مجھے سب سے پہلے معلوم ہوا پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل سینیٹر (متوقع) جہانگیر بدر نے پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی پر اعتزاز احسن کی مجلس عاملہ کی رکنیت معطل کر دی اور انہیں شوکاز نوٹس جاری کر دیا۔ میں نے اس خبر پر اطمینان کا سانس لیا۔ یہ واقعہ اگر 16 فروری سے پہلے وقوع پذیر ہوتا تو مجھے شدید افسوس ہوتا اور میں پاکستان پیپلز پارٹی سے اعتزاز احسن کا جرم پوچھتا' میں جہانگیر بدر سے عرض کرتا' کیا ضمیر کے مطابق آواز اٹھانا جرم ہے؟ کیا پارٹی کو محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کا وعدہ یاد کرانا جرم ہے؟ کیا عوام کی رائے اور توقعات کا ساتھ دینا جرم ہے؟ کیا مری ڈکلیریشن اور 5 اگست کے تحریری معاہدے یاد کرانا' صدر صاحب سے 58 دو ب کے اختیارات لے کر پارلیمنٹ کو واپس کرنے کا مطالبہ گناہ ہے اور کیا رول آف لاء کا مطالبہ' افتخار محمد چودھری اور وکلاء برادری کا ساتھ دینا اور حق کیلئے لانگ مارچ کرنا اور دھرنا دینے کا اعلان جرم ہے؟ میں ان سے پوچھتا چودھری اعتزاز احسن نے جب 9 جون 2008ء کو لانگ مارچ کیا تھا تو اس وقت پارٹی کا ڈسپلن کہاں تھا؟ کیا پارٹی اس وقت صرف اس لئے خاموش نہیں رہی تھی کہ ملک کے صدر جنرل پرویز مشرف تھے اور اس لانگ مارچ کے ذریعے انہیں ڈرانے' دھمکانے اور کمزور کرنے کی ضرورت تھی' کیا یہ حقیقت نہیں اس وقت آصف علی زرداری کیلئے راستہ ہموار کرنے کی ضرورت تھی چنانچہ حکومت نے لانگ مارچ کے شرکاء کو اسلام آباد تک پہنچنے کی اجازت بھی دے دی اور ان کیلئے خوراک' پانی اور ٹوائلٹس کا بندوبست بھی کیا لیکن آج ملک میں آصف علی زرداری کی حکومت ہے چنانچہ پارٹی بھی ایکٹو ہو گئی ہے اور ڈسپلن بھی جاگ اٹھا ہے مگر میں آج یہ بات نہیں کر سکتا کیوں؟ کیونکہ میں تائب ہو چکا ہوں' میں نے اپنی زندگی کا زاویہ بدل لیا ہے اور میں اب اس ملک کو جناب عباس اطہر کی عینک سے دیکھ رہا ہوں چنانچہ مجھے اب اعتزاز احسن چار سو فیصد مجرم دکھائی دے رہے ہیں۔ چودھری اعتزاز احسن واقعی پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں' خدا کی پناہ 18 فروری 2008ء کے الیکشنز کی پہلی سالگرہ پر افتخار محمد چودھری کا ساتھ دینا' وکلاء اور سول سوسائٹی کو اپنے حقوق کیلئے باہر نکلنے کی دعوت دینا' رول آف لاء' آزاد اور خود مختار عدلیہ کے خواب دیکھنا'

اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنا‘ 2007ء میں صدر پرویز مشرف کی طرف سے وزارت عظمٰی قبول نہ کرنا‘ الیکشن نہ لڑنا‘ وزارت نہ لینا‘ سینٹ کے ٹکٹ کیلئے اپلائی نہ کرنا اور پارٹی قیادت سے اختلاف پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی نہیں تو کیا ہے؟ ٹیلی ویژن چینلز پر بیٹھ کر وزیر قانون جناب فاروق ایچ نائیک صاحب کو صرف نائیک اور اٹارنی جنرل جناب سینیٹر لطیف کھوسہ صاحب کو صرف کھوسہ کہنا اور معزز سپریم کورٹ کو ڈوگر کورٹ کہنا پارٹی کے ڈسپلن کی خلاف ورزی نہیں تو کیا ہے؟ ٹاک شوز میں بیٹھ کر یہ اعلان کرنا ”مجھے یقین ہے افتخار محمد چودھری ضرور بحال ہوں گے“ اور میں اپنی حکومت کی بقاء کیلئے اپنی پارٹی سے درخواست کرتا ہوں وہ عدلیہ کو 2 نومبر کی پوزیشن پر بحال کر دے‘ پرویز مشرف کے احتساب کا مطالبہ کرنا اور عدالتوں میں پیش نہ ہونا پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی نہیں تو کیا ہے؟ پارٹی میں اتنے بڑے بڑے لوگوں کی موجودگی کے باوجود دنیا کا پانچواں بڑا دانشور بن جانا‘ دنیا بھر سے عدلیہ کی آزادی کی جدوجہد کے ایوارڈ اور تمغے لینا اور امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں خطاب کرنا اور بڑے بڑے جلسوں میں شعلہ بیانی کا مظاہرہ پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی نہیں تو کیا ہے؟ اور حکومت سے محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کی تفتیش کا مطالبہ کرنا اور سرِ عام بغاوت سے بھرپور شعر پڑھنا اور عدل اور انصاف کے بارے میں نظمیں لکھنا اور سردیوں کی دوپہر میں اپنے گھر کے لان میں بیٹھ کر کینو کھانا پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی نہیں تو کیا ہے؟ چنانچہ میرا خیال ہے چودھری اعتزاز احسن کو ان جرائم پر کڑی سے کڑی سزا دینی چاہیے تاکہ اس ملک میں آئندہ کسی شخص کو اتنے سنگین جرائم کی جرأت نہ ہو۔

میری کیونکہ کایا پلٹ چکی ہے اور میں اب دنیا کو نئی عینک سے دیکھ رہا ہوں چنانچہ مجھے یہ جان کر قطعاً حیرت نہیں ہوئی کہ پاکستان مسلم لیگ ن نے سینٹ کے الیکشنز کیلئے پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ق کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے‘ میں آج اس سمجھوتے کو زمینی حقائق سمجھ رہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں جب تمام بھوکوں نے ایک ہی دسترخوان پر جانا ہے تو پھر صلح صفائی کا مظاہرہ کیوں نہ کیا جائے؟ جب سب کا مقصد ایک ہے تو پھر سیاسی اختلافات‘ جوڑ توڑ‘ اصول اور بے اصولی کی لڑائی کو چند دنوں کیلئے موقوف کیوں نہ کر دیا جائے؟ کیوں ناں سارے سیاستدان سر جوڑ کر بیٹھیں‘ سینٹ کی سیٹیں آپس میں تقسیم کریں اور مارچ کے دوسرے ہفتے میں ایک بار پھر ایک دوسرے پر کیچڑ پھینکنا شروع کر دیں‘ اس فارمولے میں آخر کیا حرج ہے؟ یہ خوشگوار واقعہ اگر 15 فروری سے قبل پیش آیا ہوتا تو مجھے بہت دکھ ہوتا لیکن اب کیونکہ میں نے دنیا کو نئے زاویئے سے دیکھنا شروع کر دیا ہے چنانچہ میں خوشی سے لڈیاں ڈال رہا ہوں‘ وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے کراچی میں ایم کیو ایم کے گورنر ڈاکٹر عشرت العباد کے ساتھ ملاقات کی اور اس ملاقات کو ایم کیو ایم اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے درمیان پہلا

رابطہ قرار دیا‘ میری اگر کایا نہ پلٹی ہوتی تو مجھے اس ملاقات پر بھی بہت افسوس ہوتا کیونکہ میں نے 8 جولائی 2007ء میں لندن کی آل پارٹیز کانفرنس میں میاں نواز شریف کو خود یہ کہتے ہوئے سنا اور دیکھا بھی تھا کہ ”پاکستان میں دہشتگردی کے واقعات میں الطاف حسین کے کردار کے حوالے سے ضروری قانونی کارروائی کیلئے برطانوی حکومت کو مشترکہ یادداشت بھجوائی جائے جبکہ مستقبل میں کوئی جماعت ایم کیو ایم کیساتھ اتحاد نہیں کریگی“۔

میری کایا کیونکہ پلٹ چکی ہے لہٰذا میں اب سمجھتا ہوں سیاست میں کوئی بات‘ کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی‘ سیاست کے سارے دروازے کھلے ہوتے ہیں اور کوئی بھی شخص کسی بھی وقت کسی بھی دروازے سے اندر بھی داخل ہو سکتا ہے اور باہر بھی نکل سکتا ہے اور سیاستدانوں کے تمام بیان ”سیاسی بیان“ ہوتے ہیں اور یہ ہرگز ہرگز قرآن و حدیث نہیں ہوتے چنانچہ قومی مفاد میں دونوں جماعتوں کے درمیان رابطے میں کوئی حرج نہیں‘ میری کایا کیونکہ پلٹ چکی ہے چنانچہ میں بھی حکیم بابر اعوان اور چودھری نثار علی خان کی طرح سمجھتا ہوں جج دھرنوں اور جلسے جلوسوں سے بحال نہیں ہوں گے اور وکلاء نے تحریک کے اعلان سے پہلے اپوزیشن جماعتوں کو اعتماد میں نہ لے کر بڑی زیادتی کی چنانچہ انہیں اب اس زیادتی کا تاوان برداشت کرنا چاہیے اور وکلاء لانگ مارچ اور دھرنے کو 3 نومبر 2009ء تک مؤخر کر دیں‘ میری کایا کیونکہ پلٹ چکی ہے چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں وکلاء کا یہ خدشہ سو فیصد غلط ہے کہ ان کی جدوجہد کا پھل ہمیشہ سیاسی جماعتیں کھا جاتی ہیں‘ انہوں نے 9 مارچ 2007ء کو تحریک شروع کی‘ اس تحریک کا فائدہ محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف نے اٹھایا‘ 3 نومبر 2007ء کی تحریک کا فائدہ پاکستان پیپلز پارٹی کو ہوا‘ جون 2008ء کے لانگ مارچ کے نتیجے میں آصف علی زرداری صدر بن گئے اور اگر اس بار بھی لانگ مارچ اور دھرنے کا سٹیرنگ سیاسی جماعتوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا تو اس کا فائدہ پاکستان مسلم لیگ ن کو پہنچے گا‘ میری کایا کیونکہ پلٹ چکی ہے چنانچہ میں وکلاء کے اس خیال سے بھی متفق نہیں ہوں کہ اگر میاں نواز شریف کو یہ یقین ہو جائے وہ اور میاں شہباز شریف ڈس کوالی فائی نہیں ہوں گے‘ پنجاب کی حکومت ختم نہیں ہو گی اور پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان مسلم لیگ ق کے ساتھ اتحاد نہیں کرے گی تو وہ بھی وکلاء اور ججوں کو تنہا چھوڑ دیں‘ میری کایا کیونکہ پلٹ چکی ہے چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں یہ تمام شکوک و شبہات بھی پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی ہیں اور وکلاء برادری کو بھی ایسے گستاخانہ سوال اٹھانے والوں کو اپنی تحریک سے نکال دینا چاہیے‘ تمام لوگوں کو شوکاز نوٹس جاری کر دینے چاہئیں۔

⊘ ⊘ ⊘

بس ذرا سی بے شرمی

یہ 19 فروری تھا میری کایا کو پلٹے ہوئے چوتھا دن۔ میں نے کیلنڈر پر نشان لگایا اور اطمینان کا لمبا سانس لیا' چائے کا کپ پکڑا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا' میرے صحن کی بیل پر پیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کھلے تھے' میں نے حیرت سے سوچا ''اس سال بہار ذرا جلدی نہیں آ گئی'' مجھے فوراً یاد آیا ہماری بیل پر فروری میں پھول لگنا شروع ہو جاتے ہیں اور جولائی اگست تک لگتے رہتے ہیں' آپ میری بدنصیبی دیکھئے' میری مایوسی' قنوطیت' کاملیت پسندی' جنون اور طالبانی سوچ نے مجھے کبھی یہ بیل دیکھنے اور اس پر لگے پھولوں پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا' میں حکومتوں کو گرانے' بنانے اور معاشرے میں مایوسی پھیلانے میں اتنا مصروف رہا تھا کہ مجھے اپنے صحن میں جھانکنے کا وقت ہی نہیں ملا' میں کبھی 12 مئی کے شہیدوں کو روتا رہتا تھا' کبھی لال مسجد اور مدرسہ حفصہ کی بچیاں مجھے سونے نہیں دیتی تھیں اور کبھی میں وزیرستان پر گرائے جانے والے میزائلوں پر کڑھتا رہتا تھا' مجھے سانحہ کارساز اور لیاقت باغ کے شہید بھی تنگ کرتے رہتے تھے چنانچہ میں نے بہار کو کبھی بہار کی طرح نہیں دیکھا' میں نے اب کیونکہ دنیا کو نئے زاویے سے دیکھنا شروع کر دیا ہے اور میں اب ان کالم نگاروں' صحافیوں اور اینکر پرسنز میں شامل ہونے کی کوشش کر رہا ہوں جو سورج مکھی کی طرح سورج کے ساتھ ساتھ اپنا رخ بدلتے ہیں' جنہیں ہر حکمران سچا اور ہر حکومت کے اقدامات کھرے دکھائی دیتے ہیں' جو ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں سوشلسٹ ہو جاتے ہیں' جنرل ضیاء الحق کے دور میں مجاہد بن جاتے ہیں' بے نظیر بھٹو کے دور میں ''پی پی کے جانثار'' ہو جاتے ہیں' میاں صاحب کے دور میں میاں صاحب کے ''واہ جی واہ'' گروپ میں شامل ہو جاتے ہیں' جنرل پرویز مشرف کے دور میں روشن خیال اور اعتدال پسند ہو جاتے ہیں اور آصف علی زرداری کے دور میں مظلوموں کے ٹولے میں شامل ہو جاتے ہیں اور جو سب کے یار ہیں لیکن کسی کے دوست نہیں ہیں چنانچہ میری زندگی بہت سکھی ہو گئی ہے' مجھے اب کسی بات پر ٹینشن نہیں ہوتی۔

میں نے 19 فروری کو خبر پڑھی کسی ٹریفک وارڈن نے پنجاب اسمبلی کے رکن شوکت منظور کی گاڑی روک لی' ایم پی اے صاحب ٹریفک وارڈن کو بتاتے بھی رہے ''میں ایم پی اے ہوں' میں ایم پی اے ہوں'' لیکن ٹریفک وارڈن نے عاجزی اور وضعداری سے عرض کیا ''سر قانون سب کیلئے برابر ہے' آپ نے ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کی چنانچہ آپ کو جرمانہ ادا کرنا پڑے گا'' ایم پی اے نے اسے ڈانٹا' اسے گھورا' اس کے ساتھ بدتمیزی بھی کی لیکن ٹریفک وارڈن قانون پر اڑا رہا یہاں تک کہ ایم پی اے کو 300 روپے کا چالان پیپر لینا پڑا لیکن اس دوران ایم پی اے کی انا زخمی ہو چکی تھی چنانچہ اس نے فوراً حکام بالا کو فون کیا اور حکام بالا نے ٹریفک وارڈن کو کھڑے کھڑے معطل کر دیا' میں یہ خبر اگر 15 فروری کو پڑھتا تو میں کڑھنا شروع کر دیتا' میں اس ٹریفک وارڈن کے حق میں کالم لکھتا اور اس ایم پی اے کی بھرپور مذمت کرتا لیکن 19 فروری تک کیونکہ میں ایک نیا شخص بن چکا ہوں چنانچہ میں اس معاملے میں ایم پی اے کو ٹھیک اور ٹریفک وارڈن کو غلط سمجھتا ہوں' اس بے وقوف ٹریفک وارڈن کو معلوم ہی نہیں تھا ایم پی اے کیا ہوتا ہے؟ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اگر چاہیں تو صدر پرویز مشرف کو دس' دس بار یونیفارم میں صدر منتخب کرا سکتے ہیں' یہ لوگ افتخار محمد چودھری کو سیاسی شخصیت ڈکلیئر کر سکتے ہیں اور پورا پورا شہر ہڑپ کر کے بھی ڈکار نہیں لیتے' ایم پی اے قانون بنانے اور اس پر عملدرآمد کرنے کیلئے پیدا نہیں ہوئے' یہ لوگ قانون توڑنے' قانون کو قدموں میں روندنے بلکہ اس پر گھوڑے دوڑانے کیلئے دنیا میں آتے ہیں' اس بے وقوف ٹریفک وارڈن کو یہ تک معلوم نہیں تھا اس ملک میں قانون کسی رکن اسمبلی' کسی جرنیل اور کسی وڈیرے کیلئے نہیں بنتا' عام شہری کیلئے تخلیق ہوتا ہے' اس بے وقوف ٹریفک وارڈن کو ایم پی اے کی گاڑی روکنے سے پہلے لاہور کے اس ہیڈ کانسٹیبل کا انجام بھی یاد کر لینا چاہیے تھا جس نے ایک میجر جنرل کی گاڑی کے شیشوں سے کالے کاغذ اتروانے کی گستاخی کی تھی اور اسکے جواب میں لاہور پولیس اس کانسٹیبل کو ہتھکڑی لگا کر جنرل صاحب کے دربار میں پیش کرنے پر مجبور ہو گئی تھی لیکن اسکے باوجود جنرل صاحب کی تسلی نہیں ہوئی تھی اور آئی جی کو جنرل صاحب کا غصہ دور کرنے کیلئے لاہور کا ایس ایس پی تک تبدیل کرنا پڑا تھا اور مرحوم عارف نکئی کے دور میں پولیس نے ایک ایم پی اے کے بھائی کو گرفتار کر لیا تھا اور اس گرفتاری کا داغ دھونے کیلئے چیف منسٹر کو تھانے پر چھاپہ مارنا پڑا تھا اور ٹریفک پولیس کے ایک کانسٹیبل نے مری میں ایک رکن اسمبلی کی گاڑی کو روکنے کی غلطی کی تھی اور رکن اسمبلی اور اس کے حواریوں نے کانسٹیبل کی پسلیاں توڑ دی تھیں اور قانون' آئین اور ضابطہ یہ منظر خاموشی سے دیکھتا رہا تھا' یہ ٹریفک وارڈن واقعی بے وقوف اور نا اہل تھا چنانچہ میں سمجھتا ہوں اس بے وقوف کو مستقل معطل بلکہ نوکری سے بے دخل کر دینا چاہئے۔ خدا کی پناہ پاکستان جیسے اسلامی ملک میں ایک معمولی کانسٹیبل کی یہ جرأت کہ وہ کسی رکن اسمبلی کی گاڑی روک لے اور اسکا چالان بھی کر دے۔ میں سمجھتا ہوں اس کانسٹیبل کو عبرت کا نشان بنا دینا چاہئے تاکہ آئندہ کوئی پولیس اہلکار ''قانون سب کیلئے برابر'' جیسی لغویات میں الجھنے کی غلطی نہ کرے' وہ کسی رکن اسمبلی کی گاڑی کو اشارہ نہ کرے۔

میری کایا کیونکہ پلٹ چکی ہے چنانچہ میں نے جب 19 فروری کے اخبارات میں پڑھا وزیراعلیٰ پنجاب نے صوبائی وزراء کیلئے 30 نئی گاڑیاں خریدنے کی اجازت دیدی ہے تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی' میں ذاتی طور پر جانتا ہوں پنجاب کے وزراء کے پاس ایک سال پرانی گاڑیاں ہیں اور ان گاڑیوں میں انہیں اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں بڑی دقت بلکہ کوفت ہوتی تھی' پنجاب کے عارضی وزیراعلیٰ گلبرگ میں پرانی گاڑی میں "پکڑے" بھی گئے تھے چنانچہ نئی گاڑیاں انتہائی ضروری تھیں' میری درخواست ہے حکومت اگر اب گاڑیاں خریدنے ہی لگی ہے تو یہ مہربانی کرکے بلٹ پروف مرسیڈیز' بی ایم ڈبلیو اور پراڈو خرید لے تاکہ پنجاب کے وزراء بھی وفاقی وزراء کی طرح پورے اطمینان سے عوام کی خدمت کرسکیں لیکن آپ اگر میری ایماندارانہ رائے پوچھیں تو میں وزراء کو گاڑیاں دینے کا سرے سے مخالف ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں گڈ گورننس کیلئے تمام وزراء کے پاس ہیلی کاپٹرز اور جیٹ طیارے ہونے چاہئیں' اس سے وزراء کو تین فائدے ہونگے۔ اول' یہ لوگ ناشتہ اپنے آبائی گھر میں فرماسکیں گے' لنچ صوبائی دارالحکومتوں میں کرسکیں گے اور ڈنر اور آفٹر ڈنر سرگرمیاں اسلام آباد میں فرماسکیں گے اس "طویل دن" کے بعد بھی یہ لوگ فریش رہ سکیں گے اور رات دو بجے کے بعد یہ لوگ جتنا ہوسکا "گڈ گورننس" کا مظاہرہ بھی کرسکیں گے۔ دوم' ہیلی کاپٹر اور جیٹ طیارے فضا میں ہونے کی وجہ سے خودکش حملوں سے محفوظ ہوتے ہیں چنانچہ ان قیمتی انسانوں کی سیکورٹی کا مسئلہ بھی حل ہو جائیگا اور سوم ہماری سڑکوں پر دھول مٹی بہت زیادہ ہے جسکی وجہ سے بعض اوقات ہمارے وزراء کے کپڑے خراب ہو جاتے ہیں اور جہازوں میں کم از کم یہ مسئلہ نہیں ہوتا چنانچہ میری دعا ہے حکومت کو جلد از جلد عقل آجائے اور وہ اگلے سال تمام صوبائی اور وفاقی وزراء کیلئے ہیلی کاپٹر اور جیٹ طیارے خریدنے کیلئے آئی ایم ایف کو قرضے کی درخواست دیدے تاکہ صدر' وزیراعظم' گورنرز' وزرائے اعلیٰ اور وزراء کے درمیان مساوات' برابری اور یکساں معیار زندگی قائم کیا جاسکے۔

آپ میری کایا پلٹ کا کمال دیکھئے میں کتنی جلدی غیر حقیقی اور معنوی بحرانوں سے نکل آیا اور مجھے اپنے اردگرد کتنا اجالا' کتنی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ دیکھ لیجئے کوئی مسئلہ' مسئلہ ہی نہیں رہا چنانچہ میری اس ملک کے عوام سے درخواست ہے یہ بھی دنیا کو حکومت کی نظروں سے دیکھنا شروع کردیں' ان کو بھی غربت غربت' بیماری بیماری' پسماندگی پسماندگی' بے روزگاری بے روزگاری' لاقانونیت لاقانونیت' بے انصافی بے انصافی' ڈرون ڈرون اور میزائل میزائل نہیں لگیں گے۔ آپ کو افتخار محمد چودھری سچا' ڈاکٹر عبدالقدیر عوام کا ہیرو اور چودھری اعتزاز احسن اچھا دکھائی نہیں دے گا' آپ کو سرخ سرخ اور سبز سبز نہیں لگے گا' واہ جی واہ کیا بات ہے بس ذرا سی بے شرمی کی ضرورت ہے اور سارے مسئلے ختم۔

میاں صاحب زیادتی کر رہے ہیں

میں نے کیلنڈر دیکھا' یہ 23 فروری کی خوبصورت صبح تھی' میں نے 23 فروری پر بھی سرخ پنسل سے دائرہ کھینچ دیا' آج کے اخبارات میاں نواز شریف کے خطاب کے ردعمل سے بھرے تھے' میاں نواز شریف نے جمعہ 20 فروری کو وکلاء کے ساتھ مل کر دھرنے کا اعلان کیا اور اس کے بعد 21 فروری کو پارٹی کی جنرل کونسل سے تاریخی خطاب کیا' میاں صاحب کے اس خطاب میں ذوالفقار علی بھٹو کی جھلک تھی' میاں صاحب جب یہ خطاب فرما رہے تھے تو اس وقت وہ میاں صاحب کی بجائے انقلابی لیڈر نظر آرہے تھے' میں پچھلے ایک سال سے میاں صاحب کی سیاسی حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہا ہوں' وہ 18 فروری 2008ء سے محتاط کھیل رہے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا میاں صاحب سمجھتے ہیں انہوں نے اگر سیاسی جلد بازی دکھائی یا اگر وہ وفاقی حکومت کیلئے خطرہ بن گئے تو فوج اس موقع کا فائدہ اٹھالے گی' وہ آگے بڑھے گی اور ملک ایک بار پھر آٹھ دس سال کیلئے جمہوریت کی پٹڑی سے اتر جائیگا چنانچہ وہ بڑی احتیاط سے سیاست کی شطرنج پر مہرے آگے پیچھے کررہے تھے۔ میں محسوس کرتا رہا میاں صاحب بڑی حد تک اپنی طبیعت کے خلاف چل رہے ہیں لیکن پھر انہوں نے اچانک 20 اور 21 فروری کو اعلان جہاد کرکے ایک سال کی احتیاط کا کفارہ ادا کردیا' وہ ایک ہی چھلانگ میں رنگ کے اندر آگئے لیکن یہ واقعہ اگر 15 فروری سے پہلے پیش آیا ہوتا تو میں میاں نواز شریف کی اس بہادری پر تالیاں بجاتا' میں انہیں مبارکباد پیش کرتا اور اس تاریخی موڑ کو سچ کی جیت' اصولی موقف اور ملک میں عدل وانصاف کی بنیاد قرار دیتا لیکن کیونکہ اب میری کایا پلٹ چکی ہے' میں نے جنونیت ترک کردی ہے' میں مایوسی پھیلانے سے توبہ کرچکا ہوں اور میں نے اس ملک میں جمہوریت کو استحکام دینے کیلئے قلمی جہاد کا فیصلہ کرلیا ہے چنانچہ مجھے میاں صاحب کے اعلان جہاد پر شدید افسوس ہوا اور میں پچھلے تین دن سے انتہائی غصے میں ہوں کیونکہ مجھے محسوس ہوتا ہے اگر میاں نواز شریف عدلیہ کی آزادی کیلئے پورے اخلاص کے ساتھ سڑکوں پر آگئے اور ان کی پارٹی نے وکلاء کے ساتھ مل کر دھرنا دے دیا تو پاکستان میں دو بڑی تبدیلیاں آجائیں گی' معزول چیف جسٹس افتخار محمد چودھری بحال ہو جائیں گے اور سابق صدر جنرل (ریٹائرڈ) پرویز مشرف کا احتساب شروع ہو جائے گا اور یہ دونوں تبدیلیاں اس ملک کیلئے انتہائی خوفناک ثابت ہوں گی۔

آپ ذرا تصور کیجئے افتخار محمد چودھری جب بحال ہو گئے تو کیا ہو گا؟ عدالتیں سیاسی دباؤ سے آزاد ہو جائیں گی‘ سپریم کورٹ‘ ہائی کورٹ اور سیشن اور سول کورٹس بھی شیر ہو جائیں گی اور وہ بھی آزادانہ فیصلے شروع کر دیں گی‘ جج صاحبان صدر اور وزیراعظم سے لے کر ناظم تک اس ملک کے تمام بااختیار لوگوں کو طلب کرنا شروع کر دیں گے‘ جج سیاستدانوں کے خلاف فیصلے دیں گے‘ انصاف کا عمل تیز اور سستا ہو جائے گا‘ غریبوں‘ بے بسوں‘ بے کسوں اور مسکینوں کو انصاف ملنے لگے گا‘ عدالتیں اخبار کی سنگل کالم خبر پر سوموٹو ایکشن لے لیا کریں گی جس کے نتیجے میں بیوروکریسی‘ پولیس اور پرائیویٹ اداروں کو اپنا قبلہ ٹھیک کرنا پڑ جائے گا‘ عدالتوں کی خودمختاری کی وجہ سے گوالے دودھ میں پانی نہیں ملا سکیں گے‘ دکاندار کم نہیں تول سکیں گے‘ ادویات بنانے والی کمپنیاں دواؤں کی من مانی قیمت وصول نہیں کر سکیں گی‘ ڈاکٹروں کی پرائیویٹ پریکٹس بند ہو جائے گی‘ ٹرانسپورٹرز زیادہ کرائے وصول نہیں کر سکیں گے‘ حکومت 40 ڈالر بیرل پٹرول خرید کر 58 روپے لیٹر نہیں بیچ سکے گی‘ واپڈا بجلی اور گیس کے محکمے قدرتی گیس کے نرخ نہیں بڑھا سکیں گے‘ صدر اور وزیراعظم کے پروٹوکول کیلئے سڑکیں بند نہیں کی جا سکیں گی اور ہانوے بانوے لوگوں کو وزارتیں پیش نہیں کی جا سکیں گی چنانچہ آپ خود اندازا لگائیے اس کے بعد ملک کا کیا حشر ہو گا؟ حکومت حکومت کیسے کرے گی؟ انتظامیہ عوام پر ظلم کیسے کر سکے گی؟ منافع خور منافع کیسے کما سکیں گے؟ رشوت خور رشوت کیسے لے سکیں گے؟ وزراء کرپشن کیسے کر سکیں گے اور عام آدمی اور خاص شہریوں میں فرق کیسے برقرار رہ سکے گا لہٰذا میرا خیال ہے یہ اس ملک کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہو گا۔ دوسرا نواز شریف کی تحریک سے سابق صدر جنرل پرویز مشرف کا ٹرائل شروع ہو جائے گا‘ وہ عدالت میں پیش ہوں گے اور وکلاء ان پر اقتدار پر قبضے‘ آئین توڑنے‘ سترہویں ترمیم‘ پاکستان میں امریکیوں کو غیر قانونی اور غیر آئینی سہولتیں دینے‘ لوگوں کو گھروں سے اٹھا کر امریکہ کے حوالے کرنے‘ لال مسجد اور مدرسہ حفصہ پر حملہ کرنے‘ ملک میں ایمرجنسی لگانے اور ججوں کو گھروں میں محصور کرنے جیسی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر جرح کریں گے جس سے جنرل صاحب کو کوفت بھی ہو گی اور یہ روایت بھی ٹوٹ جائے گی کہ پاکستان میں جرنیل قانون سے بالا ہیں اور کوئی طاقت ان کا احتساب نہیں کر سکی۔ میاں صاحب کی اس حرکت کے نتیجے میں ملکی تاریخ میں پہلی بار کسی سابق حکمران‘ کسی ریٹائر جرنیل کا ٹرائل ہو گا‘ اسے سزا دی جائے گی اور یوں مارشل لاء کا سلسلہ رک جائے گا اور مستقبل میں جرنیل بھی حکومت پر قبضے سے پہلے سو سو بار سوچیں گے اور عدالتیں بھی کسی آمر کو آئین میں تبدیلی کا اختیار دینے سے گھبرائیں گی اور یوں ملک سچی جمہوریت اور انصاف کی اصلی پٹڑی پر آ جائے گا اور یہ اس ملک کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہو گی۔

میاں نواز شریف کی اس جسارت کے دو مزید نقصانات بھی ہوں گے‘ میاں نواز شریف کی کوشش سے اگر معزول جج بحال ہو گئے تو عدلیہ کو یہ پیغام ملے گا کہ اس ملک میں کلمہ حق کہنے والے لوگ خسارے میں نہیں رہتے‘ اس ملک میں جو شخص نیکی‘ اچھائی اور اصول کیلئے لڑتا ہے قوم اسے کندھے پر اٹھا کر دوبارہ کرسی پر بٹھا دیتی ہے چنانچہ مستقبل میں تمام سرکاری عہدے دار اصول کیلئے عہدوں کی قربانی دے دیں گے اور اس کے نتیجے میں پورے ملک کا نظام بگڑ جائے گا۔ صدر کا سیکرٹری صدر کا غیر آئینی حکم نہیں مانے گا‘ وزیراعظم کا سٹاف ان کے غیر قانونی احکامات تسلیم نہیں کرے گا‘ وزیر کا عملہ قواعد کی خلاف ورزی سے انکار کر دے گا‘ ٹریفک پولیس کا اہلکار جرنیل کی گاڑی سے کالے شیشے اتروا دے گا‘ عدالتیں میجروں‘ کرنلوں اور بریگیڈئروں کے خلاف فیصلے دینے لگیں گی‘ سیکرٹری صاحب کا حکم سیکشن افسر نہیں مانے گا اور پٹواری ڈی سی او کو ”منتھلی“ دینے سے انکار کر دے گا چنانچہ پورے ملک کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ میاں صاحب کی اس جسارت کا دوسرا نقصان یہ ہو گا کہ عام شہری یا سول سوسائٹی کا دماغ خراب ہو جائے گا کیونکہ جب افتخار محمد چودھری بحال ہوں گے اور جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف کا ٹرائل شروع ہو گا تو عام شہری کو پہلی بار اپنی طاقت کا احساس ہو گا‘ وہ جان لے گا وہ اکیلا بھی اس ملک کا مقدر بدل سکتا ہے‘ وہ جان جائے گا اگر وہ سڑکوں پر نکل آیا تو وہ صدر آصف علی زرداری جیسے مضبوط شخص کو بھی اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر سکتا ہے اور عام شہری کی یہ غلط فہمی مستقبل میں انتہائی خطرناک ثابت ہو گی کیونکہ کل کو لوگ سوات میں فوجی آپریشن‘ فاٹا پر ڈرون حملوں‘ سترہویں ترمیم کے خاتمے‘ بجلی کی لوڈ شیڈنگ‘ پٹرول اور گیس کے نرخوں میں اضافے‘ کابینہ میں وزراء کی تعداد‘ پروٹوکول‘ سیکورٹی اور صحت‘ تعلیم اور صاف پانی کی دستیابی جیسے مسئلوں پر بھی سڑکوں پر نکل آئیں گے اور حکومت عوام کی بات سننے پر مجبور ہو جائے گی۔ اگر عام شہری کو غلط فہمی ہو گئی تو حکمران اپنے وعدوں سے پھر نہیں سکیں گے اور وہ مری ڈکلیریشن جیسے اعلانات کو سیاسی بیان بھی قرار نہیں دے سکیں گے اور یوں اس ملک میں انارکی پھیل جائے گی چنانچہ میں سمجھتا ہوں میاں نواز شریف نے دھرنے کا فیصلہ کر کے بڑی زیادتی کی۔ انہوں نے اس ملک کے قانون‘ آئین‘ ضابطے اور روایت کی توہین کی ہے اور اس توہین پر ان کی جتنی بھی مذمت کی جائے وہ کم ہو گی۔ میں سمجھتا ہوں اس معاملے میں صدر آصف علی زرداری کا مؤقف سو فیصد درست ہے چنانچہ انہیں ڈرنے‘ گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں‘ ہمارے جیسے روشن خیال‘ اعتدال پسند‘ حقیقت شناس اور زمینی حقائق سے واقف کالم نگار اور پی ٹی وی کے تمام اینکرز پرسنز صدر صاحب کے ساتھ ہیں‘ یہ میدان میں ڈٹے رہیں انشاءاللہ ان کے دشمن منہ کی کھائیں گے اور آخری فتح انہیں ہی نصیب ہو گی۔

بہت اچھا ہوا

میں نے فوراً ٹیبل کیلنڈر اٹھا لیا' یہ 25 فروری کا دن تھا' کھڑکی کے شیشوں پر دھوپ دستک دے رہی تھی' کمرے کے اندر "برداشت ایبل" سی گرمی تھی' میں نے ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور نیوز چینلز سے کارٹونوں کے چینل پر شفٹ ہو گیا' کمرے کا شور ختم ہو گیا اور میں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا' ایک منٹ 12 سیکنڈ پہلے نیوز چینلز چیخ چیخ کر بتا رہے تھے سپریم کورٹ نے میاں برادران کو "ڈس کوالیفائی" کر دیا اور اس خبر کے بعد تمام چینلز میں "بریکنگ نیوز" کی دوڑ لگ گئی' میں بڑی دیر تک چیختی چلاتی سکرینوں میں الجھا رہا لیکن پھر مجھے اچانک یاد آیا میری کایا تو پلٹ چکی ہے چنانچہ میں نے فوراً اس صورتحال سے نکلنے کے جتن شروع کر دیئے' میں نے سب سے پہلے چینل تبدیل کیا' پھر ٹھنڈے پانی کے دو گلاس چڑھائے' پانچ چھ لمبے لمبے سانس لئے' جوتے اتار کر پاؤں پھیلائے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے مجھے یہ یادگار اور شاندار دن دیکھنے کی توفیق عطا فرمائی' میں تسلیم کرتا ہوں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ اگر 15 فروری سے پہلے دیا ہوتا تو میں اسے عدل اور سیاست کا یوم سیاہ قرار دیتا اور قلمی جہاد کیلئے فوراً میدان میں کود پڑتا لیکن کیونکہ اب میری کایا پلٹ چکی ہے چنانچہ میں اس دن کو اب پاکستان کی تاریخ کا یوم نجات سمجھتا ہوں۔ 25 فروری کو جو کچھ ہوا وہ بہت ہی اچھا اور شاندار تھا اور مجھے یقین ہے یہ دن اچھے اور شاندار دنوں کی ماں بلکہ ٹیسٹ ٹیوب مدر ثابت ہو گا اور اس کی کوکھ سے ایسے بے شمار شاندار دن جنم لیں گے جو اس ملک کو ترقی' خوشحالی اور استحکام کی آخری منزل تک پہنچا دیں گے۔ میں نے سوچا مجھے فوری طور پر اس شاندار کارنامہ پر سپریم کورٹ آف پاکستان' پاکستان پیپلز پارٹی اور وفاقی حکومت کو مبارکباد پیش کرنی چاہیے کیونکہ ان تینوں کی مشترکہ کوششوں سے اس ملک کے غریب عوام کو تفریح طبع کیلئے یہ شاندار موقع ملا اور ہم اس پر حکومت کی جتنی بھی تعریف کریں وہ کم ہو گی۔

آپ اس مبارک دن کی برکتیں ملاحظہ کیجئے' 25 فروری سے پہلے پنجاب کے اڑھائی ہزار تنوروں پر غریب عوام کو دو روپے میں روٹی ملتی تھی لیکن ماشاء اللہ جوں ہی عدالت کا فیصلہ سامنے آیا' میاں شہباز شریف کی حکومت ختم ہوئی اور پنجاب میں گورنر راج کے نفاذ کا اعلان ہوا تنوروں سے دو

پے روٹی کے بینرز اتار دیئے گئے اور روٹی کا نرخ فوراً پانچ روپے ہو گیا' آپ غور کیجئے اس ایک اقدام سے کتنے لوگوں کے روزگار اور آمدنی میں اضافہ ہوا' کتنے لوگوں کا منافع بڑھ گیا اور آنے والے دنوں میں پنجاب کے کتنے سرمایہ کاروں کو اس کا فائدہ پہنچے گا؟ میرا خیال ہے میاں شہباز شریف عوام کو سستی روٹی دے کر ان کا مزاج اور عادت بگاڑ رہے تھے اور یہ کسی بھی طرح طیارہ اغواء یا غداری سے کم بڑا جرم نہیں چنانچہ وفاقی حکومت کو چاہیے وہ فوراً اس جرم پر میاں شہباز شریف کے خلاف مقدمہ درج کرے اور وہ سابق اٹارنی جنرل اور ریٹائر جج ملک قیوم کو دوبارہ جج بھرتی کرے' یہ مقدمہ ان کی عدالت میں پیش کر دے اور ملک صاحب عدلیہ کی آزادی اور خودمختاری کا بھرپور مظاہرہ کریں۔ آپ اس دن کی برکتیں ملاحظہ کیجئے' میاں شہباز شریف نے عام' مظلوم اور غریب شہریوں کی فریادیں سننے کیلئے ایک شکایت سیل بنا رکھا تھا' اس سیل میں کوئی بھی شخص درخواست دے سکتا تھا اور اس درخواست پر فوراً عملدرآمد ہوتا تھا لیکن 25 فروری کے بابرکت دن یہ سیل بھی بند ہو گیا جس کا فوری فائدہ یہ ہوا کہ پنجاب کے پسماندہ علاقوں کے گندے' غریب اور غلیظ لوگوں کی لاہور آمد کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور یوں لاہور کی مال روڈ کی چکا چوند اور رونق واپس آ گئی۔ آپ اس دن کی برکتیں ملاحظہ کیجئے' میاں نواز شریف نے 25 فروری کی شام انکشاف کیا صدر آصف علی زرداری نے میاں شہباز شریف کو بزنس ڈیل کی آفر کی تھی "صدر صاحب کا کہنا تھا شہباز صاحب آئیں ایک بزنس ڈیل کریں' آپ جسٹس عبدالحمید ڈوگر کو چیف جسٹس قبول کر لیں' ان کی مدت میں توسیع مان لیں اور اس کے ریٹرن میں آپ اور میاں نواز شریف کے حق میں عدالتی فیصلہ آ جائے گا اور آپ دونوں اہل قرار دے دیئے جائیں گے" 25 فروری کی برکت سے ثابت ہو گیا بزنس ڈیل نہ کرنے والے لوگ ناسمجھ ہوتے ہیں اور ان لوگوں کا یہی حشر ہوتا ہے چنانچہ آئندہ جس شخص نے سیاست میں رہنا ہے اسے چپ چاپ بزنس ڈیل کر لینی چاہیے۔ آپ اس دن کی برکت ملاحظہ کیجئے' 18 فروری 2008ء سے 25 فروری 2009ء تک ملک میں ہارس ٹریڈنگ نہیں ہوئی تھی اور ہارس ٹریڈنگ کی اس کمی کے باعث لاتعداد گھوڑے اور ان کے مالکان بے روزگار ہو چکے تھے اور بعض گھوڑے چار چار سال پرانا چارہ کھانے پر مجبور ہو گئے تھے' 25 فروری کی برکت سے گھوڑوں کی تجارت ایک بار پھر شروع ہو گی جس سے تمام گھوڑا مالکان کے دن پھرنا شروع ہو جائیں گے' پنجاب میں ایک سال سے وزراء کی تعداد بھی بے تحاشا کم تھی جس کے باعث کار سرکار چلانے میں دقت کا سامنا تھا۔ 25 فروری کی برکت سے وزراء اور حکومت کے درمیان موجود رکاوٹ ختم ہو گئی چنانچہ اب کم از کم ایک سو دس ایم پی اے حضرات کو وزارتیں پیش کی جا سکیں گی جس سے پنجاب کی

حد تک بے روزگاری کا خاتمہ ہو جائیگا' پنجاب حکومت نے ایک سال سے وزراء کیلئے نئی گاڑیاں بھی نہیں خریدی تھیں جس کی وجہ سے وزراء ایک دو سال پرانی گاڑیاں استعمال کرنے پر مجبور تھے' وزراء کو پروٹوکول کی سہولت بھی حاصل نہیں تھی' پنجاب کے سینئر وزیر تک کو پروٹوکول کیلئے صرف چار گاڑیاں دی گئی تھیں جبکہ انہیں بلٹ پروف مرسڈیز کی سہولت بھی دستیاب نہیں تھی' 25 فروری کی برکت سے یہ رکاوٹ بھی ختم ہو گئی لہٰذا اب تمام وزراء کو نئی گاڑیاں بھی دی جائیں گی اور انہیں پروٹوکول کیلئے پولیس اور رینجرز کے تازہ دم دستے بھی فراہم کیے جائیں گے جس کے نتیجے میں وزراء دل جمعی اور یکسوئی کے ساتھ عوام کی خدمت کر سکیں گے۔ گزشتہ ایک برس سے پنجاب کی بیوروکریسی خوف کے عالم میں کام کر رہی تھی' وزیر اعلیٰ پنجاب جس شہر کے دورے پر جاتے تھے اس شہر کے سرکاری ہسپتالوں کے ایس ایم حضرات' سول ورکس کے عہدیداروں' سکولوں کے ہیڈ ماسٹروں' پنجاب ہائی ویز کے افسروں اور سرکاری دفتروں کے اہلکاروں کی ذاتی زندگی میں خلل آ جاتا تھا' ان لوگوں کو راتوں کو اٹھ اٹھ کر ہسپتال صاف کرنا پڑتے تھے' ڈسپنسری میں دوائیں پوری کرنا پڑتی تھیں' سکولوں میں ماسٹروں کی حاضریاں یقینی بنانا پڑتی تھیں' سڑکوں کے کھڈے بھرنا پڑتے تھے اور دفتری عملے کو وقت پر دفتروں میں لانا پڑتا تھا' 25 فروری کی برکت سے پورے پنجاب کی بیوروکریسی نے اطمینان کا سانس لیا اور پورے ایک سال بعد پنجاب کے تمام ایس ایم حضرات 25 فروری کی رات اطمینان کی نیند سوئے' لاہور کے تمام سرکاری اہلکاروں' ٹھیکیداروں اور پٹواریوں نے بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا' پچھلے ایک سال سے ناظموں کے فنڈز بھی منجمد تھے اور ان بیچاروں کو اپنی چائے تک کا خرچ ذاتی جیب سے دینا پڑتا تھا' 25 فروری کی برکت سے یہ فنڈز بھی بحال ہو گئے جس کے نتیجے میں ناظموں کے چہروں پر لالی آ گئی۔ 25 فروری سے پہلے سیاستدان خود کو بہت مضبوط سمجھنے لگے تھے' یہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے کہ قوم کی ذمہ داری ان کے نازک کندھوں پر استوار ہے اور اگر انہوں نے اخلاص سے کام نہ کیا تو کل کا مؤرخ انہیں معاف نہیں کرے گا' یہ لوگ اتحاد' مل جل کر آگے بڑھنے' سیاسی سمجھوتوں اور سیاسی برداشت جیسی لغویات میں بھی الجھ کر رہ گئے تھے' یہ لوگ سیاسی اختلاف کرتے ہوئے بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے لیکن 25 فروری کی برکت سے ملک ان لغویات سے بھی پاک ہو گیا چنانچہ کل سے سیاستدانوں نے ایک دوسرے کو جس اعلیٰ پائے کی گالیاں دینا اور ایک دوسرے کے چہرے پر کیچڑ ملنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے' قوم بڑے دلوں سے اس کا انتظار کر رہی تھی اور ماشاءاللہ 25 فروری کے دن کی برکت سے یہ انتظار بھی ختم ہو گیا اور اب سیاستدان چوکوں اور چوراہوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی چڈیاں دھوئیں

گے اور ان کی بدبو سے پورا ملک مہک اٹھے گا اور اس دن کی سب سے بڑی برکت فوج ہے' 18 فروری 2008ء کے الیکشنز اور پاکستان کے دو بڑے سیاستدانوں اور دو بڑی سیاسی جماعتوں کی طرف سے ایک دوسرے کو بھائی بھائی قرار دینے سے فوج یہ سمجھ بیٹھی تھی اسے اب باقی زندگی بیرکوں میں گزارنا پڑے گی لیکن 25 فروری کی برکت سے ان لوگوں کے چہرے ایک بار پھر خوشی سے دمک اٹھے ہیں اور انہوں نے شام کے وقت اطمینان سے بیٹھ کر اپنے لمبے بوٹوں پر پالش پھیرنا شروع کر دی ہے چنانچہ میں سمجھتا ہوں 25 فروری کا دن ہر لحاظ سے تاریخی ہے اور اس تاریخی دن کی برکت سے بہت جلد پیچھے رہ جانے والے تین "ماہرین" بھی فارغ ہو جائیں گے چنانچہ پوری قوم اس دن کے تخلیق کاروں کی جتنی بھی تعریف کرے کم ہو گی۔

میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سمجھتا ہوں بہت اچھا ہوا اور اگر منا بھائی اسی طرح ڈٹے رہے تو آخر فتح یقیناً ان کے قدم چومے گی اور یہ آخری عمر ایک سو دس منزلہ عمارت کے کسی پینٹ ہاؤس میں اطمینان سے گزاریں گے۔

⊘ ⊘ ⊘

باقی سب خیریت ہے!

لاہور کا ایک کاروباری شخص دیوالیہ ہو گیا' وہ معاشی دباؤ میں آیا تو اس کے عزیز رشتے دار' دوست احباب اور کاروباری ساتھی ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور وہ دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا' اس وقت اسے کسی روشن خیال عالم دین نے سمجھایا' انسان پر غربت' افلاس اور بھوک کے عالم میں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے چنانچہ تم حالات کے ساتھ مفاہمت کا کوئی راستہ نکال لو' وہ صاحب بات سمجھ گئے چنانچہ انہوں نے لاہور شہر میں چھوٹے پیمانے پر شراب کی سپلائی شروع کر دی' وہ نیک نیت' محنتی اور ثابت قدم تھے لہٰذا قدرت نے ان کے کاروبار میں ''برکت'' ڈال دی اور وہ دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے' اس دوران انہوں نے اپنے کاروبار کو وسعت دینے کیلئے شراب کے ساتھ چند وغیرہ وغیرہ قسم کے لوازمات بھی سپلائی کرنا شروع کر دیئے جس کے بعد ان کے کاروبار کو چار چاند لگ گئے اور وہ جلد ہی لاہور شہر کے بڑے ''بزنس ٹائی کون'' بن گئے جس کے بعد وہ اپنے آپ کو حاجی صاحب چھڑے والے و مشروبات ڈیلر کہلانے لگے' حاجی صاحب کے پاس دولت آئی تو ان کے گرد نئے دوستوں کا میلہ لگ گیا' ایک دن نئے دوستوں کی محفل میں ان کا ایک پرانا دوست بھی آ گیا' پرانے دوست نے ان کی آن بان اور شان دیکھی تو اس نے ان سے پوچھا ''حاجی صاحب آپ کا نیا کاروبار کیسا چل رہا ہے'' حاجی صاحب نے سب سے پہلے اس خدا کا شکر ادا کیا جس نے انہیں کسی غیر کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچائے رکھا اور اس کے بعد کھل کر اپنے کاروبار کی تعریف کرنے لگے' حاجی صاحب کا دوست ذرا شریفانہ قسم کا تھا' اس کو جب حاجی صاحب کے کاروبار کی تفصیل معلوم ہوئی تو وہ شرمسار ہو گیا اور شرمندگی کے عالم میں حاجی صاحب سے پوچھا ''کیا آپ اس کاروبار سے مکمل طور پر مطمئن ہیں'' حاجی صاحب نے ایک لمبی آہ بھری اور اس کے بعد بولے ''ویسے تو اللہ کا بڑا کرم ہے' اللہ نے رزق میں وسعت دے رکھی ہے' شہر میں عزت اور دھاک بھی ہے لیکن بس ایک مسئلہ ہے!'' دوست نے پوچھا ''وہ کیا'' حاجی صاحب نظریں جھکا کر بولے ''بس لوگ کبھی کبھی بے شرم اور بے غیرت کہہ دیتے ہیں' باقی سب خیریت ہے''۔

میں نے 15 فروری کو جمہوریت' سسٹم' روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی بقا کیلئے ''جنونیت'' ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا' میں نے منصوبہ بنایا تھا میں حکومت پر تنقید نہیں کروں گا' میں حکومت کے ہر سفا کانہ' بے رحمانہ اور سنگدلانہ اقدام پر خاموش رہوں گا اور حکومت خواہ پنجاب میں گورنر راج لگوا دے' موبائل عدالتیں بنا دے یا پھر وزراء کیلئے پچاس کروڑ روپے کی نئی بلٹ پروف گاڑیاں خریدنے کا فیصلہ کر لے' میں حماقت اور فضول خرچی کی ہر گھڑی میں حکومت کا ساتھ دوں گا' میں حکومت کی وعدہ خلافیوں اور چالاکیوں پر بھی واہ واہ کروں گا اور میں حکومت کے ان اقدامات کی بھی تعریف کروں گا جن کے بارے میں مجھے یقین ہو گا یہ کل کے دن ''ری ورس'' ہو جائیں گے اور جب بھی حکومت بم کو ٹھوکر مارنے لگے گی تو میں اس وقت بھی تالیاں بجاؤں گا' میں نے فیصلہ کیا میں جنونی اور آسیبی میڈیا کو فرینڈلی میڈیا یعنی مولانا فضل الرحمٰن میڈیا بنانے کی کوشش بھی کروں گا اور میں تمام جنونی صحافیوں کی کایا پلٹنے کی کوشش بھی کروں گا' میں نے اس سلسلے میں رؤف کلاسرا کی برین واشنگ کی کوشش بھی کی لیکن مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا یہ ایک ایسی ٹیڑھی ہڈی ہے جو ٹوٹے بغیر سیدھی نہیں ہو سکے گی چنانچہ میں ناکام بھی ہو گیا اور الٹا مجھے تین چائے کا بل بھی دینا پڑ گیا لہٰذا میں اس کے بعد فوراً تائب ہو گیا اور میں نے خود کو اپنی ''اصلاح'' تک محدود رکھنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ دنیا کے تمام بڑے فلاسفی کہتے ہیں انسان اگر اپنی اصلاح کر لے تو پوری دنیا بدل سکتی ہے یوں میں پندرہ دن تک مسلسل اپنی اصلاح کرتا رہا لیکن 28 فروری تک پہنچ کر میں بے بس ہو گیا اور مجھے محسوس ہونے لگا میں بھی ایک ایسی ہی ٹیڑھی ہڈی ہوں جو ٹوٹ تو سکتی ہے لیکن سیدھی نہیں ہو سکتی چنانچہ میں نے دوبارہ جنون گروپ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا' میں اب جنگلی اور غیر تہذیب یافتہ ٹارزن کی طرح واپس تو آ رہا ہوں لیکن جہاں تک روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے 13 دنوں کا تعلق ہے تو یہ میری زندگی کا شاندار ترین دور تھا' میں ان 13 دنوں میں ٹینشن' فرسٹریشن اور ڈپریشن سے آزاد رہا اور مجھے پہلی بار معلوم ہوا انسان اگر شمر کی آنکھ سے دیکھے تو اسے کربلا کے شہید بھی حکومت کی رٹ دکھائی دیتے ہیں' مجھے پہلی بار معلوم ہوا اگر انسان اپنے جسم میں میر جعفر اور میر صادق کا ضمیر پیدا کر لے یا انسان حجاج بن یوسف کے میڈیا مینجمنٹ گروپ میں شامل ہو جائے تو خانہ کعبہ کی گرتی ہوئی دیواروں' حجر اسود کے ٹکڑوں' پلاسی کے میدان میں غداروں کے قہقہوں کے درمیان دم توڑتے سپاہیوں اور ٹیپو سلطان کے ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے'' جیسے نعروں کا مفہوم بدل جاتا ہے' مجھے پہلی بار معلوم ہوا اگر انسان فرعون کے دربار سے منسلک ہو جائے تو اسے حضرت موسیٰؑ کا کلمہ حق قانون شکنی محسوس ہوتا ہے اور اسے نمرود کی آگ آزاد اور خود مختار عدلیہ کا

فیصلہ دکھائی دیتی ہے' مجھے محسوس ہوا اگر انسان ''جنونی گروپ'' سے باہر آ جائے تو اس کی زندگی بڑی سکھی ہو جاتی ہے اور وہ ہر قسم کی گالی کو ملازمت کا حصہ سمجھ کر برداشت کر جاتا ہے اور زندگی کو کافی کے کپ' ہوانا کے سگار اور پیرس کی خوشبو کی طرح انجوائے کرتا ہے لیکن اس سارے کھیل میں ایک چھوٹا سا' معمولی سا مسئلہ ہے اور یہ مسئلہ حاجی صاحب چڑے والے دمشروبات ڈیلر سے ملتا جلتا ہے لوگ کبھی کبھار سر راہ یا ٹیلی فون پر بے شرم اور بے غیرت کہہ دیتے ہیں لیکن باقی سب خیریت ہے۔

آپ میری دردناک صورتحال کا اندازہ کیجئے کہ میں نے ابھی صرف فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ابھی بے شمار مرحلے باقی تھے لیکن 13 دنوں میں لوگوں نے فون کر کے میری مت ماردی لہٰذا میں ان جیالوں' مجاہدوں اور جرأت مند حضرات کی ہمت اور شجاعت پر حیران ہوں جو یہ کام پچھلے تیس بتیس برسوں سے کر رہے ہیں' جو قلم لے کر ہر حکومت کے دروازے پر بیٹھ جاتے ہیں اور ''آپ سرکار'' شروع کر دیتے ہیں' اس آپ سرکار کے نتیجے میں انہیں ہزاروں لاکھوں فرزندانِ توحید روزانہ گالیاں دیتے ہیں مگر ان کی جبین ناز پر شرمندگی کی سلوٹ تک نہیں آتی' میں حیران ہوں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو کتنے بڑے ''ظرف'' سے نواز رکھا ہے کہ یہ لوگ سویرے سویرے اٹھ کر حکومت کی دیوار چاٹنا شروع کر دیتے ہیں اور حکومت کے خاتمے تک سانس نہیں لیتے لہٰذا میں ان تمام حاجی صاحبان چڑے والے کو ان کی ثابت قدمی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آپ ان حاجی صاحبان کی کارروائیاں ملاحظہ کر لیجئے کل لاہور میں سری لنکا کی کرکٹ ٹیم پر حملہ ہوا اور حاجی صاحبان کل سے اس حملے کو پاکستانی دہشت گردوں کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں' ان لوگوں کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ یہ اسے ممبئی حملوں کا ردعمل قرار دے سکیں' یا اتنا ہی اعتراف کر لیں بھارتی ایجنسیوں نے بدلہ لینے کیلئے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ایک خطرناک کھیل کا ٹریلر ہے' اصل فلم ابھی چلنا باقی ہے' ہم اگر فرض کر لیں یہ لوگ بھارتی نہیں تھے اور یہ پاکستان کے نان سٹیٹ ایکٹرز ہیں تو پھر یہ مزید تشویشناک صورتحال ہے کیونکہ میاں شہباز شریف کے دور میں پنجاب دہشت گردی سے محفوظ رہا تھا' اس دور میں ڈیرہ اسماعیل خان اور میانوالی میں دو تین واقعات ہوئے تھے لیکن یہ فرقہ وارانہ دہشت گردی تھی جبکہ سنٹرل پنجاب بالخصوص لاہور دہشت گردی سے محفوظ رہا تھا' اس کی دو بڑی وجوہات تھیں ایک آپ میاں شہباز شریف سے سو اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود ماننا پڑے گا وہ ایک اچھے منتظم اور اچھے ٹیم لیڈر ہیں چنانچہ انہوں نے اہم پوسٹوں پر ایماندار اور ان تھک افسر لگا دیئے تھے اور ان افسروں کی کوششوں سے پنجاب محفوظ رہا' دوسرا میاں برادران شمالی اور جنوبی وزیرستان میں

روز حملوں' فاٹا میں امریکی اثر و رسوخ اور فوجی آپریشن کے خلاف ہیں' وہ سوات کے مسئلے کا پرامن حل بھی چاہتے ہیں اور انہوں نے آج تک مذہبی طبقے کو دہشت گرد بھی قرار نہیں دیا چنانچہ شدت پسندوں نے پنجاب کو ٹارگٹ نہیں کیا لیکن جوں ہی پنجاب کی حکومت ختم ہوئی تو نان سٹیٹ ایکٹرز کیلئے اسلام آباد اور لاہور میں کوئی فرق نہیں رہا اور انہوں نے لاہور میں بھی کارروائیاں شروع کر دیں لہٰذا یہ کارروائی کررا کی ہے تو صورتحال تشویشناک ہے اور اگر یہ پاکستان کے نان سٹیٹ ایکٹرز ہیں تو بھی صورتحال انتہائی خوفناک ہے اور اگر ہم نے گورنر پنجاب کے اختیارات کی توسیع اسی طرح جاری رکھی تو شمالی وزیرستان اور لاہور میں کوئی فرق نہیں رہے گا لیکن میرا خیال ہے حکومت اس معاملے میں سنجیدگی دکھانے کی بجائے ان حاجی صاحبان سے کام چلانے کی کوشش کر رہی ہے جن کی نظر میں چند گالیوں کے سوا سب خیرت ہوتی ہے اور جو حکومتی رٹ قائم کرنے کیلئے لال مسجد جیسے واقعات کو بھی درست قرار دیتے ہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

سزا

میری جان پر پچھلے دو ماہ سے ایک قرض چلا آ رہا ہے' یہ قرض عافیہ صدیقی ہے اور عافیہ صدیقی اور اس پر ڈھائے جانے والے مظالم میری آدھی نیند کھا چکے ہیں۔ میں روز جب رات کو سونے لگتا ہوں تو عافیہ صدیقی اور اس کے تین بچے میرے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور ان کے آنسو سیدھے میرے ماتھے پر گرتے ہیں اور میری نیند ساتھ بہالے جاتے ہیں۔ عافیہ صدیقی کراچی سے بگرام لے جائی گئی' بگرام میں اس پر جتنے مظالم ڈھائے گئے اس کا پہلی بار انکشاف ابو یحیٰ علیبی نے کیا تھا۔ ابو یحیٰ علیبی کا تعلق القاعدہ سے تھا' وہ تنظیم کے اہم رہنماؤں میں شمار ہوتا تھا اور وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ 2003ء میں گرفتار ہو گیا تھا' ابو یحیٰ کو بگرام کے امریکی بیس میں قید رکھا گیا تھا' وہ جولائی 2006ء میں اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے فرار ہوا اور اس نے 2007ء میں الجزیرہ ٹیلی ویژن کو ایک انٹرویو دیا' اس انٹرویو میں اس نے انکشاف کیا ''افغانستان اور بعض عرب ممالک میں بے شمار خفیہ جیلیں ہیں اور ان جیلوں میں سینکڑوں بے گناہ لوگ قید ہیں' ابو یحیٰ کا کہنا تھا'' بگرام کی جس جیل میں وہ لوگ قید تھے وہاں ایک پاکستانی خاتون بھی تھی' یہ خاتون دو سال پہلے بگرام لائی گئی اور وہ شدید تشدد کے باعث اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے'' ابو یحیٰ کا کہنا تھا' وہ ایک درمیانی عمر کی خاتون ہے جس کے ساتھ وہی سلوک ہو رہا ہے جو مرد قیدیوں کے ساتھ ہوتا ہے اور اس خاتون کی یادداشت ختم ہو چکی ہے'' میں نے جب الجزیرہ پر ابو یحیٰ کا انٹرویو سنا تھا تو میرا ذہن فوراً عافیہ صدیقی کی طرف چلا گیا تھا اور میں نے سوچا تھا وہ پاکستانی خاتون یقیناً عافیہ صدیقی ہوگی۔

یہ عافیہ صدیقی کون ہے؟ عافیہ صدیقی ایک پاکستانی امریکی خاتون تھی' وہ 2 مارچ 1972ء کو کراچی میں پیدا ہوئی' اس کے والد محمد صدیقی پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے' یہ خاندان 70 کی دہائی میں امریکہ منتقل ہو گیا' عافیہ صدیقی پر مذہب کا غلبہ تھا' وہ سکول اور یونیورسٹی میں سکارف لیتی تھی' عافیہ نے دنیا کے بہترین تعلیمی ادارے ''ایم آئی ٹی'' سے گریجوایشن کی تھی' ایم آئی ٹی میں وہ مسلمان طالب علموں کی ایک ایسوسی ایشن میں شامل ہو گئی تھی' گریجوایشن کے بعد اس کے والدین نے اس کی شادی ڈاکٹر امجد

خان کے ساتھ کر دی اور وہ دونوں اطمینان سے زندگی گزارنے لگے' اللہ تعالیٰ نے اس دوران اسے دو بچوں سے نوازا' 2001ء میں نائین الیون کا واقعہ پیش آیا جس کے بعد دنیا کی تمام سیکرٹ ایجنسیاں دہشت گردوں کے خفیہ نیٹ ورک کے پیچھے لگ گئیں' 2002ء کے وسط میں امریکہ کے اٹارنی جنرل جان ایش کرافٹ اور ایف بی آئی کے ڈائریکٹر رابرٹ میولر نے پریس کانفرنس کی اور اس کانفرنس میں انکشاف کیا کہ ایف بی آئی القاعدہ کے سات کارکنوں کو تلاش کر رہی ہے' ان کارکنوں میں ایک درمیانی عمر کی خاتون بھی ہے' ان سات لوگوں نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کیلئے دہشت گردوں کو رقم فراہم کی تھی' اس اعلان کے کچھ عرصہ بعد ایف بی آئی نے عافیہ صدیقی کی تصویر ریلیز کر دی۔ ایف بی آئی کا کہنا تھا امریکی حکومت نے 1999ء میں القاعدہ کے تمام اکاؤنٹس منجمد کر دیئے تھے جس کے بعد یہ لوگ بینکوں کے ذریعے رقم ٹرانسفر نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ان لوگوں نے اس کا حل ہیروں کی شکل میں نکالا' یہ لوگ مغربی افریقہ کے ملک لائبیریا سے ہیرے خریدتے تھے' یہ ہیرے امریکہ سمگل کرتے تھے' انہیں انڈر ورلڈ میں فروخت کرتے تھے اور ان سے حاصل ہونے والی رقم دہشت گردی میں استعمال کرتے تھے۔ ایف بی آئی کا کہنا تھا عافیہ صدیقی ہیروں کی اس سمگلنگ کی مرکزی کردار تھی' وہ سال میں کئی کئی بار لائبیریا جاتی تھی' وہاں سے ہیرے خریدتی تھی اور امریکہ لا کر فروخت کر دیتی تھی۔ ایف بی آئی کا کہنا تھا عافیہ صدیقی جولائی 2001ء میں بھی لائبیریا گئی اور وہاں سے 15 ملین ڈالر کے ہیرے خرید کر لائی تھی بعد ازاں ان لوگوں نے اس رقم میں سے پانچ لاکھ ڈالر خرچ کیے اور اس کے نتیجے میں امریکہ میں نائین الیون کا واقعہ وقوع پذیر ہوا۔ بعض امریکی صحافیوں کا کہنا تھا عافیہ صدیقی کی نشاندہی شیخ خالد محمد نے کی تھی' شیخ خالد القاعدہ کا مرکزی رہنما تھا اور نائین الیون کا سارا آپریشن اس نے ڈیزائن کیا تھا' وہ یکم مارچ 2003ء کو کراچی سے گرفتار ہوا تھا اور اس نے دوران تفتیش عافیہ صدیقی کا نام لیا تھا' اس وقت عافیہ کراچی میں مقیم تھی اور شدید گھریلو مسائل کا شکار تھی' اس کے خاوند نے اسے طلاق دے دی تھی جس کے صدمے کی وجہ سے اس کے والد دنیا سے رخصت ہو گئے' عافیہ کو اللہ تعالیٰ نے انہی دنوں بیٹے کی نعمت سے نوازا لیکن اس کے باوجود وہ شدید ڈپریشن اور پریشانی کا شکار تھی' اسی پریشانی میں اس نے اپریل 2003ء میں اپنے تینوں بچے لیے اور ٹرین کے ذریعے کراچی سے اسلام آباد روانہ ہو گئی' اس وقت اس کے بچوں کی عمریں سات سال' پانچ سال اور چھ ماہ تھی' عافیہ صدیقی راستے میں کسی جگہ بچوں سمیت غائب ہو گئی' عافیہ صدیقی کی گمشدگی کے چند روز بعد ایک موٹر سائیکل سوار اس کی والدہ کے پاس آیا اور اس نے بتایا عافیہ گرفتار ہو چکی ہے اور اگر وہ اپنی بیٹی کی سلامتی چاہتی ہے تو وہ خاموشی اختیار کر لے۔

انہی دنوں پاکستان کی وزارت داخلہ کے ترجمان اور دو امریکی اہلکاروں نے صحافیوں کے سامنے اعتراف کیا کہ عافیہ صدیقی اور اس کے بچے ان کی حراست میں ہیں اور وہ ان سے تفتیش کر رہے ہیں ابھی اس اعتراف کو چند ہی روز گزرے تھے کہ وزارت داخلہ اور امریکی اہلکاروں نے اپنے بیان کی تردید کر دی' یوں عافیہ صدیقی اور اس کے بچے قصہ ماضی بن گئے۔ عافیہ صدیقی 3 اگست 2008ء تک گوشہ گمنامی میں رہی' 4 اگست کو نومسلم صحافی ریڈلی نے اسلام آباد میں انکشاف کیا عافیہ صدیقی بگرام جیل میں قید ہے اور اس پر انسانیت سوز تشدد کیا جا رہا ہے' اسی دوران عافیہ کے سابق خاوند نے دعویٰ کیا ایف بی آئی 2001ء کے جن دنوں میں عافیہ کو لائبیریا میں ثابت کرتی رہی ہے عافیہ ان دنوں امریکہ میں تھی اور ان کے پاس تمام ثبوت موجود ہیں۔ اس کا کہنا تھا ''ممکن ہے القاعدہ نے عافیہ کی جعلی دستاویزات بنالی ہوں اور ان دستاویزات پر عافیہ کی جگہ کوئی دوسری خاتون سفر کرتی رہی ہو''۔

عافیہ مجرم ہے یا نہیں' یہ راز اس وقت تک راز رہے گا جب تک عافیہ اور اس کے بچے دنیا کے سامنے نہیں آتے اور انہیں کھل کر بات کرنے کی اجازت نہیں ملتی لیکن اس اجازت سے قبل انسانی ضمیر دنیا کے 6 ارب لوگوں سے چند سوال پوچھنا چاہتا ہے۔ دنیا کا ہر قانون ملزم کو صفائی کا پورا پورا حق دیتا ہے لیکن عافیہ کے معاملے میں دنیا کا قانون پانچ سال کیوں خاموش رہا؟ نمبر دو' اگر عافیہ مجرم ہے تو اس کے تینوں معصوم بچوں کا کیا قصور تھا؟ نمبر تین' عافیہ صدیقی پانچ سال بگرام کی جیل میں قید رہی کیا پاکستانی ہونے کی حیثیت سے اسے رہا کرانا اور اسے دنیا کی عدالت میں پیش کرنا ہماری ذمہ داری نہیں تھی؟ پاکستان میں بے شمار علمائے کرام ہیں ہم دنیا کی بہترین فوج کے مالک ہیں' اس ملک میں چار پانچ کروڑ پڑھے لکھے لوگ ہیں' اس ملک کے 80 فیصد لوگ روز مسجدوں میں جاتے ہیں' ہم سب لوگ صبح شام قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں' ہم سب کے سینوں میں دل ہے اور یہ دل ایک منٹ میں ستر اسی بار دھڑکتا ہے' ہماری نسوں میں خون بھی ہے اور یہ خون بھی ہماری رگوں میں سرکتا ہے' ہم سب خود کو زندہ اور باضمیر انسان بھی کہتے ہیں لیکن جب عافیہ جیسے لوگوں کا معاملہ آتا ہے تو ہماری زبانیں گنگ کیوں ہو جاتی ہیں؟ ہمارا ضمیر کروٹ بدل کر کیوں سو جاتا ہے اور ہماری نمازیں' ہمارے قرآن مصلحت کی چادر کیوں اوڑھ لیتے ہیں؟ ہم نظریہ ضرورت کے مورچے میں سر کیوں چھپا لیتے ہیں؟ اور ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں عافیہ صدیقی کے ساتھ چھ ماہ کا ایک بچہ بھی تھا اور اگر کل روز حشر عافیہ صدیقی کے اس چھ ماہ کے بچے نے ہمارا گریبان پکڑ لیا تو ہم اللہ کو کیا جواب دیں گے۔ ہم بھول جاتے ہیں حضرت امام حسینؓ کے چھ ماہ کے بیٹے نے فرات کے کنارے ایک سوال پوچھا تھا اور ہم چودہ سو سال سے اس سوال کا جواب دے

رہے ہیں لیکن قدرت ہمارے جواب سے مطمئن نہیں ہو رہی۔ آج اکیسویں صدی میں عافیہ صدیقی کا چھ ماہ کا بیٹا بھی ہم سے وہی سوال پوچھ رہا ہے' وہ ہم سے پوچھ رہا ہے ''میرا کیا جرم تھا'' ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے اس کائنات کا ایک رب ہے اور اس رب کی نظر میں اس وقت ہمارا کیا مقام ہوگا؟ وہ ہمارے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا؟ یہ چھ ماہ کا بچہ اس ملک کے 16 کروڑ لوگوں کو پیغام دے رہا ہے خدا کیلئے خدا سے ڈرو۔ تم سب نے فوت ہونا ہے اور فوت ہونے کے بعد اپنے رب کے سامنے پیش ہونا ہے اور اللہ کی عدالت وہ عدالت ہے جس میں تمہیں کوئی بش نہیں بچا سکے گا' وہاں صرف تمہارے اعمال' تمہاری سوچ' تمہاری جرأت اور تمہارا ایمان تمہارا ساتھ دے گا اور تم نے اپنے اعمال اور اپنی نیکیاں اس چھ ماہ کے بچے اور ایک مظلوم عورت کے حوالے کر دی ہیں چنانچہ تم اب خالی ہاتھ لے کر اللہ کے سامنے پیش ہو گئے۔ ہمیں ماننا پڑے گا عافیہ صدیقی کے معاملے میں ہماری خاموشی ایک ایسا گناہ کبیرہ تھی جس کا تاوان اس پوری قوم کو ادا کرنا پڑے گا' جس کی سزا ہم سب کو بھگتنا پڑے گی۔ صدر مشرف کی سزا شروع ہو چکی ہے اور ہماری سزا کا وقت شروع ہونے والا ہے۔ بس چند دن کی بات ہے اور ہم تاوان کے بیلنے میں گنے کی طرح پیس دیئے جائیں گے' ہم معافی مانگتے مانگتے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔

⊘ ⊘ ⊘

جب تک

چیک افسانہ نویس فرانز کافکا کے ایک کردار پر قتل کا الزام لگ جاتا ہے' پولیس ملزم کو گرفتار کرنے آتی ہے تو وہ اہلکاروں کو کہتا ہے "حضور آپ میری عرض سنیں' میں ...." کانسٹیبل فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے "نہیں' تم کچھ نہیں کہہ سکتے تم ملزم ہو" تھانے پہنچ کر ملزم تھانیدار کے سامنے ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے کی کوشش کرتا ہے' تھانیدار اسے گھور کر کہتا ہے "تم ملزم ہو' تم کچھ نہیں بول سکتے' اب تم نے جو کچھ کہنا ہے عدالت میں جا کر کہنا" کیس عدالت میں پہنچ جاتا ہے' پیشیاں شروع ہو جاتی ہیں' وکیل بحث کا آغاز کر دیتے ہیں' ہر سماعت پر ملزم جج سے بولنے کی اجازت طلب کرتا ہے لیکن جج اس کی طرف غصے سے دیکھتا ہے اور سرد لہجے میں حکم جاری کرتا ہے "تم تحریری طور پر اپنا بیان دے چکے ہو' اب تم صرف اپنے وکیل کو بولنے دو" ملزم اپنے وکیل سے عرض کرنے کیلئے منہ کھولتا ہے لیکن وکیل اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھ کر پھنکارتا ہے "تم ملزم ہو تم کچھ نہیں بول سکتے" یوں کیس چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ وکیلوں کی بحثیں ختم ہو جاتی ہیں' فیصلے کا دن آ جاتا ہے اور جج حاضرین کو گواہ بنا کر ملزم کو موت کی سزا سنا دیتا ہے' ملزم فیصلہ سنتا ہے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر ایک بار پھر عرض کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جج یہ کہہ کر عدالت برخاست کر دیتا ہے "عدالت اپنا فیصلہ سنا چکی ہے' اب تم نے جو کچھ کہنا ہے اپیل میں کہو" ملزم مجرم بن کر جیل چلا جاتا ہے وہاں وہ جیلر کے سامنے عرض کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جیلر بھی اس کی فائل بند کر کے کہتا ہے "اب تم مجرم ہو' تم کچھ نہیں کہہ سکتے" مجرم کو کال کوٹھڑی میں ڈال دیا جاتا ہے' وہاں بھی اس سے جو ملنے آتا ہے وہ اسے روک کر کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ہر ملاقاتی اسے مجرم کہہ کر سننے سے انکار کر دیتا ہے' آخر میں جب اسے پھانسی گھاٹ لے جایا جاتا ہے تو وہ جلاد سے مخاطب ہونے کی سعی کرتا ہے لیکن جلاد بھی اس کی بات سننے سے انکار کر دیتا ہے' رسہ کھینچنے سے چند لمحے پہلے مجرم آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور پھر وہاں موجود عملے پر نظر ڈال کر کہتا ہے "کوئی ہے جس کے کانوں تک میری آواز پہنچ سکے جو میری بات سن سکے" سب خاموش رہتے ہیں' مجرم ٹھنڈا سانس بھرتا ہے اور پھر پھندے کو مخاطب کر کے کہتا ہے "یہ کیسے لوگ ہیں جو ملزم کی بات سنے بغیر اس کا فیصلہ کر دیتے ہیں" ابھی لفظ اس کے منہ ہی میں ہوتے ہیں کہ جیلر رومال لہراتا ہے اور جلاد تختہ کھینچ دیتا ہے۔

معلوم نہیں کافکا اس کہانی کے ذریعے اپنے قارئین کو کیا سمجھانا چاہتا تھا' اس کا یہ ملزم کس جذبے' کس طبقے کا نمائندہ تھا اور وہ کون سے طبقے اور کون سے جذبے تھے جو اس کی سنے بغیر اسے پھانسی چڑھا دیتے ہیں لیکن جہاں تک ہمارا اور ہمارے ملک کا تعلق ہے یہ کہانی پڑھ کر محسوس ہوتا ہے وہ ملزم اس ملک کے 16 کروڑ عوام ہیں اور اس کہانی کے کانسٹیبل' تھانیدار' وکیل' جج اور عدالتیں اس ملک کی وہ مقتدر طاقتیں ہیں جن کے ہاتھ میں ان ملزموں کی تقدیر ہے' یہ 16 کروڑ ملزم اس ملک کے ہر تھانیدار' ہر جج اور ہر عدالت سے درخواست کرتے ہیں "حضور آپ ہماری بھی عرض سن لیں" لیکن ہر عدالت' ہر جج اور ہر تھانیدار انہیں گھور کر چپ کرا دیتا ہے۔ ذرا سوچئے ایوب خان نے سکندر مرزا کو گرفتار کر کے راتوں رات جلاوطن کر دیا اور خود اس ملک کے بلاشرکت غیرے مالک بن گئے اور انہوں نے ایک لمحے کیلئے نہ سوچا کہ وہ اس ملک کے لوگوں سے یہ ہی پوچھ لیں کہ انہیں سکندر مرزا چاہیے یا ایوب خان۔ یحییٰ خان آئے' حکومت کی اور جاتے جاتے 7 کروڑ لوگ بھٹو کے حوالے کر گئے' ان 7 کروڑ ملزموں سے پوچھے بغیر کہ انہیں بھٹو چاہیے بھی یا نہیں۔ جنرل ضیاء تشریف لائے تو انہوں نے بھی ان "ملزموں" سے پوچھے بغیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی' پھر ان کا جی چاہا تو انہوں نے ملزمان سے بغیر پوچھے محمد خان جونیجو اور نواز شریف کو اس ملک کا جیلر مقرر کر دیا۔ صدر اسحاق خان آئے تو انہوں نے پہلے بے نظیر اور پھر نواز شریف کو "حکمران" بنانے کا فیصلہ کیا اور پھر عوام کو اعتماد میں لئے بغیر خود ہی انہیں چلتا کر دیا' درمیان میں کسی مقتدر طاقت کو معین قریشی پسند آ گئے اور اس نے ان 16 کروڑ "ملزمان" کو اطلاع دیئے بغیر انہیں پلیٹ میں رکھ کر معین قریشی کے سامنے "سرو" کر دیا' کسی نے فیصلہ کیا اور بے نظیر ایک بار پھر پاکستان کی تقدیر بن گئیں' کسی نے فیصلہ کیا اور بے نظیر گھر واپس چلی گئیں' کسی نے نواز شریف کو ایک اور چانس دینے کا فیصلہ کیا اور نواز شریف کو ہیوی مینڈیٹ مل گیا' کسی کا جی چاہا اور نواز شریف اقتدار کے برج سے اتر کر اٹک پہنچ گئے اور پھر کسی نے فیصلہ کیا اور نواز شریف کو خاندان سمیت عزت و آبرو کے ساتھ ملک سے باہر بھجوا دیا گیا اور اس کے بعد کسی تھانیدار کے دماغ میں خیال آیا اور محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف واپس آ گئے' محترمہ شہید کر دی گئیں' 18 فروری کے الیکشن ہوئے' اتحادی حکومت بنی' مسلم لیگ ن وزارتوں سے الگ ہوئی اور آج نئے آپشنز پر گفتگو شروع ہو چکی ہے' ہر آپشن زیر غور ہے' وزارت عظمیٰ اور صدارت کیلئے نئے امیدوار ڈسکس ہو رہے ہیں اگر ڈسکس نہیں ہو رہے' اگر کسی کو غور کے قابل نہیں سمجھا جا رہا تو وہ اس ملک کے عوام ہیں' وہ کافکا کی کہانی کے وہ ملزمان ہیں جنہیں مرنے تک عرض کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ہماری بدقسمتی دیکھئے ہمارے سب فیصلے اوپر ہی اوپر ہو رہے ہیں اور کوئی ان ملزموں

سے نہیں پوچھ رہا' کوئی ان سے نہیں پوچھ رہا انہیں کون سا لیڈر چاہیے اور انہیں کون سا نظام درکار ہے۔

یقین کیجئے ایک کوچوان' ایک ساربان اور ایک کمہار بھی کبھی کبھار اپنے گدھے' اپنے اونٹ اور اپنے گھوڑے سے پوچھ لیا کرتے ہیں کہ اسے کون سا چارہ چاہیے "وہ پھک" کھانا پسند کرے گا یا لوسن' وہ صحن میں بندھنا چاہے گا یا اندر باڑے میں اور اسے لکڑی کی کھرلی چاہیے یا سیمنٹ کی پکی ناند لیکن یہ لوگ جی ہاں یہ لوگ حکومتیں بناتے اور حکومتیں توڑتے وقت 16 کروڑ لوگوں پر ایک نگاہ غلط بھی نہیں ڈالتے اور اقتدار میں آنے کے بعد انہیں عوام کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا' انہیں اتنی زحمت نہیں ہوتی وہ عوام سے پوچھ لیں کہ انہیں کیا چاہیے۔ عوام فاقوں پر مجبور ہوں' غربت اور بے روزگاری کا شکار ہوں یا پٹڑیوں' چوکوں اور چوراہوں میں خودکشیاں کر رہے ہوں ان حکمرانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی' ان کے غیر ملکی دورے اور ان کی میٹنگز ہی ختم نہیں ہوتیں اور یہ ہر پندرہویں دن اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ آپ اندازا لگائیں یہ حکومت پٹرول کی قیمتوں میں پانچ بار اضافہ کر چکی ہے اور گزشتہ روز وزیراعظم نے چھٹی بار پٹرول کی قیمت میں 10 روپے 97 پیسے' ڈیزل کی قیمت میں 7 روپے 45 پیسے اور مٹی کے تیل میں 8 روپے 64 پیسے کا ریکارڈ اضافہ کر دیا' وزیراعظم نے اس اضافے کی سمری پر دستخط کرنے سے پہلے ایک لمحے کیلئے رک کر اتنا نہیں سوچا جو عوام بھوک سے مر رہے ہیں ان پر اس اضافے کے کیا اثرات پڑیں گے اور شاباش ان 16 کروڑ لوگوں کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری پر جو اس اضافے پر بھی چپ سادھے بیٹھے ہیں۔ یہ حقیقت ہے ایک گھوڑا لگام کھینچے' اونٹ ٹانگ باندھنے اور گدھا حد سے زیادہ بوجھ ڈالنے پر کبھی کبھار دولتی جھاڑ دیتا ہے' بلبلا اٹھتا ہے' ہنہنا لیتا ہے لیکن صدقے جاؤں ان 16 کروڑ شہزادوں پر کہ جس نے چاہا' جب چاہا اور جتنا چاہا ان پر بوجھ لاد دیا اور جس کے ہاتھ میں چاہی ان کی لگام تھما دی مگر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور نہ ہی احتجاج کیا' واہ بھائی واہ۔ میں جوں جوں بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں' میں جوں جوں زندگی کی رو میں آگے بڑھتا جا رہا ہوں' میں جوں جوں اس ملک کے حالات دیکھتا ہوں' مجھے یوں محسوس ہوتا ہے یہ ملک اس وقت تک نشیب اور زوال کی طرف بڑھتا رہے گا جب تک اس ملک کے 16 کروڑ لوگ اپنے لئے ملزم کی بجائے منصف کا کردار پسند نہیں کریں گے' جب تک لوگوں کے مقدر کے فیصلے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں آئیں گے' جب تک عوام حکمرانوں کو اپنی بات نہیں سنائیں گے' جب تک لوگ احتساب نہیں کریں گے' جب تک لوگ حکمرانوں کو یہ نہیں بتائیں گے "ہم انسان ہیں' جانور نہیں"۔

⊘ ⊘ ⊘

بنانا اسٹیٹ

وہ واپس مڑا' آہستہ آہستہ چلتا ہوا الباسو کے قریب پہنچا' الباسو گھبرا گیا' وہ اس کے قریب پہنچ کر اس کے کان پر جھکا اور آہستہ سے بولا "ہمارے پاس کیلے ہیں' ہم ثابت کر دیں گے کیلا توپ سے زیادہ مہلک ہوتا ہے" وہ مڑا' دروازے کی طرف بڑھا' ایک لمحے کیلئے رکا' جنرل کی طرف ہاتھ لہرایا اور باہر نکل گیا' پورچ میں اس کے گارڈز کھڑے تھے' وہ گاڑی میں بیٹھا اور عمارت سے باہر نکل گیا۔ وہ ہنڈورس میں کیلوں کا سب سے بڑا بیوپاری تھا' وہ چھٹی نسل سے اس کاروبار کے ساتھ وابستہ تھا' اس کے پردادا کا پردادا کولمبس کے ساتھ ہنڈورس آیا تھا اور ملک میں ہزاروں ایکڑ پر پھیلے کیلے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا' وہ تاجرانہ ذہنیت کا مالک تھا' اس نے فوراً بھانپ لیا تھا یہ کیلے مستقبل میں سونے کی کان ثابت ہوں گے چنانچہ اس نے کیلے کے جنگلات پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

یہ ایک طویل داستان ہے اور میرا خیال ہے جب تک آپ اس داستان کا پس منظر نہیں جانیں گے اس وقت تک آپ کو اس کھیل کی سمجھ نہیں آئے گی۔ میں سب سے پہلے آپ کو ہنڈروس کے بارے میں بتاتا ہوں' ہنڈورس لاطینی امریکہ کا ایک چھوٹا سا ملک ہے' یہ ملک گھنے جنگلات' صاف پانی اور کیلے کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے' یہ ملک کولمبس نے 1502ء میں دریافت کیا تھا اور 1525ء میں ہسپانوی جہاز رانوں نے ہنڈورس میں پہلی کالونی بنائی تھی۔ 1525ء کے بعد سپین سے یورپی باشندوں کے جہاز ہنڈورس آتے رہے اور یہاں آباد ہوتے رہے' یہ ہسپانوی لوگ مقامی آبادی میں "مکس" ہو گئے اور یوں آہستہ آہستہ یہاں ایک نئی نسل نے جنم لے لیا۔ 1800ء کے شروع میں ہنڈورس پر ہسپانویوں کا اثر و رسوخ کم ہونے لگا جس کے بعد 1838ء میں ہنڈورس کے لوگوں نے سپین سے آزادی حاصل کر لی۔ 1901ء میں اس ملک میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا اور یہ واقعہ آگے چل کر سفارت کاری کی ایک خوبصورت اصطلاح بن گیا تھا۔ دنیا میں سب سے زیادہ کیلے ہنڈورس میں پیدا ہوتے تھے اور اس وجہ سے یہ ملک اس وقت تک دنیا میں کیلوں کا سب سے بڑا ایکسپورٹر تھا' انیسویں صدی میں ہنڈورس میں فروٹس کی دو بڑی کمپنیاں تھیں' ایک کا نام یونائیٹڈ فروٹ تھا

جبکہ دوسری کمپنی سٹینڈرڈ فروٹ کے نام سے جانی جاتی تھی' یہ دونوں کمپنیاں سالانہ اربوں ڈالرز کے کیلے اور فروٹ شمالی امریکہ' جنوبی امریکہ' کینیڈا اور یورپ ایکسپورٹ کرتی تھیں' 1901ء میں کسی تجارتی لین دین کی وجہ سے ان دونوں کمپنیوں میں لڑائی ہوئی اور یہ لڑائی آگے چل کر جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ اس وقت الباسو نام کا ایک جنرل ہنڈورس میں بارسوخ سمجھا جاتا تھا' یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کا مالک الباسو سے ملا اور اس سے مدد مانگی لیکن الباسو نے جواب دیا" تم لوگ تاجر ہو جنگ لڑنا تم لوگوں کے بس کی بات نہیں' تم لوگ یہ سلسلہ فوراً بند کر دو' یونائیٹڈ کمپنی کے مالک نے جواب دیا" جب انا درمیان میں آجاتی ہے تو تاجر کو سپاہی بنتے دیر نہیں لگتی" الباسو نے اس کے جواب میں اس سے کہا" لڑنے کیلئے ہتھیار اور حوصلہ چاہئے اور تمہارے پاس کیا ہے" تاجر اس جواب پر غصے میں آ گیا اور اس کے بعد اس نے جنرل کو للکار کر کہا" ہمارے پاس کیلے ہیں اور ہم ثابت کر دیں گے کیلا توپ سے زیادہ مہلک ہوتا ہے" یونائیٹڈ کمپنی کے مالک نے اتنا کہا اور واپس جا کر کیلے کو توپ کی شکل دینا شروع کر دی' یونائیٹڈ فروٹ کمپنی نے سیاست میں قدم رکھ دیا' اس نے سب سے پہلے ہنڈورس کے تمام وزراء خریدے' پھر وزیراعظم کو اپنا ملازم رکھ لیا' پھر اپنی مرضی کا پولیس چیف لگا دیا' پھر بدمعاشوں کا گینگ بنایا اور اسے ہنڈورس کی فوج کا نام دے دیا اور پھر اپنے منشیوں کو جج بنا دیا' یوں پورے ملک کے طاقتور اداروں پر قبضہ کر لیا۔ یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کے اس سیاسی اثر رسوخ سے سٹینڈرڈ فروٹ کمپنی کو نقصان پہنچنے لگا چنانچہ اس نے امریکہ اور یورپ کی ان کمپنیوں سے رابطہ کیا جن کو وہ کیلے فروخت کرتی تھی' یورپ اور امریکہ کی فروٹس کمپنیوں نے سٹینڈرڈ فروٹ کمپنی کو مالی' سفارتی اور فوجی مدد دینا شروع کر دی' یوں ہنڈورس میں دونوں فروٹس کمپنیوں کے درمیان طاقت کی لڑائی شروع ہو گئی' یہ جنگ جب امریکہ کے مشہور لکھاری او ہنری کے نوٹس میں آئی تو اس نے دنیا کی اس عجیب وغریب جنگ پر ایک کتاب لکھی اور اس کتاب میں اس نے ہنڈورس کو بنانا ری پبلک کا نام دے دیا اور وہ دن ہے اور یہ دن ہے' دنیا نہ صرف ہنڈورس کو بنانا ری پبلک کہتی ہے بلکہ ہر وہ ملک جو سیاسی طور پر غیر مستحکم ہو' جس کی پارلیمنٹ بے اختیار ہو' جس میں مافیا حکمرانی کرتے ہوں' جس میں سرکاری افسر اور ادارے حکمران کلاس کے ذاتی ملازم سمجھے جاتے ہوں' جس کی عدالتیں سیاستدانوں کی تابع ہوں' جس کے الیکشنز میں دھاندلی ہوتی ہو' جہاں ڈکٹیٹر شپ ہو' جس میں کرپشن عام ہو' جس میں سرکاری ملازمتیں رشتے داروں اور دوستوں میں تقسیم ہوتی ہوں' جس کی سرحدوں کی خلاف ورزی ہوتی ہو' جس میں فوج پارلیمنٹ سے زیادہ مضبوط ہو' جس میں جرنیل اقتدار پر قبضے کرتے رہتے ہوں' جس میں قانون اور انصاف بکتا ہو' جس میں امن وامان نہ ہو' جس میں بیرونی طاقتوں کا اثر ورسوخ ہو'

جس کی اکانومی ورلڈ بینک' آئی ایم ایف اور دوسرے ممالک کے زیر اثر ہو اور جس میں اقتدار کرپٹ تاجروں' بے ایمان سیاستدانوں اور مفاد پرست جرنیلوں کے دائرے میں گھومتا ہو' اس ملک کو بھی بنانا ری پبلک کہا جاتا ہے۔

پاکستان کو 27 دسمبر 2007ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پہلی بار یورپی پریس نے بنانا ری پبلک لکھنا شروع کیا تھا' مجھے اچھی طرح یاد ہے اس کے جواب میں 22 جنوری 2008ء کو صدر پرویز مشرف نے غیر ملکی صحافیوں کے ساتھ گفتگو کی تھی اور اس گفتگو کے دوران صدر پرویز مشرف نے دعویٰ کیا تھا" پاکستان بنانا ری پبلک نہیں' ہم ایک خود مختار' امن پسند اور غیرت مند قوم ہیں" مجھے اچھی طرح یاد ہے صدر مشرف کے اس اعلان پر وہاں موجود تمام غیر ملکی ہنس پڑے تھے' مجھے اس وقت غیر ملکی صحافیوں کی ہنسی پر حیرت ہوئی تھی لیکن پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا' مجھے اس ہنسی کی وجہ معلوم ہوتی چلی گئی اور آج جون کے آخری لمحات میں بیٹھ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے پاکستان میں نہ صرف بنانا ری پبلک کے تمام آثار موجود ہیں بلکہ ہم بڑی تیزی سے بنانا ری پبلک بن رہے ہیں۔ ہمارے پاس پارلیمنٹ ہے لیکن اس کے پاس کوئی اختیار نہیں' ہمارے پاس صدر ہیں لیکن وہ غیر مقبول ہیں' ہمارے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی شوکت عزیز کا نیا ایڈیشن ہیں' شوکت عزیز سانس لینے سے قبل ایوان صدر کی طرف دیکھتا تھا اور گیلانی صاحب پانی بھی زرداری ہاؤس کی طرف منہ کر کے پیتے ہیں' ہمارے پاس چیف منسٹرز ہیں لیکن بے اختیار ہیں' سپریم کورٹ ہے لیکن ملک میں دو چیف جسٹس ہیں' فوج ہے لیکن امریکی جہاز پاکستان کی حدود میں آ کر ہمارے فوجی جوانوں کو شہید کر جاتے ہیں' ہمارے ملک میں پولیس ہے لیکن مجرم کھلے پھر رہے ہیں' کھمبے ہیں لیکن بجلی نہیں اور دفتر ہیں لیکن ان میں کام نہیں ہو رہا۔ آپ ہماری کمزوری کی حد ملاحظہ کیجئے' پچھلے دنوں افغانستان کے صدر حامد کرزئی نے بھی پاکستان میں فوجیں اتارنے کی دھمکی دے دی تھی۔ آپ ذرا سوچئے افغانستان اور حامد کرزئی کون ہیں؟ حامد کرزئی دنیا کے کمزور ترین حکمران ہیں' ان کی حکومت کابل میں صرف دس کلومیٹر تک محدود ہے جبکہ افغانستان دنیا کا واحد ملک ہے جسے پاکستان امداد دیتا ہے۔ افغانستان کے عوام پاکستانی آٹا کھاتے ہیں لیکن آپ ہماری کمزوری کی حد ملاحظہ کیجئے افغانستان بھی اب ہمیں جنگ کی دھمکی دے رہا ہے۔ ہمارے لئے اس سے بڑی شرمندگی بلکہ ذلت کی بات کیا ہوگی؟ میں جب ان حالات کو دیکھتا ہوں اور اس کے بعد ہنڈورس میں بننے والی بنانا ری پبلک دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے اوپر ترس آتا ہے اور میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں ہم اگر بنانا سٹیٹ نہیں ہیں تو ہم اس سے زیادہ دور بھی نہیں ہیں۔

آپ فاٹا اور صوبہ سرحد کے تازہ ترین آپریشن کو لے لیجئے‘ اس آپریشن سے قبل یہ خبریں آنا شروع ہوئیں طالبان پشاور شہر کی سرحدوں تک پہنچ چکے ہیں‘ پشاور شہر سے اوسطاً روزانہ 17 کے قریب لوگ اغوا ہوتے ہیں اور بھاری تاوان دے کر رہا ہوتے ہیں‘ نامعلوم لوگوں نے سرکاری عمارات‘ سکولوں اور دکانوں کو آگ لگانا شروع کر دی اور حکومتی مشینری معطل ہو کر رہ گئی۔ ان خبروں کے بعد حکومت نے آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی کو صوبہ سرحد کا ”چارج“ دے دیا جس کے بعد پیرا ملٹری فورسز نے فاٹا میں آپریشن شروع کر دیا۔ اس آپریشن کے بعد ثابت ہو گیا ہم حقیقتاً بنا ناری پبلک کی سرحدوں پر کھڑے ہیں‘ بس ایک قدم آگے بڑھانے کی دیر ہے اور یہ ملک مکمل طور پر مافیاز کے قبضے میں چلا جائے گا اور جس کے پاس جتنی طاقت ہو گی وہ ملک کے اتنے حصے پر قبضہ کر لے گا اور اپنا سکہ چلانا شروع کر دے گا اور خدانخواستہ وہ وقت آ گیا تو صدر پرویز مشرف‘ آصف علی زرداری اور رحمان ملک تو باہر بھاگ جائیں گے لیکن ہم لوگ کہاں جائیں گے؟ میں جب بھی یہ سوچتا ہوں تو میری روح تک کانپ جاتی ہے۔ کاش اللہ تعالیٰ ہمارے حکمرانوں کے دل میں رحم ڈال دے اور یہ آگ سے کھیلنا بند کر دیں‘ یہ اس مسئلے کا کوئی مستقل حل تلاش کر لیں ورنہ ہمیں 1971ء کی پوزیشن پر جاتے دیر نہیں لگے گی کیونکہ جس طرح ہنڈورس کے تاجروں کے پاس کیلے اور مشرقی پاکستان کے سیاستدانوں کے پاس پٹ سن کی طاقت تھی بالکل اسی طرح قبائلی علاقوں کے پاس پوست کی ”دولت“ موجود ہے اور یہ دولت جنگ لڑنے اور جیتنے کیلئے کافی ہے۔

⊘ ⊘ ⊘

بلیک باکس سے جھانکتی تصویر

انسانی یادیں تصویروں کی شکل میں ہوتی ہیں‘ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں‘ ہم جو کچھ سوچتے ہیں اور ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں‘ یہ سب تصویروں کی شکل میں ہمارے ذہن کے بلیک باکس میں محفوظ ہو جاتا ہے اور ہم بوقت ضرورت اس خزانے کو استعمال میں لاتے رہتے ہیں۔ میرے ذہن کے بلیک باکس میں بھی ایسی بے شمار تصویریں جمع ہیں‘ ان میں ایک ایسی تصویر بھی موجود ہے جو مجھے روزانہ یاد آتی ہے اور میں بڑی دیر تک اس تصویر کی سنگینی میں الجھا رہتا ہوں۔ یہ 2007 کا سال تھا‘ صدر پرویز مشرف کا تکبر ملک کی ہر گلی‘ ہر سڑک اور ہر چوک میں چیختا چلاتا دکھائی دیتا تھا‘ اس دور میں نواب اکبر بگٹی‘ سپریم کورٹ اور لال مسجد سمیت جو بھی جنرل پرویز مشرف کی انا کے راستے میں آیا جنرل صاحب نے اسے اپنی طاقت کی ایڑی تلے کچل دیا۔ جنرل صاحب اس وقت نعشوں کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر مکے لہراتے تھے اور بلوچوں کو دھمکی دیتے تھے ”یہ 1971ء نہیں کہ تم ادھر مار کر ادھر پہاڑ پر چڑھ جاؤ گے‘ یہ 2007ء ہے‘ تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کدھر سے میزائل آیا اور کدھر نکل گیا“۔ میں نے اس دور میں ایک بوڑھے شخص کو بازار روڈ کی مسجد میں گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے جنرل پرویز مشرف کیلئے درازی عمر کی دعا کرتے دیکھا‘ میں اس بوڑھے کی دعا سن کر حیران رہ گیا کیونکہ اس وقت پاکستان مسلم لیگ ق کے چند ”اولیائے کرام“ کے سوا کوئی شخص صدر پرویز مشرف کے حق میں دعا نہیں کرتا تھا‘ میں نے اس بوڑھے سے پوچھا ”باباجی آپ کو معلوم ہے آپ کیا دعا کر رہے ہیں“ بوڑھے نے بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور دکھی آواز میں بولا ”میں ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کرتا ہوں یا باری تعالیٰ صدر پرویز مشرف کو اتنی زندگی ضرور عطا کر کہ ہم اس ملک میں اس کے خلاف مقدمہ قائم ہوتے‘ اسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے اور اس کا فیصلہ ہوتے دیکھ سکیں“۔

اس بوڑھے نمازی کے یہ الفاظ‘ اس کی بھیگی پلکیں اور مسجد کا وہ ماحول تصویر میں ڈھلا اور میرے ذہن کا حصہ بن گیا اور میں جب بھی پرویز مشرف کا نام پڑھتا ہوں‘ سنتا ہوں یا ان کی تصویر دیکھتا ہوں تو وہ تصویر میرے ذہن کے بلیک باکس سے نکل کر میرے شعور کے صحن میں آ گرتی ہے اور میں سوچتا ہوں کیا اس ملک میں کبھی صدر (سابق) پرویز مشرف کا احتساب ہو گا؟ لیکن احتساب کے مطالبے سے پہلے آپ اپنے ذہن کو ٹٹول کر سوچئے پرویز مشرف کے جرائم کیا تھے؟ آپ کارگل کا ایشو لے لیجئے‘ اس کا

ذمہ دار کون تھا؟ 1999ء میں جمہوری حکومت پر شب خون کو لے لیجئے' اس کا ذمہ دار کون تھا؟ صدر رفیق تارڑ کی کرسی پر قبضے کو لے لیجئے' پاکستان مسلم لیگ ق کے قیام کو لے لیجئے' رچرڈ آرمیٹج کی ایک ٹیلی فون کال پر اپنی داخلی اور خارجی پالیسی کے یوٹرن کو لے لیجئے اور افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کو لے لیجئے' ان کا ذمہ دار کون تھا؟ آپ کو ہر سیاسی غلطی کے پیچھے جنرل پرویز مشرف دکھائی دیں گے۔ صدر پرویز مشرف کے جرائم صرف یہیں تک محدود نہیں ہیں بلکہ پاکستان کے ہوائی اڈے امریکا کے حوالے کرنا ہوں' ڈاکٹر عبدالقدیر کی گرفتاری ہو' نواب اکبر بگٹی کا قتل ہو' اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے ریفرنڈم ہو' ایل ایف او ہو' سترہویں ترمیم ہو' طالبان کے خلاف آپریشن ہو' پاکستان کے قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشن ہو' پاکستان میں عریانی اور فحاشی کا سیلاب ہو' میراتھن ریس' بسنت اور فیشن شوز ہوں' پاکستان کے شہریوں کو گھروں سے اٹھا کر امریکا کے حوالے کرنے کا ایشو ہو' چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی معزولی ہو' لال مسجد اور مدرسہ حفصہ پر فوج کشی ہو' این آر او ہو' 12 مئی کو کراچی میں شہریوں کا قتل عام ہو' 3 نومبر کی ایمرجنسی ہو' عدلیہ کے 92 ججوں کی معزولی ہو' محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت ہو' 18 فروری کے الیکشنوں میں دھاندلی ہو یا پھر شوکت عزیز کی کرپشن ہو' پاکستان کے پچھلے آٹھ برس کے تمام بڑے سیاسی جرائم کے پیچھے سابق صدر جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ملک میں جنرل پرویز مشرف کی ہوس اقتدار کے باعث نہ صرف فوج کا امیج خراب ہوا بلکہ سول سوسائٹی بھی بری طرح دہشت گردی کا شکار ہوئی۔ آج اگر فاٹا میں گولی چلتی ہے یا پاکستان کے کسی حصے میں خودکش حملہ ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری جنرل (ر) پرویز مشرف کے سر ہی عائد ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے اپنے 8 سالہ اقتدار میں پاکستانی معاشرے' پاکستانی آئین اور پاکستانی نظام میں اتنے کانٹے بو دیئے ہیں کہ انہیں چننے کیلئے اب کئی نسلیں چاہئیں۔ یہ سابق صدر پرویز مشرف ہی ہیں جن کی وجہ سے آج جمہوریت کی گاڑی کے ٹائر پنکچر ہو چکے ہیں اور سیاسی جماعتیں مل کر چلنے کی خواہش کے باوجود آگے نہیں بڑھ پا رہیں۔ یہ جنرل پرویز مشرف ہی ہیں جن کی وجہ سے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا ڈھول ہمارے گلے میں لٹک رہا ہے اور پوری قوم اسے بجانے پر مجبور ہے اور یہ پرویز مشرف ہی ہیں جن کی وجہ سے آج پاکستان امریکہ کی ریاست بن چکا ہے اور یورپ کے سفیر پاکستان میں وائسرائے کی طرح حکم چلاتے ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے لیکن اس سے کہیں بڑا المیہ صدر (سابق) جنرل (ر) پرویز مشرف کا اطمینان ہے' وہ ملک کو برباد کرنے اور آئین کو پاؤں تلے کچلنے کے باوجود' وہ اتنی بڑی بڑی سیاسی غلطیوں' زیادتیوں اور مظالم کے باوجود آج بھی پاکستان میں اطمینان سے گھوم رہے ہیں' یہ کیوبا کے سگار پی رہے ہیں' اسلام آباد کلب

میں تاش کھیل رہے ہیں' گالف سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور ڈانس پارٹیوں کو انجوائے کر رہے ہیں۔ میں جب صدر پرویز مشرف کو انجوائے کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے اس بوڑھے نمازی کی دعا یاد آ جاتی ہے اور میں سوچتا ہوں کیا اب بھی ان تمام سیاسی غلطیوں' آئین کا حلیہ بگاڑنے' عوام کے مینڈیٹ کی توہین کرنے اور جامعہ حفصہ اور گھروں سے غائب ساڑھے چھ سو لوگوں کے خاندانوں کی آہ و بکا کی شنوائی کا وقت نہیں آیا' کیا اب بھی سابق صدر پرویز مشرف کا احتساب نہیں ہونا چاہئے؟ ہم ایک ایسے بدقسمت ملک کے باسی ہیں جس میں بڑے لوگوں کے سات قتل تک معاف ہو جاتے ہیں جبکہ پینے کیلئے ایک گلاس پانی بھرنے اور تنور سے ایک روٹی اٹھانے والوں پر پوری تعزیرات پاکستان نافذ کر دی جاتی ہے لہٰذا ہمیں 16 مارچ 2009ء تک انصاف کا ہر آئینہ دھندلا اور تبدیلی کا ہر خواب شکستہ دکھائی دیتا تھا لیکن آج پاکستان کی عدلیہ نہ صرف آزاد ہو چکی ہے بلکہ اس ملک کے 17 کروڑ لوگ اس عدلیہ کی حفاظت کیلئے کندھے سے کندھا جوڑے کھڑے ہیں چنانچہ اگر اس آزاد عدلیہ کے ہوتے ہوئے جنرل پرویز مشرف جنرل ایوب خان' جنرل یحییٰ خان اور جنرل ضیاء الحق کی طرح 21 توپوں کی سلامی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے' کیا انہیں بھی پاکستانی پرچم میں لپیٹ کر دفن کیا گیا یا یہ بھی ہوانا کے سگار پی کر' فرانسیسی وائن کے پیگ چڑھا کر اور غیر ملکی چینلوں کو اپنے کارنامے سنا سنا کر باقی زندگی گزارتے رہے اور حکومت مدرسہ حفصہ کی معصوم بچیوں کے والدین کی "ٹیکس منی" سے انہیں سیکورٹی فراہم کرتی رہی تو انصاف اور احتساب کے خواب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے عوام کی پلکوں پر ٹوٹ جائیں گے۔ میرے ذہن کے بلیک باکس میں پڑی وہ تصویر روزانہ باہر جھانکتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے کیا ابھی تک میری دعا کی قبولیت کا وقت نہیں آیا' میں روزانہ اس تصویر کا سوال سنتا ہوں اور میرے اندر سے' دور گہرائی سے آواز آتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ نیا پاکستان ہے اور اس نئے پاکستان سے سابق صدر جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف عنقریب فرار ہو جائیں گے یا پھر انہیں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا کیونکہ وقت کا پہیہ اب آگے چل پڑا ہے۔ یہ صدر ایوب خان کا 1968ء' جنرل یحییٰ خان کا 1971ء اور جنرل ضیاء الحق کا 1987ء نہیں۔ یہ پاکستانی عوام کا 2009ء ہے' یہ افتخار محمد چودھری کی عدلیہ ہے لہٰذا یہ عدلیہ اور یہ سال پاکستان کی 62 سالہ تاریخ کا قرض اتارے گا اور جنرل پرویز مشرف اس قرض کے پہلے شکار ہوں گے۔ یہ تقدیر کا فیصلہ ہے اور تقدیر کے فیصلے کو ٹالنے کیلئے ابھی تک کائنات میں کوئی ایل ایف او اور کوئی این آر او ایجاد نہیں ہوا' اس کیلئے عدالت کا ایک ہرکارہ اور جج کا ایک ہتھوڑا کافی ہوتا ہے اور اب ہرکارے کی اس صدا اور ہتھوڑے کی اس ٹھک ٹھک کا وقت آ پہنچا ہے۔ میں ذہن کے بلیک باکس سے جھانکتی اس تصویر کو روزانہ یہ دلاسہ دیتا ہوں۔

ادھار کی چند سانسیں

یہ 27 جولائی کا دن اور کوئٹہ کا شہر تھا' صوبائی دارالحکومت کے فائیو سٹار ہوٹل سرینا میں چائلڈ لیبر پر میڈیا ورکشاپ ہو رہی تھی اور اس ورکشاپ میں محترمہ صبا محسن' وزیر اعلیٰ بلوچستان کے میڈیا ایڈوائزر عبدالرازق بگٹی اور میں مدعو تھے' ورکشاپ میں چائے کا وقفہ آیا تو بگٹی صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک کونے میں لے گئے' عبدالرازق بگٹی کے ساتھ یہ میری پہلی اور آخری بالمشافہ ملاقات تھی' وہ مجھے کوئٹہ سے اکثر ٹیلی فون کرتے رہتے تھے اور میں ان کے لب و لہجے' اردو ادب سے خصوصی شغف اور عاجزی انکساری کا دل سے معترف تھا' وہ مجھے صدر پرویز مشرف اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے مابین دوبئی میں ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتانے لگے' اس وقت تک یہ خبر ''اوپن'' نہیں ہوئی تھی اور میرے لئے انکشاف کی حیثیت رکھتی تھی' میں نے ان سے خبر کا ذریعہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا ''میرا ایک دوست دوبئی کے شاہی محل میں کام کرتا ہے' اس نے مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دی ہے'' اس کے بعد ہم دونوں نئی سیاسی صورتحال پر گفتگو کرنے لگے' بگٹی صاحب کا فرمانا تھا یہ ملاقات صدر پرویز مشرف اور بے نظیر بھٹو دونوں کیلئے نقصان دہ ہوگی جبکہ میرا خیال مختلف تھا' میں نے ان سے عرض کیا ''یہ دونوں ایک دوسرے کو بے وقوف بنانے کی آخری کوشش کر رہے ہیں' صدر پرویز مشرف داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر کمزور ہو چکے ہیں' پورا ملک خودکش حملوں سے لرز رہا ہے' عالمی اخبارات میں تواتر سے خبریں شائع ہو رہی ہیں' فوج اس صورتحال سے خوش نہیں اور کور کمانڈرز کے اجلاس میں بھی اب صدر پرویز مشرف کو واپسی کے مشورے دیئے جا رہے ہیں' اتحادیوں کی طرف سے فاٹا اور جنوبی وزیرستان پر جنگی پیمانے پر حملوں کیلئے دباؤ آ رہا ہے' امریکہ پاکستان کو دھمکی دے چکا ہے اگر تم نے حملہ نہ کیا تو ہم کر دیں گے اور 20 جولائی کو عدلیہ آزاد ہو چکی ہے لہٰذا صدر پرویز مشرف بری طرح تنہا ہو گئے ہیں اور ان کے لئے اگلے پانچ برس کیلئے یونیفارم میں صدر رہنا مشکل ہوتا جا رہا ہے چنانچہ انہیں نواز شریف یا بے نظیر بھٹو میں سے کسی ایک بڑے سیاسی سہارے کی ضرورت ہے' نواز شریف صدر پرویز مشرف کے ساتھ سمجھوتے کیلئے تیار نہیں ہیں لہٰذا صدر مشرف کے پاس صرف بے نظیر بھٹو بچتی ہیں' بے نظیر بھٹو 2004ء سے اس صورتحال کی توقع

کر رہی تھیں' وہ جانتی تھیں امریکہ کو پاکستان میں روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا سلسلہ جاری رکھنے کیلئے کسی سیاسی طاقت کی ضرورت پڑے گی چنانچہ انہوں نے پچھلے چار برسوں میں تین کام کئے''

بگٹی صاحب میری بات دلچسپی سے سنتے رہے' میں نے عرض کیا ''بے نظیر بھٹو نے آصف علی زرداری کو امریکہ بھجوا دیا جہاں وہ امریکی سینیٹروں' کانگریس مین اور حکومت پر اثر انداز ہونے والی شخصیات کے ساتھ لابنگ کر رہے ہیں' دوسرا بے نظیر بھٹو نے پاکستان کے اسلام پسند طبقوں اور جہادی طاقتوں کے خلاف بیانات دینا شروع کر دیئے' انہوں نے لال مسجد کے آپریشن تک کو درست قرار دے دیا اور تین انہوں نے صدر پرویز مشرف کے ساتھ خفیہ مذاکرات شروع کر دیئے'' بگٹی صاحب مسکرائے اور چمکیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بولے ''لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کو بے وقوف کیسے بنا رہے ہیں'' میں نے عرض کیا ''جنرل پرویز مشرف کو ستمبر یا اکتوبر میں دوسری بار صدر منتخب ہونے کیلئے مولانا فضل الرحمٰن اور بے نظیر بھٹو کی ضرورت ہے' اگر مولانا فضل الرحمٰن صوبہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتیں توڑ دیتے ہیں اور بے نظیر بھٹو نواز شریف کے ساتھ مل کر اسمبلیوں سے استعفے دے دیتی ہیں تو جنرل پرویز مشرف کو اقتدار بچانے کیلئے مارشل لاء لگانا پڑے گا جس کیلئے شاید فوج تیار نہ ہو' صدر مشرف مولانا فضل الرحمٰن کو ''قابو'' کر چکے ہیں جبکہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ آج ڈیل فائنل ہو جائے گی' یوں جنرل پرویز مشرف اسمبلیوں سے اعتماد کا ووٹ لے لیں گے'' بگٹی صاحب نے مسکرا کر پوچھا ''لیکن بے وقوف بنانے والی بات درمیان میں رہ گئی'' میں نے عرض کیا ''وردی وہ کارڈ ہے جس پر دونوں لیڈر گیم کر رہے ہیں' صدر مشرف چاہتے ہیں وہ یونیفارم کے ساتھ صدر منتخب ہوں' یونیفارم میں رہ کر عام انتخابات کرائیں' نئی حکومت بنے اور وہ اس کے بعد یونیفارم اتار دیں لیکن بے نظیر بھٹو سمجھتی ہیں جنرل پرویز مشرف صدر منتخب ہونے کے بعد یونیفارم اتارنے سے بھی انکار کر دینگے اور حکومت انہیں الیکشن میں زیادہ سیٹیں بھی نہیں لینے دے گی یوں وہ مار کھا جائینگی چنانچہ وہ چاہتی ہیں صدر سب سے پہلے یونیفارم اتاریں اور اسکے بعد اسمبلیوں سے اعتماد کا ووٹ لیں'' بگٹی صاحب نے فرمایا ''اس سارے کھیل میں بے نظیر بھٹو کو کیا ملے گا'' میں نے عرض کیا ''انکی سوئس کیسز سے جان چھوٹ جائے گی' آئین میں انکے تیسری بار وزیراعظم منتخب ہونے کی گنجائش نکل آئیگی اور ان کیلئے واپسی کا دروازہ کھل جائیگا اور بے نظیر بھٹو اس ڈیل کے ذریعے وقت بھی حاصل کر رہی ہیں' ان کا خیال ہے اگست میں نئی صورتحال پیدا ہو جائے گی اور 1988ء کیطرح یہ اگست بھی ان کیلئے خوش نصیبی لے کر آئے گا'' بگٹی صاحب نے آخری سوال پوچھا ''کیا دونوں کے منصوبے پورے ہو جائینگے'' میں نے عرض کیا ''یہ فیصلہ اگست کا مہینہ کریگا'

یہ مہینہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بڑا اہم ثابت ہوگا“

ہم اس کے بعد ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف ہو گئے‘ عبدالرزاق بگٹی صاحب نے ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں جانا تھا‘ ان کی خواہش تھی میں ان کے ساتھ چلوں اور ہم ٹیلی ویژن پروگرام کے بعد اکٹھے کھانا کھائیں لیکن میں نے عرض کیا ورکشاپ میں میری پریذنٹیشن ہے میں ابھی نہیں نکل سکتا‘ انہوں نے فرمایا ”آپ پھر میرے ساتھ رات کا کھانا کھائیں“ میں نے معذرت کرتے ہوئے جواب دیا‘ میں اپنے دوست اعجاز قادری کے ساتھ کھانے کا منصوبہ بنا چکا ہوں تاہم میں نے اگست میں دوبارہ کوئٹہ آنا ہے‘ میں اس وقت آپ کے ساتھ گاؤں چلوں گا‘ انہوں نے میرے ساتھ ہاتھ ملا کر فرمایا ”وعدہ“ میں نے ان کا ہاتھ دبا کر جواب دیا ”یہ ایک پنجابی کا بلوچ سے وعدہ ہے“ انہوں نے قہقہہ لگایا‘ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور رخصت ہو گئے‘ میں دوبارہ ورکشاپ میں مصروف ہو گیا‘ سہ پہر کو میں ہوٹل کے کمرے میں آیا اور میں نے ٹی وی آن کیا تو ٹیلی ویژن پر عبدالرزاق بگٹی کے قتل کی خبر چل رہی تھی‘ وہ ہماری ورکشاپ کے بعد ٹی وی سٹیشن گئے تھے‘ وہاں سے وہ باہر نکلے تھے تو راستے میں موٹر سائیکلوں پر سوار نامعلوم نوجوانوں نے ان کی گاڑی پر فائر کھول دیا‘ وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے‘ ٹیلی ویژن پر ان کی گاڑی اور ان کی خون میں ڈوبی ہوئی نعش بھی دکھائی جا رہی تھی‘ میں یہ خبر سن کر سکتے میں آ گیا اور میرے لئے یقین کرنا مشکل ہو گیا وہ شخص جو چند لمحے قبل میرے ساتھ گفتگو کر رہا تھا وہ اب دنیا میں موجود نہیں‘ میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف دیکھا‘ اس ہاتھ پر ابھی تک عبدالرزاق بگٹی کے ہاتھ کی گرم جوشی موجود تھی اور میں نے اپنے کان چھو کر دیکھے ان کانوں میں بھی ان کے لہجے اور خوبصورت اردو کے اثرات باقی تھے‘ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا وہ شخص جو دو گھنٹے میرے ساتھ بیٹھا رہا‘ جس نے میرے ساتھ گفتگو کا بھرپور سیشن کیا تھا اور میں نے جس کے ساتھ اگست میں دو تین دن اکٹھے گزارنے کا پروگرام بنایا تھا وہ شخص اب دنیا سے رخصت ہو چکا ہے‘ میں نے سوچا‘ کیا یہ ہے وہ زندگی جس کو ہم عمر بھر ڈیلوں‘ سمجھوتوں اور مذاکرات کا لہو پلاتے رہتے ہیں اور جس کو قائم رکھنے کیلئے ہم ہزار ہزار سازشیں کرتے ہیں لیکن جب یہ زندگی جدا ہونے پر آتی ہے تو یہ ہمیں آنکھ تک نہیں جھپکنے دیتی‘ یہ ہمیں ایک سانس تک ادھار نہیں دیتی‘ میں نے سوچا کیا صدر پرویز مشرف اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے پاس عبدالرزاق بگٹی سے مختلف جسم ہے اور کیا ان لوگوں نے کبھی نہیں مرنا‘ اگر ان لوگوں نے بھی بالآخر دنیا سے رخصت ہو جانا ہے تو پھر اس سارے تام جھام کا کیا فائدہ‘ اس سارے کھیل اور سمجھوتوں کی اس ساری منافقت کا کیا حاصل‘ مجھے ان سوالوں کا کوئی جواب نہ ملا تو میں نے لمبی سانس بھری اور آخر میں سوچا اگر میں اس وقت عبدالرزاق

بگٹی کی دعوت قبول کر لیتا اور ان کے ساتھ ٹی وی سٹیشن چلا جاتا تو اس وقت میں کہاں ہوتا!“ اس سوال پر پہنچ کر میرا دل ڈوب گیا‘ میں صوفے پر گر گیا اور مجھے محسوس ہوا جیسے گولیوں کی ایک باڑ میرے سر کے قریب سے گزر گئی ہے‘ مجھے محسوس ہوا قدرت نے مجھے چند سانسیں ادھار دے دی ہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

آٹے کی جنگ

میں ماس کمیونیکیشن کا طالب علم تھا تو کورس کی کسی کتاب میں تصویر کے بارے میں ایک چینی کہاوت پڑھی تھی' یہ کہاوت ماس کمیونیکیشن کے تمام طالب علموں کی طرح میرے ذہن سے بھی چپک کر رہ گئی' ماس کمیونیکیشن کے کورس میں دو ایسی تعریفیں ہیں جو اس شعبے کے کند ذہن سے کند ذہن طالب علم کو بھی یاد رہتی ہیں اور صحافت کے طالب علم خواہ پوری جرنلزم بھول جائیں لیکن وہ یہ دونوں تعریفیں قبر تک یاد رکھتے ہیں۔ پہلی تعریف خبر کے بارے میں ہے' کسی مشہور امریکی صحافی نے خبر کے بارے میں کہا تھا "اگر کتا انسان کو کاٹ لے تو یہ کوئی خبر نہیں لیکن اگر انسان کتے کو کاٹ لے تو یہ خبر ہوتی ہے" اور دوسری تعریف یہ چینی کہاوت ہے' چین کے قدیم باشندوں کا خیال تھا "ایک تصویر دس ہزار الفاظ کے برابر ہوتی ہے" یہ دونوں تعریفیں بیک وقت غیر سنجیدہ بھی ہیں اور انتہائی درجے کی سیریس بھی لیکن طالب علمی کا دور ایسا وقت ہوتا ہے جب سنجیدہ سے سنجیدہ چیز بھی مذاق لگتی ہے چنانچہ ہم لوگوں کو بھی یہ دونوں تعریفیں لطیفہ محسوس ہوتی تھیں لیکن جب میں عملی صحافت میں آیا تو معلوم ہوا یہ دونوں تعریفیں بنیادی طور پر میڈیا کی اصل فلاسفی ہیں اور خبر واقعی اس وقت تک خبر نہیں کہلاتی جب تک انسان کتے کو نہ کاٹ لے اور جہاں انسانی زبان گنگ اور لفظ بنجر ہو جاتے ہیں وہاں تصویریں بولتی ہیں اور جہاں الفاظ مصلحت کے ڈھیر میں گم ہو جائیں وہاں کیمرے کا لینز اور ٹی وی سکرین آواز بن جاتی ہے' وہاں تصویریں خبروں اور کالموں کی جگہ لے لیتی ہیں۔ میں نے اپنی عملی صحافت میں ایسی سینکڑوں تصویریں دیکھی ہیں جو دس دس کالموں اور پچاس پچاس سرخیوں پر بھاری تھیں اور جن میں ایسا خوفناک سچ چھپا تھا جسے بیان کرنے کیلئے کروڑوں الفاظ خرچ کر دیئے جاتے تو بھی شائد لکھنے یا بولنے والا اس سچ کے کسی ایک پہلو کا اظہار نہ کر پاتا۔ میں دل کی گہرائیوں سے سمجھتا ہوں صحافت بالخصوص آج کی صحافت تصویروں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی' اخبار کے سارے الفاظ اور حرف ایک طرف اور تصویر ایک طرف' اسی طرح نیوز چینلز آنے کے بعد ہمیں ماننا پڑے گا خبر وہی ہوتی ہے جو ٹیلی ویژن سکرین سے ہوتی ہوئی اخبار کے صفحے تک پہنچے یا اخبار کے صفحات سے ہو کر ٹیلی ویژن چینلز کا حصہ بنے۔

میں رو میں بہہ کر صحافت کے فلسفے کی طرف چلا گیا' میں آپ کو دراصل ایک تصویر کے بارے

میں بتانا چاہتا تھا' میں نے چند دن قبل اخبارات میں ایک تصویر دیکھی' اس تصویر میں درمیانی عمر کی ایک خاتون تھی' خاتون کے سر سے خون ٹپک رہا تھا' یہ خون بالوں سے بہتا ہوا ٹھوڑی تک پہنچ گیا تھا' خاتون کو چند خواتین نے سہارا دے رکھا تھا جبکہ ان کے پیچھے سینکڑوں خواتین جمع تھیں اور ان سے ذرا سے فاصلے پر ایک ٹرک کھڑا تھا' میں نے تصویر کا کیپشن پڑھا' کیپشن میں لکھا تھا "کوئٹہ کے ایک سیاستدان نے اپنے علاقے کے لوگوں میں تقسیم کرنے کیلئے آٹے کا ٹرک منگوایا' آٹا دیکھ کر وہاں سینکڑوں خواتین جمع ہو گئیں' خواتین نے ٹرک پر دھاوا بول دیا جس پر مجبوراً پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا اور یہ روزہ دار خاتون اس لاٹھی چارج کا شکار بن گئی" یہ کیپشن اور تصویر ایسے ملک سے تعلق رکھتی تھی جو دنیا کے 30 بڑے زرعی ممالک میں شمار ہوتا ہے' جس میں دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام ہے اور جسے قدرت نے چاروں موسم اور ہر قسم کی زمین عنایت کی۔ دنیا میں صرف ایسے دس ملک ہیں جن میں سمندر سے لے کر صحرا' صحرا سے لے کر میدان' میدانوں سے لے کر بارانی زمین' نہری زمین اور دریاؤں کے ڈیلٹاؤں پر قائم کھلیان موجود ہیں۔ جن میں دنیا کی بلند ترین چوٹیاں اور پچاس پچاس کلو میٹر لمبے گلیشئر ہیں اور جن میں بیک وقت 55 ڈگری سینٹی گریڈ کی گرمی اور منفی پچاس درجے کی سردی پڑتی ہے لیکن اس ملک میں آج عوام کو آٹا نہیں مل رہا' اس ملک میں لوگ آٹے کیلئے قطاریں بنا کر کھڑے ہیں' آٹے کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان ہو رہے ہیں' ڈنڈے کھاتے ہیں اور زخم لے کر گھر جاتے ہیں۔ آپ ہماری بدنصیبی دیکھئے آج سندھ میں آٹے کا تھیلا چھ سو روپے میں بک رہا ہے۔ صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں یہ نو سو روپے میں ملتا ہے جبکہ بلوچستان میں دکاندار لوگوں کو منہ مانگی قیمت پر آٹا بیچ رہے ہیں۔ یہ وہ پاکستان ہے جو تقسیم سے قبل پورے ہندوستان کو اناج فراہم کرتا تھا' ہمیں شرم سے ڈوب مرنا چاہئے۔

ہمیں قلت اور ذلت کے اس دور میں بہرحال پنجاب کی تعریف کرنا پڑے گی پنجاب میں عوام کو تین سو روپے میں آٹا اور تنوروں پر دو سے تین روپے میں روٹی مل رہی ہے۔ پنجاب حکومت دعویٰ کر رہی ہے پنجاب کے تمام شہروں' قصبوں اور دیہات میں آٹا تین سو روپے تھیلا سپلائی کیا جا رہا ہے جبکہ تنوروں کو پابند کیا گیا ہے وہ عوام کو دو روپے میں روٹی فراہم کریں' وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے آٹے کے معیار کی جانچ پڑتال کیلئے تین لیبارٹریاں بھی بنا دی ہیں اور صوبے بھر کی سرکاری مشینری کو آٹے کی فراہمی کو یقینی بنانے کی خصوصی ہدایات بھی دے دی ہیں اور وزیر اعلیٰ کو جس علاقے سے کوئی شکایت موصول ہوتی ہے وہ اسی وقت اس ضلع کے ڈی سی او کو تبدیل کر دیتے ہیں' وزیر اعلیٰ کا دعویٰ ہے یہ بندوبست رمضان کے بعد بھی جاری رہے گا اور وہ پنجاب میں گندم' آٹے اور روٹی کا بحران پیدا نہیں ہونے دیں گے لیکن میں ان کے اس دعوے سے اتفاق نہیں کرتا کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں گندم اور آٹے کے

درجنوں بیوپاری پنجاب کی سیاست میں ملوث ہو چکے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جو گندم اور آٹے کی قلت پیدا کر کے اربوں روپے کماتے تھے اور اپنے منافع کا ایک مخصوص حصہ سیاستدانوں اور حکمرانوں کی "نذر" کرتے تھے چنانچہ وفاق میں میر ظفر اللہ جمالی کی حکومت ہو یا شوکت عزیز کی اور جنرل خالد مقبول پنجاب حکومت کے سربراہ ہوں یا چودھری پرویز الٰہی۔ آٹے کے یہ بیوپاری وزیر اعظم ہاؤس' وزیر اعلیٰ ہاؤس اور گورنر ہاؤس کے روزانہ کے "وزیٹر" ہوتے تھے اور یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے 2007ء میں شوکت عزیز اور چودھری پرویز الٰہی کے ساتھ مل کر "فالتو" گندم دو سو ڈالر ٹن کے حساب سے عالمی مارکیٹ میں بیچ دی تھی اور جب ملک میں آٹے کا بحران پیدا ہوا تھا تو ان لوگوں نے پانچ سو ڈالر فی ٹن میں گندم خرید کر پاکستان کو سپلائی کی تھی اور اس خرید و فروخت میں انہوں نے اربوں روپے بنائے تھے' یہ آٹا مافیا سیاستدانوں سے زیادہ مضبوط ہے چنانچہ میرا خیال ہے یہ لوگ میاں شہباز شریف کو زیادہ دیر اقتدار میں ٹکنے نہیں دیں گے' ان کی پوری کوشش ہو گی پنجاب میں جلد سے جلد حکومت ختم ہو اور میاں شہباز شریف کی جگہ پنجاب میں کوئی ایسا وزیر اعلیٰ آ جائے جو صوبے میں گندم' آٹے اور روٹی کی قیمت کو عالمی مارکیٹ کے برابر کر دے تاکہ لاہور کے بشیرے اور نیویارک کے بش ایک ہی قیمت میں روٹی خرید سکیں۔ مجھے خطرہ ہے یہ لوگ اگر اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو یہ چند ہی دنوں میں اربوں روپے کما لیں گے جبکہ عوام آٹے کی قطار میں لگ کر پولیس کے ڈنڈے کھائیں گے اور پیٹ پر پتھر باندھ کر سوئیں گے۔

ہمارے سارے سینئر تجزیہ نگار اور سیاستدان پنجاب کی حالیہ کشمکش کو اقتدار یا سیاست کی لڑائی قرار دے رہے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں یہ آٹے کی جنگ ہے اور یہ جنگ پاکستان مسلم لیگ ن اور پاکستان پیپلز پارٹی نہیں لڑ رہی بلکہ یہ جنگ آٹے کے بیوپاریوں اور میاں شہباز شریف کے درمیان ہے اور آپ دیکھ لیجئے گا جس روز میاں شہباز شریف اقتدار سے رخصت ہوں گے اس سے اگلے دن پنجاب سے آٹا غائب ہو جائے گا اور عوام قطاروں میں کھڑے ہو کر چھ چھ سو روپے میں آٹے کا تھیلا خریدیں گے اور تنوروں پر روٹی پانچ' چھ روپے میں فروخت ہو گی۔ یہ سیاست کی جنگ نہیں یہ آٹے اور منافع کی جنگ ہے' ایسی جنگوں میں عموماً منافع خور جیتتے اور عوام ہارتے ہیں چنانچہ پنجاب کے عوام بھی قطار میں کھڑے ہونے کیلئے کمر کس لیں۔ یہ چند دن کی بات ہے۔

⦸ ⦸ ⦸

کیوں

خدیجہ کے والد کی ڈیوٹی شام پانچ بجے ختم ہوتی تھی اور انہوں نے چھ بجے گھر پہنچ جانا تھا' آج خدیجہ کی زندگی کا ایک اہم دن تھا' آج دس سالہ خدیجہ کی سالگرہ تھی اور خدیجہ نے اپنی تمام سہیلیوں' کلاس فیلوز اور کزنز کو بلا رکھا تھا' خدیجہ کے والد نے ڈیوٹی پر جاتے ہوئے بیٹی کیلئے تحفہ خرید لیا تھا' انہوں نے تحفہ سرکاری گاڑی کی سیٹ کے نیچے رکھ دیا' ان کا خیال تھا جوں ہی ان کی ڈیوٹی ختم ہو گی' وہ گاڑی سے تحفہ نکالیں گے اور رکشہ پکڑ کر گھر چلے جائیں گے۔ انہوں نے اپنے ڈی ایس پی سے بھی اجازت لے لی تھی لیکن دس جنوری کو پانچ بھی بجے اور چھ بھی ہوئے مگر خدیجہ کے والد گھر نہ پہنچ سکے' خدیجہ نے اس دن مجھے فون کیا اور مجھ سے پوچھا "میری جیسی بچیاں کیا کریں" میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ خدیجہ نے بتایا "میرے والد لاہور پولیس میں ملازم تھے' وہ 10 جنوری کو ڈیوٹی پر گئے' جی پی او کے قریب خودکش حملہ ہوا اور میں انتظار کرتی رہ گئی مگر میرے ابو مجھے چھوڑ کر آسمانوں پر چلے گئے" خدیجہ چند لمحوں تک اپنے آنسو سمیٹتی رہی اور تھوڑی دیر رک کر بولی "میرے گھر کیک بھی ہے' غبارے بھی اور چھوٹی چھوٹی موم بتیاں بھی' اگر نہیں ہیں تو میرے ابو نہیں ہیں اور جن بچیوں کے ابو سالگرہ کے دن شہید ہو جاتے ہیں وہ بچیاں عمر بھر خوشیاں نہیں منا سکتیں"۔ میں نے معصوم سی خدیجہ سے پوچھا "بیٹا تم کس شخص کو اپنا مجرم سمجھتی ہو؟" خدیجہ نے فوراً جواب دیا "میں خودکش حملہ آور کو اپنا مجرم نہیں سمجھتی' پتہ نہیں اس بے چارے پر کیا ظلم ہوا تھا جس سے مجبور ہو کر اس نے یہ راستہ منتخب کیا' میرے مجرم وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے ملک میں ایسے حالات پیدا کئے' میں ان تمام سیاستدانوں کو بھی اپنا مجرم سمجھتی ہوں جو ان حالات میں بھی اپنے مفادات کیلئے لڑ رہے ہیں اور قیامت کے دن میرے ہاتھ ان تمام لوگوں کے گریبانوں پر پہنچیں گے"۔ خدیجہ کا فون بند ہوا تو میرے دل سے اس بچی کیلئے دعا نکلی اور میں نے سوچا "زندگی کے دکھ انسان کو کس طرح دس سال کی عمر میں میچور کر دیتے ہیں"۔

یہ خودکش دھماکے کون کر رہے ہیں' یہ لوگ اس سے کیا فائدہ لینا چاہتے ہیں اور وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے حالات کو اس موڑ تک پہنچا دیا' یہ بحث اب بعد از وقت ہو گی' انگریزی کا ایک محاورہ ہے'

ماضی وہ چیز ہے جسے قدرت بھی نہیں بدل سکتی اور یہ حقیقت ہے ہم نے ماضی میں بے شمار غلطیاں کی تھیں' آج ان تمام غلطیوں کی فصل پک چکی ہے اور ہم چاہیں یا نہ چاہیں لیکن اب ہمیں غلطیوں کی یہ فصل کاٹنا پڑے گی۔ ہمارے لئے اچھا ہوگا' ہم اپنی غلطیوں کا یہ بوجھ اپنے ہی کندھوں پر ڈھولیں ورنہ یہ بوجھ ہماری اگلی نسلوں کو اٹھانا پڑے گا اور انسان کیلئے اگلی نسل کی تکلیف ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ یہ بم دھماکے ہماری ماضی کی غلطیوں کا نتیجہ ہیں لیکن ہم جو غلطیاں آج کر رہے ہیں ان کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ پاکستان میں آج اس حقیقت پر کوئی شخص غور نہیں کر رہا' نیویارک ٹائمز نے گزشتہ جمعہ کو وائٹ ہاؤس میں ہونے والی ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ کا حوالہ دیا تھا' یہ میٹنگ صدر بش نے کی تھی اور اس میں نائب صدر ڈک چینی اور وزیر خارجہ کونڈ ولیزا رائس کے علاوہ امریکی سلامتی کے بے شمار وزیر اور مشیر شامل ہوئے تھے اور اس اجلاس میں امریکی حکومت نے ہمارے قبائلی علاقوں میں خفیہ آپریشن کے بارے میں غور و خوض کیا تھا' نیویارک ٹائمز کا دعویٰ تھا' امریکی حکومت پاکستانی علاقوں میں اپنی سپیشل فورسز اتارنے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے اور امریکی حکومت کا خیال ہے صدر پرویز مشرف اور نئے آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی امریکی فوج کو پاکستان میں داخل ہونے کی اجازت دے دیں گے۔ گزشتہ ہفتے امریکہ میں ڈیموکریٹ پارٹی کے چار صدارتی امیدوار ہیلری کلنٹن' اوباما' جان ایڈورڈ اور رچرڈسن کے درمیان ایک کھلا مباحثہ ہوا تھا اور اس مباحثے میں چاروں امیدواروں نے اعلان کیا تھا اگر امریکہ میں ہماری حکومت آئی تو ہم پاکستان کا جوہری پروگرام امریکہ اور برطانیہ کی نگرانی میں دے دیں گے' اوباما نے پاکستان پر سیدھے سادے حملے کا اعلان بھی کر دیا۔ یہ دونوں خبریں غلطیوں کی ایک نئی امریکی سیریز کی نشاندہی کر رہی ہیں اور اگر ہماری حکومت دباؤ میں آ کر امریکہ کی سپیشل فورسز کو قبائلی علاقوں میں اترنے کی اجازت دے دیتی ہے اور ہم اپنے نیوکلیئر پروگرام پر بھی سمجھوتہ کر لیتے ہیں تو ذرا تصور کیجئے ہمارے ملک کا نیا سیناریو کیا ہوگا؟ اور بدقسمتی سے ان دونوں غلطیوں کے امکانات موجود ہیں۔

ہمیں پاکستان کے مستقبل کا اندازا لگانے کیلئے امریکہ کی تازہ ترین پیش رفت کا جائزہ لینا پڑے گا۔ امریکہ نے اپنی فوج کا ایک بڑا حصہ مڈل ایسٹ اور سینٹرل ایشیا پر تعینات کر رکھا ہے' یہ فوج سینٹرل کمانڈ کہلاتی ہے اور یہ افغانستان اور پاکستان سمیت دنیا کے 27 ممالک کی ''انچارج'' ہے۔ مارچ 2007ء میں اس کے کمانڈر جنرل ابی زید ریٹائر ہوئے تو صدر جارج بش نے ایڈمرل ولیم فالن کو سینٹرل کمانڈ کا چیف بنا دیا' ایڈمرل ولیم فالن کا تعلق امریکی نیوی سے تھا اور امریکہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ نیوی کے کسی افسر کو کسی کمانڈ کا چیف بنایا گیا تھا۔ امریکی تجزیہ نگار اس کی چار وجوہات بیان کرتے ہیں'

ایڈمرل فالن فوج کے علاوہ ایک بہت اچھے سفارتکار بھی ہیں' وہ فوج کے بہت اچھے منصوبہ ساز بھی ہیں اور وہ ری پبلکن کے ساتھ ساتھ ڈیموکریٹس میں بھی بہت مقبول ہیں اور چوتھا امریکہ اب زمین کے علاوہ سمندری حدود پر بھی نظر رکھنا چاہتا ہے اور اس کیلئے اسے ایسے کمانڈر کی ضرورت تھی جو سمندری حدود کے تقاضے سمجھتا ہو' ایڈمرل ولیم فالن کی تعیناتی سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے صدر بش کی خواہش ہے ان کی پالیسیاں ڈیموکریٹس کے دور میں بھی پھلتی پھولتی رہیں لہٰذا وہ اب تمام اہم پوزیشنوں پر ایسے لوگوں کو تعینات کر رہے ہیں جو ولیم فالن کی طرح ری پبلکن اور ڈیموکریٹس دونوں میں مقبول ہیں۔ ایڈمرل ولیم فالن زمینی قبضے کے قائل ہیں' ان کا فلسفہ ہے جب تک شورش زدہ علاقے آپ کے قبضے میں نہیں آتے اس وقت تک حالات آپ کے قابو میں نہیں آتے۔ ولیم فالن کی طرح امریکہ کی سپیشل آپریشن فورسز کی کمانڈ بھی نیوی کے ایک دوسرے افسر ایڈمرل اریک اول سن کے پاس ہے اور ایڈمرل اریک اول سن بڑے تواتر سے پاکستان اور افغانستان کے دورے کر رہے ہیں۔ وہ اگست میں پاکستان آئے اور نومبر میں بھی اور دسمبر 2007ء میں بھی وہ افغانستان میں صدر حامد کرزئی سے ملے جس کے بعد حامد کرزئی نے پاکستان آ کر محترمہ بے نظیر بھٹو سے ملاقات کی تھی۔ ایڈمرل ولیم فالن بھی ایمرجنسی سے ایک دن پہلے پاکستان پہنچے تھے اور وہ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد تک پاکستان میں رہے تھے۔ ان دونوں اعلیٰ عہدیداروں کی پاکستان اور افغانستان کے دورے اور اعلیٰ حکام سے ملاقاتیں بہت اہم ہیں اور ان ملاقاتوں کے پیچھے خدشات کے بے شمار سانپ چھپے دکھائی دیتے ہیں۔ امریکی پریس بڑے عرصے سے نشاندہی کر رہا تھا صدر پرویز مشرف امریکہ کی جس حد تک مدد کر سکتے تھے انہوں نے کر دی اور امریکہ اب باقی کام سیاستدانوں سے لے گا اور محترمہ بے نظیر بھٹو اس ٹاسک کیلئے شاندار چوائس ہیں۔ امریکہ کے بعض اخبار نویسوں کا خیال تھا محترمہ بے نظیر بھٹو اقتدار میں آ کر امریکی فوج کو پاکستان میں آپریشن کرنے کی اجازت دے دیں گی۔ محترمہ نے بھی ایک آدھ بیان میں اس کا عندیہ دیا تھا لیکن پھر 27 دسمبر 2007ء کا واقعہ پیش آیا اور امریکہ کو اپنی پالیسی کا ازسر نو جائزہ لینا پڑا' جنوری کے پہلے ہفتے کی پیش رفت سے یوں محسوس ہوتا ہے شائد امریکہ اب پاکستان میں اپنی سپیشل فورسز اتارنے کیلئے زیادہ انتظار نہ کرے۔ امریکہ اس نئے بندوبست کیلئے پاکستانی حکومت سے اجازت طلب کرے گا' اگر صدر مشرف نے اجازت دے دی تو ان کا اقتدار جاری رہے گا بصورت دیگر پاکستان کا اقتدار ''منتقل'' ہو جائے گا اور یہ اجازت نئے بادشاہ کو دینا پڑے گی' ہم فرض کرتے ہیں پاکستان میں امریکہ کی سپیشل فورسز آ جاتی ہیں اور وہ ہمارے قبائلی علاقوں اور سوات میں آپریشن شروع کر دیتی ہیں تو کیا ہوگا؟ میں جب بھی اس

مرحلے پر آتا ہوں تو میری روح تک کانپ اٹھتی ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے اس کے بعد ان علاقوں کے نوجوان انتقام لینے کیلئے پاکستان کے مختلف علاقوں کا رخ کریں گے' ذرا سوچئے اگر ایسا ہوا تو اس ملک کا کیا بنے گا؟ ہمارا کون کون سا جی پی او نشانہ بنے گا؟ ہمارے کس کس چوک میں معصوم اور بے گناہ لوگوں کی نعشیں پڑی ہوں گی اور ہماری کس کس خدیجہ کا والد اس اندھے انتقام کا شکار ہو جائے گا؟ ہم فوری طور پر ان حالات کا اندازا نہیں لگا سکتے لیکن یہ طے ہے 2008ء سلامتی سے گزرتا نظر نہیں آتا۔ یہ سال جاتے جاتے خون کے بے شمار دریاؤں سے گزرے گا اور ملک کے بے شمار لوگ خون کے ان دریاؤں میں ڈوب جائیں گے۔

پاکستان جیسے ملکوں کی سب سے بڑی بدقسمتی حکمرانوں کی غلطیوں کا نتیجہ ہوتی ہے' غلطیاں حکمران کرتے ہیں لیکن ان غلطیوں کا نتیجہ ہمیشہ بے گناہ اور معصوم لوگ بھگتتے ہیں' مجھے یقین ہے جب صدر پرویز مشرف نے 2001ء میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا یا ہماری حکومت نے افغانوں اور طالبان کے ہیروز پکڑ کر امریکہ کے حوالے کرنا شروع کئے تھے تو اس وقت حکومت کے کسی عہدیدار نے خدیجہ کے والد سے مشورہ نہیں کیا ہوگا؟ حکومت کے کسی عہدیدار نے کراچی' راولپنڈی اور پشاور کے ان بے گناہ راہگیروں سے نہیں پوچھا ہوگا جو اس دن گھر سے نکلے اور دھماکے کی لپیٹ میں آ گئے اور خدیجہ جیسی بچیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تنہا چھوڑ گئے۔ یہ قسمت اور قدرت بھی عجیب چیز ہے اس کی رسی ہمیشہ گناہگاروں کیلئے دراز لیکن بے گناہوں کیلئے تنگ ہوتی ہے اور بش سے لے کر حامد کرزئی تک تمام ظالم عزت و آبرو اور امن سے زندگی گزارتے ہیں لیکن خدیجہ کے والد جیسے لوگ گاڑیوں کی سیٹوں تلے تحفے رکھ کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ بدقسمتوں کی فہرست کی سب سے بڑی بدقسمتی ہوتی ہے' کاش میں اپنے رب سے پوچھ سکوں یا اللہ تیری یہ دنیا کیسی ہے؟

⦸ ⦸ ⦸

''مجھے کیا فرق پڑتا ہے''

''اگر پاکستان دیوالیہ ہو جائے تو پھر کیا ہوگا؟'' وہ نیچے فرش پر بیٹھ گیا' اس نے آلتی پالتی ماری' کان سے گیلا' مسلا اور کچلا ہوا سگریٹ اتارا' اس پر پھونک ماری' اسے ہونٹوں میں دبایا' ماچس جلائی' شعلے کا سرا سگریٹ کے سرے سے ٹکرایا' آنکھیں بند کیں اور ایک لمبا' گہرا اور لطف سے بھرپور کش لگایا' اس کے نتھنوں سے بدبودار تمباکو کی دو لکیریں نکلیں اور پورے کمرے میں پھیل گئیں' مجھے سگریٹ اور تمباکو سے جتنی نفرت ہے اتنا ہی مجھے لوگوں کا سگریٹ پینے کا سٹائل اچھا لگتا ہے' میں جب نتھنوں' ہونٹوں کے سروں اور دانتوں کی لکیروں کے درمیان سے دھوئیں کی لکیریں نکلتی دیکھتا ہوں تو میں چند لمحوں کیلئے اس منظر میں کھو سا جاتا ہوں' وہ میری اس کمزوری سے واقف ہے چنانچہ وہ سگریٹ سلگانے سے پہلے کبھی مجھ سے اجازت نہیں لیتا' اس نے سگریٹ کا دوسرا کش لیا اور میری طرف دیکھنے لگا' میں نے فوراً جواب دیا ''اللہ دتے پاکستان کے حالات بہت خراب ہو جائیں گے'' اس نے چارلی چپلن کی طرح گال پچکائے' سر ہلایا اور اس کے بعد بولا ''مثلاً کیا ہوگا؟'' میں نے چند لمحے سوچا اور جواب دیا ''ڈالر مزید مہنگا ہو جائے گا'' اس نے فوراً میری بات کاٹی ''ہو جائے مجھے کیا فرق پڑتا ہے' جب ڈالر 60 روپے کا تھا تو میرے پاس کون سے ڈالروں کے بکسے پڑے تھے'' میں نے اطمینان سے اس کی بات سنی اور اس کے بعد کہا ''ہم عالمی منڈی سے پٹرول نہیں خرید سکیں گے'' وہ فوراً بولا ''نہ خرید سکیں' مجھے کیا فرق پڑتا ہے' میں نے تو اپنی موٹر سائیکل پانچ سال پہلے بیچ دی تھی' میں اب سائیکل پر گھر سے یہاں آتا ہوں اور سائیکل پر واپس چلا جاتا ہوں' میری بلا سے پاکستان کو پٹرول ملے' نہ ملے'' میں نے اطمینان سے اس کی بات سنی اور اس کے بعد کہا ''پٹرول نہیں ہوگا تو ہمارے سارے ہوائی جہاز رک جائیں گے' ٹرینیں' بسیں اور کاریں بند ہو جائیں گی' ہمارے تھرمل پاور پلانٹس بند ہو جائیں گے' ہمارے سارے کارخانے فیکٹریاں اور ملیں بند ہو جائیں گی' ہمارے سارے دفتر بند ہو جائیں گے اور ہمارے سارے پلازے اور شاپنگ سنٹر بند ہو جائیں گے'' اس نے بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا اور بولا ''بند ہو جائیں مجھے کیا فرق پڑتا ہے' میں کون سا جہازوں پر سفر کرتا ہوں' میں دس سال سے ٹرین اور بس پر بھی نہیں بیٹھا اور میرے پاس کون سی کار ہے

جس کی میں فکر کروں گا' میرے گھر میں صرف دو بلب اور ایک پنکھا ہے' میں پچھلے پانچ سال سے بے روزگار ہوں' آپ کے باتھ روم اور فرش صاف کرتا ہوں اور میرے گھر کا خرچ چلتا ہے اور رہ گئی شاپنگ تو میری بیوی اور میرے بچوں نے کبھی شاپنگ نہیں کی چنانچہ مجھے کیا فرق پڑتا ہے''۔

میں نے اس کی یہ بات بھی اطمینان سے سنی اور اس کے بعد کہا ''ہماری دواؤں کی سپلائی بند ہو جائے گی' ہمارے ملک کے تمام ہارٹ پیشنٹ' کینسر کے تمام مریض' گردوں' پھیپھڑوں اور جگر کے اکثر مریض مر جائیں گے' ہم دیگوں کیلئے شیمپو' رنگ گورا کرنے والی کریمیں اور جلد نرم کرنے والے لوشن بھی نہیں منگوا سکیں گے' ہمیں ٹوتھ پیسٹ بھی نہیں مل سکیں گے اور ہم باہر سے بڑے فریج' بڑے اے سی اور بڑے مائیکرو ویو اوون بھی نہیں منگوا سکیں گے'' اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا' چند لمحے سوچا اور الجھے الجھے لہجے میں بولا ''مجھے کیا فرق پڑتا ہے' آج جب پاکستان دیوالیہ نہیں تو میرے پاس کون سی یہ ساری چیزیں موجود ہیں' میرے ابے کو خون کی الٹیاں ہوئیں' وہ گھر پر پڑا پڑا مر گیا' میں اسے گلی کے ڈاکٹر کے پاس تک نہ لے جا سکا' میری اماں کی ٹانگ ٹوٹ گئی میرے پاس ایکسرے کے پیسے نہیں تھے' وہ روتی روتی مر گئی' میری بیوی' میرے بچوں کو آج تک سر درد کی گولی نہیں ملی اور ہمارے گھر میں پانی کا کولر تک نہیں چنانچہ اگر پاکستان دیوالیہ ہو جائے تو مجھے کیا فرق پڑتا ہے'' میں نے اس کی یہ بات بھی اطمینان سے سنی اور اس کے بعد کہا ''ہم گندم نہیں خرید سکیں گے' ہمارے ملک میں بجلی اور گیس کی لوڈشیڈنگ ہو گی' ہمارے بینکوں میں روپے ختم ہو جائیں گے' ہمیں آلو' پیاز اور لہسن نہیں ملے گا' ہم چینی' گھی اور میدہ نہیں لے سکیں گے' ہمیں پیزا' کیک اور کافی نہیں ملے گی' ہم فرنچ آئس کریم نہیں کھا سکیں گے' ہم اطالوی سوٹ' جوتے اور ٹائیاں نہیں لے سکیں گے' ہم غیر ملکی خوشبو نہیں لگا سکیں گے اور اے جاہل انسان ہم شیو کیلئے ریزر اور جیل نہیں خرید سکیں گے'' اس نے قہقہہ لگایا' سگریٹ کا آخری کش لگایا اور بولا ''جناب عالی مجھے گندم یا آٹا پہلے کہاں مل رہا ہے' میں سو گھروں سے بھیک مانگ کر آٹے کے تھیلے کیلئے پیسے جمع کرتا ہوں' سارا دن قطار میں کھڑا ہوتا ہوں' آٹا لاتا ہوں اور ہم سب پانی میں بھگو کر آدھی آدھی روٹی کھاتے ہیں' ہم نے عرصہ ہوا آلو' پیاز اور لہسن کی شکل نہیں دیکھی' چینی' گھی اور میدہ کس بلا کا نام ہے ہم سرے سے نہیں جانتے' میرے محلے میں چار گھنٹے بجلی آتی ہے' پیزا' کیک اور کافی ہم نے زندگی بھر نہیں چکھی اور شیو کیسے کی جاتی ہے مجھے اس فن سے واقفیت ہی نہیں چنانچہ مجھے کیا فرق پڑتا ہے'' اس نے سگریٹ کا ٹوٹا فرش صاف کرنے والی ٹاکی میں دبا دیا اور شوخ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا' مجھے شدید غصہ آیا لیکن میں اس کی یہ بات بھی اطمینان سے برداشت کر گیا اور میں نے اس سے کہا ''پوری دنیا میں ہماری

جگ ہنسائی ہو گی' دنیا ہمارے سفیروں' وزیروں' وزیراعظم اور صدر کو حقارت سے دیکھے گی' ہمارے ملک کا جھنڈا بدنام ہو گا' ہماری تجارت رک جائے گی' دنیا کی کوئی کمپنی ہماری کمپنیوں کو سودا نہیں دے گی' ہمارے غیر ملکی اثاثے ضبط ہو جائیں گے' دنیا ہمیں بھکاری سمجھ کر ہم سے منہ پھیر لے گی اور اقوام عالم میں ہماری بے عزتی ہو گی'' اس نے ایک بلند و بانگ قہقہہ لگایا ''مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے' مجھے آج تک اس ملک میں عزت نہیں ملی' میں ہمیشہ آپ کے سامنے فرش پر بیٹھتا ہوں' آپ کے پورے دفتر میں کوئی شخص میرے ساتھ ہاتھ نہیں ملاتا' مجھ سے آج تک کسی سیاستدان نے ووٹ نہیں مانگا' میں اس ملک میں بھکاری ہوں' غیر ممالک چھوڑیں میرا اس ملک میں کوئی اثاثہ نہیں' اللہ کی اس زمین کا ایک انچ میرا نہیں اور مجھے پورا ملک حقارت سے دیکھتا ہے' آپ خود سوچئے جس شخص کو پوری زندگی عزت نہیں ملی وہ حکمرانوں کی عزت کیلئے کیوں پریشان ہو گا چنانچہ مجھے کیا فرق پڑتا ہے'' اس نے طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھا' اس کی نظروں میں حرارت تھی' یہ حرارت آنکھوں سے ہوتی ہوئی میرے پورے جسم میں پھیل گئی' میرا دل چاہا میں اس کو گریبان سے پکڑوں' اس کے منہ پر دو تھپڑ ماروں اور اسے دھکے دے کر دفتر سے باہر نکال دوں لیکن میں کیونکہ ایک مہذب اور پڑھا لکھا انسان ہوں چنانچہ میں اس کی یہ بات بھی اطمینان سے سہہ گیا۔

میں نے اس سے کہا ''امریکہ' یورپ' مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ کے سفارتخانے ہمیں ویزے نہیں دیں گے' غیر ملکی فلائٹس بند ہو جائیں گی' ہم میں سے کوئی شخص ملک سے باہر جا سکے گا اور نہ ہی کوئی ملک میں آ سکے گا' ہمارے بچے ٹوفل اور سیٹ کے امتحان بھی نہیں دے سکیں گے' ہمارے بچے سینئر کیمبرج میں بھی نہیں بیٹھ سکیں گے اور ہمارے طالب علم اعلیٰ تعلیم کیلئے آکسفورڈ' کیمبرج اور ہارورڈ یونیورسٹی میں داخلہ بھی نہیں لے سکیں گے' ہمارے بچے بار ایٹ لاء بھی نہیں کر سکیں گے' ہم پولیس' عدالتوں اور فوج کو تنخواہیں بھی نہیں دے سکیں گے' ہم ایوان صدر' وزیراعظم ہاؤس اور گورنر ہاؤسز کے اخراجات بھی برداشت نہیں کر سکیں گے' ہمارے صدر' وزیراعظم اور وزیروں کے غیر ملکی دورے بھی رک جائیں گے' ہم کابینہ اور پارلیمنٹ کے ارکان کی تنخواہوں اور مراعات کا بل بھی ادا نہیں کر سکیں گے' ہمارے سرکاری اداروں اور دفتروں کا کام بھی رک جائے گا اور ہماری بیوروکریسی کیلئے لوٹ کھسوٹ کے مواقع بھی ختم ہو جائیں گے'' میں نے خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھا' اس نے ایک طویل شیطانی قہقہہ لگایا اور بولا ''مجھے کیا فرق پڑتا ہے' میرے بچے کے نصیب میں تو ٹاٹ سکول تک نہیں' میں پاسپورٹ تک نہیں بنوا سکتا' میں تو آج تک گوجر خان تک نہیں گیا اور فوج' پولیس اور عدالت نے آج تک مجھے کون سا

انصاف دلایا ہے‘ کون سی پارلیمنٹ اور سرکاری دفتر میرا ہے‘ اس ملک کا کون سا صدر‘ وزیراعظم اور وزیر میرا ہے چنانچہ میری بلا سے یہ سارے لوگ بھوکے مرجائیں مجھے کیا فرق پڑتا ہے‘‘ وہ خاموش ہو گیا اور یہ میری برداشت کی حد تھی‘ میں کرسی سے اٹھا‘ میں نے اسے طویل گالی دی اور اسے دفع ہو جانے کا حکم دے دیا‘ اس نے قہقہہ لگایا‘ وہ فرش سے اٹھا‘ اس نے گندی ٹاکی جھاڑی اور مسکرا کر بولا ’’جناب میں اکیلا نہیں ہوں‘ اس ملک میں مجھ جیسے تیرہ چودہ کروڑ لوگ ہیں‘ یہ ملک خوشحال ہو یا دیوالیہ ہو جائے ہم تیرہ چودہ کروڑ لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا‘ اس ملک میں صدر پرویز مشرف کی حکومت ہو یا صدر آصف علی زرداری اس ملک کے سربراہ ہو جائیں‘ اس ملک کے وزیراعظم شوکت عزیز ہوں یا یوسف رضا گیلانی اور اس کے مشیر خزانہ سلمان شاہ ہوں یا شوکت ترین ہم تیرہ چودہ کروڑ لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا‘ یہ آپ جیسے لوگ ہیں جن کو اے سی‘ فریج اور کاریں چاہئیں‘ جنہیں پٹرول‘ بجلی اور گیس کی فکر ہے یا جو ڈالر کے اوپر نیچے ہونے سے پریشان ہوتے ہیں اور جن کے وزیروں کیلئے اس ملک کا خوشحال ہونا ضروری ہے‘ یہ آپ جیسے صرف ایک دو کروڑ لوگوں کا ملک ہے‘‘ اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

⦸ ⦸ ⦸

احتجاج کیسے کرنا چاہیے

ڈاکٹر محمد یونس چٹا گانگ یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر تھے‘ انہوں نے 1975ء میں ’’جوبرا‘‘ گاؤں کے 42 خاندانوں کو 856 ٹکے (27 ڈالر) قرض دیئے‘ ان خاندانوں نے بانس کے موڑھے‘ رومال‘ چپلیں اور چادریں بنائیں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے‘ یہ گرامین بینک کی ابتدا تھی‘ گرامین بینک دنیا کا پہلا معاشی ادارہ تھا جس نے غریب عورتوں کو چھوٹے قرضے دینے شروع کیے اور بنگالی عورتوں نے ان قرضوں سے کمال کر دیا لہٰذا آج بنگلہ دیش میں خوشحالی انگڑائی لے رہی ہے‘ گرامین بینک دسمبر 1976ء میں شروع ہوا تھا اور حکومت نے 1983ء میں اسے باقاعدہ بینک تسلیم کر لیا تھا جس کے بعد ڈاکٹر یونس نے اسے دیہات میں پھیلا دیا‘ اکتوبر 2006ء تک اس کی دو ہزار دو سو 26 شاخیں مکمل چکی تھیں اور یہ بنگلہ دیش کے 71 ہزار 3 سو 71 دیہات کو غربت سے آزاد کرا چکا تھا‘ ان تیس برسوں میں بنگلہ دیش کے 65 لاکھ خاندانوں نے گرامین سے قرض لیا اور ان قرضوں سے دو کروڑ 22 لاکھ افراد کی معاشی حالت تبدیل ہوئی‘ یہ بینک اب تک 45 ہزار بھکاریوں کو بھی باعزت زندگی دے چکا ہے جبکہ اس نے گرامین فون اور گرامین ٹیلی کام جیسے ادارے بھی بنائے جنہوں نے بنگلہ دیش کے دور دراز دیہات میں ایک لاکھ 39 ہزار خواتین کو پی سی او بنا کر دیئے اور یوں بنگالی گاؤں ابلاغی دنیا سے جڑ گئے‘ گرامین بینک کا سلسلہ اب 46 ملکوں تک پھیل چکا ہے اور دنیا کے دس کروڑ لوگ اس سے استفادہ کر چکے ہیں‘ ڈاکٹر یونس کو اس نئے ماڈل پر 13 اکتوبر 2006ء کو نوبل پرائز ملا تھا لیکن ڈاکٹر یونس‘ ان کا گرامین بینک اور نوبل پرائز ہمارا موضوع نہیں‘ ہمارا موضوع ذرا مختلف ہے۔

ڈاکٹر یونس نے 80ء کی دہائی میں اچانک محسوس کیا تھا صرف معاشی خوشحالی سب کچھ نہیں ہوتی‘ انسانوں کیلئے معیشت کے ساتھ ساتھ شعور اور لائف سٹائل بھی ضروری ہوتا ہے چنانچہ اس نے گرامین بینک سے قرضہ لینے والوں کیلئے 16 سماجی اصول وضع کیے اور جب تک کوئی شخص ان اصولوں پر عمل در آمد کی گارنٹی نہیں دیتا گرامین بینک اسے قرضہ نہیں دیتا‘ گرامین بینک کے ورکرز قرض دینے کے بعد لوگوں کے گھر جا کر دیکھتے ہیں کیا وہ لوگ ان سماجی اصولوں پر عمل کر رہے ہیں؟ اگر انہیں کسی خاندان

میں کمی محسوس ہو تو یہ لوگ انہیں شعور اور لائف سٹائل پر لیکچر دیتے ہیں اور ان لیکچرز کا سلسلہ اس خاندان میں تبدیلی تک جاری رہتا ہے' یہ اصول کچھ اس طرح ہیں' گرامین خاندان کے لوگ نظم و ضبط' اتحاد' حوصلہ اور محنت کبھی ترک نہیں کریں گے' ہم اپنے خاندان کو اچھی اور معیاری زندگی دیں گے' ہم اپنے گھروں کو پکا کریں گے' ہم اپنی سبزیاں خود اگائیں گے' ہم اپنا کنبہ چھوٹا رکھیں گے' ہم اپنے بچوں کو تعلیم دیں گے' ہم اپنے گھر اور بچوں کو صاف ستھرا رکھیں گے' ہم اپنے گھروں میں لیٹرین بنائیں گے' ہم پانی ابال کر استعمال کریں گے' ہم جہیز لیں گے اور نہ ہی دیں گے' ہم کسی کو نقصان پہنچائیں گے اور نہ ہی کسی سے نقصان اٹھائیں گے' ہم اپنی آمدنی سے بچت کریں گے اور اس بچت کی سرمایہ کاری کریں گے' ہم دوسروں کی مدد کریں گے' ہم فلاح عامہ کے کاموں کو وقت دیں گے اور ہم ہر صورت ووٹ ڈالیں گے' ڈاکٹر یونس کے ان سماجی اصولوں نے بنگلہ دیش کو تبدیلی کے ایک ایسے عمل کا حصہ بنا دیا جس نے لوگوں کا ماحول' عادات' حلیہ اور شعور بدل دیا لہٰذا آج بنگلہ دیش کے دو کروڑ 22 لاکھ لوگ نہ صرف صاف ستھری' صحت مند اور تعلیم یافتہ زندگی گزار رہے ہیں بلکہ ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں بھی ان کا زبردست حصہ ہے' یوں اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر محمد یونس کی سماجی تحریک ان کے معاشی نظریئے سے کہیں بڑی اور شاندار ثابت ہوئی' دنیا میں کسی بھی قوم کی معیشت کسی بھی وقت ٹھیک ہو سکتی ہے' آج پاکستان میں تیل نکل آئے' سونے کے پہاڑ دریافت ہو جائیں یا بارشوں میں پچاس فیصد اضافہ ہو جائے تو ہم دس برسوں میں دنیا کی امیر ترین اقوام میں شمار ہو جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کیا ہم اس دولت سے اچھی زندگی بھی گزار سکیں گے؟ نہیں ہرگز نہیں' کیونکہ اچھی اور معیاری زندگی کیلئے سماجی شعور کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ شعور طویل تربیتی عمل کا متقاضی ہے اور اس شعور کیلئے قوموں کو ڈاکٹر یونس جیسے لوگ درکار ہوتے ہیں' آپ اس سلسلے میں عربوں کی مثال لے سکتے ہیں' عربوں کو اللہ تعالیٰ نے 60ء کی دہائی میں تیل کی دولت سے نوازا تھا' چالیس برسوں میں تیل ختم ہو گیا لیکن عربوں کو زندگی گزارنے کا ڈھنگ نہ آیا' وہ آج بھی اونٹوں پر بچے باندھ کر ''کیمل ریس'' کراتے ہیں' صحرا میں مصنوعی برف باری سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور فرانس سے پانی درآمد کر کے پیتے ہیں' کیوں؟ کیونکہ انہیں کسی نے اچھی زندگی گزارنے کی ٹریننگ نہیں دی تھی چنانچہ دولت ان میں کوئی تبدیلی نہ لا سکی۔

پاکستان میں 3 نومبر 2007ء کو ایمرجنسی لگی آج 12 نومبر ہے' ان 9 دنوں میں مجھے پاکستان کا ہر شہری پریشان دکھائی دیا' ہمارے لوگ احتجاج کرنا چاہتے تھے' میڈیا کو حکومت نے کچل دیا تھا' تمام سڑکیں اور راستے بند تھے اور جج گھروں میں محبوس تھے لہٰذا عام شہری اس صورتحال میں پریشان

تھے' وہ حکومت تک اپنے جذبات پہنچانا چاہتے تھے لیکن انہیں طریقہ معلوم نہیں تھا جبکہ میرے جیسے نام نہاد دانشور اس کمزوری کو عوام کی بے حسی اور مایوسی قرار دے رہے تھے' ہم نے عوام پر یہ الزام لگاتے ہوئے ایک لمحے کیلئے نہیں سوچا' وہ کون شخص ہوگا جو سڑک پر آئے اور پولیس کے ہاتھوں ہڈیاں تڑوا کر گھر جا بیٹھے' کون اپنی دکان بند کرے' کون دفتر سے چھٹی کرے اور کون اپنے بچوں کو آنسو گیس میں دھکیل دے' انسان کی فطرت ہے وہ تشدد اور موت سے گھبراتا ہے چنانچہ یہ پاکستانیوں کی فطری کمزوری تھی جس نے انہیں باہر نہیں نکلنے دیا' یہ سماجی شعور کی کمی ہے جس کے باعث جب بھی پاکستان میں 9 مارچ یا 3 نومبر کے واقعات پیش آتے ہیں تو لوگ بے بسی سے اپنے ہی بازوؤں کو دانتوں سے کاٹنے لگتے ہیں' وہ ساری ساری رات جاگتے ہیں لیکن انہیں سمجھ نہیں آتی وہ اپنے جذبات کا اظہار کیسے کریں لہٰذا اگر گرامین بینک کی طرح ہماری تمام این جی اوز' تمام فلاحی ادارے اور تمام مذہبی اور سیاسی جماعتیں ان حالات میں سماجی شعور کو اپنے ایجنڈے کا حصہ بنا لیں تو ملک میں بڑی تبدیلی آ سکتی ہے' مثلاً آپ اخوت کو لیجئے' اخوت گرامین بینک کی طرح پاکستان کی ایک شاندار تحریک ہے' اسی طرح میں کئی بار کاروان علم فاؤنڈیشن کا ذکر کر چکا ہوں' لاہور میں ٹرسٹ سکول ہے' شیخ طاہر یوسف اس کے روح رواں ہیں' مجھے یقین ہے یہ تنظیم آنے والے دنوں میں دنیا میں پاکستان کی پہچان بن جائے گی' ایدھی فاؤنڈیشن ہے' ہمدرد کے مختلف پراجیکٹس ہیں' ڈاکٹر اختر حمید خان مرحوم کا اورنگی پائلٹ پراجیکٹ ہے اور لودھراں پائلٹ پراجیکٹ ہے' پاکستان میں ان کے علاوہ بھی سینکڑوں ہزاروں ادارے ہیں اگر یہ تمام ادارے مل کر ایک سماجی ایجنڈا اختیار کر لیں اور یہ ایجنڈا تمام تحریکوں اور تنظیموں میں شامل کر لیا جائے تو ہم پاکستان میں ایک سماجی انقلاب لا سکتے ہیں' میرا مشورہ ہے یہ تنظیمیں آج ہی سے اپنے ممبروں کو احتجاج کا طریقہ سکھانا شروع کر دیں' یہ انہیں بتائیں احتجاج رائے ہوتا ہے جنگ نہیں اور ہم نے احتجاج کے دوران کسی صورت اینٹ' ڈنڈا اور پتھر نہیں اٹھانا' ہم نے کسی کو گالی نہیں دینی' یہ تنظیمیں اپنے کارکنوں کو سمجھائیں وہ جب سڑکوں پر آئیں تو انہوں نے کوئی بتی نہیں توڑنی' کوئی ٹائر نہیں جلانا' کسی پولیس والے پر حملہ نہیں کرنا اور سڑکوں اور گلیوں میں گند نہیں ڈالنا' ہماری این جی اوز آج سے سماجی شعور کا سلسلہ شروع کر سکتی ہیں' یہ اپنے کارکنوں اور عام لوگوں کو سمجھائیں جب تک ایمرجنسی ختم نہیں ہوتی اس وقت تک پاکستان کے تمام شہری اپنے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھے رکھیں اور یہ لوگوں کو بتا سکتی ہیں پاکستان کے سارے عوام صبح دس بجے اپنے گھروں' دفتروں' سکولوں' کالجوں' یونیورسٹیوں اور دکانوں سے باہر آئیں اور پانچ منٹ تک اپنی اپنی دہلیز پر خاموش کھڑے رہیں' ذرا سوچئے جب 16 کروڑ لوگ اپنی اپنی دہلیز پر

کھڑے ہوں گے اور یہ روز کا معمول بن جائے گا تو اس احتجاج کا مقابلہ کون کرے گا؟ اسی طرح اگر این جی اوز مختلف محلوں' گلیوں اور سڑکوں کے نام پی سی او کے تحت حلف نہ لینے والے ججوں کے ناموں پر رکھ دیں' اگر یہ اپنے سکولوں' اداروں اور دکانوں کے نام ان لوگوں کے نام پر رکھ دیں جنہوں نے ہمارے ملک کیلئے قربانی دی تھی اور یہ فیصلہ کر لیں ان کے ممبر اپنے بچوں کے نام ناپسندیدہ لوگوں کے ناموں جیسے نہ رکھیں' اگر یہ لوگ ملک میں نام بدلنے کی تحریک شروع کر دیں' لوگ ہزاروں کی تعداد میں اپنے نام بدلیں اور اخبارات میں باقاعدہ اشتہار دیں تو اس سے کتنی بڑی تبدیلی آ جائے گی' لوگ اپنی چھتوں پر سیاہ پرچم بھی لہرا سکتے ہیں اور یہ ناپسندیدہ لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں فون اور ایس ایم ایس بھی کر سکتے ہیں' یقین کیجئے یہ وہ طریقے ہیں جن سے ہم وہ نتائج حاصل کر سکتے ہیں جو سینکڑوں جنگوں اور ہزاروں پتھراؤ سے نہیں مل سکتے لہٰذا اگر اس نازک لمحے میں ڈاکٹر یونس جیسے لوگ سامنے آ جائیں تو ہم عوامی جذبات کو صحیح شکل دے سکتے ہیں' ہم ملک اور ادارے بچا سکتے ہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

خانہ جنگی

"میں سب سے نمٹ لوں گا" وہ طیش میں بولا اور میں اور میرا دوست بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے' میں نے سمجھانے کیلئے منہ کھولا لیکن اس نے مجھے گھورا اور پھنکارتی آواز میں بولا "تم لوگ یہاں سے جاتے ہو یا میں تمہیں بجھواؤں" مجھے اس کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے تھے' اس کے کارندے اور ورکشاپ کے چھوٹے ہمارے گرد جمع تھے' میں نے اپنے دوست کا ہاتھ دبایا اور ہم چپ چاپ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے' میرا دوست غصے میں تھا' اسے اپنی توہین اور ذلت کا شدید احساس ہو رہا تھا' اس نے اسی احساس نفرت کے دوران ڈیش بورڈ سے ریوالور نکالا اور نیچے اترنے کیلئے دروازہ کھولنے لگا لیکن میں نے ریوالور چھین لیا اور گاڑی بھگا دی' میرا دوست غصے میں کھول رہا تھا' میں اسے پہاڑ پر لے گیا' ہم دونوں پہاڑی ریستوران کی ایک الگ تھلگ میز پر بیٹھ گئے اور میں اسے اسلام آباد کی خوبصورتی اور ہریالی دکھا دکھا کر نارمل کرنے لگا لیکن میرا دوست اپنی خفت' پریشانی اور غصے سے الجھتا رہا' وہ اسی طرح کھولتا رہا' یہ بہت معمولی بات تھی' ہم نے پنکچر لگانے کیلئے ایک ورکشاپ پر ٹائر دیا تھا' ہم ٹائر لینے گئے تو میرے دوست کا خیال تھا یہ اس کا ٹائر نہیں جبکہ دکاندار مصر تھا ہم اسے یہی ٹائر دے کر گئے تھے' میرے دوست نے اپنے دوسرے ٹائر دکھائے' ان ٹائروں اور اس ٹائر میں بڑا فرق تھا' گاڑی کے تینوں ٹائر نئے تھے جبکہ یہ ٹائر انتہائی بوسیدہ اور خستہ تھا لیکن دکاندار ہماری بات ماننے پر تیار نہیں تھا' بحث کے دوران بات بگڑ گئی' میں نے ورکشاپ کے مالک کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ بدتمیزی پر اتر آیا' میں نے اسے ایف آئی آر کٹوانے کی دھمکی لگائی تو وہ سینہ ٹھونک کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور چلا کر بولا "آپ پولیس چھوڑ فوج لے آئیں' میں سب سے نمٹ لوں گا" ہم نے اصرار کیا تو اس نے ورکشاپ کے چھوٹے جمع کر لئے اور تمام لوگ پیچ کس' راڈ اور ہتھوڑیاں لے کر ہمارے گرد جمع ہو گئے' میں ان کی دیدہ دلیری اور بے خوفی سے ڈر گیا اور اپنے دوست کو وہاں سے لے کر بھاگ گیا' ہم اپنا ٹائر بھی وہیں چھوڑ آئے' میرا دوست اس توہین کا انتقام لینا چاہتا تھا' اس کا خیال تھا اگر میں اسے نہ روکتا تو وہ کم از کم دو تین لوگوں کی ٹانگوں میں گولیاں ضرور مار دیتا' میں نے اسے سمجھایا "یار صرف تین چار ہزار روپے کے ٹائر

کیلئے انسان کو اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہیے" لیکن اس کا خیال تھا ورکشاپ کے مالک نے اس کا چار ہزار روپے کا نائر نہیں دبایا بلکہ اس نے اس کی عزت نفس اور حقوق پر ہاتھ ڈالا ہے۔

میرا دوست غصے میں مغلظات بکتا جا رہا تھا اور میں اس کے جذبات اور ورکشاپ کے مالک کے ردعمل کا تقابل کر رہا تھا اور مجھے دونوں شدت پسند' ضدی' ہٹ دھرم' غصیلے اور جاہل لگ رہے تھے' میں حیران تھا' میرا دوست فارن کوالی فائیڈ اور مہذب شخص تھا جبکہ ورکشاپ کے مالک کو ہندسے تک نہیں لکھنے آتے تھے لیکن دونوں کے ردعمل اور رویے میں کوئی فرق نہیں تھا' دونوں رول آف لاء' برداشت' حوصلے اور صبر کی نعمتوں سے محروم تھے اور دونوں اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کا فیصلہ "ایٹ دی سپاٹ" کرنا چاہتے تھے اور مر جانا اور مار دینا دونوں کی زندگی کا بنیادی فلسفہ تھا' میں نے سوچا تعلیم' تہذیب اور معاشرت کے اتنے بڑے فرق کے باوجود دونوں کی سوچ ایک جیسی کیسے ہو سکتی ہے اور دونوں کی نظر میں زندگی جیسی خوبصورت نعمت بدصورت اور بے معنی کیوں ہے اور دونوں وحشی اور اجڈ بن کر کیوں سوچ رہے ہیں اور میں نے سوچا' کیا اس ملک' اس معاشرے میں صرف یہی دو غیر متوازن اور بے عقل کردار ہیں یا پھر اس وقت پورا معاشرہ اسی طرح سوچ رہا ہے اور کیا پورے ملک نے خودکشی اور انتقام کا راستہ اختیار کر لیا ہے؟ مجھے افسوس سے تسلیم کرنا پڑتا ہے یہ معاملہ صرف ایک یا دو لوگوں تک محدود نہیں بلکہ یہ ضد' یہ ہٹ دھرمی اور کھلا انتقام ہمارا قومی مزاج بن چکا ہے اور ورکشاپ کا مستری ہو یا صدر اور وزیراعظم ہم سب لوگ غصے' نفرت اور مار دو' توڑ دو جیسی سوچ کا شکار ہو چکے ہیں' ہم من حیث القوم ایک ایسے نفسیاتی مرض کا شکار ہو چکے ہیں جس میں انسان جان لینے اور جان دینے کو اپنا مقصد حیات بنا لیتا ہے' میں پچھلے دنوں ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں وزیر مملکت رضا ہراج کو دیکھ رہا تھا' میزبان نے وزیر مملکت سے پوچھا "اگر الیکشن کمیشن نے جنرل پرویز مشرف کے کاغذات واپس کر دیئے تو آپ کیا کریں گے" وزیر مملکت نے بڑے جوش سے جواب دیا "ہم دوسرا راستہ اختیار کریں گے" میں نے چودھری شجاعت حسین کو بھی ایک ٹیلی ویژن چینل پر گفتگو کرتے دیکھا رپورٹر نے پوچھا "اگر سپریم کورٹ نے صدر صاحب کو دو عہدے رکھنے کی اجازت نہ دی تو!" چودھری صاحب نے اپنے جناتی لہجے میں جواب دیا "ہم کوئی اور طریقہ کریں گے" میں نے عمران خان کو ٹیلی ویژن پر کہتے دیکھا "ایم کیو ایم شرافت کی زبان نہیں سمجھتی لہٰذا اب ہم دوسری زبان استعمال کریں گے" میں نے پچھلے دنوں پاکستان کے انتہائی سینئر اور پڑھے لکھے وکلاء کے منہ سے سنا "جس نے عدلیہ کی طرف انگلی اٹھائی ہم اس کی انگلی کاٹ دیں گے" دس ستمبر سے پہلے مسلم لیگ ن کی قیادت نے اعلان کیا تھا "مسلم لیگ کے کارکن

ائیرپورٹ پر جھنڈے لے کر جائیں گے اگر کسی نے روکا تو یہ جھنڈے ڈنڈے بن جائیں گے" ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین لندن میں بیٹھ کر لچے اور لفنگے کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں اور شیخ رشید قوم کو پیغام دے رہے ہیں "اگر میاں نواز شریف 10 ستمبر کے دن ائیرپورٹ پر دس ہزار کارکن جمع کر لیتے تو ان کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا" یہ کیا ہے؟ یہ کیا سوچ ہے اور اس سوچ کا کیا نتیجہ نکلے گا؟

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا یہ سوچ آج ہی پیدا ہوئی ہے؟ نہیں! یہ بنیادی طور پر ہماری آٹھ برس کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے اور بدقسمتی سے اس کا آغاز ہمارے حکمرانوں نے کیا تھا' جب آپ قومی ہیرو ڈاکٹر عبدالقدیر اور ان کے ساتھیوں کو اٹھا کر جیلوں میں پھینک دیں گے' جب آپ سینکڑوں لوگوں کو گھروں سے غائب کر دیں گے اور عدالتوں کے فیصلوں کے باوجود انہیں پیش نہیں کریں گے' جب آپ سردار اکبر بگٹی کو سر عام دھمکی لگائیں گے" یہ 1973ء نہیں کہ تم بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ جاؤ' تمہیں معلوم ہی نہیں ہو گا کس طرف سے کون سا میزائل آئے گا اور کہاں کہاں گرے گا" جب آپ 9 مارچ 2007ء کو چیف جسٹس آف پاکستان کو اپنے سامنے بٹھا کر غیر فعال کر دیں گے اور وکلاء کو عدالت اور چیف جسٹس کی بحالی کیلئے ملک میں تحریک چلانی پڑے گی' جب چیف جسٹس 12 مئی کو کراچی جائیں گے اور سندھ حکومت اور ایم کیو ایم اعلان کر دے گی ہم چیف جسٹس کو کراچی میں داخل نہیں ہونے دیں گے اور 12 مئی کو شہر قاتلوں کے حوالے کر دیا جائے گا اور صدر صاحب اسے عوامی رائے قرار دے دیں گے اور جب عمران خان کے کراچی اترنے پر پابندی لگا دی جائے گی اور جب سپریم کورٹ میاں نواز شریف اور اس کے خاندان کو واپس آنے کا حکم دے گی اور آپ انہیں گھسیٹ کر جہاز میں پھینکیں گے اور انہیں سعودی عرب بھجوا دیں گے تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا جب آپ شمالی وزیرستان اور فاٹا میں اپنے ہی شہریوں کے خلاف فوج استعمال کریں گے اور لال مسجد کو توپ کے گولوں سے اڑا دیں گے اور اس کے بعد بڑے فخر سے اعلان کریں گے "لال مسجد میں صرف 191 لوگ مرے" تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا' جب آپ صرف ایک شخص کے اقتدار کیلئے فوج سے لے کر عدلیہ تک پاکستان کے تمام اداروں کی قربانی دے دیں گے اور جب آپ ایک یونیفارم اور پانچ سال کی مزید صدارت کیلئے تمام اصول' تمام ضابطے اور ساری اخلاقیات پاؤں میں روند ڈالیں گے تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا' کیا اس کے بعد بھی لوگوں کا حکومت اور حکومتی اداروں پر اعتماد متزلزل نہیں ہو گا' یقین کیجئے آج پاکستان طبقاتی لحاظ سے تقسیم ہو چکا ہے' مذہب پسند لوگوں نے اپنا ایک گروپ بنا لیا ہے' یہ لوگ مسجدوں اور مدرسوں پر قابض ہو رہے ہیں اور حکومت کے کسی ادارے کی اتھارٹی تسلیم نہیں کر رہے' فوج متنازعہ ہو چکی ہے اور لوگ اس پر کھلے عام امریکہ نوازی

کا الزام لگا رہے ہیں' کراچی الطاف بھائی کا ہو چکا ہے اور ان کی اجازت کے بغیر وہاں پتہ نہیں ہلتا' پنجاب گجرات الٰہی ہو چکا ہے' صوبہ سرحد جے یو آئی کی ملکیت بن چکا ہے اور بلوچستان بلوچ سرداروں نے آپس میں تقسیم کر لیا ہے' پیچھے رہ گئے سرکاری ادارے تو یہ یونیفارم کی حفاظت میں جتے ہیں چنانچہ مستری شہاب ہو یا پھر میرا دوست بیرسٹر شہاب دونوں قانون ہاتھ میں لینے کیلئے بے تاب پھر رہے ہیں' یہ سب لوگ اپنا فیصلہ خود کرنا چاہتے ہیں اور اپنے غصے میں کسی حکومتی ادارے کو شامل نہیں کر رہے' یہ کیا ہے ؟ کیا یہ سول وار نہیں' کیا سول وار میں یہی نہیں ہوتا کہ حکومتی ادارے جواب دے جاتے ہیں اور لوگ اپنا انتقام خود لینے لگتے ہیں' کیا سول وار میں سنٹرل فورسز ختم نہیں ہو جاتیں؟ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کیا اس وقت ملک میں کوئی سنٹرل فورس موجود ہے؟ کیا کسی جگہ قانون اور انصاف نام کی کوئی چیز موجود ہے اور کیا لوگ آج غصے کی رو میں نہیں بہہ رہے؟ اگر اس کا جواب ہاں ہے تو کیا ہم خانہ جنگی کا شکار نہیں ہو چکے ہیں؟ کیا ہم تباہی کے دہانے پر نہیں کھڑے' سوچئے اور اپنی عقل کا ماتم کیجئے۔

○ ○ ○

بے بسی

''میں ان ججوں کو قوم کا ہیرو سمجھتا ہوں' میں تین نومبر سے اچھی طرح نہیں سویا' میں کھانا کھانا' نہانا دھونا اور کپڑے پہننا بھی بھول گیا ہوں' میرا کسی کے ساتھ بات چیت کرنے کو دل نہیں چاہتا' میں خود کو اپنے ہیروز کا مجرم سمجھتا ہوں اور میں ان کیلئے کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی'' نوجوان رکا' اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا' کمرے کی فضا سوگوار ہو گئی' یہ پہلا نوجوان نہیں تھا' پچھلے ڈیڑھ ماہ سے ملک کا ہر شہری ایک دوسرے سے پوچھ رہا ہے' میں اپنے ہیرو ججوں کیلئے کچھ کرنا چاہتا ہوں'' میں کیا کروں'' ہماری حکومتوں نے ماضی میں بدقسمتی سے عوام کو اپنے جذبات کے اظہار کے طریقے ہی نہیں سکھائے تھے لہٰذا آج لوگوں کے اندر جذبات کے سمندر بہہ رہے ہیں لیکن انہیں سمجھ نہیں آ رہی وہ اپنے جذبات ہیرو ججوں تک کیسے پہنچائیں' یہ لوگ ججوں کے حق میں جلسے اور جلوس کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے راستے میں پولیس مزاحم ہو جاتی ہے' یہ لوگ ان ججوں تک پھول پہنچانا چاہتے ہیں' ان کے گھروں کے سامنے موم بتیاں لگانا چاہتے ہیں اور یہ ان کے حق میں بیان دینا چاہتے ہیں لیکن ملک میں ایمرجنسی اور دفعہ 144 ہے چنانچہ یہ لوگ غصے اور ڈپریشن میں اپنے ہی بازوؤں پر دانت گاڑھ کر رہ جاتے ہیں اور لوگ اپنی بے بسی کو جرم سمجھنے لگے ہیں یہ اسی بے بسی اور احساس جرم کا نتیجہ ہے آج ہارٹ اٹیک اور برین ہیمبرج کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے جبکہ میڈیکل سٹورز سے ڈپریشن اور ٹینشن کی ادویات نہیں ملتیں' لوگ حقیقتاً پریشان ہیں اور ان پریشان لوگوں میں سے ایک نوجوان اس وقت میرے سامنے بیٹھا تھا۔

یہ نوجوان کیا کرے؟ مجھے بھی فوری طور پر اس سوال کا کوئی جواب نہ سوجھا' یہ بے چارہ پاکستانی شہری تھا اور اس کے پاس صبر' شرمندگی' افسوس اور رونے دھونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا' میں نے سوچا اگر یہ نوجوان چین کا شہری ہوتا تو یہ کیا کرتا؟ چین میں کوریا کی جنگ میں ماؤزے تنگ کا بیٹا فوت ہو گیا تھا' جب بیٹے کی شہادت کی خبر چین پہنچی تو چین کی مائیں اپنے اپنے بیٹے لے کر ماؤ کے پاس حاضر ہو گئیں اور ان سے عرض کیا آج سے ہمارے سب بیٹے آپ کے بیٹے ہیں' ماؤ نے یہ بیٹے بھی محاذ

جنگ پر بھجوا دیئے اور اس کے بعد محاذ سے ہمیشہ اچھی خبر آئی' اگر یہ نوجوان چین کا شہری ہوتا تو یقیناً اس کی ماں اسے معزول ججوں کے پاس چھوڑ جاتی لیکن یہ چین نہیں پاکستان ہے' میں نے سوچا اگر یہ نوجوان کولمبیا کا شہری ہوتا تو یہ کیا کرتا؟ کولمبیا میں مافیا نے ججوں اور عدالتوں کو بموں سے اڑانا شروع کر دیا تھا لیکن ججوں نے اس کے باوجود مافیا کے خلاف سماعت جاری رکھی' اس وقت جو جج عدالت جانے کیلئے گھر سے نکلتا تھا اسے یقین ہوتا تھا وہ گھر واپس نہیں آئے گا لیکن اس کے باوجود وہ عدالت بھی جاتا تھا اور مقدمے کی سماعت بھی شروع کرتا تھا' عوام نے جب ججوں کا استقلال دیکھا تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے جس کے بعد عوام ججوں کو جلوس کی شکل میں عدالت لاتے اور خود جج کی کرسی کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے۔ عدالت میں بم پھٹتا اور یہ لوگ بھی جج کے ساتھ شہید ہو جاتے' یہ سلسلہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ ایک ایسا وقت بھی آیا جب جج کی کرسی سے لے کر میلوں تک لوگ ہی لوگ ہوتے تھے چنانچہ بم بازی کا سلسلہ رک گیا اور ججوں نے مافیا لارڈ کو سزا سنا دی' اگر یہ نوجوان میلان کا شہری ہوتا تو یہ کیا کرتا؟ میلان کے ایک میئر نے مجسٹریٹ کو نوکری سے نکال دیا تھا' یہ مجسٹریٹ ایمانداری' فرض شناسی اور حسن سلوک کی وجہ سے پورے شہر میں مقبول تھا' لوگوں نے فوراً مجسٹریٹ آفس کا گھیراؤ کر لیا اور اس وقت تک کسی نئے مجسٹریٹ کو دفتر میں داخل نہیں ہونے دیا جب تک میئر نے عوام سے معافی نہ مانگی اور اس مجسٹریٹ کو بحال نہ کیا۔ اگر یہ نوجوان ترکی کا شہری ہوتا تو یہ کیا کرتا؟ ترکی کے ایک باغی کو یونان نے پناہ دے دی تھی' جس کے جواب میں انقرہ کے شہری اپنی اپنی گاڑیوں پر گھروں سے نکلتے' یونان کے سفارتخانے کے سامنے رکتے' گاڑی کا ہارن بجاتے اور آگے روانہ ہو جاتے' یہ عمل لاکھوں لوگ روزانہ دہراتے تھے یہاں تک کہ یونانی سفارتخانے کا عملہ کانوں میں روئی ٹھونسنے پر مجبور ہو گیا' اگر یہ نوجوان انڈونیشیا کا شہری ہوتا تو یہ کیا کرتا؟ انڈونیشیا کے ایک وزیر کی جاوا میں کانیں تھیں' اس کی ایک کان میں دھماکہ ہوا اور کان کی گیلی مٹی اڑنے لگی' ان لوگوں نے یہ مٹی جمع کی' دارالحکومت گئے اور یہ مٹی وزیر کے گھر کے سامنے ڈھیر کرنے لگے' وزیر صاحب صرف تین دن اس احتجاج کا مقابلہ کر سکے' اگر یہ نوجوان ایوری کوسٹ کا شہری ہوتا تو یہ کیا کرتا؟ ایوری کوسٹ کے ایک وزیر سرکاری ہسپتالوں میں دواء کا استعمال شروع کرانا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹروں کا خیال تھا اس دواء میں بے شمار ''سائیڈ ایفیکٹس'' ہیں اور اگر سرکاری سطح پر اس دواء کا استعمال شروع کیا گیا تو مریضوں کو بہت نقصان پہنچے گا چنانچہ ڈاکٹروں نے وزیر کی ہدایات ماننے سے انکار کر دیا' وزیر نے ان ڈاکٹروں کو عبرت کا نشانہ بنانے کا فیصلہ کر لیا' اس نے 50 ڈاکٹروں کو نوکری سے نکال دیا' عوام کو معلوم ہوا تو لوگ جمع ہوئے'

انہوں نے ملک کے مختلف علاقوں میں پچاس کلینک بنائے اور دوگنی تنخواہ اور مراعات پر ان ڈاکٹروں کو وہاں تعینات کر دیا اور ساتھ ہی اس دواء ساز کمپنی کی ساری ادویات کا بائیکاٹ کر دیا' اس احتجاج کا نتیجہ بھی وہی نکلا' وزیر کو عوام سے معافی مانگنا پڑی اور حکومت ان ڈاکٹروں کو دوگنی مراعات پر ملازم رکھنے پر مجبور ہو گئی' اگر یہ نوجوان مصر کا شہری ہوتا تو یہ کیا کرتا؟ مصری ججوں نے عدلیہ میں حکومت کے بڑھتے عمل دخل کے خلاف احتجاج شروع کیا' حکومت نے ان ججوں کو دبانے کی کوشش کی' عوام کو معلوم ہوا تو لوگ ان ججوں کی ڈھال بن گئے اور یہ ڈھال اس قدر مضبوط تھی کہ حکومت پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی' اگر یہ نوجوان بنگلہ دیش کا شہری ہوتا تو یہ کیا کرتا؟ بنگلہ دیش کے عوام نے صدر جنرل ارشاد حسین کے خلاف احتجاج کا فیصلہ کیا' ڈھاکہ کے تمام شہریوں نے ایک شام اپنے اپنے گھروں کو تالہ لگایا اور اپنی دہلیز پر بیٹھ گئے' اس دن ڈھاکہ کے ایک کونے سے ''ہمیں کیا چاہیے'' کا نعرہ لگتا تھا اور پورا شہر بآواز بلند کہتا تھا ''ارشاد کا سر چاہیے' ارشاد کا سر چاہیے'' اور جنرل ارشاد حسین اور ان کا اقتدار صرف ایک گھنٹہ ان نعروں کا مقابلہ کر سکا' اگر یہ نوجوان میکسیکو کا شہری ہوتا تو یہ کیا کرتا؟ میکسیکو میں ایک بار ہائی کورٹ کے ایک جج کی عدالت میں حکومت کا مقدمہ پیش تھا' جج نے جس دن فیصلہ سنانا تھا اس دن ٹریفک پولیس جج کی گاڑی اٹھا کر لے گئی' یہ خبر ریڈیو سے نشر ہوئی تو ہزاروں لوگ اپنی اپنی گاڑیاں لے کر جج کے دروازے پر کھڑے ہو گئے' جج باہر نکلا تو اس کے گھر کے سامنے گاڑیوں کا میلوں لمبا پل بنا تھا' تمام لوگ جج کو دیکھ کر گاڑیوں سے باہر نکلے اور اپنی اپنی گاڑیوں کی چابیاں جج کے قدموں میں ڈھیر دیں' اگر یہ نوجوان نیوزی لینڈ کا شہری ہوتا تو یہ کیا کرتا؟ نیوزی لینڈ کے ایک پولیس افسر نے کسی بینک کے چیف ایگزیکٹو کو گرفتار کر لیا' چیف ایگزیکٹو نے پولیس افسر کو رشوت کی پیش کش کی لیکن پولیس افسر نے اس پیش کش کو بھی مقدمے کا حصہ بنا دیا' پولیس افسر نے اسی بینک سے اپنا گھر ''مارگیج'' کرا رکھا تھا' چیف ایگزیکٹو نے اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا' ماتحتوں نے اگلے ہی دن پولیس افسر کو گھر خالی کرنے کا نوٹس جاری کر دیا' پولیس افسر عدالت گیا لیکن تکنیکی اور قانونی طور پر بینک کا دعویٰ درست نکلا چنانچہ عدالت نے بینک کے حق میں فیصلہ دے دیا' عوام اس کارروائی کے پیچھے چھپی بدنیتی سے واقف تھے لہٰذا جس دن پولیس افسر مکان خالی کر رہا تھا اس دن نیوزی لینڈ کے سینکڑوں لوگ اپنے اپنے مکانوں کی چابیاں لے کر اس کے سامنے حاضر ہو گئے' یہ نیوزی لینڈ کے لوگوں کی طرف سے اس پولیس افسر کی استقامت اور ایمانداری کو سلام تھا۔

میں نے سوچا اگر یہ نوجوان اور اس جیسے دوسرے کروڑوں نوجوان نیوزی لینڈ' میکسیکو' مصر' بنگلہ دیش' ایوری کوسٹ' انڈونیشیا' کولمبیا اور چین کے شہری ہوتے تو آج ان کے پاس اپنے جذبات کے

اظہار کیلئے سینکڑوں' ہزاروں طریقے ہوتے اور اگر ہمارے زیر عتاب جج بھی پاکستان کے علاوہ کسی زندہ ضمیر معاشرے میں ہوتے تو وہ بھی آج اتنے بے بس نہ ہوتے اور آج انہیں بھی تنخواہوں' پنشن' گاڑیوں' ڈرائیوروں' خانساموں' ٹیلی فونوں اور رہائش گاہوں کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا' آج ہزاروں لاکھوں لوگ اپنے اپنے گھروں کی چابیاں لے کر ان کے گھر کے باہر کھڑے ہوتے اور اس وقت تک سینکڑوں گاڑیاں ان کے گھروں کے باہر ہوتیں' اور لوگ انہیں اب تک پچاس سال کی تنخواہیں اور پنشنیں پیش کر چکے ہوتے' افسوس یہ نوجوان اور یہ جج دونوں ایک ایسے ملک کے شہری ہیں جس کی بے بس زمینوں میں صرف بے بسی کاشت ہوتی ہے اور آج پورے ملک میں بے بسی کی یہ فصل لہلہا رہی ہے' ہم سب اپنے حجروں میں بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھ رہے اور آسمان ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا ہے! کیوں؟ کیونکہ آسمان کے پاس بے بس لوگوں کیلئے مسکراہٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

⊘ ⊘ ⊘

عوام کیا کریں

ہم اب آتے ہیں عوام کی طرف' دنیا کی سب سے بڑی طاقت عوام ہوتے ہیں' یہ ایک ایسی طاقت ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے "زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھیں" شاید یہی وجہ تھی دنیا کے تمام مذاہب' تمام نظریات اور تمام انقلابات عوام سے اٹھے اور آہستہ آہستہ طبقہ اشرافیہ یا حکمران کلاس تک پہنچے' دنیا میں سچ وہ ہوتا ہے جسے عوام سچ تسلیم کرتے ہیں چنانچہ کسی بھی معاشرے میں تبدیلی کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ عوام ہوتے ہیں اور جب تک عوام متحرک نہیں ہوتے اس وقت تک معاشرے میں "چینج" نہیں آتی اور ہماری بدقسمتیوں میں سب سے بڑی بدقسمتی عوام کی بے حسی ہے' ہمارے عوام کا بہت بڑا طبقہ بے حس بھی ہے' نکما بھی اور خوش فہم بھی' آپ المیہ ملاحظہ کیجئے ہمارے لوگ تبدیلی' خوشحالی اور ترقی کیلئے پچھلے ساٹھ برس سے حکومت کی طرف دیکھ رہے ہیں' ملک میں جب بھی کوئی نئی حکومت بنتی ہے تو لوگ اس کے ساتھ اپنی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں' سال چھ ماہ تک ان کی توقعات کی فصل لہلہاتی رہتی ہے لیکن پھر اچانک انہیں محسوس ہوتا ہے اس حکومت اور پچھلی حکومت میں کوئی فرق نہیں تھا چنانچہ یہ لوگ حکومت کو گالیاں دیتے ہیں' اس کے خلاف نعرے لگاتے ہیں' جلوس نکالتے ہیں اور سجدوں میں گڑ گڑا کر اللہ تعالیٰ سے "حکمرانوں سے جان چھڑا" کی دعائیں کرتے ہیں' حکومت اس دوران اپنی طبعی اور غیر طبعی عمر پوری کر لیتی ہے اور ایوب خان کی جگہ یحییٰ خان' ذوالفقار علی بھٹو کی جگہ جنرل ضیاء الحق' بے نظیر بھٹو کی جگہ نواز شریف اور صدر پرویز مشرف کی جگہ یوسف رضا گیلانی آ جاتے ہیں اور لوگوں کی توقعات ایک کوٹ سے نکل کر دوسری شیروانی میں چلی جاتی ہیں لیکن ان کے مسائل اسی جگہ قائم رہتے ہیں۔

آپ پاکستان کے مسائل کی تاریخ نکال کر دیکھ لیجئے' پاکستان میں مہنگائی ایوب خان کے دور میں بھی تھی' مہنگائی آج یوسف رضا گیلانی کی حکومت میں بھی ہے' بے روزگاری' جہالت' لوڈشیڈنگ' بد امنی' بے انصافی اور لاقانونیت ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں بھی تھی اور یہ مسائل آج بھی ہیں' آٹا' دالیں' چاول' گھی اور پٹرول سابق ادوار میں بھی ناپید تھا اور یہ آج بھی نہیں مل رہا چنانچہ اگر دیکھا جائے تو پچھلے

ادوار اور آج کے دور میں کوئی فرق نہیں' کل بھی کوئی تبدیلی نہیں تھی اور آج بھی معاشرے میں کوئی فرق نہیں آیا' ہم ہمیشہ اس معاملے میں حکومت اور حکمرانوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھول جاتے ہیں اگر صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے ایک ہزار ارکان' چار ہزار 9 سو گیارہ سیاستدان' ایک سو ایکس وزیر اور تین ہزار اعلیٰ سرکاری افسر اس ملک کا مقدر نہیں بدل سکے تو اس ملک کے 16 کروڑ عوام نے بھی بیروزگاری' مہنگائی' غربت' تعلیم' صحت' صفائی' انصاف اور امن و امان کیلئے کچھ نہیں کیا؟ ہمارے عوام نے تو آج تک اپنے سر کی جوئیں تک نکالنے کی ہمت نہیں کی' یہ 16 کروڑ لوگ تو منہ دھلانے' مسواک کرنے اور دروازے پر پڑی کچرے کی ٹوکری تک اٹھانے کیلئے حکومت کا انتظار کرتے ہیں' دنیا میں حقوق اور فرائض میں فرض قانون کا درجہ رکھتا ہے اور جو شخص اپنا فرض ادا نہیں کرتا اسے حق مانگنے کا "حق" حاصل نہیں ہوتا لیکن بدقسمتی سے ہمارے 16 کروڑ عوام اپنے فرائض تو ادا کر نہیں رہے اور حق مانگنے میں پیش پیش ہیں' ہمارے 16 کروڑ لوگ خاموشی سے گھر بیٹھے ہیں' خودکشیاں کرنیوالوں کے جنازے پڑھ رہے ہیں اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے یہ شکوہ کر رہے ہیں کہ ہمارے حالات تبدیل کیوں نہیں ہو رہے؟ ہم یہ بھول جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسوقت تک اس قوم (یعنی پورا ملک) کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنی حالت نہیں بدلتی۔

ہمارے عوام کیا کر سکتے ہیں؟ یہ وہ سوال ہے جس کے جواب میں ہماری خوشحالی' ترقی اور تبدیلی چھپی ہے! میرے مہربانو! اس ملک میں 16 کروڑ لوگ ہیں' ان 16 کروڑ لوگوں میں 8 کروڑ خطِ غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں جبکہ باقی 8 کروڑ لوئر مڈل کلاس' مڈل کلاس اور اپر کلاس میں شمار ہوتے ہیں' ہم اگر ان 8 کروڑ لوگوں میں سے لوئر مڈل کلاس کے تین کروڑ لوگوں کو نکال دیں تو پیچھے مڈل کلاس اور اپر کلاس کے 5 کروڑ لوگ رہ جاتے ہیں' یہ پانچ کروڑ لوگ خوشحال بھی ہیں' خودمختار بھی' تعلیم یافتہ بھی اور روشن ذہن بھی لہٰذا اگر یہ لوگ متحرک ہو جائیں' یہ لوگ اپنی ذمہ داری قبول کر لیں تو یہ پانچ کروڑ لوگ اس ملک میں خوشحالی' ترقی اور تبدیلی میں بنیادی کردار ادا کر سکتے ہیں اور دس سال میں یہ ملک کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے' یہ پانچ کروڑ کتنی بڑی طاقت ہیں اس کا اندازہ آپ 80 ہزار وکلاء سے لگا لیجئے' اس ملک میں 80 ہزار وکلاء ہیں' ان میں سے نصف وکلاء 9 مارچ 2007ء کو گھروں اور چیمبرز سے نکلے اور انہوں نے نہ صرف فوج کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا بلکہ ملک کا سارا سیاسی نقشہ ہی تبدیل کر دیا' اگر یہ 40 ہزار وکلاء اتنی بڑی تبدیلی لا سکتے ہیں تو ذرا سوچئے ملک کے 5 کروڑ خودمختار اور خوشحال عوام کیا نہیں کر سکتے؟' اس ملک میں لگ بھگ دو کروڑ ریٹائر اور بزرگ شہری ہیں' ان لوگوں کے پاس بچوں کو ڈرانے'

دھمکانے' ڈانٹنے' فحاشی عریانی اور بداخلاقیوں کے شکوے کرنے اور اپنی جوانی کے قصے سنانے کے سوا کوئی کام نہیں' اگر یہ لوگ دس دس' پندرہ پندرہ کا گروپ بنائیں اور یہ گروپ کچی آبادیوں میں ایک ایک کمرے کا سکول بنا لیں اور بچوں کو مفت تعلیم دینا شروع کر دیں' ملک کے وہ تمام لوگ جن کی آمدنی چالیس ہزار روپے سے زائد ہے اگر وہ دس دس لوگوں کا گروپ بنائیں' یہ لوگ چار چار ہزار روپے ماہانہ "کنٹری بیوٹ" کریں اور ان چالیس ہزار روپوں سے یہ لوگ اپنے محلے میں ایک چھوٹی سی ڈسپنسری بنا لیں' دس اساتذہ ایک گروپ بنا لیں' ایک کمرہ کرائے پر لیں اور یہ اساتذہ شام کے وقت معاشرے کے ان بچوں کو مفت پڑھانا شروع کر دیں جو اچھی اور اعلیٰ تعلیم افورڈ نہیں کر سکتے' دس ڈاکٹر اپنا گروپ بنائیں اور شام کو روز کسی کچی آبادی' کسی گاؤں اور غریبوں کی کسی بستی میں جائیں اور لوگوں کا مفت معائنہ کریں' دس کھلاڑی گروپ بنائیں' یہ خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے والے طبقوں میں جائیں اور ان بچوں کو کھیلنے کا طریقہ سکھائیں' انجینئرز اپنے اپنے گروپ بنائیں اور محروم طبقوں کے بچوں کو فنی تربیت دیں' بیگمات گروپس بنائیں' صابن اور ٹوتھ پیسٹ خریدیں اور کچی بستیوں میں جا کر بچوں کو منہ دھونے اور پیسٹ کرنے کا طریقہ سکھائیں' کپڑے بیچنے والے تھان لیں' درزی لیں' کچی آبادیوں میں جائیں اور بچوں کو کپڑے سی دیں' زرعی ماہرین کے گروپس بنیں اور یہ گروپس چھوٹے کسانوں اور کچی آبادیوں کے لوگوں کو اپنی ضرورت کی سبزیاں اور پھل اگانے اور مرغیاں اور بکریاں پالنے کا طریقہ بتائیں' صنعت کاروں کے گروپس بنیں اور یہ گروپس کچی آبادیوں میں جا کر لوگوں کو چھوٹی چھوٹی صنعتیں لگانے کی ترغیب دیں' ماہرین نفسیات گروپس بنائیں اور یہ گروپس کچی آبادیوں میں جا کر لوگوں کو آگے بڑھنے' ہمت جوان رکھنے اور زندگی کی خوبصورتیوں کے بارے میں لیکچر دیں' علماء کے گروپس بنیں' یہ گروپس کچی آبادیوں میں اپنے ڈیرے اور حجرے بنائیں اور وہاں بیٹھ کر لوگوں میں زندگی پیدا کرنے کی کوشش کریں اور طالب علم اپنے گروپس بنائیں اور یہ گروپس غریب بستیوں میں جا کر بچوں کو پڑھائیں یا ان طالب علموں کو تعلیم دیں جو پڑھنا چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس وسائل نہیں ہیں تو ذرا سوچئے اس ملک میں کتنا بڑا انقلاب آ سکتا ہے' مجھے یقین ہے اگر ہماری سول سوسائٹی اس طرح متحرک ہو جائے' یہ لوگوں میں تحریک پیدا کرے تو شاید اس ملک میں کسی شخص کو خودکشی نہ کرنا پڑے' شاید لوگوں کے اندر زندگی کے رنگ اٹھنے اور دوڑنے لگیں اور یہ ملک ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچ جائے' مجھے رہ رہ کر محسوس ہوتا ہے اگر ہمارے ملک کے پانچ کروڑ لوگوں نے 11 کروڑ لوگوں کو اپنی ذمہ داری نہ سمجھا' اگر پانچ کروڑ لوگوں نے آگے بڑھ کر ان گیارہ کروڑ لوگوں کا ہاتھ نہ تھاما تو اس ملک میں گیارہ کروڑ بچیں

گے اور نہ ہی پانچ کروڑ۔

دنیا کی تاریخ میں آج تک کوئی حکومت ملک کو بنا سکی اور نہ ہی بچا سکی' یہ لوگ ہوتے ہیں' یہ عوام ہوتے ہیں جو ملکوں کو بناتے بھی ہیں اور بچاتے بھی ہیں اور بد قسمتی سے ہمارے ملک کے عوام ہی بے حس ہیں' ان میں کوئی جان ہی نہیں چنانچہ ملک کیسے بنے گا' ملک کیسے بچے گا۔

⊘ ⊘ ⊘

خودکشی کرنے والوں سے ڈریں

محمد رفیق نے پاؤ بھر کا پتھر اٹھایا' ہاتھ بلند کیا اور پورا زور لگا کر پتھر ہوا میں اچھال دیا' پتھر اڑتا ہوا شیشے سے ٹکرایا' ٹھاک' کرچ کرچ کی آواز آئی اور شیشے کی کرچیاں دور دور تک بکھر گئیں۔ محمد رفیق نے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھائے اور نعرے لگانے لگا۔ ٹیلی ویژن کا کیمرہ محمد رفیق کو دیکھ رہا تھا' کیمرے نے آہستہ آہستہ محمد رفیق کو فوکس کیا' سکرین کی سائیڈ سے ٹیلی ویژن کا رپورٹر سامنے آیا اور اس نے محمد رفیق سے پوچھا "آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں؟" محمد رفیق نے کیمرے کی آنکھوں میں آنکھ ڈالی' غصے سے حکومت کو گالی دی اور بولا "میں فیکٹری میں کام کرتا ہوں' میں فیکٹری جاتا ہوں تو وہاں بجلی نہیں ہوتی' ہم سارا دن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے ہیں' میں شام کو گھر واپس آتا ہوں تو گھر میں بجلی نہیں ہوتی' میری بیوی اور بچے اندھیرے میں بیٹھے ہوتے ہیں' ہم نے پورے ماہ بجلی کی شکل نہیں دیکھی' ہمارے بلب' ہماری ٹیوب لائٹس اور ہمارے سوئچ تک کرنٹ کو ترس گئے ہیں لیکن جب بل آیا تو وہ پانچ ہزار روپے تھا" محمد رفیق رکا' اس نے حکومت کو ایک اور موٹی سی گالی دی اور بولا "میری تنخواہ پانچ ہزار ہے اور وہ بھی دو ماہ سے نہیں ملی' آپ خود فیصلہ کریں' میں پانچ ہزار روپے میں مکان کا کرایہ دوں' گھر کیلئے قطار میں لگ کر آٹا خریدوں' گھی' چینی اور سبزی کا بندوبست کروں' بچوں کی سکول کی فیس دوں' بیوی کیلئے دوائیں خریدوں یا بجلی کا بل ادا کروں' مجھے بتایئے میں کیا کروں" محمد رفیق رکا' اس نے لمبا سا سانس لیا اور دوبارہ بولا "چلو میں بل بھی دے دیتا ہوں لیکن اس کے بدلے مجھے بجلی تو ملے؟ یہ کیا انصاف ہے' بجلی دیتے نہیں ہیں لیکن بل وصول کر لیتے ہیں چنانچہ میں نے آج فیصلہ کیا' میں بجلی کا یہ دفتر توڑ کر گھر جاؤں گا" اس کے ساتھ ہی ٹیلی ویژن کا رپورٹر اور کیمرہ مین محمد رفیق سے آگے نکل گئے لیکن فضا میں محمد رفیق کی گالیاں اور نعرے موجود رہے۔

محمد رفیق ان سولہ کروڑ پاکستانیوں میں سے ایک ہے جو بجلی کے ہاتھوں موت کے دروازے تک پہنچ چکے ہیں' ہماری جدید دنیا چار ستونوں پر کھڑی ہے' معیشت' ٹیلی کمیونیکیشن' کمپیوٹر اور میڈیا۔ سماجی ماہرین کا کہنا ہے اگر کسی معاشرے کے یہ چار ستون ڈھ جائیں تو وہ سوسائٹی اکیسویں صدی سے

براہ راست نویں صدی میں جا گرے گی اور آپ دلچسپ حقیقت ملاحظہ کیجئے بجلی ان چاروں ستونوں کی جان ہے' اگر بجلی کا سوئچ آف ہو جائے تو ملک میں معیشت بچتی ہے' ٹیلی کمیونیکیشن' کمپیوٹر اور نہ ہی میڈیا کی سکرین۔ آپ معیشت کی تفصیل میں جا کر دیکھئے زراعت ہو' کارخانے ہوں' دفاتر ہوں یا مارکیٹس ہوں' یہ تمام بجلی کے محتاج ہیں۔ اگر بجلی بند ہو جائے تو پوری معیشت کا بلب فیوز ہو جاتا ہے' ٹیلی کمیونیکیشن ٹیلی فون کی شکل میں ہو' موبائل کی شکل میں یا پھر انٹرنیٹ کی صورت میں' بجلی اس کی بھی جان ہے اور آپ آج کی ان بنیادی چیزوں کو کب تک یو پی ایس اور جنریٹرز پر چلا سکتے ہیں؟ چنانچہ ایک وقت آتا ہے جب آپ کو ہاتھ کھڑے کرنا پڑ جاتے ہیں اور اس وقت جدید دنیا کا یہ ستون بھی ڈھ جاتا ہے۔ کمپیوٹر آج کی سماجی دنیا کا دل ہے' آپ اس کے بغیر بس کا ٹکٹ تک نہیں خرید سکتے اور یہ بھی بجلی کا محتاج ہے اور رہ گیا میڈیا تو اخبار سے لے کر ریڈیو اور ریڈیو سے لے کر ٹیلی ویژن تک میڈیا کی کوئی قسم بجلی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور پاکستان میں اس وقت جدید زندگی کے یہ چار "ٹولز" آخری سانسیں لے رہے ہیں چنانچہ ہم بڑی تیزی سے اکیسویں صدی سے نویں صدی کی طرف جا رہے ہیں۔

بجلی کا یہ بحران کیوں ہے؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ پچھلی حکومت کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے یا اس میں وہ لوگ قصوروار ہیں جنہوں نے تیس برس سے کالا باغ ڈیم نہیں بننے دیا' بجلی رمضان تک کیوں موجود تھی اور عید کے فوراً بعد یہ بجلی کہاں رخصت ہو گئی اور ہم کب تک ان اندھیروں میں ڈوبے رہیں گے؟ یہ تمام سوال اپنی جگہ بہت اہم ہیں لیکن یہ ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کا وقت نہیں کیوں کہ جواب تلاش کرنے کیلئے بھی بجلی چاہئے اور ہمارے ملک کی تاریں اس وقت ایک ایک یونٹ کو ترس رہی ہیں مگر ایک چیز ثابت ہو چکی ہے حکومت ملک کا کوئی بنیادی مسئلہ حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے مسائل کی تمام گیندیں حکومت کے ہاتھ سے پھسلتی چلی جا رہی ہیں اور حکومت گھبراہٹ میں کبھی گیندوں کی طرف دیکھتی ہے اور کبھی تماشائیوں کی طرف خوف کی نگاہ ڈالتی ہے۔

حکومت شدید مالیاتی بحرانوں کا بھی شکار ہو چکی ہے' تمام عالمی ڈونرز اور سرمایہ کار اپنے ڈالرز سمیٹ کر واپس جا چکے ہیں جس کے بعد حکومت کیلئے روزمرہ کے اخراجات چلانا بھی مشکل ہو چکا ہے چنانچہ حکومت نے سرمائے کے حصول کیلئے عوام پر بوجھ بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ پاکستان میں پہلی بار حکومت عوام سے لوڈشیڈنگ کے بل بھی وصول کر رہی ہے اور حکومت کا یہ اقدام ظاہر ہے ملک کو خانہ جنگی کی طرف لے جا رہا ہے اور محمد رفیق جیسے مجبور لوگ ایک ایک کر کے سڑک پر آ رہے ہیں' یہ لوگ آج لوڈشیڈنگ کی وجہ سے بپھرے ہوئے ہیں لیکن حکومت لوڈشیڈنگ کے جس حل پر کام کر رہی ہے وہ لوگوں

کے اس غصے کو جنگ کی شکل دے دے گا اور مسئلے کا حل مسئلے سے بھی کئی گنا سنگین ثابت ہوگا۔ حکومت لوڈ شیڈنگ سے جان چھڑانے کیلئے کرائے پر پاور پلانٹس حاصل کر رہی ہے' یہ پاور پلانٹس بیس بائیس سینٹ فی یونٹ بجلی فراہم کریں گے اور جب ان کی پیداوار شروع ہو گئی تو حکومت کو پانچ ہزار روپے ماہانہ کمانے والے محمد رفیق کو دس ہزار روپے بل بھجوانا پڑے گا۔ آپ تصور کیجئے اس وقت محمد رفیق کا کیا ردعمل ہوگا؟ بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے بارے میں ایک افواہ یہ بھی گردش کر رہی ہے کہ لوڈشیڈنگ کی یہ لہر خالصتاً کاروباری ہے' پاور پلانٹس کا ایک مافیا اس وقت ملک میں موجود ہے اور یہ مافیا لوڈشیڈنگ کا بحران پیدا کر کے نئے پاور پلانٹس کی ضرورت پیدا کر رہا ہے' یہ نئے آئی پی پی ایز کی جسٹی فکیشن کی کوشش ہے۔ پاکستان میں پچھلے ماہ غربت اور بے روزگاری کے ہاتھوں 147 لوگوں نے خودکشی کی تھی' یہ نئے پاور پلانٹس آنے سے پہلے کی صورتحال تھی۔ آپ تصور کیجئے جب پاور پلانٹس آ جائیں گے تو اس وقت لوگوں کی کیا حالت ہوگی؟ اس وقت شائد لوگ بجلی کی تاروں کے ساتھ لٹک کر دنیا کے دکھوں سے آزاد ہو جائیں چنانچہ ہم ایک ایسی بند گلی میں آ چکے ہیں' جس کے آگے کوئی راستہ نہیں اور پچھلے راستے پر حکومت ایک اونچی دیوار کھڑی کر رہی ہے۔ اس نازک گھڑی پر میری حکومت سے درخواست ہے وہ لوگوں کے ساتھ جھوٹ بولنا بند کر دے' عوام کو اصل حقائق بتائے اور اخلاص پر مبنی ایک ایسی لانگ ٹرم پالیسی بنائے جو اگلے دس پندرہ برسوں میں اس ملک کو مسائل سے نکال دے ورنہ یقین کیجئے محمد رفیق جیسے لوگ اس بار حکمرانوں کو بھاگنے کا راستہ نہیں دیں گے۔ معاشروں اور ملکوں کو مالیاتی بحرانوں سے اتنا خطرہ نہیں ہوتا جتنے خطرناک ان کیلئے خودکشی کرنے والے عوام ہوتے ہیں کیونکہ جو شخص اپنی جان لے سکتا ہے اسے دوسروں کی جان لیتے ہوئے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی اور ملک میں اس وقت محمد رفیق جیسے لوگوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے۔

⊘ ⊘ ⊘

میں احتجاج کرتا ہوں

یہ بحث بہر حال لا حاصل اور فضول ہے کہ یہ واقعہ کبل میں پیش آیا یا پھر مینگورہ' سیدو شریف' شاہ ڈھیری یا پھر کالام میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ بحث بھی بے معنی ہے کہ یہ سوات میں نفاذ عدل سے پہلے کا واقعہ ہے یا پھر یہ سرحد حکومت اور طالبان کے درمیان تحریری معاہدے کے بعد پیش آیا۔ یہ بحث بھی فضول ہے کہ یہ خاتون کسی غیر محرم مرد کے ساتھ گھر سے نکلی تھی اور طالبان نے خاتون کو سرِ عام کوڑے مارنا شروع کر دیئے۔ یہ بحث بھی لا حاصل ہے کہ اس خاتون کے اپنے سسر کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے' لوگوں نے گواہی دی اور اسے 34 کوڑے مارے گئے' یہ بحث بھی فضول ہوگی کہ کوئی صاحب اس خاتون کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے' ناکامی ہوئی اور وہ طالبان میں شامل ہوئے۔ انہوں نے خاتون پر بدکاری کا الزام لگایا اور خاتون کو سرِ عام کوڑے مارے گئے اور یہ بحث بھی لا حاصل ہے کہ خاتون نے بجلی ٹھیک کرانے کیلئے الیکٹریشن کو گھر بلوایا تھا اور اس کے بعد الیکٹریشن اور خاتون دونوں حدود کے دائرے میں آ گئے لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ ایک انتہائی غیر انسانی' غیر اخلاقی اور غیر شرعی اقدام تھا اور اس اقدام پر اس ملک کے ہر مسلمان کا سر شرم سے جھک گیا اور اس واقعے کے بعد یہ سوال درست لگتا ہے کہ یہ کون سا اسلام ہے جو ایک پردہ دار خاتون کو مردوں کے درمیان لٹا کر کوڑے مارتا ہے اور سارا مجمع آرام سے' سکون سے اس کی چیخیں سنتا ہے؟ لوگوں کا یہ سوال بھی ٹھیک ہے کہ یہ فیصلہ کسی قاضی نے سنایا تھا اور کیا اس سزا کیلئے شرعی گواہیاں لی گئی تھیں؟ میں تاریخ کا کیڑا ہوں' میں نے سیرت کی کتب اور خلفائے راشدین کے عہد میں انصاف کا اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں پڑھا۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے لئے اسلامی سزاؤں سے انحراف ممکن نہیں' ہم بحیثیت مسلمان ان سزاؤں کو تسلیم بھی کرتے ہیں اور ان پر عملدرآمد کے بھی پابند ہیں لیکن کیا اسلام کسی خاتون کو مردوں کے درمیان کوڑے مارنے کی اجازت دیتا ہے؟ نہیں بالکل نہیں دیتا۔ یہ طریقہ سو فیصد غیر شرعی' غیر اخلاقی اور غیر انسانی تھا اور میں بحیثیت مسلمان اس غیر انسانی حرکت پر احتجاج کرتا ہوں۔

یہ اس واقعے کا ایک پہلو ہے لیکن اس کے چار مزید پہلو بھی ہیں اور ہمیں ان پہلوؤں پر بھی

غور کرنا ہوگا۔ ان چار پہلوؤں میں سے پہلا پہلو اجتہاد ہے' اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس کے راستے میں وقت کی دیواریں حائل نہیں ہوتیں۔ یہ اپنے اندر ہر دور' ہر عہد اور ہر ایج کی گنجائش پیدا کر لیتا ہے' انسان اگر سجدہ نہیں کر سکتا تو اللہ تعالیٰ اشاروں حتیٰ کہ پلکوں تک سے سجدے کی اجازت دے دیتا ہے۔ انسان وضو نہیں کر سکتا تو وہ ہاتھوں پر سوکھا ہاتھ پھیر کر وضو کر سکتا ہے' کسی میں حج کی استطاعت نہیں تو اللہ تعالیٰ اس پر یہ فرض ہی ساقط کر دیتا ہے' انسان اگر برائی کو ہاتھ اور زبان سے نہیں روک سکتا تو اسلام اسے برائی کو دل میں برا کہنے کی اجازت دے دیتا ہے اور اگر مرد اور عورت نکاح کرنا چاہیں اور ان کا کوئی گواہ نہ ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر میاں بیوی بن سکتے ہیں لہٰذا یہ دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے وقت کی ہر تبدیلی اور انسان کی ہر ضرورت کو "ویل کم" کیا' دنیا میں گھڑی ایجاد ہوئی' لاؤڈ سپیکر آیا' فٹ بال کھیلا جانے لگا' گاڑیاں اور جہاز آئے اور انسان نے ستاروں کی چالوں کا مطالعہ شروع کیا تو اسلام نے سب سے پہلے ان تبدیلیوں کو تسلیم کیا۔ یہ دنیا کا واحد مذہب ہے جو وقت کے عالموں کو عصری تقاضوں کی گنجائش پیدا کرنے کی پوری پوری اجازت دیتا ہے اور گنجائش کے اس عمل کو اجتہاد کہتے ہیں۔ سوات کا یہ واقعہ اجتہاد کی کمی کی انتہائی خوفناک مثال ہے اور یہ ثابت کرتا ہے ہمارے علمائے کرام اپنا دینی فرض ادا نہیں کر رہے۔ انہوں نے عصری تقاضوں کی گنجائش نکالنے کا سلسلہ منقطع کر دیا ہے جس کی وجہ سے دنیا میں اسلام تنہائی کا شکار ہو رہا ہے چنانچہ میں اس واقعے کی بنیاد پر علمائے کرام سے درخواست کرتا ہوں پاکستان کے تمام مکاتب فکر کے علماء اکٹھے ہوں' یہ ایک جگہ بیٹھیں اور وقت کے چند ناگزیر تقاضوں کے بارے میں اجتہاد فرمائیں۔ ہمیں ماننا پڑے گا خواتین آج سے چودہ سو سال پہلے گھروں تک محدود رہ سکتی تھیں لیکن آج کے دور میں یہ ممکن نہیں۔ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا ہم ملک کی آدھی آبادی کو گھروں تک محدود کر کے معاشرے کو آگے نہیں لے جا سکتے۔ عورت اگر تعلیم حاصل نہیں کرے گی' وہ استاد' ڈاکٹر اور سرجن نہیں بنے گی تو بیمار عورتوں کی سرجری' علاج اور تعلیم کا بندوبست کیسے ہوگا چنانچہ عورتوں کو تعلیم سے محروم رکھنا دین کے تقاضوں سے انحراف ہے۔ اسی طرح پردہ ضروری ہے لیکن آج کے دور میں پردے کی حدود طے کرنا بھی لازم ہے۔ آج جب سعودی عرب اور امارات جیسی اسلامی ریاستیں بھی خواتین کے بارے میں اپنے قوانین تبدیل کر رہی ہیں' سعودی عرب میں خواتین کو کابینہ میں شامل کیا جا رہا ہے' انہیں نوکری اور کاروبار کی اجازت دی جا رہی ہے تو ہم اس معاملے میں اتنے سخت کیوں ہیں' ہم حالات کی تبدیلی کو کیوں نہیں سمجھ رہے؟ میں اس غفلت پر علمائے کرام سے احتجاج کرتا ہوں۔

اس واقعے کا دوسرا پہلو میڈیا ہے' میں دل کی گہرائیوں سے یہ سمجھتا ہوں ہم میڈیا کے لوگوں کا

بھی کوئی نہ کوئی ضابطہ اخلاق ہونا چاہئے' ایک ایسی فلم کا بار بار دکھانا جو معاشرے کو "ڈی مورالائز" کردے' جسے دیکھ کر لوگوں کا ایمان' یقین اور سکون غارت ہو جائے' یہ کہاں کا پروفیشنل ازم اور آزادی ہے۔ اس ویڈیو فلم سے کسی طور یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ حقیقتاً پاکستان اور سوات میں پیش آیا تھا اور یہ واقعی آج یا کل کی بات ہے۔ ہوسکتا ہے یہ افغانستان کے کسی گاؤں کا منظر ہو' یہ بھی ہوسکتا ہے یہ ایک دو یا پانچ سال پرانی ویڈیو ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے یہ فلم غیر حقیقی ہو' یہ ایک ڈرامہ ہو جو اسلام' پاکستان اور طالبان کو بدنام کرنے کیلئے رچایا گیا ہو اور یہ کسی بین الاقوامی منصوبے کا حصہ ہو؟ کیا ہمیں اس ویڈیو کو چلانے سے قبل ان تمام پہلوؤں کا جائزہ نہیں لینا چاہئے تھا؟ اور کیا قانون' معاشرہ' اخلاقیات اور اسلام کسی خاتون کی چیخیں سنا کر لوگوں کے دل اور ضمیر زخمی کرنے کی اجازت دیتا ہے! میں ضابطہ اخلاق کی کمی پر اپنے میڈیا' اپنے پیشے کے سامنے بھی احتجاج کرتا ہوں اور اس واقعے کا تیسرا پہلو خواتین کے حقوق کی علمبردار تنظیمیں اور ایکٹویسٹ ہیں۔ محترمہ عاصمہ جہانگیر' فرزانہ باری اور ثمر من اللہ نے دو دن سے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ میں اس معاملے میں مکمل طور پر ان کے ساتھ ہوں' یہ واقعی ظلم ہے اور کسی معاشرے میں اس کی کوئی گنجائش نہیں لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کیا عافیہ صدیقی عورت نہیں تھی' کیا اس کا تعلق پاکستان سے نہیں تھا اور کیا یہ مسلمان نہیں۔ ایک مسلمان عورت کو پاکستان کی ایجنسیوں نے اس کے معصوم بچوں کے ساتھ اغواء کیا' اس کے بچے اس سے جدا کئے' پہلے پاکستان میں اس کے ساتھ ٹارچر اور بدسلوکی ہوئی' پھر اسے امریکہ کے حوالے کیا گیا' امریکی فوجی بگرام میں پانچ سال تک اس خاتون پر جسمانی' ذہنی' روحانی اور جنسی تشدد کرتے رہے' امریکی ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق عافیہ صدیقی کے ساتھ جنسی زیادتی ہوتی رہی لیکن ہماری کسی وومن ایکٹوسٹ اور زنانہ حقوق کی کسی تنظیم نے عافیہ صدیقی کے حق میں جلوس نہیں نکالا' ہماری ماڈرن بہنوں نے اس ظلم پر امریکا کی مذمت نہیں کی' کیوں؟ کیا ہم اس کا یہ مطلب لیں کہ اگر کلین شیو امریکی فوجی پانچ سال تک کسی مسلمان پاکستانی عورت پر ظلم کرتے رہیں تو یہ ظلم' ظلم نہیں ہوتا جبکہ اس کے مقابلے میں اگر کوئی داڑھی والا شخص (اور شخص بھی وہ جس کی قومیت' مذہب اور پس منظر ابھی تک واضح نہیں ہوا) کسی خاتون کو ایک منٹ گیارہ سیکنڈ تک کوڑے مارے تو یہ ظلم ہے! کیا جامعہ حفصہ کی دو ہزار بچیاں عورتیں نہیں تھیں اور کیا بلوچستان کی وہ 260 بچیاں عورت نہیں جو ابھی تک گھروں سے غائب ہیں۔ ہمیں ماننا پڑے گا ہم ظلم کے معاملے میں بھی "ڈبل سٹینڈرڈ" کے شکار ہیں' ہم امریکی ظالم کو ظالم کہتے ہوئے گھبراتے ہیں جبکہ کسی باریش شخص کی حماقت کو ظلم عظیم کا درجہ دے دیتے ہیں۔ ہمیں چاہئے ہم فیصلہ کریں آج سے ہماری نظر میں عافیہ صدیقی اور اس

نامعلوم خاتون میں کوئی فرق نہیں! اور ہم امریکی اور یورپی ظالم کو بھی اتنا ہی ظالم سمجھتے ہیں جتنا اس مظلوم عورت کو سرعام کوڑے مارنے والوں کو کہتے ہیں چنانچہ میں این جی اوز کے اس رویے پر بھی احتجاج کرتا ہوں۔

اور اس واقعے کا چوتھا اور آخری پہلو اسلام دشمنی ہے' پوری دنیا ایک نامعلوم شخص کے غیر انسانی' غیر اخلاقی اور غیر شرعی اقدام کی بنیاد پر اسلام اور مسلمانوں کو برا کہہ رہی ہے' کیوں؟ کیا ایک مسلمان کے گناہ' غلطی یا جرم کی بنیاد پر پورے اسلام کو گالی دینا انصاف ہے؟ دوسرا سعودی عرب کی عدالت نے 10 مارچ 2009ء کو ایک 75 سالہ خاتون کو غیر محرم مردوں کے ساتھ ملاقات کے جرم پر 40 کوڑوں کی سزا دی تھی' دنیا اس سزا پر کیوں خاموش ہے؟ اور سوات کے اس واقعے پر کیوں چیخ رہی ہے؟ کہیں اس لئے تو نہیں کہ سعودی عرب ایک امیر ملک ہے چنانچہ دنیا کیلئے ان کے سارے فیصلے قابل قبول ہیں جبکہ پاکستان ایک غریب ملک ہے چنانچہ کسی بھی نامعلوم ویڈیو کے جرم پر اس کو جہالت' بربریت اور وحشت کی گالی دے دی جائے اور ہم غربت کی وجہ سے یہ گالی چپ چاپ سہہ جائیں گے' میں مسلمان ہوں' پاکستانی ہوں اور اس رویے پر بھی پوری دنیا کے سامنے احتجاج کرتا ہوں کیونکہ کسی شخص کو غربت کی وجہ سے مجھے وحشت اور بربریت کی گالی دینے کا حق حاصل نہیں۔

⊘ ⊘ ⊘

عظمت کا لمحہ

قدیم یونان کے لوگ رات کو اپنی پگڑیاں' دستاریں اور ٹوپیاں دروازے پر لٹکا دیتے تھے' ان کا خیال تھا عظمت کی دیوی رات کے وقت اپنے آسمانی مسکن سے نکلتی ہے' ایک ایک دستار' ایک ایک پگڑی اور ایک ایک ٹوپی کے پاس رکتی ہے اور اسے ان ٹوپیوں' ان پگڑیوں اور ان دستاروں میں سے جو پسند آ جاتی ہے وہ اپنی سونے کی چھڑی اس پر رکھ دیتی ہے اور عظمت کی دیوی کی یہ چھڑی جس دستار کو چھو جاتی ہے اس دستار کا مالک زمانے میں عظیم ہو جاتا ہے' اسے عزت' شہرت اور عظمت نصیب ہو جاتی ہے' اہل یونان کا ایمان تھا یہ دیوی دنیا میں ایک بار ہر شخص کے دروازے پر جاتی ہے اور اگر اس رات اس شخص نے اپنی دستار دروازے پر لٹکا رکھی ہو تو وہ اس کی دستار کو اپنی چھڑی سے چھو دیتی ہے اور اگلی صبح جب وہ شخص اپنی دستار پہنتا ہے تو دیوی کی عظمت اس کے سر' اس کے ماتھے میں نفوذ کر جاتی ہے اور یوں وہ شخص معتبر ہو جاتا ہے' اہل یونان رات کے اس پل کو عظمت کا لمحہ کہتے تھے اور ان کا خیال تھا یہ دنیا کا قیمتی ترین لمحہ ہوتا ہے اور دنیا کے تمام خزانے مل کر بھی اس ایک لمحے کی برابری نہیں کر سکتے' اہل روم کا خیال ان سے ذرا مختلف تھا' یہ لوگ سمجھتے تھے دیوتاؤں کا دیوتا دنیا کے ہر انسان پر عظمت کا ایک لمحہ اتارتا ہے اور انسان اگر اس لمحے سے لپٹ جائے تو وہ ستارہ بن جاتا ہے' وہ انسانوں کی صف سے نکلتا ہے' آسمان پر پرواز کرتا ہے اور آسمان کے ستاروں کا حصہ بن جاتا ہے اور پھر ابد تک چمکتا رہتا ہے' اہل روم کا خیال تھا دنیا میں جو لوگ اس لمحے کو کھو دیتے ہیں وہ پتھر بن جاتے ہیں اور دنیا کے تمام پتھر وہ بدنصیب لوگ ہیں جنہوں نے عظمت کے لمحے کھو دیئے تھے اور آسمانوں کے تمام ستارے وہ خوش نصیب لوگ تھے جو عظمت کے اس لمحے سے لپٹ گئے اور ابدی ہو گئے لیکن عربوں کا خیال ان دونوں سے مختلف تھا' عرب سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ دنیا کے ہر انسان کو ایک بار خیر اور شر میں سے کسی ایک کے انتخاب کا موقع دیتا ہے اور انسان اس لمحے جس کا انتخاب کرتا ہے اس کا اختتام ہمیشہ اس پر ہوتا ہے' عربوں کا خیال تھا معاشرے میں جو شخص جتنا بڑا ہوتا ہے قدرت اسے اتنی ہی کثرت سے خیر اور اتنے ہی وسیع شر کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے اور انسان اپنی اوقات' مرتبے اور صلاحیت کے مطابق خیر اور شر کا انتخاب کرتا ہے۔

میں ایک کم عقل دنیا دار شخص ہوں لہٰذا میں نہیں جانتا عربوں کا تصور درست تھا' اہل روم کا خیال صحیح تھا یا پھر اہل یونان درست سوچتے تھے لیکن مجھے اتنا معلوم ہے اللہ تعالیٰ' قدرت یا آسمانی طاقتیں اپنے بندوں پر ایسے لمحے ضرور اتارتی ہیں جب انکا ایک فیصلہ انہیں عظیم یا بدترین بنا دیتا ہے' یہ وہ لمحہ اور یہ وہ فیصلہ ہوتا ہے جب ایک شخص حضرت امام حسینؓ بن جاتا ہے اور دوسرا یزید' جب ایک شخص ٹیپو سلطان بنتا ہے اور دوسرا میر صادق' جب ایک شخص اسامہ بن لادن بنتا ہے اور دوسرا بش' قدرت خیر اور شر کے اس انتخاب' دائیں اور بائیں کی پسند اور منفی اور مثبت کے اس چناؤ کا موقع دنیا کے ہر شخص کو دیتی ہے اور اس ایک لمحے کا فیصلہ انسان کی ذلت اور عظمت کا تعین کرتا ہے' دنیا کے تمام بڑے' عظیم اور شاندار لوگ اسی ایک لمحے سے نکلے ہیں اور دنیا کے تمام برے' بدبخت اور قابل ملامت اشخاص بھی اسی لمحے کی پیداوار ہیں' دنیا کا ہر انسان محض ایک انسان ہوتا ہے لیکن یہ اس قیمتی لمحے کا وہ فیصلہ ہوتا ہے جو ہمیں اچھا یا برا بناتا ہے' جو ہمیں پہاڑوں سے بلند' سونے سے قیمتی اور دیوتاؤں سے مضبوط بناتا ہے اور جو ہمیں طبعی زندگی کے دائرے سے نکال کر تاریخ کا حصہ بنا دیتا ہے' یہ سقراط کا وہ "انکار" ہوتا ہے جو مرنے کے بعد بھی اسے پانچ ہزار سال تک زندہ رکھتا ہے اور جو اسکی زندگی کو دنیا کے آخری انسان کی آخری سانس تک پھیلا دیتا ہے' میری پچھلے دنوں معطل چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سے ملاقات ہوئی تھی' میں انکے پاس اکثر حاضر ہوتا رہتا ہوں اور وہ میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں' اس ملاقات میں انہوں نے فرمایا تھا "اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اچھے فیصلے کرنے کی ہمت دیتا ہے' وہ انہیں ڈٹ جانے کا حوصلہ دیتا ہے اور مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے 9 مارچ 2007ء کو ایک ایسا ہی فیصلہ کرنے کا چانس دیا' میں نے یہ چانس ضائع نہیں ہونے دیا اور اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے استقامت بخشی اور اس استقامت کے نتیجے میں آج پورے پاکستان کے عوام میرے پیچھے کھڑے ہیں" میں نے ان سے اتفاق کیا اور اسکے بعد عرض کیا "آپ اگر 9 مارچ کو صدر مشرف کیسامنے انکار نہ کرتے تو آپ بھی محض ایک جج ہوتے اور آج لوگ آپکا نام تک بھول چکے ہوتے" چودھری صاحب نے میری بات سے اتفاق کیا۔

دنیا کا سب سے مشکل سوال حقیقت یا سچائی ہوتی ہے' کون سچا ہے؟ کس کا مؤقف درست ہے اور کون سچائی پر ہے؟ یہ سوال آج تک انسان کو گمراہ کر رہا ہے لیکن اس کا جواب آج سے چودہ سو سال پہلے حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے دے دیا تھا اور یہ وہ شخص تھا جس کا دل اور جس کی روح مسلمان اور بدن مشرک تھا چنانچہ جب اس کا انتقال ہوا تو نبی رسالتؐ نے عرب کے ریگزاروں میں اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی تھی اور سینکڑوں صحابہ کرام نے نبی رسالتؐ کے ساتھ مل کر اس کیلئے دعائے مغفرت کی

تھی' تاریخ بتاتی ہے مسلمان نجاشی کے پاس پناہ گزین ہوئے اور کفار مکہ نے ان لوگوں کی واپسی کیلئے نجاشی کے دربار میں سفارت بھجوائی' کفار مکہ نے نجاشی کے دربار میں مسلمانوں کے خلاف ایک لمبی چوڑی تقریر کی' نجاشی نے اس تقریر کے بعد حضرت جعفر طیارؓ کو جواب دینے کا موقع دیا' حضرت جعفر طیارؓ کے خطاب کے بعد نجاشی نے ان سے چند سوال پوچھے' ان سوالوں میں ایک سوال تھا'' تمہارے نبیؐ کو ماننے والے اولین لوگ کون تھے'' حضرت جعفرؓ نے فوراً فرمایا'' یہ مکہ کے عام لوگ ہیں' ان میں غلام ہیں' مسکین ہیں اور معاشرے کے محروم لوگ ہیں'' نجاشی نے فوراً کہا'' بے شک یہ نبی سچا ہے'' میں نے جب یہ واقعہ پڑھا تھا تو میں نے حیرت سے سوچا تھا نبوت کی سچائی کا عام لوگوں کے ایمان کے ساتھ کیا تعلق؟ بڑے عرصے بعد معلوم ہوا سچائی اللہ کی وہ نعمت ہے جو سب سے پہلے محروم' مسکین اور عام لوگوں تک پہنچتی ہے اور غریب اور محروم شخص کا خیال' اس کی پسند اور اس کی رائے ہمیشہ سچی ہوتی ہے' قدرت ہمیشہ محروم لوگوں کی آوازوں میں بولتی ہے اور دنیا کی ہر اچھائی محروم طبقوں سے ہو کر بالائی طبقوں تک پہنچتی ہے اور برائی ہمیشہ بالائی طبقوں سے زیریں طبقوں تک آتی ہے چنانچہ دنیا کے ہر نبی کو سب سے پہلے عام شخص نے تسلیم کیا تھا اور حضرت ابراہیمؑ ہوں یا حضرت محمدؐ معاشرے کے بالائی طبقے سب سے آخر میں ان پر ایمان لائے تھے' معلوم ہوا عام انسان کی بات کبھی غلط نہیں ہوتی اور جو حکمران عام انسان کی بات نہیں سنتا وہ کبھی عظمت کے تخت تک نہیں پہنچ پاتا۔

آپ بدقسمتی دیکھئے عظمت کی یہ دیوی آصف علی زرداری کے دروازے پر کھڑی رہی لیکن افسوس آصف علی زرداری نے یہ لمحہ کھو دیا' زرداری صاحب 28 دسمبر تک ایک عام انسان تھے لیکن پھر قدرت نے انہیں ایک بڑا انسان' ایک عہد ساز شخصیت بننے کا موقع دیا' عظمت کی دیوی ساڑھے چار ماہ تک ان کے دروازے پر کھڑی رہی لیکن افسوس زرداری صاحب نے اس کی چھڑی اپنی دستار تک نہ پہنچنے دی اور اب یہ لمحے میاں نواز شریف کے دروازے پر کھڑے ہیں اور اگر میاں نواز شریف نے بھی یہ لمحے کھو دیئے تو یہ دونوں چند مہینوں میں ماضی کا قصہ عبرت بن جائیں گے اور عظمت کے یہ لمحے ان انسانوں کے دروازوں پر جا رکیں گے جو قدرت کی چاپ سن سکتے ہیں' جو اللہ کی مہربانی کا شکر ادا کر سکتے ہیں' آپ عجیب بات دیکھئے دنیا میں حکومتیں' وزیراعظم اور وزراء ہزاروں ہوتے ہیں لیکن قدرت ان میں سے کسی کسی کو لیڈر بننے کا موقع دیتی ہے اور اللہ نے پہلے یہ موقع آصف علی زرداری کو دیا تھا اور یہ لمحہ اب میاں نواز شریف کے دروازے پر کھڑا ہے اور جس دن میاں نواز شریف تمام مجبوریوں اور سمجھوتوں سے آزاد ہو کر آگے بڑھ گئے اس دن عظمت کا تاج میاں صاحب کے سر پر ہوگا اور اگر میاں صاحب نے

بھی'' اگر' مگر' چونکہ اور چنانچہ'' میں یہ موقع کھو دیا تو تاریخ میں میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری ہمسائے ہوں گے اور ان کے چہرے وقت کی گھاس اور عبرت کی ریت میں دفن ہو جائیں گے' پاکستان کا عام شہری ججوں کی بحالی چاہتا ہے اور جس شخص نے عام انسان کی اس سچائی کو نہ پہچانا وہ ہماری آنکھ کے سامنے وقت کے قبرستان میں دفن ہو جائے گا اور جس نے آگے بڑھ کر عام انسانوں کی خواہشوں کا ہاتھ پکڑ لیا اس پر عظمت کے لمحے قربان ہو جائیں گے۔

⊘ ⊘ ⊘

اینڈ آف ڈے

آپ دو بھائیوں کی مثال لیں' پہلا بھائی بے انتہائی لالچی' موقع پسند' مفاد پرست اور کرپٹ تھا جبکہ دوسرا بھائی ایماندار' دین دار' مثبت سوچ کا حامل اور قناعت پسند تھا' دونوں بھائی عملی زندگی میں داخل ہوئے تو پہلے بھائی نے میڈیکل سٹور کھول لیا جبکہ دوسرا بھائی سکول ٹیچر بن گیا' پہلے بھائی نے چند ہی ماہ میں میڈیکل سٹور کو ٹکسال بنا لیا' وہ دوائیں سٹاک کرتا جب مریض دواء کی تلاش میں ایڑھیاں رگڑنے لگتے تو وہ دوگنی اور تین گنی قیمت میں دوائیں بیچتا' وہ نقلی اور جعلی دوائیں بھی بناتا تھا' وہ ایکسپائرڈ دوائیں بھی فروخت کرتا تھا اور وہ نشے کے ٹیکے بھی بیچتا تھا' اس نے جعلی ڈراپس' آنکھ کے جعلی قطروں اور دو نمبر مرہموں کی فیکٹری بھی لگا لی اور وہ لوگوں کو دردکش دوائیں اور سٹیرائیڈز بھی بیچنے لگا' اس نے دو تین سال میں شہر میں نصف درجن کے قریب میڈیکل سٹور بنا لئے' اس نے ڈاکٹروں کو قرضے دے کر شہر میں نئے کلینکس اور ہسپتال بھی بنوائے اور وہ ڈاکٹروں کے ساتھ مل کر عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے لگا' اس شہر میں کبھی صرف ایک ڈاکٹر اور دو میڈیکل سٹور ہوتے تھے لیکن اس بھائی کی مہربانی سے شہر میں دو سے تین درجن کلینکس بن گئے اور میڈیکل سٹورز کا کوئی شمار قطار نہ رہا' شہر کا جو بھی شخص ایک بار کسی ڈاکٹر کی دہلیز پر قدم رکھ دیتا تھا' دوائی اس کے معمول کا حصہ بن جاتی تھی اور شہر میں کوئی ایسا شخص اور کوئی ایسا گھرانہ نہیں بچا تھا جو ہفتے میں کم از کم ایک دن اس کے کسی سٹور سے دواء نہیں خریدتا تھا چنانچہ اس کا کاروبار دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا اور وہ شہر کا متمول ترین شخص بن گیا' شہر کی سب سے بڑی کوٹھی اس کی ملکیت تھی' شہر کے مضافات میں اس کا ایکڑوں پر محیط فارم ہاؤس تھا' شہر میں سب سے زیادہ گاڑیاں اس کے پاس تھیں اور اس کی دکانوں اور گھروں میں ساٹھ ستر کے قریب ملازم تھے' اس کے بچے لاہور اور مری میں پڑھتے تھے اور وہ چھوٹے شہر میں رہنے کے باوجود شہزادوں اور بادشاہوں جیسی زندگی گزارتا تھا۔

دوسرا بھائی اس سے یکسر مختلف تھا' وہ سکول میں سوا تین ہزار روپے کا ملازم تھا' وہ پوری ایمانداری سے بچوں کو پڑھاتا تھا' اس نے زندگی میں کبھی سکول سے چھٹی نہیں کی' اس کے والد کا انتقال

ہوا تو وہ والد کی تدفین کے بعد سیدھا سکول پہنچا اور اس دن بھی اس نے کلاس لی' وہ سکول کا وقت ختم ہونے کے بعد بھی سکول میں رک جاتا تھا اور وظیفے کے امتحان دینے والے بچوں کو مفت ٹیوشن پڑھاتا تھا' وہ سکول کے نالائق بچوں کو جمع کرتا تھا اور شام کو انہیں گھر لے آتا تھا' اپنے گھر سے انہیں کھانا کھلاتا تھا اور رات گئے تک انہیں پڑھاتا تھا' اپنے بچوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ بڑا شاندار تھا' وہ اپنے بچوں کو خود سکول چھوڑتا تھا' انہیں سکول سے لے کر اپنے سکول آتا تھا' انہیں کسی درخت کے نیچے بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا تھا اور اس کے بعد انہیں ہوم ورک کراتا تھا' اس نے اپنے بچوں کو تیسری چوتھی کلاس میں شیکسپیئر کے پورے پورے ڈرامے رٹا دیئے تھے' اس کے بچے ریاضی کے مشکل سے مشکل سوال چٹکی بجا کر حل کر دیتے تھے' وہ اپنے شاگردوں اور بچوں کو اخلاقیات بھی سکھاتا تھا' اس نے انہیں روز نہانے' دانت صاف کرنے' بال بنانے' ناخن تراشنے' سلام میں سبقت کرنے' بڑوں کی عزت کرنے اور ورزش کرنے کی عادت بھی ڈال دی تھی' وہ اپنے شاگردوں اور بچوں کو اعتماد اور بہادری کا سبق بھی دیتا تھا چنانچہ اس کے بچے اور شاگرد اعتماد کی دولت سے مالا مال تھے' دوسرے بھائی نے اپنے حلقے میں شامل ہونے والے ہر بچے کو قناعت اور وسعت قلبی کی دولت سے نواز دیا' وہ لوگوں کو نماز اور روزے کی عادت بھی ڈال دیتا تھا' اس نے اپنے شاگردوں اور بچوں کو مطالعے اور غور و فکر کی عادت بھی ڈال دی تھی اور وہ لوگوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیتا تھا چنانچہ اس کے شاگرد اور بچے آگے سے آگے بڑھتے چلے گئے' اس کے تمام بچوں نے وظیفے حاصل کئے اور اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر پاکستان کے بڑے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتے چلے گئے' اس کے ایک بیٹے نے ایف ایس سی میں لاہور بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور سرکاری وظیفے پر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخل ہوا اور وہاں بھی تمام کلاسوں میں پہلی پوزیشن حاصل کی' میڈیکل کالج سے فارغ ہونے کے بعد وہ سکالرشپ پر امریکہ گیا' وہاں سے اس نے لیزر میں سپیشلائزیشن کی اور کراچی میں آ کر لیزر سرجری کا کلینک بنا لیا' وہ آج کل کراچی میں سب سے زیادہ ٹیکس دینے والا ڈاکٹر ہے' دوسرے بیٹے نے سی ایس ایس کیا' فارن سروس جوائن کی اور وہ آج کل یورپ کے ایک ملک میں قونصلر ہے' تیسرا بیٹا ایم اے کرنے کے بعد سیاست میں آیا اور آج کل پارلیمنٹ کا ممبر ہے جبکہ ماسٹر صاحب کے شاگرد پورے ملک میں بکھرے ہوئے ہیں اور تمام بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں یا پھر کامیاب بزنس مین ہیں' ماسٹر صاحب پاکستان کے جس شہر میں جاتے ہیں درجنوں با اثر لوگ ننگے پاؤں ان کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔

یہ دوسرے بھائی کی کہانی تھی' اب پہلے بھائی کی طرف واپس آتے ہیں' پہلے بھائی نے

کروڑوں روپے کمائے' وہ پوری زندگی اپنے سکول ٹیچر بھائی کی غربت اور بے وقوفی پر ہنستا رہا' اس کا خیال تھا اس کا بھائی زمینی حقائق سے ناواقف ہے چنانچہ وہ اپنا وقت اور توانائی ضائع کر رہا ہے' وہ بھائی کو ہمیشہ پرائیویٹ سکول کھولنے یا اپنے ساتھ میڈیکل سٹور بنانے کا مشورہ دیتا تھا لیکن دوسرے بھائی نے ہمیشہ ہنس کر ٹال دیا' وہ اپنی غربت اور فقر و فاقے میں خوش تھا' پہلا بھائی اس پر ہنستا رہا اور اپنی دولت میں اضافہ کرتا رہا لیکن پھر ایک عجیب واقعہ پیش آیا' چالیس سال کی عمر میں پہلے بھائی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا' وہ اس اٹیک سے بچ گیا لیکن اس کی صحت نہ سنبھل سکی' اس نے بائی پاس کرایا' آپریشن ٹھیک نہ ہوا اور اس کے پھیپھڑوں میں پانی پڑ گیا' اس نے پھیپھڑوں کا علاج کرایا تو گردے جواب دے گئے' اس نے گردہ خرید لیا تو اس کا لبلبہ جواب دے گیا' اس نے انسولین لینا شروع کی تو اس کے گلے میں کینسر نکل آیا' اس نے کینسر کا آپریشن کرایا تو اس کے گھٹنے جواب دے گئے اور اس نے گھٹنے تبدیل کرائے تو اس کے دماغ میں رسولی نکل آئی' غرض وہ ایک مسئلے سے نکلتا تو دوسرے میں داخل ہو جاتا یہاں تک کہ وہ بستر سے لگ گیا اور بیس برس کی لگاتار بیماری کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا' اس نے زندگی میں اپنے بچوں کو کبھی گرم ہوا نہیں لگنے دی تھی' بچے پیسے کی فراوانی کی وجہ سے زیادہ پڑھ بھی نہیں سکے چنانچہ باپ کے انتقال کے بعد ان کے ہاتھ میں اثاثے آئے تو وہ آپس میں لڑ پڑے' کاروبار اور بینک بیلنس کا بٹوارہ ہوا' بچوں نے باپ کی زمین جائیداد بیچی اور لاہور اور اسلام آباد شفٹ ہو گئے وہاں انہوں نے غلط موقع پر غلط انویسٹمنٹ کی اور سارا پیسہ برباد کر دیا یہاں تک کہ وہ کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے' آج کل پہلے بھائی کا ایک بیٹا لاہور کی ایک کچی آبادی میں کریانے کی چھوٹی سی دکان کرتا ہے' دوسرا بیٹا اسلام آباد کے ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس ملازم ہے اور تیسرا بیٹا نشے میں دھت ہو کر سڑکوں پر پڑا رہتا ہے جبکہ اس کی بیوہ اپنی بیٹی کے ٹکڑوں پر پل رہی ہے' پہلے بھائی کی ساری سلطنت ''اینڈ آف دی ڈے'' برباد ہو گئی۔

ہم اب دونوں بھائیوں کی کہانی کے نتیجے کی طرف آتے ہیں' دنیا میں زندگی گزارنے کے دو راستے ہوتے ہیں' برائی کا راستہ اور اچھائی کا راستہ' برائی کا راستہ خوبصورت بھی ہوتا ہے اور شارٹ کٹ بھی' انسان اس راستے پر چل کر بہت جلد دولت' اختیار اور آسودگی پا لیتا ہے لیکن سفر کے درمیان یا آخر میں یہی آسودگی' یہی اختیار اور یہی دولت اس کی سب سے بڑی ناکامی بن جاتی ہے' اسے کوئی بیماری لگتی ہے اور اس بیماری کا علاج اس کی آدھی دولت کو نگل جاتا ہے' باقی دولت اس کی نالائق اولاد اجاڑ دیتی ہے اور آخر میں وہ انسان اور اس کا خاندان زیرو پوائنٹ پر کھڑا ہو جاتا ہے' اس کے برعکس دوسرا راستہ ذرا طویل' مشکل اور کٹھن ہوتا ہے' اس راستے پر چلنے والے لوگ دوران سفر زیادہ سہولتیں حاصل نہیں کر پاتے'

انہیں فاقے بھی کاٹنے پڑتے ہیں اور اپنی خواہشوں اور حسرتوں کی قربانی بھی دینا پڑتی ہے لیکن سفر کے آخری حصے میں وہ دنیا کی تمام نعمتیں پا جاتے ہیں' انہیں دولت بھی ملتی ہے' عزت بھی' شہرت بھی' نیک نامی بھی اور سکون بھی' آپ واپس دونوں بھائیوں کی طرف آئیں' آج پہلا بھائی قبر میں عذاب بھگت رہا ہے جبکہ دوسرا بھائی ستر سال کی عمر میں بھی صحت مند ہے' اسے دل کا عارضہ لاحق ہے اور نہ ہی پیشاب کی تکلیف' وہ روزانہ پیٹ بھر کر کھانا کھاتا ہے اور پانچ پانچ کلومیٹر واک کرتا ہے' پہلے بھائی کے بچے کوڑی کوڑی کے محتاج ہیں جبکہ دوسرے بھائی کے بچے کروڑوں میں کھیل رہے ہیں' پہلا بھائی بدنامی اور عبرت کا نشان بن چکا ہے جبکہ دوسرے بھائی کے استقبال کیلئے سینکڑوں لوگ جمع ہو جاتے ہیں چنانچہ اینڈ آف دی ڈے دوسرا بھائی کامیاب قرار پایا۔

مجھے یہ واقعہ میرے ایک استاد نے سنایا تھا اور آخر میں مجھے مشورہ دیا تھا ''تم جب بھی زندگی کی منصوبہ بندی کرنا اینڈ آف دی ڈے کو سامنے رکھ کر اس کی پلاننگ کرنا' تم خسارے میں نہیں رہو گے'' میں آج سوچتا ہوں کاش ہمارے صدر پرویز مشرف کا بھی کوئی استاد ہوتا تو وہ یوں آج تنہا نہ ہوتے' یوں آج ہر چیز ان کے ہاتھ سے نہ نکل رہی ہوتی!

⊘ ⊘ ⊘

مٹی کیلئے

انسان کی زندگی میں چند دن بہت اہم ہوتے ہیں' یہ دن اس کی زندگی کا سارا رخ' سارا دھارا' ساری سوچ بدل دیتے ہیں' میری زندگی میں بھی چند ایسے دن آئے تھے۔ ایک وہ دن تھا جب میں نے کلاس کی آخری کرسی پر بیٹھ کر پہلی پوزیشن حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک وہ دن تھا جب مجھے معلوم ہوا دنیا انسان سے سارے حق چھین سکتی ہے لیکن اس سے محنت کرنے' محبت کرنے' اللہ کے حضور توبہ کرنے اور اس سے دعا کرنے کا حق نہیں چھین سکتی۔ ایک وہ دن تھا جب میں نے اپنے اندر کے خوف کو نکال کر پھینک دیا تھا' میں نے یہ یقین کر لیا تھا زندگی' عزت اور رزق اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے چنانچہ لوگوں سے' حکومتوں سے اور حالات سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں اور ایک وہ دن تھا جس نے مجھے زندگی کی ایک حقیقت سے روشناس کرایا جس کو میں اور میرے جیسے لوگ عمر بھر نہیں سمجھ پاتے۔ یہ 18 اپریل 2007ء کا دن تھا' اس دن اخبار کے اندرونی صفحات پر ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی اور اس خبر نے میرے ذہن کو جڑوں سے ہلا دیا۔ یہ کبیر والا کے چار سگے بھائیوں کی پھانسی کی خبر تھی اور ایسی خبریں عموماً اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن اس خبر میں ایک ایسا فقرہ تھا جس میں دس ہزار سال کی دانش چھپی تھی اور ہم عموماً زندگی کے ہنگاموں میں اس دانش پر توجہ نہیں دیتے۔ میں اس فقرے کی طرف تو بعد میں آؤں گا' پہلے آپ کو اس خبر کے مندرجات بتاتا چلوں۔ کبیر والا میں لکھانام کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے' اس گاؤں میں دو خاندانوں کے درمیان زرعی زمین کی ملکیت پر تنازعہ چل رہا تھا' اس تنازعے کے دوران ایک خاندان کے چار بھائیوں نے 15 اپریل 1999ء کو دوسرے خاندان کے 13 افراد کو کلہاڑیوں کے ذریعے قتل کر دیا۔ قتل ہونے والوں میں پانچ خواتین اور دو معصوم بچے بھی شامل تھے' مجرم واردات کے بعد گرفتار ہوئے' ان کے خلاف مقدمہ چلا اور ڈسٹرکٹ جج خانیوال نے چاروں بھائیوں کو 13 مرتبہ پھانسی دینے کا حکم دے دیا۔ مجرموں نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی لیکن یہ اپیل ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ دونوں نے خارج کر دی۔ مجرموں نے بعد ازاں صدر مملکت سے رحم کی اپیل کی لیکن صدر پرویز مشرف نے بھی 28 دسمبر 2006ء کو یہ اپیل مسترد کر دی اور یوں چار بھائیوں کو 17 اپریل

2007ء کو سینٹرل جیل ملتان میں صبح ساڑھے چار بجے پھانسی دے دی گئی۔ یہ تھی اس کیس کی مختصر سی روداد۔ اب آتے ہیں اس فقرے کی طرف میں نے جس کے بارے میں عرض کیا تھا اس فقرے میں دس ہزار سال کی دانش موجود ہے اور اس فقرے کی وجہ سے یہ خبر اور 17 اپریل کا وہ دن میری زندگی کا اہم ترین دن بن گیا۔ پھانسی کے بعد ان چاروں بھائیوں کی نعشیں بستی لکھانے جائی گئیں اور انہیں اسی زمین میں دفن کر دیا گیا جسکی ملکیت کیلئے انہوں نے 13 افراد کو قتل کیا تھا۔ خبر نگار نے خبر کے آخر میں لکھا تھا ''چار بھائیوں نے جس زمین کیلئے 13 لوگوں کو قتل کیا وہ بالآخر اسی زمین میں دفن ہو گئے'' اور یہ فقرہ تھا جس نے مجھے بتایا دنیا کے کسی انسان کو زمین کیلئے کوئی جرم نہیں کرنا چاہئے کیونکہ زمین آج تک کسی کی ملکیت نہیں ہوئی۔

ہم لوگ جس زمین' جس جائیداد کو اپنی کہتے ہیں اس کے تین بڑے دلچسپ پہلو ہیں' اس کا پہلا پہلو بے وفائی ہے' دنیا کے تمام مکان' گھر' عمارتیں اور دکانیں تیس سال بعد اپنا مالک یا مکین تبدیل کر لیتی ہیں۔ میرے دادا نے جو مکان بنایا تھا میرے والد اور چچا اس مکان میں نہیں رہے' میرے والد نے ہمارے لئے جو گھر بنایا ہم لوگ اس میں نہیں رہے اور میں نے جو مکان اپنے اور اپنے بچوں کیلئے بنایا ہے میرا اندیشہ ہے میرے بچے بھی اس میں نہیں رہیں گے کیونکہ انسان ایک ایسا جانور ہے جس کی ہر نسل اپنا نیا گھونسلہ اپنا نیا بل بناتی ہے اور دنیا میں ہم سب لوگ اپنی آنکھوں سے اپنے بنائے ہوئے مکانوں کو خالی اور اداس ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ دوسری حقیقت اس سے بھی دلچسپ ہے' دنیا میں سو سال بعد بستیوں اور شہروں کی ساری ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے' گاؤں کی جگہ شہر آباد ہو جاتے ہیں اور شہروں کی جگہ بڑے شہر لے لیتے ہیں۔ آپ غور کیجئے دنیا کے تمام قدیم شہر آج اس جگہ نہیں ہیں جس جگہ انہیں آباد کرنے والوں نے آباد کیا تھا' لاہور راوی کے کنارے تھا اور بارہ دروازوں کے اندر قید تھا لیکن آج راوی لاہور کے مضافات میں شفٹ ہو چکا ہے جبکہ لاہور دروازے توڑ کر باہر نکل گیا ہے' اصل لاہور نئے لاہور کی بنیادوں میں دفن ہو چکا ہے اور آج اسکی یاد تک تاریخ کے اوراق میں گم ہو چکی ہے۔ یہی صورتحال کراچی' حیدر آباد' کوئٹہ' پشاور اور راولپنڈی کی ہے۔ یہ تمام پرانے شہر نئے شہروں کی بنیاد بن گئے ہیں۔ رہ گیا اسلام آباد تو یہ چالیس برس پہلے جنگل تھا اور اس جنگل کے اندر چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ نجی بٹ اسلام آباد کی ایک مشہور شخصیت ہیں' بٹ صاحب اسلام آباد کے ابتدائی ٹھیکیداروں میں شمار ہوتے ہیں' انہوں نے اپنی آنکھوں سے آبپارہ مارکیٹ کے پیچھے گاؤں دیکھا تھا' وہ اس جنگل کے چشموں میں نہاتے بھی رہے ہیں اور انہوں نے جب زیرو پوائنٹ کے قریب گھر بنایا تھا تو اس گھر سے چند گز کے فاصلے پر

گاؤں تھا لیکن آج چالیس برس بعد یہ جنگل پاکستان کا مہنگا ترین شہر بن چکا ہے۔ آپ تصور کیجئے آج جس جگہ ایف ٹین یا ای سیون کے سیکٹر آباد ہیں وہاں کبھی بستی لکھا جیسے گاؤں تھے اور اس گاؤں کے لوگ بھی زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کیلئے ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے لیکن آج وہ زمین کس کی ملکیت ہے؟ آج اس پر کون آباد ہے؟ آپ تیسری حقیقت بھی ملاحظہ کیجئے' دنیا میں پانچ سو سال بعد زمین اپنی شیپ تبدیل کر دیتی ہے' شہروں کی جگہ جھیلیں بن جاتی ہیں' جھیلوں کی جگہ گاؤں آباد ہو جاتے ہیں' دیہات سڑکوں میں دفن ہو جاتے ہیں' سڑکیں جنگلوں میں گم ہو جاتی ہیں' جنگل ویرانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں' ویرانے باغ بن جاتے ہیں' باغ دلدل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں' دلدلیں صحرا بن جاتی ہیں اور صحرا دریاؤں میں گم ہو جاتے ہیں۔ گویا پانچ سو سال بعد زمین کے سارے نین نقش تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگ آج جس جگہ بیٹھے ہیں یہ زمین کبھی مغل شہزادوں کی ملکیت تھی' اس سے پہلے خاندان غلاماں اسکا مالک تھا' اس سے پہلے محمود غزنوی نے اسے تاراج کیا تھا' اس سے قبل اشوک اعظم اسکا مالک تھا اور اس سے قبل کورے اور پانڈے اسکے حکمران تھے۔ اس زمین کو سکندر اعظم نے بھی اپنی ملکیت بنانے کی کوشش کی تھی اور راجہ اندر نے بھی اور اس پر بودھوں نے بھی اپنی مہر لگائی تھی' اسے چنگیز خان نے بھی ہضم کرنے کی کوشش کی تھی اور تیمور لنگ بھی اسے اپنے قدموں میں روندنے کی خواہش لیکر یہاں آیا تھا لیکن وہ سب لوگ اپنی اپنی بولی بول کر رخصت ہو گئے اور آج اس پر ہمارا بسیرا ہے اور کل یہ کسی دوسرے کی ملکیت ہوگی۔

جی ہاں صرف پانچ سو سال بعد ہماری رہائش گاہیں' ہمارے شہر کسی جھیل میں دفن ہوں گے یا پھر ہماری آرزوؤں اور خواہشوں کے محلوں سے دریا گزر رہے ہوں گے اور ہماری ہڈیوں کی خاک تک کا نشان ان ہواؤں میں موجود نہیں ہوگا لیکن اس کے باوجود انسان زمین کیلئے لڑتا ہے' یہ اسے اپنی ملکیت بنانے کے خبط میں مبتلا ہے اور یہ اس خبط کی تسکین کیلئے دوسرے انسانوں کو قتل کر دیتا ہے' ہم لوگ کس قدر بے وقوف ہیں' ہم مٹی پر قبضے کیلئے انسانوں کی جان لیتے ہیں اور آخر میں خود بھی اس مٹی میں مل کر بے وجود' بے نشان ہو جاتے ہیں کیونکہ انسان کی قبر اور قبرستانوں کی بھی ایک عمر ہوتی ہے' قبریں اور قبرستان بھی جوان ہوتے ہیں' بوڑھے ہوتے ہیں' مرتے ہیں اور پھر بے نشان ہو جاتے ہیں۔ ہمیں کیا معلوم ہم کس کی قبر پر آباد ہیں اور ہمارے مکان میں کل کلاں کس کی قبر بنے گی۔ ہم سب مٹی کے بطن سے نکلے ہوئے لوگ ہیں اور ہماری تمام خواہشوں اور آرزوؤں نے بھی ایک دن مٹی میں مل کر ختم ہو جانا ہے اور ہماری خواہشوں کی مٹی بھی کسی دن زمین کے ساتھ اپنی ہیئت بدل لے گی۔ ہم کسی درخت' کسی پودے کا

کلوروفل بن جائیں گے یا پھر کھانسی کا بیکٹیریا بن کر اپنے بعد آنے والوں کی زندگی عذاب کر دیں گے۔

ہم سب اس حقیقت سے واقف ہیں لیکن کیونکہ ہماری مٹی میں حرص کا عنصر بھی شامل ہے چنانچہ ہم پوری زندگی زیادہ سے زیادہ مٹی' زیادہ سے زیادہ زمین گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کوشش کے دوران کسی دن اس مٹی میں مٹی ہو جاتے ہیں۔ ہم مٹی کے بیٹے کتنے بے وقوف ہیں' ہم اس مٹی کیلئے قتل بھی ہوتے ہیں اور قتل بھی کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں مٹی کبھی کسی کی ملکیت نہیں ہوتی۔

⊘ ⊘ ⊘

اللہ میڈ

''اس کی وجہ تکبر ہے' ہر کامیاب انسان اپنی کامیابی کو ذاتی اچیومنٹ سمجھتا ہے' یہ احساس اس کے اندر غرور اور تکبر پیدا کر دیتا ہے اور یہاں سے خرابی جنم لیتی ہے'' ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی' یہ ایک خاص قسم کی مسکراہٹ تھی اور یہ مسکراہٹ دنیا کے ہر صوفی' ہر نیک' عالم اور اصلی دانشور کے چہرے پر ہوتی ہے۔ دنیا کا ہر صوفی' ہر عالم اور ہر نیک شخص اپنی نیکی' اپنے علم اور اپنے تصوف کو لوگوں سے چھپا کر رکھتا ہے لیکن وہ اپنی مسکراہٹ نہیں چھپا پاتا۔ یہ مسکراہٹ اچھے لوگوں کا ٹریڈ مارک ہوتی ہے اور یہ آپ کو مدر ٹریسا سے لے کر نیلسن منڈیلا' میاں محمد بخش سے شاہ حسین اور امام غزالی سے لے کر مولانا روم تک دنیا کے ہر اچھے' بڑے' نیک' عالم اور صوفی کے چہرے پر دکھائی دیتی ہے۔ میں نے ہمیشہ اچھے لوگوں کو ان کی اس مسکراہٹ سے پہچانا' میں نے ان سے ایک ایسا سوال پوچھا جو میرے دل میں ہمیشہ سے کھٹکتا چلا آ رہا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا ''دنیا کا ہر کامیاب انسان آخر میں تنہا کیوں ہوتا ہے'' انہوں نے فوراً جواب دیا ''اپنے تکبر اور غرور کی وجہ سے'' میں ان سے تفصیل کا متقاضی تھا' وہ بولے ''دنیا میں تکبر کی سب سے بڑی شکل سیلف میڈ ہے'' میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا' انہوں نے فرمایا ''جب کوئی انسان اپنے آپ اور اپنی کامیابیوں کو سیلف میڈ کا نام دیتا ہے تو وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ' قدرت اور فطرت کی نفی کرتا ہے بلکہ وہ ان تمام انسانوں کے احسانات اور مہربانیوں کو بھی روند ڈالتا ہے جنہوں نے اس کی کامیابی میں مرکزی کردار ادا کیا تھا اور یہ دنیا کا بدترین تکبر ہوتا ہے'' وہ رکے' چند لمحے سوچا اور اس کے بعد بولے ''تم فرعون اور نمرود کو دیکھ لو' یہ دونوں انتہا درجے کے ذہین' فطین اور باصلاحیت حکمران تھے' فرعون نے نعشوں کو حنوط کرنے کا طریقہ ایجاد کیا تھا' اس نے ایک ایسی سیاہی بھی بنوائی تھی جو قیامت تک مدھم نہیں ہوتی' اس نے ایسے اہرام بھی تیار کیے تھے جن کی ہیئت کو آج تک کی جدید سائنس نہیں سمجھ پائی' اس نے دنیا میں آبپاشی کا پہلا نظام بھی بنایا تھا اور فرعون کے دور میں مصر کے صحراؤں میں بھی کھیتی باڑی ہوتی تھی لیکن یہ فرعون بعد ازاں عبرت کی نشانی بن گیا۔ کیوں؟'' انہوں نے میری طرف دیکھا' میں نے فوراً عرض کیا ''اپنے تکبر' اپنے غرور کی وجہ سے'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرا کر بولے ''ہاں لیکن

فرعون کا تکبر سیلف میڈ لوگوں کے غرور سے چھوٹا تھا' اس نے صرف اللہ کی نفی کی تھی' وہ اللہ کے سوا اپنے تمام بزرگوں' اپنے تمام دوستوں اور اپنے تمام مہربانوں کا احسان تسلیم کرتا تھا' وہ اپنے استادوں کو دربار میں خصوصی جگہ دیتا تھا اور وہ اپنی بیویوں کا اتنا احترام کرتا تھا کہ اس نے اپنی اہلیہ محترمہ کے کہنے پر حضرت موسیٰ کو گود لے لیا تھا'' وہ رکے اور دوبارہ بولے ''تم نمرود کو دیکھو' نمرود نے کھیتی باڑی کے جدید طریقے ایجاد کرائے تھے' اس نے دنیا میں پہلی بار زمین کو یونٹوں میں تقسیم کیا تھا' اس نے اونچی عمارتیں بنوائیں تھیں' اس نے شہروں میں فوارے لگوائے تھے' اس نے دنیا میں پہلی بار درخت کاٹنے کی سزا تجویز کی تھی اور وہ دنیا کا پہلا بادشاہ تھا جسکے ملک سے غربت اور بیروزگاری ختم ہو گئی تھی اور جسکی رعایا کا ہر فرد خوشحال اور مطمئن تھا لیکن پھر یہ بادشاہ بھی اللہ کے عذاب کا شکار ہوا۔ کیوں؟'' میں نے فوراً عرض کیا ''غرور کیوجہ سے'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور بولے ''ہاں وہ اللہ کے وجود کی نفی کا مرتکب ہوا تھا اور یہ اسکا واحد جرم تھا جبکہ عام زندگی میں وہ ایک اچھا انسان اور شاندار بادشاہ تھا' وہ مہمان نواز تھا' وہ شائستگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا' اسنے اپنے دربار میں دنیا جہاں کے عالم اور ماہرین جمع کر رکھے تھے' وہ بہادری اور شجاعت میں یکتا تھا' وہ اپنے دوست احباب' ماں باپ اور عزیز رشتے داروں کا بھی احترام کرتا تھا اور وہ لوگوں کے احسانات اور مہربانیوں کو بھی یاد رکھتا تھا لیکن اسنے اللہ کی ذات کی نفی کی' خود کو خدا کہہ بیٹھا اور اللہ کی پکڑ میں آ گیا'' وہ رک گئے۔

وہ چند لمحے سوچتے رہے اور اس کے بعد بولے ''فرعون اور نمرود نے صرف اللہ کی ذات میں برابری کی تھی جبکہ خود کو سیلف میڈ کہنے والا شخص نعوذ باللہ نہ صرف اس سے برتری کا دعویٰ کرتا ہے بلکہ وہ دنیا بھر کے ان لوگوں کے احسانات بھی فراموش کر دیتا ہے جنہوں نے اس کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا چنانچہ یہ شخص فرعون اور نمرود کے مقابلے میں بھی کئی گنا بڑے غرور اور تکبر کا مظاہرہ کرتا ہے لہٰذا یہ آخر میں اللہ کی پکڑ میں آ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر تنہائی کا عذاب نازل فرما دیتا ہے'' وہ رکے' انہوں نے ایک لمبا سانس لیا اور دوبارہ بولے ''انسان مجلسی جانور ہے۔ انسان' انسان کا محتاج ہے' ہم سب اپنے جیسے لوگوں میں بیٹھنا چاہتے ہیں' ان کے ساتھ گپ شپ کرنا چاہتے ہیں' ان کے ساتھ اپنے جذبات شیئر کرنا چاہتے ہیں' ہمارے لئے سب سے بڑی سزا تنہائی ہوتی ہے اسی لئے قید تنہائی کو دنیا میں سب سے سنگین سزا قرار دیا گیا۔ انسان بڑے سے بڑا عذاب برداشت کر جاتا ہے لیکن وہ تنہائی کی سزا نہیں بھگت سکتا۔ اللہ تعالیٰ کیونکہ ہماری رگ رگ' ہماری نس نس سے واقف ہے چنانچہ وہ خود کو سیلف میڈ قرار دینے والوں کو تنہائی کی حتمی سزا دیتا ہے۔ تم دیکھ لو' دنیا میں جس بھی شخص نے خود کو سیلف میڈ قرار دیا' جس نے

بھی اپنی اچیومنٹس کو اپنی ذاتی کوشش' جدوجہد اور محنت کا نتیجہ کہا وہ کامیابی کی آخری سٹیج پر پہنچ کر تنہائی کا شکار ہو گیا' وہ تنہائی کی موت مرا" وہ خاموش ہو گئے' میں چند لمحے انہیں دیکھتا رہا' جب خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تو میں نے عرض کیا "ہمیں سیلف میڈ کی بجائے کیا کہنا چاہئے" وہ فوراً بولے "اللہ میڈ" وہ چند لمحے مجھے دیکھتے رہے اور اس کے بعد بولے "کامیاب اور کامران لوگوں پر اللہ کا خصوصی کرم ہوتا ہے' اللہ ان لوگوں کو کروڑوں' اربوں لوگوں میں سے کامیابی کیلئے خصوصی طور پر چنتا ہے' انہیں وژن اور آئیڈیاز دیتا ہے' ان کو محنت کرنے کی طاقت دیتا ہے' انہیں دوسرے انسانوں کے مقابلے میں زیادہ توانائی بخشتا ہے' ان کے آگے بڑھنے کے خصوصی مواقع پیدا کرتا ہے' ان کیلئے کامیابی کے راستے کھولتا ہے' معاشرے کے بااثر اور اہم لوگوں کے دلوں میں ان کیلئے محبت اور ہمدردی پیدا کرتا ہے اور آخر میں تمام لوگوں کو حکم دیتا ہے وہ ان لوگوں کو کامیاب تسلیم کریں' وہ اپنی نشستوں سے اٹھ کر ان کیلئے تالی بجائیں اگر یہ حقیقت ہے تو پھر یہ ساری کامیابی اللہ کی کامیابی نہ ہوئی' ہم لوگ اور ہماری ساری کامیابیاں اللہ میڈ نہ ہوئیں' تم سوچو' تم بتاؤ"۔ انہوں نے رک کر میری طرف دیکھا' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بولے "اور جب کوئی کامیاب شخص اپنی کامیابی کو اللہ کا کرم اور مہربانی قرار دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں اس کے گرد رونق لگا دیتا ہے' وہ لوگوں کے دلوں میں اس شخص کیلئے محبت ڈال دیتا ہے یوں یہ شخص زندگی کی آخری سانس تک لوگوں کی محبت اور رونق سے لطف اٹھاتا رہتا ہے' اللہ اس کی زندگی پر تنہائی کا سایہ نہیں پڑنے دیتا"۔ میں نے ان کی طرف دیکھا اور ڈرتے ڈرتے پوچھا "پھر انسان کی زندگی میں اس کی کوشش اور جدوجہد کا کیا مقام ہوا" انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولے "ہماری کیا مجال ہے ہم اس کی اجازت کے بغیر محنت کر سکیں یا ہم اس کی مہربانی کے بغیر جدوجہد کر سکیں' ہم میں تو اتنی مجال نہیں کہ ہم اس کی رضامندی کے بغیر اس کا نام تک لے سکیں' پھر ہماری محنت' ہماری جدوجہد کی کیا حیثیت ہے' یہ سب اللہ کی مہربانی کا کھیل ہے' یہ سب اللہ میڈ ہے' ہم اور ہم سب کی کامیابیاں اللہ میڈ ہیں' خدا کے بندو اللہ کے کریڈٹ کو تسلیم کر دتا کہ تمہاری زندگیاں تنہائیوں سے بچ سکیں' تم پر غم کا سایہ نہ پڑے"۔ وہ رکے اور اس کے بعد زور دے کر بولے "یاد رکھو' زندگی میں کبھی خود کو سیلف میڈ نہ کہنا' ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ میڈ سمجھنا' اللہ تم پر بڑا کرم کرے گا"۔

⊘ ⊘ ⊘

اللہ کا انعام

"اچھا تم بتاؤ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سب سے بڑا تحفہ کیا دیا تھا" وہ مسکرائے اور میری طرف دیکھا' میں سوچ میں پڑ گیا' وہ اس دوران میری طرف دیکھتے رہے' میں نے تھوڑی دیر سوچا اور عرض کیا "شعور" انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا' میں نے عرض کیا "عقل" وہ فوراً بولے "شعور اور عقل دونوں ایک ہی چیز ہیں" میں نے مزید سوچا اور عرض کیا "آکسیجن' سورج کی روشنی' پانی' خوراک اور جمالیاتی حس" انہوں نے ناں میں گردن ہلا دی' میں نے عرض کیا "تعمیر کا فن' انسان کائنات کی واحد مخلوق ہے جو پتھروں کو ہیرے کی شکل دے سکتی ہے' جو مٹی کا محل بنا سکتا ہے اور جو ریت کے ذروں کو شیشے میں ڈھال سکتا ہے" وہ مسکرائے اور انکار میں سر ہلا دیا' میں نے اس کے بعد انسان کی تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کا نام لینا شروع کر دیا لیکن وہ انکار میں سر ہلاتے رہے یہاں تک کہ میں تھک گیا اور بے بسی سے ان کی طرف دیکھنے لگا' وہ مسکرائے اور نرم آواز میں بولے "آپ نے انسان کی جن خوبیوں اور صلاحیتوں کا ذکر کیا وہ تمام اللہ تعالیٰ کی دین ہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے یہ خوبیاں قائم اور دائم رہتی ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے تو انسان فرعون ہو یا نمرود یا بش اس کی خوبیاں اس کی خامیاں بن جاتی ہیں اور وہ دنیا میں زندہ لاش بن کر رہ جاتا ہے" میں خاموشی سے سننے لگا' وہ بولے "میں آپ کو اب اس سب سے بڑے تحفے کے بارے میں بتاتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کیا" میں ہمہ تن گوش ہو گیا' وہ بولے "قدرت نے انسان کو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کی صلاحیت سے نواز رکھا ہے' دنیا کی کوئی دوسری مخلوق' کوئی خاکی یا نوری پیکر اس خوبی کی مالک نہیں" میں نے حیرت سے پوچھا "جناب میں آپ کی بات نہیں سمجھا" وہ بولے "مثلاً تم چاند کو لے لو' اللہ تعالیٰ نے جب کائنات بنائی تو اس نے چاند میں ایک پروگرام فیڈ کر دیا اور چاند اب اس پروگرام کے تحت چمک رہا ہے اور جب تک قدرت پروگرام نہیں بدلے گی یہ چاند اسی طرح چمکتا رہے گا' آپ سورج' ستاروں اور سیاروں کو لے لیجئے' زمین کی حرکت کو لیجئے' ہواؤں' فضاؤں' ندیوں اور نالوں کو لے لیجئے' دریاؤں' سمندروں اور پہاڑوں کو لے لیجئے' زلزلوں' طوفانوں اور سیلابوں کو لے لیجئے' یہ تمام ایک پروگرام کے تحت چل رہے ہیں اور قدرت یہ

پروگرام فیڈ کر کے ان سے لاتعلق ہو گئی" وہ خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا "جناب میں اب بھی آپ کا نقطہ نہیں سمجھ سکا" وہ بولے "دنیا کا کوئی پہاڑ' کوئی درخت' کوئی جانور' کوئی ستارہ اور کوئی سیارہ اللہ تعالیٰ کو خوش نہیں کر سکتا لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس خوبی سے نواز رکھا ہے کہ وہ اپنے رب کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے' وہ اسے راضی کر سکتا ہے" میں نے عرض کیا "جناب میں یہی تو آپ سے پوچھ رہا ہوں" وہ مسکرائے اور بولے "لیکن اس نقطے کو سمجھنے کیلئے مجھے پیچھے تاریخ میں جانا پڑے گا" میں خاموشی سے سننے لگا' وہ بولے "آپ شیطان اور حضرت آدمؑ کا واقعہ دیکھئے' اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حکم دیا وہ انسان کو سجدہ کرے' شیطان نے حکم عدولی کی' اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوئے اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے راندۂ درگاہ کر دیا' شیطان آسمانوں سے اترا اور کروڑوں سال سے زمین پر خوار ہو رہا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو گندم کا دانہ چکھنے سے منع فرمایا' حضرت آدمؑ نے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی' اللہ تعالیٰ ان سے بھی ناراض ہوئے اور انہیں بھی آسمان سے زمین پر بھیج دیا لیکن حضرت آدمؑ کے رویئے اور شیطان کے رویئے میں بڑا فرق تھا" وہ دم لینے کیلئے رکے اور دوبارہ گویا ہوئے "شیطان زمین پر آنے کے باوجود اپنی بات پر اڑا رہا جبکہ حضرت آدمؑ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے لگے' وہ سجدے میں پڑے رہتے تھے' روتے جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہی' اپنی غلطی' اپنے جرم اور اپنے گناہ کی معافی مانگتے جاتے تھے' حضرت آدمؑ کی توبہ کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول نہ کر لی اور مشیت ایزدی ان سے راضی نہ ہو گئی" وہ خاموش ہو گئے' ہمارے درمیان خاموشی کے بے شمار پل گزر گئے' جب یہ وقفہ طویل ہو گیا تو میں نے عرض کیا "جناب میں اب بھی آپ کی بات نہیں سمجھا" وہ مسکرائے اور نرم آواز میں بولے "اللہ تعالیٰ کا انسان کیلئے سب سے بڑا انعام توبہ ہے' انسان اس انعام' اس تحفے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ذات کو راضی کر سکتا ہے اور وہ اللہ جو اپنے بندے کی کسی خطا' کسی جرم' کسی کوتاہی اور کسی گناہ سے ناراض ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ سے مان جاتا ہے اور اس بندے پر اپنے رحم' اپنے کرم اور اپنی محبت کے دروازے کھول دیتا ہے اور یوں انسان سکون میں چلا جاتا ہے"۔

وہ رکے اور دوبارہ بولے "جب تک انسان کو اللہ کی محبت' کرم اور رحم نصیب نہیں ہوتا اس وقت تک انسان کو سکون' آرام' چین' خوشی اور مسرت حاصل نہیں ہوتی' خوشی' خوشحالی اور سکون اللہ کی رضا مندی سے منسلک ہے اور جو شخص' جو قوم اور جو طبقہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی سے محروم ہو جاتا ہے اس کا سکون' خوشی اور خوشحالی چھن جاتی ہے چنانچہ جب بھی انسان کا رزق تنگ ہو جائے' اس کا دل مسرت اور

خوشی سے خالی ہو جائے' وہ چین اور سکون سے محروم ہو جائے اور اسے زندگی میں ایک تپش' ڈپریشن اور ٹینشن کا احساس ہو تو اسے چاہیے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جائے' وہ کثرت سے توبہ کرے اور وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرے" میں خاموش رہا' وہ بولے "یہ سکون کا ایک نسخہ ہے' سکون کا دوسرا نسخہ معافی ہے' ہم لوگ دن میں اوسطاً سو سے تین سو تک غلطیاں کرتے ہیں' اگر ہم ہر غلطی پر معذرت کو اپنی روٹین بنا لیں' ہم نے جلد بازی' بے پروائی' نفرت' غصے' تکبر اور ہٹ دھرمی میں جس شخص کا حق مارا' ہم نے جس کو نقصان پہنچایا اور ہم نے جس کو ڈسٹرب کیا ہم اگر فوراً اس شخص سے معافی مانگ لیں تو بھی ہماری زندگی میں سکون' آرام اور خوشی آ سکتی ہے' ہمیں معافی مانگنے میں کبھی کوتاہی نہیں برتنی چاہیے کیونکہ معافی وہ چٹان ہے جس کے نیچے سکون' خوشی اور خوشحالی کے چشمے چھپے ہیں اور جب تک ہم یہ چٹان نہیں سرکائیں گے' ہم خوشی' خوشحالی اور سکون کا ٹھنڈا پانی نہیں پی سکیں گے" وہ رکے اور دوبارہ بولے "یاد رکھو دنیا میں صرف اور صرف شیطان توبہ اور معافی سے دور رہتا ہے جبکہ اللہ کے بندے ان دونوں چیزوں کو اپنی روٹین بنا لیتے ہیں' ہٹ دھرمی' تکبر' ظلم' ضد' نفرت اور غصہ شیطان کی خامیاں ہیں اور جن لوگوں کی ذات میں یہ ساری خامیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں' تم کبھی ان کے منہ سے توبہ اور معافی کا لفظ نہیں سنو گے چنانچہ تم کبھی ان لوگوں کو پرسکون' خوش اور خوشحال نہیں پاؤ گے' یہ دولت مند ہو سکتے ہیں لیکن یہ دولت انہیں خوشی اور سکون فراہم نہیں کرتی' تم ان لوگوں کا انجام بھی اچھا ہوتا نہیں دیکھو گے جبکہ معافی اور توبہ کرنے والے لوگوں میں تمہیں غصہ' نفرت' ضد' ظلم' تکبر اور ہٹ دھرمی نہیں ملے گی اور تمہیں یہ لوگ کبھی پریشان' ڈپریس اور ٹینس نہیں ملیں گے چنانچہ ہر لمحہ لوگوں سے معافی مانگتے رہو اور اللہ سے توبہ کرتے رہو' تمہاری زندگی سے کبھی سکون' خوشی اور خوشحالی کم نہیں ہو گی" وہ خاموش ہو گئے' میں نے ان کے گھٹنے چھوئے اور باہر آ گیا۔

⊘ ⊘ ⊘

اوقات

ایک سوکھا سڑا' میلا کچیلا ہاتھ کھڑکی سے اندر آیا اور آ کر میرے سامنے پھیل گیا' میری طبیعت خراب ہو گئی' میں نے غصے سے باہر دیکھا' باہر ہاتھ سے کہیں زیادہ میلا کچیلا اور سوکھا سڑا بھکاری کھڑا تھا' میں نے اسے ہاتھ سے معاف کرنے کا اشارہ کیا اور گاڑی ریورس گیئر میں ڈال دی' ہاتھ وہیں رہا' میں نے ہاتھ کو ہاتھ سے باہر دھکیلنے کی کوشش کی مگر ہاتھ وہیں رہا' میرے غصے میں اضافہ ہو گیا' میں نے شدید وحشت میں چلا کر کہا ''کما کر کھاؤ' اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہاتھ پاؤں دیئے ہیں'' میلا کچیلا شخص ہنس پڑا' اس کے دانت اس کے ہاتھ سے کہیں زیادہ گندے اور بدبودار تھے' اس نے ہاتھ میرے سامنے لہرایا اور بدبودار لہجے میں بولا ''کیا تمہیں اتنا ہی ملتا ہے جتنا تم کام کرتے ہو' جتنا تم اپنے ہاتھ پاؤں چلاتے ہو'' میرے دماغ کو آگ لگ گئی' میں نے اس کا ہاتھ نہایت بدتمیزی سے جھٹک دیا' ہاتھ واپس وہیں آ گیا' میں نے گاڑی سے اترنے کیلئے ہینڈل کھینچا لیکن اس سے پہلے کہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوتا' میرے ساتھی نے مجھے پرسکون رہنے کا اشارہ کیا اور جیب سے پانچ روپے کا سکہ نکال کر بھکاری کے ہاتھ پر رکھ دیا' بھکاری نے سکہ الٹ پھیر کر دیکھا اور پھر میری جھولی میں پھینک کر بولا ''اس سے کیا ملتا ہے' یہ دولت تم اپنے پاس سنبھال کر رکھو'' یہ اونٹ کی کمر پر آخری تنکا تھا' میرے ضبط کے سارے کیل قبضے نکل گئے' میرے منہ میں جھاگ آ گئی اور میں اپنے جسم کی ساری نفرت سمیٹ کر اس پر چڑھ دوڑا ''تمہیں تمہاری اوقات کے مطابق تو دے دیا' اب تمہیں کپڑے بھی اتار کر دے دیں'' بھکاری نے قہقہہ لگایا' ہاتھ واپس کھینچا اور نسبتاً اونچی آواز میں بولا ''اللہ تعالیٰ نے جتنا تمہیں دیا کیا تمہاری اتنی اوقات تھی'' میں نے غصے سے ایکسیلیٹر دبایا' گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور میں اس میلے کچیلے' سوکھے سڑے بھکاری اور اس کے سوکھے سڑے اور میلے کچیلے ہاتھ سے دور چلا گیا۔

یہ شاید دوسرا چوک تھا یا تیسرا' گاڑی سرخ سگنل پر رکی' میں نے رومال سے پسینہ پونچھا' جونہی گرم سلگتے قطرے سوتی رومال کے ریشوں میں جذب ہوئے میری ذات کی پہلی اینٹ نے اپنی جگہ چھوڑ دی' ایک سوال اندر سے اٹھا اور اٹھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا' میں نے اپنے آپ سے پوچھا ''اللہ نے

مجھے جتنا دیا کیا واقعی میں اتنا ڈیزرو کرتا تھا'' جواب آیا ''نہیں اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری اوقات سے زیادہ دیا'' میں نے سوچنا شروع کر دیا' سوچتا گیا' سوچتا گیا' گتھیاں کھلتی گئیں' کھلتی گئیں' معلوم ہوتا گیا' ہوتا گیا' میں آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس دنیا میں اربوں لوگ مجھ سے زیادہ ذہین' مجھ سے زیادہ محنتی اور مجھ سے زیادہ فنکار ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے زیادہ عزت' ان سے زیادہ صحت اور ان سے زیادہ رزق دیا' اس دنیا میں کروڑوں اربوں لوگ مجھ سے زیادہ کام کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے میرے کام کو ان سے زیادہ درجہ اور ان سے زیادہ اہمیت دے دی' مجھے معلوم ہوا میرا رب مجھے میرے کام' میری محنت سے زیادہ دیتا ہے' اس سوال کے بعد ایک دوسرا سوال اٹھا اور اٹھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا' میں نے اپنے آپ سے پوچھا ''کیا میں دنیا میں اپنی اوقات کے مطابق زندگی گزار رہا ہوں'' جواب آیا ''نہیں' اس سے لاکھ کروڑ درجے بہتر'' میں نے سوچنا شروع کیا تو معلوم ہوا' میری اوقات تو بہت ہی چھوٹی ہے' میں معمولی معمولی باتیں برداشت نہیں کر سکتا' میں کمینگی' سفلے پن اور حرص کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا' میں اس قدر منتقم مزاج ہوں کہ اپنے سے کہیں زیادہ کمزور لوگوں سے بھی انتقام لیتے نہیں چوکتا' جھوٹا ہوں' غیبت باز ہوں' فحش کلام ہوں' احساس کمتری کا شکار ہوں اور خود غرض ہوں اور وہ کون سی خامی' کون سی خرابی ہے جو میرے اندر نہیں لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کا کرم سر پر سایہ کئے ہوئے ہے' اللہ تعالیٰ نے میری ساری خامیوں' ساری خرابیوں اور سارے عیبوں پر پردے ڈال رکھے ہیں' اللہ نے مجھے عزت' شہرت اور نیک نامی سے نواز رکھا ہے' میرے پاس آزادی ہے' آسائش ہے اور فراوانی ہے''۔

میں نے آگے پیچھے مڑ کر دیکھا' میرے گردا گرد لوگ ہی لوگ تھے' سر ہی سر' کندھے ہی کندھے اور دھڑ ہی دھڑ تھے' میں نے ان تمام دھڑوں' تمام کندھوں اور تمام سروں کو غور سے دیکھا' مجھے سارے لوگ اپنے جیسے لگے' مجھے معلوم ہوا' ان سب لوگوں کو ان کی محنت' ان کے کام سے زیادہ مل رہا ہے' انہیں ان کا رب ان کی اوقات سے زیادہ دے رہا ہے' میں نے آنکھیں بند کر لیں' وہ سارے دھڑ بہت سارے دھڑ بن گئے' وہ سارے کندھے بہت سارے کندھے بن گئے' وہ سارے سر بہت سارے سر بن گئے' یہ سارے سر' کندھے اور دھڑ پندرہ سولہ کروڑ بن گئے اور وہ سڑک پھیل کر ملک بن گئے' اسلامی جمہوریہ پاکستان' پاک سرزمین شاد باد' مجھے محسوس ہوا اس پورے ملک کو اس کی اوقات سے زیادہ مل رہا ہے' قدرت ان تمام سروں' کندھوں اور دھڑوں کو ان کی محنت سے کہیں زیادہ صلہ دے رہی ہے' یہ سب لوگ بھارت میں بھی ہو سکتے تھے' اس بھارت جس میں 19 کروڑ لوگ 6 روپے روزانہ کماتے ہیں اور 6 کروڑ دو' دو روپے' جس میں 20 کروڑ اچھوتوں کو آج کے زمانے میں بھی سائیکل خریدنے کی اجازت

نہیں‘ جو اپنی پشت پر جھاڑو باندھ کر پھرتے ہیں‘ جو جوتے نہیں پہن سکتے اور جو بڑی ذات کے ہندوؤں سے بات کرتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں‘ ہم لوگ روانڈا‘ برونڈی‘ کوسوو اور سربیا میں بھی ہو سکتے تھے جہاں لوگ اقوام متحدہ کے کیمپوں کے سامنے ایک ایک روٹی کیلئے ہفتہ ہفتہ پڑے رہتے ہیں‘ یہ لوگ فلسطین کے شہری بھی ہو سکتے تھے جہاں کوئی گھر ایسا نہیں جس کے صحن میں چار پانچ قبریں نہ ہوں‘ یہ لوگ عراق اور افغانستان کے شہری بھی ہو سکتے ہیں جہاں زندگی اب خوف کا دوسرا نام ہے اور یہ لوگ ان بالٹک سٹیٹس کے شہری بھی ہو سکتے تھے جن میں لوگ چند ڈالروں کیلئے اپنے بچے بیچنے کیلئے تیار بیٹھے ہیں‘ مجھے معلوم ہوا‘ ہم سب لوگ اپنی اوقات سے کہیں بہتر زندگی گزار رہے ہیں‘ ٹھیک ہے حالات اتنے اچھے نہیں جتنے ہونے چاہئیں لیکن ان حالات کو تو ہم نے ہی بہتر بنانا ہے‘ اس نظام کو بدلنا‘ ظالم طرز حکومت کا رخ تبدیل کرنا‘ اپنے پاؤں کے کانٹے چننا تو ہماری اپنی ذمہ داری ہے‘ یہ فرض‘ یہ ذمہ داری تو ہم نے ہی نبھانی ہے‘ قدرت نے تو کوئی کمی‘ کوئی کسر نہیں چھوڑی‘ ہمیں آزادی دی‘ زمین دی‘ پانی دیا اور رزق دیا لیکن اب ہم چاہتے ہیں وہ اپنے فرشتے نازل فرما کر یہ نظام بھی درست کر دے‘ وہ آصف علی زرداری کا دل پھیر دے‘ وہ صدر پرویز مشرف کو اٹھا کر ایوان صدارت سے باہر پھینک دے اور وہ فرشتے بھجوائے اور فرشتے ججوں کو ان کی کرسیوں پر بٹھا دیں‘ تو یہ کیسے ممکن ہے؟ اللہ کرم کیا کرتا ہے اور اس کرم سے فائدہ تو انسان نے خود اٹھانا ہوتا ہے۔

میں نے یوٹرن لیا اور اس میلے کچیلے‘ سوکھے سڑے بھکاری کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا‘ واپس آیا‘ گاڑی سے اتر کر اسے تلاش کیا‘ مگر وہ نہ ملا‘ میں دیر تک تلاش کرتا رہا لیکن جب مایوس ہو گیا تو اندر سے آواز آئی وہ بھکاری بھکاری نہیں تھا وہ ایک پیغام تھا‘ وہ ایک خط تھا‘ ادھورے پتے والا بے رنگ خط اور بے رنگ خط میں کاغذ کی ایک چھوٹی سی چٹ تھی اور اس چٹ پر لکھا تھا ”یاد رکھو جو رب نعمت دیتا ہے‘ وہ رب نعمت چھین بھی سکتا ہے‘ اگر اپنے رب سے اپنی اوقات سے بڑھ کر پانا چاہتے ہو تو اپنی اوقات میں رہو‘ شکر کرو‘ توبہ کرو اور ہر وقت اسے یاد رکھو۔“

⦸ ⦸ ⦸

ایجیکسیو میں ہوٹل سے ڈاؤن ٹاؤن کیلئے فیری چلتی تھی، ہم بالکونی سے آخری فیری کو رات کے اندھیرے میں گھلتے ہوئے دیکھ رہے تھے، تم نے اُس وقت سرگوشی میں پوچھا تھا ''کیا یہ فیری واپس آئے گی'' میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا' تمہارا سوال اور میری خاموشی دونوں اب تک بالکونی کی بیلوں سے لپٹے ہوئے ہیں۔

انٹرلاکن میں رات کے آخری پہر چاند نے ہماری کھڑکی پر دستک دی، تم نے پٹ کھول کر دیکھا' چاندنی کی لہروں میں ''مکس اپ'' ہورہا تھا' تم نے چاند کے ساتھ سودا کرلیا' تم نے خوابوں کے بدلے چاند لے لیا اور میں خاموشی سے خوابوں کو دور جھیلوں کی طرف رخصت ہوتے دیکھتا رہا' میری وہ خاموشی اور تمہارے خوابوں کی لاش دونوں ابھی تک انٹرلاکن کی فضا میں بین کررہی ہیں۔ کولون کے پل کی جالیوں میں ہزاروں تالے لگے ہیں اور تالوں پر لاکھوں لوگوں کے نام کندہ تھے' لوگ آتے تھے' تالہ لگاتے تھے' ایک دوسرے کے ماتھے کا بوسا لیتے تھے اور چابیاں دریا میں پھینک دیتے تھے۔ تم نے پوچھا تھا ''کیا انسان وقت کو تالے سے باندھ سکتا ہے'' میں خاموش رہا تھا' تم نے تالوں کی پوری قطار پر پیار سے' شفقت سے اور عقیدت سے ہاتھ پھیر دیا تھا' تمہاری عقیدت' تمہاری شفقت اور تمہارے پیار کا لمس بھی ابھی تک ان تالوں پر موجود ہے۔ برگن میں اُس دن دھوپ تھی اور دھوپ میں ذرا سی تلخی' ہم نے بلندی سے شہر کو دیکھا' ٹھنڈا سمندر پہاڑ کی ناف چوم رہا تھا اور پہاڑوں کے کولہوں پر شہر آباد تھا۔ تم نے دھوپ میں اپنا ہاتھ ڈبویا' تھوڑی سی دھوپ چرائی اور یہ دھوپ میرے ٹھنڈے چہرے پر مل دی' برگن کی دھوپ کا وہ ذائقہ بھی ابھی تک میرے ماتھے' میرے کانوں کی لوؤں اور میری ٹھوڑی سے چپکا ہے اور یون فرو' ٹاپ آف دی یورپ' الپس کے بلند ترین گلیشئر پر آئس پیلس تھا اور آئس پیلس کی برفیلی دیواروں میں ہم دونوں کا سایا دکھائی دے رہا تھا' سایہ سائے کے ساتھ سرگوشیاں کررہا تھا' یہ سرگوشیاں اور برف کے وہ سائے دونوں ابھی تک یون فرو کی ٹرین میں پڑے ہیں۔

تم کاؤنٹ کرکے دیکھ لو ہجر کے چودہ ہزار چار سو بارہ سمندروں میں خوشیوں کے' مسرتوں کے اور قربتوں کے صرف تین سو اٹھارہ گنڈولے تھے' ہماری محبتوں کے صحرا میں صرف تین سو اٹھارہ پھول کھلے تھے لیکن یہ سارے پھول ابھی تک مہک رہے ہیں' یہ سارے پھول ابھی تک زندہ ہیں۔

عبداللہ اکیڈمی
الکریم مارکیٹ۔ اُردو بازار، لاہور